رجسٹرڈ نمبر ال - ۱۸۹۲

جامعہ

اردو اکادمی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

کا

ماہوار رسالہ

زیر ادارت

ڈاکٹر سید عابد حسین۔ ایم اے، پی ایچ، ڈی

پروفیسر محمد عاقل ایم اے

قیمت سالانہ صہ؍ مطبع جامعہ دہلی فی پرچہ ۸؍

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جامعہ

جلد ۲۴ | مارچ ۱۹۳۵ء | نمبر ۳

فہرست مضامین

محمد مجیب بی اے (آکسن) پرنٹر و پبلشر نے جامعہ برقی پریس میں چھپوا کر شائع کیا

ترکی اور جنگ آزادی

یہ خالدہ ادیب خانم صاحبہ کے چوتھے توسیعی لکچر کا ایک حصّہ ہے۔
لکچروں کا مجموعہ مکتبہ جامعہ کی طرف سے جلد شائع ہونے والا ہے۔

خواتین اور حضرات!

اگرچہ میں دل سے دعا کرتی ہوں کہ دنیا میں جنگ و جدل کا خاتمہ ہو جائے مگر اس کی کوئی امید نظر نہیں آتی۔ البتہ ۱۹۱۸ء میں جب دو کروڑ آدمی قتل ہو چکے تھے ملک کے ملک اُجڑ چکے تھے، بے شمار مخلوقِ خدا خانماں برباد کی مصیبت میں گرفتار تھی غرض دنیا تہ و بالا ہو گئی تھی۔ تمام انسانوں کے دل امن و امان کی آرزو سے معمور تھے۔ فاتح اور مفتوح دونوں خلوص اور جوش سے اس بات کی تمنا کرتے تھے کہ دنیا میں صلح و آشتی کا دور دورہ ہو جائے۔ نوعِ انسانی کی تاریخ میں کوئی زمانہ ایسا نہیں گذرا جب دنیا کی سب قومیں عدل و انصاف اور ہمدردی کا ایک نیا دور شروع کرنے پر اس قدر مائل ہوں جتنی اُس زمانے میں تھیں۔

جنگ سے ترکوں کو جتنا نقصان پہنچا اتنا شاید ہی کسی قوم کو پہنچا ہو۔ وہ پورے دس سال سے میدانِ جنگ میں دشمنوں کا مقابلہ کر رہے تھے اور اِدھر خود اُن کے گھر میں خونریزی اور انقلاب کا بازار گرم تھا جس کی وجہ سے ملک کے جسم میں خون کا ایک قطرہ بھی باقی نہیں رہا تھا۔ وہ صلح کے لئے بڑی سے بڑی قیمت ادا کرنے کو تیار تھے۔ یہ قیمت عارضی صلح سے قبل مغربی مدبّروں کے اعلانات میں معیّن کی جا چکی تھی۔ لائڈ جارج نے ۵ر جنوری ۱۹۱۸ء کو اعلان کیا تھا کہ وہ علاقہ جہاں ترک خود آباد ہیں اور دارالسلطنت قسطنطنیہ ترکی کے قبضہ میں رہنے دیا جائے گا۔ اِس کے معنی یہ تھے کہ اُسے اپنے دو تہائی مقبوضات سے

ہاتھ دھونا پڑے گا۔ ترک اسی کو غنیمت سمجھتے تھے کہ انہیں اپنے گھر میں چین سے بیٹھنا نصیب ہوگا اور غیروں کی مداخلت سے محفوظ رہ کر اپنی نئی زندگی کی تشکیل اور نشو ونما کا موقع ملے گا۔

پریسیڈنٹ ولسن نے کہا تھا "جتنے ملک جنگ میں شریک ہیں ان کی نئی تقسیم ریاستوں کے مطالبات کے اعتبار سے نہیں بلکہ رعایا کے مفاد کے لحاظ سے کی جانی ہے۔" ایک اور موقع پر انھوں نے فرمایا تھا "ہمارا فیصلہ بے لاگ ہوگا۔ ایسا یہ تفریق نہیں کی جائے گی کہ جن کے ساتھ ہم چاہیں انصاف کریں اور جن کے ساتھ نہ چاہیں نہ کریں۔ انصاف ایسا ہونا چاہیئے جس میں کسی کی رعایت نہ کی جائے۔ جس کا معیار صرف یہ ہو کہ قوموں کے حقوق میں مساوات برتی جائے۔" پرانے مدبّروں میں صرف یہی ایک شخص تھا جس نے یہ اندازہ کر لیا تھا کہ نوع انسانی امن کی آرزومند ہے۔ ان الفاظ میں جو شیکسپیر کا سا زورِ بیان اور انجیل کی سی سادگی رکھتے تھے اس نے اپنے چودہ اصولوں کا اعلان کیا۔ حضرت موسیٰ کے دس احکام کے مقابلے میں ولسن کے چودہ احکام بھی یادگار رہیں گے۔ مگر فرق یہ تھا کہ حضرت موسیٰ اپنے احکام کو نافذ کرنے کی قوت رکھتے تھے اور ولسن اس سے محروم تھا۔ وہ دنیا کی بزمِ مشورہ میں ایک بھولے بھٹکے مسافر کی طرح آنکلا۔ اور تھوڑی دیر بیٹھکر چلا گیا۔ صلح کی شرطیں انھیں پرانے طرز کے مدبّروں نے طے کیں۔ یہ بڑے قابل لوگ تھے اور جنگ سے پہلے حُبّ وطن کے جو معنی سمجھے جاتے تھے ان کے لحاظ سے محبِ وطن بھی تھے۔ مگر سب کے سب اتنے بے بصیرت تھے کہ خدا کی نشانیوں کو جو نور کے حرفوں میں دیوار پر نظر آرہی تھیں نہیں دیکھ سکے، اتنے بے حس تھے کہ جذبات کی نئی لہروں کو جو جمہور کے دلوں میں اٹھ رہی تھیں نہیں سمجھ سکے، اتنے نافہم تھے کہ انھوں نے جنگِ عظیم کے بعد بھی یہ سبق نہیں سیکھا کہ جو محبِ وطن اپنے ملک کی سلامتی چاہتا ہے اُسے اپنے ہمسایہ ملکوں میں بھی

امن و امان کی فضا پیدا کرنی چاہیے۔

عارضی صلح کے بعد اتحادیوں کی فوجوں نے استنبول، سلیشیا اور چنک پر قبضہ کر لیا۔ ترکوں کی فوجیں منتشر ہونے لگیں۔ چھ مہینے تک ترک اس دھوکے میں رہے کہ یہ قبضہ عارضی ہے اور صلح نامہ پر دستخط ہونے کے بعد ختم ہو جائے گا۔

مگر حریفوں نے جب یہ دیکھا کہ ترکی کے پاس فوج نہیں رہی ہے تمام ملک میں ابتری اور بے بسی کی حالت ہے تو ان کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اور وہ خواہشیں جن کی بنا پر مخفی معاہدے کئے گئے تھے پھر ابھر آئیں۔ آرنلڈ ٹوائنبی اپنی کتاب "ترکی" میں لکھتا ہے "جس طرح بھوکے بھیڑیئے شکار کی تاک میں خیمہ گاہ کے گرد چکر کاٹتے ہیں اسی طرح مغرب کی ریاستیں اس فکر میں تھیں کہ موقع پا کر ترکی پر ٹوٹ پڑیں۔ کیونکہ ترکی ایک زرخیز ملک ہے اور یورپ کی شہنشاہیت بہت لالچی ہے۔

اندرونی حالت | اتحاد و ترقی کے لیڈر ملک سے رخصت ہو چکے تھے۔ ان کی انجمنوں کی رہبری کرنے والا کوئی نہ تھا۔ کوئی اور منظم پارٹی موجود نہ تھی جو اس کی جگہ لے لیتی۔ اور قوم کی نمایندگی کرتی اس لئے کہ نوجوان ترکوں نے کوئی اور پارٹی قائم ہی نہیں ہونے دی تھی۔ ایک پارٹی کی حکومت میں یہ بھی ایک بڑا عیب ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ جنگ اور انقلاب کے زمانے میں بہت کامیاب ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ نئی اصلاحات کو بہت جلد عمل میں لا سکے۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ جہاں اس میں انتشار پیدا ہوا پھر ملک کی سیاسی حالت سنبھالے نہیں سنبھلتی۔ پارٹی اپنے آپ کو کُل قوم کا نمایندہ سمجھتی ہے اور اس کے دشمن بھی یہی سمجھتے ہیں۔ اس لئے اگر انھیں اس پارٹی سے کوئی نقصان پہنچا ہو تو وہ کُل قوم سے اس کا بدلہ لیتے ہیں۔ ایک طرف اتحادی ریاستیں اور دوسری طرف اتحاد و ترقی کے اندرونی دشمن، نوجوان ترکوں کی زیادتیوں کی سزا بے قصور ترکی قوم کو دینا چاہتے تھے۔ جو لوگ دراصل قصوروار تھے وہ تو

چلے گئے تھے۔ اَب صرف وہ لوگ باقی تھے جنھوں نے صرف بعض چیزوں میں جماعت اتحاد و ترقی کا ساتھ دیا تھا اور جن کا وجود ترکی کے لئے نہایت مفید اور ضروری تھا۔ مشکل یہ تھی کہ ملک کے سربرآوردہ اشخاص میں سے کوئی ایسا نہ تھا جو کبھی نہ کبھی اِس جماعت کا رکن نہ رہا ہو۔

حکومت پھر سلطان کے ہاتھ میں آگئی۔ اس نے پارلیمنٹ کو برخاست کر دیا۔ چونکہ اس پارلیمنٹ کی حیثیت ایک کٹھ پتلی سے زیادہ نہ تھی اِس لئے اس کے برخاست کئے جانے سے کوئی حرج نہیں ہوا۔ مگر سلطان نے نئے انتخابات کا حکم نہیں دیا۔ اور مُلک کی حکومت خود اُس کے اور اُن ریاستوں کے ہاتھ میں رہی۔ جن کی فوجیں قسطنطنیہ پر قابض تھیں۔ وہ اپنی مجلسِ وزراء میں کبھی کبھی ایسے لوگوں کو بھی رکھتا تھا جن کی قابلیت ورحبِّ وطن میں شبہ کی گنجائش نہ تھی۔ مگر جہاں انھوں نے بیرونی حکومتوں کے احکام پر آنکھ بند کر کے عمل کرنے سے انکار کیا وہ فوراً موقوف کر دیئے جاتے تھے۔

ترکی کے حصے بخرے کرنے کی تجویز

ترکوں کے سامنے صلح کی شرائط پیش کرنے سے پہلے اتحادی ترکوں کے متعلق ایک خطرناک فیصلہ کر چکے تھے۔ وہ یہ تھا کہ مشرقِ ادنیٰ میں ایک یونانی سلطنت قائم کی جائے جس میں مشرقی اور مغربی تھریس، سمرنا اور اس کے عقب کا علاقہ شامل ہو۔ وہ سمجھتے تھے کہ اِس ترکیب سے آبنائے اتحادیوں کے لئے کھُلا رہے گا اور ترک، بلغاری اور روسی اس کے قریب نہ آنے پائیں گے۔ انھوں نے یہ بھی طے کر لیا تھا کہ مشرق میں شمسون سے لے کر بحیرۂ اخضر تک اور بحیرۂ روم سے سلیشیا تک جو بحرِ اسود کے کنارے واقع ہے آرمینیہ کی خودمختار ریاست قائم کی جائے گی۔ اِس نئی ریاست کے لئے وہ نہ صرف ترکی کا علاقہ بلکہ ایران اور روس کا کچھ حصہ بھی چھیننا چاہتے تھے۔ اِس دوسری تجویز کو عمل میں لانے کی اُنھیں کوئی جلدی نہیں تھی۔ ترکی آرمینیہ کی مستقل حیثیت کو

پہلے ہی تسلیم کر چکا تھا۔ نئی تجویز سے اور مشرقی سلطنتوں کے بھڑک جانے کا اندیشہ تھا۔ اس کے علاوہ کاظم قارا ابکر پندرہ ہزار باقاعدہ ترکی فوج لئے ہوئے موجود تھا اور سرحد پر جو مسلمان قبائل رہتے تھے وہ بھی بڑے جنگجو لوگ تھے۔ اتحادی جہازوں کی توپوں کی زد سے یہ علاقہ باہر تھا۔ البتہ پہلی تجویز یعنی سمرنا کو یونانیوں کے حوالے کر دینا، قابلِ عمل تھی اور اس کے لئے یہ موقع بھی بہت اچھا تھا۔ اس لئے کہ اٹلی جو خود سمرنا کا دعویدار تھا صلح کی کانفرنس سے علیحدہ ہو چکا تھا۔ ارنلڈ ٹوائنبی اتحادیوں کی اس قسم کی حرکتوں کو ایک دوسرے کی جیبیں کترنے سے تعبیر کرتا ہے۔ اتحادیوں نے چوبیس گھنٹے پہلے یہ نوٹس دیا کہ ہماری فوجیں جہاز سے اتر کر سمرنا میں داخل ہوں گی۔ اس بہانے سے یونانی فوج ۱۵ رمئی ۱۹۱۹ء کو سمرنا پہنچا دی گئی۔ اس واقعہ نے دم بھر میں کایا پلٹ کر دی۔ ترکوں نے اپنی فوجوں کو منتشر کرنا روک دیا اور فوراً لڑنے مرنے کو تیار ہو گئے۔ آرنلڈ ٹوائنبی جو مورخانہ بے تعصبی اور انصاف پسندی کی وجہ سے نوعِ انسانی کے لئے فخر کا باعث ہے یونانی فوج کے سمرنا میں داخل ہونے کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے:۔ "۱۵ رمئی ۱۹۱۹ء کو مغربی اناطولیہ پر ایک بلائے ناگہانی نازل ہو گئی جیسے کوہِ آتش فشاں پھٹتا ہے اور لوگ حیران رہ جاتے ہیں کہ یہ کیا ہو گیا۔ جنگ یورپ کے ختم ہونے کے چھ مہینے بعد ایک روز دفعتہً سمرنا کی گلیوں میں شہر کے لوگوں اور نہتے سپاہیوں کا قتل عام شروع ہو گیا۔ محلے کے محلے اور گاؤں کے گاؤں لوٹ لئے گئے۔ عقبی خطے کی زرخیز وادیوں میں آگ کے شعلے بھڑکنے لگے اور خون کی ندیاں بہ گئیں۔ ایک فوجی دیوار کھڑی ہو گئی جس نے قسطنطنیہ اور سمرنا کی بندرگاہوں کو اندرونی ملک سے جدا کر کے تجارت کو تباہ کر دیا۔ لڑائی کے دوران میں مکان، پل اور سڑکیں مسمار کر دی گئیں۔ ملک کے باشندے تلوار کے گھاٹ اتارے گئے اور جو بچ رہے وہ یا تو زبردستی فوج میں بھرتی کر لئے گئے

یا جلاوطن کر دئے گئے۔ غرض قتل و غارت کا یہ سیلاب سمرنا سے شروع ہوا اور دور دور تک پھیلتا چلا گیا۔"

مغربی مسئلہ یونان اور ترکی میں | ترکی کی طرف سے جو ردّ عمل ہوا اُس کے متعلق یہ بات دنیا کو نہیں بھولنی چاہئے کہ اس کا آغاز حکومت کی طرف سے نہیں بلکہ خود جمہور کی طرف سے ہوا۔ جن میں کسان، پہاڑی لوگ بلکہ عورتیں تک شامل تھیں۔ استنبول سے فوجی افسر بے اجازت بھاگ کر تھرلیس پہنچے اور انھوں نے چھوٹے چھوٹے جتھے بنا کر لڑنا شروع کیا۔ سارے ملک میں احتجاج کے جلسے کئے گئے۔ دو چیزوں نے اس قوتِ جذبات کو کامیابی کی منزل پر پہنچایا۔ ایک تو یہ کہ اوسط طبقے کے ترکوں میں سے ہزارہا آدمی ایسے نکل آئے جنھوں نے نہ صرف اپنی جانوں کو قربان کیا بلکہ تنظیم میں بھی کمال کر دیا۔ دوسرے یہ کہ معدودے چند لیڈر جو اُنہیں ہاتھ آئے اس مادّی اور اخلاقی قوّت سے کام لینے کی خداداد قابلیت رکھتے تھے۔ میں نے یہ حیرت انگیز تاریخی ڈراما اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور اپنی بساط کے مطابق اس میں حصّہ بھی لیا ہے۔ مجھے بڑے سرداروں کی قابلیت اور ان کی خدمات کا دِل سے اعتراف ہے مگر میرے نزدیک لڑائی کی جان اور کامیابی کا راز جمہور کا عزم تھا۔ جنھوں نے زندگی سے مایوس ہو کر دل میں سمجھ لیا تھا کہ بھیڑوں کی طرح ذبح کئے جانے سے بہتر ہے کہ میدانِ جنگ میں لڑ کر مارے جائیں۔ اِس بات کو پیش نظر رکھ کر ہم جنگ کے واقعات نہایت اختصار کے ساتھ بیان کریں گے۔

اندرونی قوتیں اور ان کا اتحاد | جب لڑائی شروع ہوئی تو اتحادیوں کی ایک لاکھ فوج ترکی میں موجود تھی۔ اس کے مقابلے میں ترکوں کے پاس مشرق میں کاظم قارابکر کی چند ہزار باقاعدہ فوج، وسط اناطولیہ میں علی نواد پاشا کی چھوٹی سی جمعیت اور چند اور نیم مسلح دستے تھے جو اِدھر اُدھر پھیلے ہوئے تھے۔ باقی جو کچھ تھے وہ رضاکار

کے بے قاعدہ جتھے تھے جن کے پاس سامانِ جنگ برائے نام تھا۔

اتحادیوں کو مشرق کی طرف سے زیادہ اندیشہ تھا۔ اس لئے انھوں نے سلطان سے کہہ کر مصطفےٰ کمال پاشا کو وہاں ناظر حربی کی حیثیت سے بھجوایا کہ ترکی فوجوں کو منتشر کردیں۔ مصطفےٰ کمال نے وہاں جانے سے پہلے استنبول میں فوج کے سرداروں سے خفیہ طور پر ملاقات اور گفت و شنید کر لی تھی۔

اماسیا کا اقرار نامہ ۱۹ر جولائی ۱۹۱۹ء کو مصطفےٰ کمال پاشا، رفعت پاشا، علی فواد پاشا اور رؤف بے نے اماسیا کے مقام پر جمع ہوکر ایک اقرار نامے پر دستخط کئے۔ جسے موجودہ ترکی ریاست کی بنیاد سمجھنا چاہئے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے :- ملک کی مرکزی حکومت، بیرونی ریاستوں کے ہاتھ میں ہے۔ ترکی جمہور نے اپنے عمل سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ایسے غیر ملکیوں کے ماتحت رہنا ہرگز منظور نہیں اور وہ ان سے لڑنے کو طیار ہے۔ قوم کی قوت اور جدّ وجہد کو متحد اور منظم کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک کانگرس جو تمام قوم کی نمایندہ ہو منعقد کی جائے اور وہ یہ فیصلہ کرے کہ ملک کی حفاظت کے لئے کیا تدابیر اختیار کرنی چاہئیں۔

ارضِ رُوم کانگرس ۲۳ر جولائی ۱۹۱۹ء کو پہلی کانگریس مصطفےٰ کمال پاشا کی صدارت میں منعقد ہوئی اور اس نے یہ فیصلہ کیا کہ ایک نمایندہ جماعت منتخب کی جائے جو ضرورت کے وقت اناطولیہ کی حکومت اپنے ہاتھ میں لے لے اور ملک کی حفاظت کا سامان کرے۔ اس کانگریس کی ہدایت کے مطابق تمام ترکی فوجیں جو یونانی حملے کی مدافعت کر رہی تھیں اناطولیہ کے مرکز کے ماتحت متحد ہوگئیں اور ایک قومی عہد نامہ طیار کیا جانے لگا جو ساری قوم کے لئے قابلِ قبول ہو۔

سیواس کانگرس ۴ر ستمبر ۱۹۱۹ء کو سیواس کانگرس نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اناطولیہ سلطان کی حکومت سے علیحدہ ہوگیا اور اس نے ملکی اور فوجی انتظام اپنے ہاتھ میں

لے لیا۔ سلطان نے خوف زدہ ہوکر داماد فرید پاشا کی وزارت کو جو اتحادیوں کا آلہ کار سمجھی جاتی تھی معزول کر دیا۔ اور ایک نئی کابینہ مقرر کی جس کے اکثر ارکان قوم پرور پارٹی کے تھے۔ یا اس سے ہمدردی رکھتے تھے۔ اسی کے ساتھ اس نے پارلیمنٹ کے انتخابات کا بھی حکم دے دیا۔ ملک نے قوم پرور پارٹی کو بہت بڑی تعداد میں منتخب کیا۔ جنوری ۱۹۲۰ء میں پارلیمنٹ کا اجلاس استنبول میں منعقد ہوا۔ اس کے لیڈر بالفعل رؤف بے تھے۔ خوش قسمتی سے مصطفےٰ کمال اور دوسرے فوجی سردار اناطولیہ ہی میں رہے۔

پارلیمنٹ نے پہلا کام یہ کیا کہ قومی معاہدے کو مکمل کر کے شائع کر دیا۔ اس کا مضمون قریب قریب وہی رہا جو پہلی بار ارض روم کی کانگریس میں تجویز ہوا تھا۔ اس میں یہ مطالبہ کیا گیا کہ جن علاقوں میں ترکوں کی اکثریت ہے اور جن پر عارضی صلح کے وقت اتحادیوں نے قبضہ نہیں کیا تھا وہ ترکی کی حکومت میں رہیں۔ بقیہ علاقے جن پر اس وقت قبضہ کیا گیا تھا (اور جن میں زیادہ تر عربوں کی آبادی تھی) اپنی قسمت کا فیصلہ خود کریں اور اس میں اُن کے باشندوں کو آزادی سے رائے دینے کا حق دیا جائے۔ ترکی کی طرف سے یہ وعدہ کیا گیا کہ باسفورس اور دردانیال میں سب قوموں کے تجارتی جہازوں کو آنے جانے کی اجازت ہوگی بشرطیکہ وہ اس بات کا ذمہ لیں کہ استنبول اور بحیرۂ مارمورہ بیرونی دست اندازی سے محفوظ رہے گا۔ ترکی میں اقلیتوں کو وہی حقوق حاصل ہوں گے جو ہمسایہ ملکوں میں مسلم اقلیتوں کو حاصل ہیں۔

ابھی اتحادیوں نے صلح کے شرائط کا جو وہ ترکی کے سامنے پیش کرنے والے تھے عام اعلان نہیں کیا تھا کہ انھیں قومی معاہدے کی اطلاع بھیج دی گئی۔ اب اُن کے سامنے دو صورتیں تھیں یا تو وہ ترکوں کی یہ شرائط جو خود انھوں نے عارضی صلح سے پہلے ترکوں کے سامنے پیش کی تھیں منظور کر لیں اور جنگ ختم کر دیں

یا سینہ زوری سے کام لے کر ترکی کے حصّے بخرے کرنے کی تجویز پہ اَڑے رہیں انھوں نے دوسری صورت اختیار کی۔

۱۶ر مارچ کو اتحادیوں نے وہ معرکے کا حملہ کیا جو دنیا میں مشہور ہو گیا۔ انھوں نے استنبول میں اور فوجیں اُتار دیں جو تمام قوم پروروں کے گھروں پر چھاپہ مار کر انھیں اُن کے بستروں سے کھینچ لائیں۔ اس کے بعد وہ پارلیمنٹ پر ٹوٹ پڑیں اور بہت سے قوم پرور ممبر، جن میں رؤف بے بھی شامل تھے گرفتار کر کے مالٹا بھیج دیئے گئے۔ جہاں ہزاروں آدمی جو اتحاد و ترقی کے رکن تھے یا سمجھ لئے گئے تھے، پہلے سے نظر بند تھے۔ اتحادیوں نے مارشل لا جاری کر دیا اور یہ اعلان کیا کہ جو شخص کسی قوم پرور کو اپنے گھر میں پناہ دے گا اُسے قتل کی سزا دی جائے گی۔ عیسائیوں کے جتھے مسلح کر کے اُن سڑکوں پر جو اناطولیہ کو جاتی تھیں متعین کر دیئے گئے کہ قوم پرور بھاگ کر اُس طرف نہ جانے پائیں۔ ترکوں نے بھی فوراً اپنے جتھے بنا لئے اور قوم پروروں کو بھاگنے میں مدد دینے لگے۔ اتحادیوں اور فوجوں کے قدغن کے باوجود بہت سے لوگ سامانِ جنگ کے ساتھ بچ کر نکل گئے۔

سلطان کی حکومت نے ایک عدالتِ خاص قائم کی۔ جس کی طرف سے اِن قوم پروروں کی جو سزائے موت کے مستوجب قرار دیئے گئے تھے پہلی فہرست شائع کی گئی۔ اس میں مصطفےٰ کمال پاشا، علی فواد پاشا، ڈاکٹر عدنان اور ایک عورت کا نام بھی شامل تھا۔ اس کے علاوہ شیخ الاسلام نے فتویٰ دیا کہ جو مسلمان ان لوگوں میں سے کسی شخص کو قتل کرے گا وہ سیدھا مسلمانوں کی جنت میں جائے گا۔ نہایت افسوس کی بات ہے کہ شیخ الاسلام نے پہلی بار نہ صرف غیر مُلکی حکومتوں کا ساتھ دیا بلکہ ظلم و استبداد پر کمر باندھ لی۔

اِس اثنا میں مصطفےٰ کمال پاشا نے جو کچھ دِن پہلے انگورہ پہنچ چکے تھے

یہ اعلان کیا کہ قومی پارلیمنٹ کا اجلاس انگورہ میں ہوگا۔ جمہور کو چاہیئے کہ پرانے ممبروں میں سے جو لوگ اس میں شریک نہیں ہوسکتے یا نہیں ہونا چاہتے اُن کی جگہ دوسرے ممبروں کو منتخب کر کے بھیجیں۔ یہی وہ جماعت تاسیسی تھی جس نے نئی ریاست قائم کی۔

قومی مجلس عالیہ کی حکومت جماعت تاسیسی کا اجلاس ۲۳ر اپریل سنہ ۱۹۲۰ء کو انگورہ میں ہوا۔ اُس نے مُلک کی حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی اور اُس کا نام قومی مجلس عالیہ رکھا۔ مشرق میں یہ پہلی جمہوری حکومت تھی جو خود جمہور نے قائم کی۔ مشرق اور مغرب کی کش مکش میں یہ سب سے اچھی مغربی چیز تھی جو مشرق نے اختیار کی۔ تاریخ میں پہلی بار نہایت نازک موقع پر مُلک کی حکومت کا پورا بار اہلِ اناطولیہ کے کاندھوں پر رکھا گیا۔ جمہور کے نمایندوں نے حکومت کی باگ اپنے ہاتھ میں لے لی۔ ان لوگوں کا کام اتنا ہی مشکل تھا جتنا ان مٹھی بھر شمالی ترکوں کا جنھوں نے تیرھویں صدی میں شمالی سلطنت کی ایسی مضبوط بُنیاد رکھی کہ وہ سات سو سال تک ہلائی نہ ہلی۔

قومی مجلس عالیہ کی حکومت اور انقلاب فرانس کی حکومت میں بہت مشابہت تھی۔ وہ مقننہ اور عاملہ دونوں کے فرائض ساتھ ساتھ انجام دیتی تھی۔ مجلس کا پریسیڈنٹ حکومت کا افسر اعلیٰ تھا۔ وائس پریسیڈنٹ پارلیمنٹ کے اجلاس میں صدارت کے فرائض انجام دیتا تھا۔ اس کی انتظامی کمیٹی مجلسِ وزرا کا کام کرتی تھی۔ ہر وزیر کا انتخاب مجلس، علیحدہ علیحدہ کرتی تھی۔ اور وہ انفرادی حیثیت سے مجلس کے سامنے جواب دہ تھا۔ اس مجلس کا دستور اساسی اس قابل ہے کہ اُس کا غور سے مطالعہ کیا جائے۔ اس لئے کہ دنیا کی تاریخ میں کسی طرزِ حکومت کی مثال، جو حقیقی جمہوریت سے اتنی قریب ہو، مشکل سے ملے گی۔

اپریل سے جون تک اس حکومت کے لئے سب سے مشکل زمانہ تھا۔ اُسے

سارے مُلک میں عدالتی اور انتظامی محکمے قائم کرنے تھے۔ اِس کام میں کسی قدر آسانی اِس وجہ سے ہوگئی کہ نوجوان ترکوں نے جو نظم قائم کیا تھا وہ اب تک چل رہا تھا۔ مرکزی حکومت کی ترتیب میں زیادہ دقت پیش آئی۔ کیونکہ ایسے لوگ جو اس میں حصّہ لے سکتے ہوں یا لینا چاہتے ہوں بہت کم تھے۔ مگر سب سے بڑی مشکل اور سب سے بڑا خطرہ یہ تھا کہ مُلک میں بد امنی پھیلی ہوئی تھی۔ وسطِ اناطولیہ کی حفاظت کا دار و مدار بے قاعدہ فوج پر تھا۔ اِس میں شک نہیں کہ اِس فوج میں بعض لوگ بڑے بلند خیالات کے تھے اور وہی اِس قومی تحریک کے ہراول تھے۔ مگر عام سپاہیوں میں نظم و ضبط قائم رکھنا بہت مشکل تھا۔ اور وہ بعض اوقات اتنی ہی زیادتیاں کر بیٹھتے تھے جتنی یونانیوں کی فوجیں کرتی تھیں۔ اس کے علاوہ سلطان نے اتحادیوں کے روپئے سے غیر ترکی فوجیں بھرتی کی تھیں اور انھیں افواجِ خلافت کے نام سے اناطولیہ میں قوم پروروں سے لڑنے کے لئے بھیج دیا تھا۔

معاہدۂ سیورے اور بے قاعدہ فوج کا خاتمہ

اِس زمانے میں دو باتیں ایسی ہوئیں جن سے قومی مجلس عالیہ کی حکومت کی بن آئی۔ اُن میں سے پہلی چیز سیورے کا معاہدہ تھا جس پر دستخط کر کے سلطان کی حکومت نے ترکی قوم کو سزائے موت کا حکم سُنا دیا۔ اس معاہدے کی شرطیں ترکی کے متعلق یہ تھیں کہ سمرنا اور اُس کا عقبی علاقہ اور مشرقی اور مغربی تھریس یونان کو دے دیا جائے، مشرق سے لے کر جنوب میں سلیشیا تک جس میں کردوں کا علاقہ شامل تھا آرمینیہ کی ریاست قائم کر دی جائے، بندرگاہیں، اتحادیوں کے سپرد کر دی جائیں، در دانیال استنبول اور بحیرۂ مارمورہ کے مشرقی اور مغربی ساحل اتحادیوں کے انتظام میں رہیں۔ ترکی کی مالیات بھی اُن کی نگرانی میں دے دی جائے۔ قدیم تجارتی اور عدالتی حقوق صرف فاتح قوموں کے لئے بحال کر دئے جائیں۔ ترکی کو ہوائی یا جنگی جہاز رکھنے کی اجازت

نہ ہو بلکہ صرف پندرہ ہزار بری فوج جس میں فوجی پولیس شامل ہے باقی رہنے دی جائے، اناطولیہ کا بے آب وگیاہ علاقہ جو ترکوں کے لئے چھوڑ دیا گیا تھا وہ بھی مغربی ریاستوں کے حلقہ ہائے اثر میں تقسیم کر دیا جائے۔

سلطان کا معاہدۂ سیورے پر دستخط کرنا اور پھر غیر ملکی فوجوں کے ساتھ افواجِ خلافت کو ترکی قوم کا خون بہانے کے لئے بھیجنا ایسی چیزیں تھیں جن کی وجہ سے لوگ سلطنت اور خلافت دونوں کے نام سے بیزار ہو گئے۔

اِدھر نئی حکومت نے اپنی باقاعدہ فوج ترتیب دی اور بے قاعدہ جمعیتوں کو اس میں شامل ہونے پر مجبور کیا۔ بعض جمعیتوں نے سرکشی اختیار کی اور وہ بھی عین اُس وقت جب یونانیوں کی طرف سے شدت کا حملہ ہو رہا تھا۔ مگر نئی حکومت کی چھوٹی سی فوج نے اِنُونُو کے مقام پر ایک طرف یونانی فوج کو اور دوسری طرف ترکوں کی باغی فوج کو شکست دی۔ اس فتح سے ترکی قوم کے حوصلے بڑھ گئے اور اسے اپنے اوپر اعتماد پیدا ہو گیا۔ اَب لوگ دل وجان سے نئی حکومت کا ساتھ دینے لگے۔

اِس زمانے میں لندن میں جو کانفرنسیں اناطولیہ کے مسئلے کے متعلق ہوئیں اُن کا ذکر میں چھوڑتی ہوں۔ یہ اُسی وقت کی جاتی تھیں جب ترکوں کی فتح ہوتی تھی۔ اُن کا مقصد بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ یونانی فوج کو سنبھلنے کی مہلت مِل جائے۔

معرکۂ سقاریہ | ترکوں اور یونانیوں کی فیصلہ کن لڑائی سقاریہ کے مقام پر ہوئی۔ یونانیوں نے اَسکی شہر میں ترکوں کو شکست دینے کے بعد تمام ریلوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ اور انگورہ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ یہ ترکوں کے لئے نازک وقت تھا مگر اُن کی قوم اور قومی مجلس اس امتحان میں پوری اُتری۔

مصطفےٰ کمال پاشا سپہ سالارِ اعظم بنائے گئے اور اُنھیں غیر معمولی اختیارات

دیئے گئے۔ عصمت پاشا محاذ جنگ کے سپہ سالار، فیضی پاشا اُن کے نائب اور رفعت پاشا وزیر جنگ ہوئے۔

ترکوں کو بڑی بڑی مشکلوں کا سامنا تھا۔ انھیں مشرق سے سپاہی اور سامانِ جنگ محاذ پر پہنچانا تھا۔ موسم انتہا سے زیادہ خراب تھا۔ راہ میں صحرا اور پہاڑ حائل تھے۔ بار برداری کا ذریعہ اونٹوں، بیل گاڑیوں اور انسانوں کے کندھوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ مردوں اور عورتوں کو چار سو میل سے زیادہ کی سنگلاخ اور دشوار گذار راہ پیدل طے کرنی پڑی۔ اسلحہ سازی کے عارضی کارخانے قائم ہوگئے۔ اور ریلوں کی بچی کھچی پٹریاں اُکھاڑ کر ہتھیار ڈھالے جانے لگے۔

یونانیوں کے پاس اسی ہزار تربیت یافتہ فوج، اعلیٰ درجے کا توپ خانہ جس میں دو سو توپیں تھیں، سامانِ جنگ بہ افراط، ریلیں۔ لاریاں اور مغربی ترکی کی عمدہ سڑکیں، ترکوں کی کُل کائنات پچیس ہزار فوج جس کے پاس کچھ نئی کچھ پرانی، کچھ ماوزر، کچھ مارٹینی بندوقیں، کُل چھ توپیں، بہت تھوڑا سامانِ جنگ اور باقی خدا کا نام۔

ترکوں نے جو شجاعت میدانِ جنگ میں دکھائی زبان میں طاقت نہیں کہ اُسے بیان کر سکے۔ تیئس دن کی لڑائی میں ساڑھے سولہ ہزار ترک کام آئے۔ جن میں افسروں کی بہت بڑی تعداد تھی۔ ترک حملہ کرتے تھے اپنی گنی چنی چھ توپوں کے سہارے پر۔ یونانیو کا پشت پناہ زبردست توپ خانہ تھا۔ مگر کیا مجال کہ ایک ترک سپاہی بھی میدانِ جنگ سے منہ موڑے۔ کاظم قارا بکر پاشا نے میدانِ جنگ سے جو تار مصطفےٰ کمال پاشا کو بھیجا تھا اُس سے ترکی قوم کے جذبات کا اندازہ ہوتا ہے۔ "جب تک پہاڑی کی کسی چوٹی پر ایک ترک سپاہی بھی باقی رہے گا، مقابلہ جاری رہے گا۔" مصطفےٰ کمال پاشا نے اُن دنوں ایک تقریر کی تھی جس کے چند دلآویز فقرے میں آپ کو سُناتی ہوں:۔

"قومی مجلس کے صدر کی حیثیت سے میں آپ حضرات کے سامنے یہ اعلان

کرتا ہوں کہ ہمارا مقصود جنگ نہیں ہے۔ ہم صلح کے طالب ہیں۔ میرے خیال میں کوئی چیز ہمیں اپنے ارادے سے باز نہیں رکھ سکتی۔ اگر یونانی فوج یہ سمجھتی ہے کہ ہم اپنے جائز حقوق چھوڑ دیں گے تو یہ محض اس کی خام خیالی ہے۔ دشمن ہمارا نام صفحۂ ہستی سے مٹانا چاہتے ہیں۔ ہم نے اپنی حفاظت کے لئے تلوار اٹھائی ہے۔ اس سے بڑھکر اور معقول بات کیا ہو سکتی ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہم یونانی فوج کو ڈھکیلتے چلے جائیں گے یہانتک کہ اس کا ایک سپاہی بھی ہماری زمین پر باقی نہ رہے۔"

ترکوں کو سقاریہ میں فتح حاصل ہوئی۔ کلیر پرائس نے اپنی کتاب "ترکی کی دوبارہ زندگی" میں اس فتح کی پوری اہمیت ذیل کے الفاظ میں دکھائی ہے:۔

"ترکوں کو دریائے سقاریہ کے کنارے جو فتح حاصل ہوئی اس نے مشرق ادنیٰ اور مشرق وسطیٰ کا سیاسی نقشہ بدل ڈالا۔ دو سو سال سے مغرب قدیم عثمانی سلطنت کو پارہ پارہ کر رہا تھا۔ مگر سقاریہ کے کنارے اس کا سامنا خود ترکی قوم سے ہوا۔ اس چٹان سے ٹکرانا تھا کہ دھارے کا رخ پلٹ گیا۔ مورخوں پر ایک دن یہ حقیقت کھل جائے گی کہ سقاریہ کی یہ چھوٹی سی لڑائی ہمارے زمانے کا سب سے زبردست فیصلہ کن معرکہ تھا۔

اس فتح کی بدولت نئی حکومت کے قدم جم گئے۔ یونانی فوج کی کمر ٹوٹ گئی اور اتحادیوں میں پھوٹ پڑ گئی۔ فرانس نے صلح کر لی، قومی مجلس عالیہ کی حکومت کو تسلیم کر لیا اور سلیشیا سے اپنی فوجیں ہٹا لیں۔ اٹلی نے عدالیہ کو خالی کر دیا۔ سوویٹ روس نے ۱۹۲۰ء میں انگورہ کی حکومت کو تسلیم کر لیا تھا۔ اس سے ہمیں بہت بڑی مادی اور اخلاقی مدد ملی کہ لڑائی کے زمانے میں جب ہمیں اپنی ساری قوت مغربی سرحد پر مجتمع کرنی تھی ہم مشرقی سرحد کی طرف سے مطمئن رہے۔ ایک بڑی وجہ کامیابی کی یہ بھی تھی کہ کاظم قارابکر پاشا نے آرمینیہ کی لڑائی میں اردھان اور قرص لے کر صلح کر لی تھی۔ اس لئے سقاریہ کی جنگ میں ترکی کو مشرق سے فوجیں اور سامان جنگ برابر پہنچتا رہا۔

اس نازک زمانے میں ہندوستان نے بھی ترکوں سے بڑی ہمدردی کی۔ اور انھیں بہت مدد دی۔ میں اس معرکے کے ایک ناچیز کارکن کی حیثیت سے آپ لوگوں کے سامنے سرِ نیاز خم کرتی ہوں اور دلی مسرت کے ساتھ یہ الفاظ کہتی ہوں "بھائیو اور بہنو! میرا شکریہ قبول کیجئے۔ خدا آپ کو جزائے خیر دے۔"

آخری فتح جنگ سقاریہ کے سال بھر بعد اگست ۱۹۲۲ء میں ترکی فوج نے مصطفےٰ کمال پاشا کی سرکردگی میں جارحانہ اقدام شروع کیا اور سمرنا کو فتح کرنے سے پہلے اپنا سارا ملک یونانی فوجوں سے خالی کرا لیا۔ مغربی ریاستوں نے یہ فیصلہ کیا کہ لوزان میں صلح کی کانفرنس منعقد کی جائے۔ دنیا نے مان لیا کہ ترکی قوم لڑائی کی آگ میں تپ کر، تلوار کی باڑھ پر چل کر اپنے امتحان میں پوری اتری۔

لوزان کانفرنس مغربی ریاستوں نے استنبول کی حکومت اور قومی مجلس عالیہ کی حکومت دونوں کو کانفرنس میں مدعو کیا۔ لوزان جانے سے پہلے اس دوعملی کی گتھی کو سلجھانا ضروری تھا مجلسِ عالیہ نے ایک طویل اور معرکتہ الآرا اجلاس کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ سلطنت اور خلافت کے منصب الگ الگ کر دئے جائیں۔ سلطنت کا خاتمہ ہو گیا اور سلطان منصبِ حکومت سے معزول کر دیا گیا۔ استنبول نئی حکومت کا ایک صوبہ قرار دیا گیا۔ (نومبر ۱۹۲۲ء) سلطان وحید الدین نے اتحادیوں کے ایک جنگی جہاز میں پناہ لی۔ اور مجلس نے عبدالمجید آفندی کو خلیفہ منتخب کر لیا۔ لوزان کانفرنس نومبر ۱۹۲۲ء میں شروع اور جولائی ۱۹۲۳ء میں ختم ہو گئی۔ قومی مجلس عالیہ کی حکومت اور اتحادیوں کے درمیان جو صلح نامہ ہوا اس میں ترکوں کے قومی معاہدے کی تمام دفعات تسلیم کر لی گئیں۔

خواتین اور حضرات!

آپ سب لوگ اور ساری دنیا بجا طور پر ان مشاہیر کی قدر کرتی ہے جنھوں نے ترکوں کو اس جنگ میں کامیابی کی منزل پر پہنچایا۔ مگر آپ کو کیا معلوم، دنیا کیا جانے کہ

اُن ہزاروں گمنام عورتوں اور مردوں نے جو اِس لڑائی میں کام آئے کیسی کیسی عظیم الشان قربانیاں کیں اور کیا کیا کارہائے نمایاں کر دکھائے۔ میری التجا ہے کہ جب آپ مسجدوں اور مندروں میں جاکر دُعا مانگیں تو اِن لوگوں کو نہ بھولیں۔ شہیدوں کی یہ جماعت، مرد، عورت، بوڑھے، جوان، بچّے، جنھوں نے اِس کوشش میں جان دی کہ اُن کی قوم امن اور عزّت کے ساتھ دنیا میں رہ سکے اِس قابل ہیں کہ دُنیا کی ساری قومیں قیامت تک اُن کے لئے دُعا کرتی رہیں ؛

~ ~ ~ ~ ~ ~

مطلعِ اسلام

(ترجمہ از "زوالِ روما" مصنفہ ایڈورڈ گبن)

ٹھیک اُس وقت جب رُومی حکومت' فارس والوں کی جنگ سے تھک کر چور ہو گئی تھی اور کلیسا نسطوریون اور منوفسیون کی وجہ سے پریشان تھا۔ حضرت محمدؐ ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے میں قرآن لئے ہوئے روم اور نصرانیت کے کھنڈروں پہ اپنا تخت بچھا رہے تھے۔ رسولِ عربی کی قابلیت اور ذہانت، ان کی قوم کے اخلاق و عادات، اور ان کے مذہب کے جوش و ولولے میں روم کی مشرقی حکومت کے زوال کے اسباب مضمر ہیں۔ اَب ہماری آنکھیں حیرت کے ساتھ اِس سب سے زیادہ یادگار انقلاب پر گڑی ہوئی ہیں جس نے کرۂ ارض کی قوموں پہ ایک بالکل نرالا اور دیر پا نقش چھوڑا ہے۔

مُلکِ عرب کا حال

فارس۔ شام۔ مصر اور حبشہ کے درمیان جو خالی جگہ ہے اس میں جزیرہ نمائے عرب ایک وسیع مگر بے قاعدہ مثلث کی طرح معلوم ہوتا ہے۔ شمالی کونے (بالیس) سے لے کر جو دریائے فرات پر واقع ہے خاکنائے باب المندب تک جہاں لوبان پیدا ہوتا ہے پندرہ سو میل کا فاصلہ ہے۔ مشرق سے مغرب تک یعنی بصرہ سے سویز تک اور خلیج فارس سے بحیرۂ احمر تک درمیانی چوڑائی اس کی نصف[1] (۷۵۰ میل) سمجھ لیجئے۔ مثلث کے ضلعے تدریجاً بڑھتے چلے جاتے ہیں یہاں تک کہ جنوبی ضلع بحرِ ہند پر ایک ہزار میل کا محاذ بناتا ہے۔

زمین اور آب و ہوا

جزیرہ نما کا پورا رقبہ جرمنی یا فرانس سے چوگنا ہے۔ لیکن اس کے بڑے حصے پر جائز طور سے ریگستانی یا کوہستانی علاقہ ہونے کا

---

[1] یہ پیمائش صحیح نہیں ہے۔ اِس لئے کہ چوڑائی ۹۰۰ میل ہے۔ جنوبی ضلع ۱۲۰۰ میل ہے۔ ۱۲

الزام عائد ہوتا ہے۔

گئے گذرے صحرائے تاتار کو بھی قدرت نے تناور درختوں اور ہری بھری جڑی بوٹیوں سے آراستہ کر دیا ہے۔ کوئی راہ رو جو اُدھر جا نکلے اِن سبز قامتوں کی موجودگی سے آرام پاتا ہے اور تنہائی محسوس ہیں کرتا لیکن عرب کا سنسان لق و دق صحرا تو ریت کا ایک ناپیداکنار ہموار میدان ہے جس کو کہیں کہیں نوکیلے عریاں پہاڑ کاٹتے ہوئے نکل جاتے ہیں۔ نہ کہیں سایہ ہے نہ جائے پناہ۔ صفحۂ ریگستان برجِ سرطان کے آفتاب کی تیز اور سیدھی شعاعوں سے جھلستا رہتا ہے۔

خوشگوار ہواؤں کے بدلے آندھیاں چلتی ہیں۔ بالخصوص جنوب و مغرب سے چلنے والی آندھی جو زہریلے کیا بلکہ مہلک بخارات پھیلاتی ہے۔ خاک کے تودے جو اِن ہواؤں کے چلنے سے بنتے اور بگڑتے رہتے ہیں سمندر کی اونچی اونچی لہروں سے مشابہ ہوتے ہیں۔ کاروان کے کاروان۔ لشکر کے لشکر اِس طوفانِ گرد میں دب کر رہ جاتے ہیں۔ پانی جیسی عام فائدے کی چیز بھی اِس قدر کمیاب کہ اُس پر وہاں لوگ جان دیتے اور اکثر لڑ مرتے ہیں۔ لکڑی کی اِس قدر قلت ہے کہ آگ جیسے معمولی عنصر کو محفوظ رکھنے اور ایک سے دوسرے کو پہنچانے کے لئے بھی بڑی کاریگری کی ضرورت ہے۔

جہاز رانی کے قابل دریا جو ایک طرف تو زمین کو زرخیز بناتے ہیں اور دوسری طرف ملکی پیداوار کو قریبی ملکوں تک لے جاتے ہیں عرب میں ناپید ہیں۔ چشمے (ندی نالے) جو پہاڑیوں سے بہ کر آتے ہیں۔ پیاسی زمین جذب کر لیتی ہے، کمیاب اور سخت تنے والے پودے مثلاً املی۔ ببول وغیرہ جن کی جڑیں چٹانوں میں سے پھوٹ نکلتی ہیں شبنم کے سہارے پھلتے پھولتے ہیں۔ بارش کے پانی کا تھوڑا سا ذخیرہ حوضوں اور تالابوں میں جمع کر لیا جاتا ہے۔ یہی کنوئیں اور چشمے تو وہ تو ریگستان کے پوشیدہ خزانے ہیں۔

خشک اور گرم میدانوں کے طویل سفر کے بعد جب حاجی لوگ وہ پانی پیتے ہیں جو

گندھک آمیز یا شور زمین پر بہ کر آیا ہے تو اُن کی طبیعت بہت مکدر ہوتی ہے۔

یہ عرب کا ایک مختصر سا خاکہ ہے۔

تکلیف اُٹھانے کے بعد اگر کسی مقام پر معمولی سا آرام بھی مل جائے تو اس کی قدر و قیمت زیادہ ہوتی ہے۔ ایک سایہ دار کنج۔ ہری بھری چراگاہ یا تازہ پانی کا ایک چشمہ اقامت گزین عربوں کی نو آبادی کو اس مبارک مقام کی طرف کھینچنے کے لئے کافی ہے جہاں اُن کو اور اُن کے مویشیوں کو کھانا اور آرام مل سکے اور اُن کی کھجوروں اور انگوروں کی زراعت سرسبز ہو سکے۔

وہ سطح مرتفع جو بحر ہند کے ساحل کے قریب ہے پانی اور لکڑی کی افراط کی وجہ سے ایک خاص امتیاز رکھتی ہے۔ وہاں ہوا نسبتاً معتدل ہے۔ پھل آس پاس کے دوسرے خطوں کی بہ نسبت لذیذ ہوتے ہیں۔ حیوانات اور انسان بھی وہاں زیادہ ہیں۔ زمین کی زرخیزی دیکھ کر کسان محنت پر آمادہ ہوتا ہے اور خاطر خواہ منافع حاصل کرتا ہے۔ اس سرزمین کا مخصوص تحفہ بخورات اور قہوہ ہیں جن کی کشش ہر زمانے میں تاجروں کو یہاں لاتی رہی۔ اگر اس خطے کا بقیہ جزیرہ نما سے مقابلہ کریں تو بے شک یہ الگ تھلگ قطعہ زمین اس کا پورے طور پر مستحق ہے کہ اس کو شاداب کے خطاب سے یاد کیا جائے۔ اس ملک کے متعلق تخیل اور فسانے کی یہ شاندار رنگ آمیزی جو تم دیکھتے ہو تضاد نے تجویز کی ہے اور فاصلہ و مسافت نے اس کی شکل و صورت بنا دی ہے۔

اس فردوس ارضی ہی کے لئے قدرت نے اپنے منتخب عطیے اور حیرت انگیز صنائع محفوظ رکھے تھے۔ تعیش فراوانی اور سادگی کی گوناگوں برکتیں یہاں کے رہنے والوں کی قسمت میں لکھی گئیں۔ زمین سونے اور جواہرات سے مالا مال تھی۔ اور بحر و بر دونوں کو خوشبو دار لذتوں سے بہرہ مند ہونے کی عادت ڈالی گئی تھی۔

عرب کے طبعی حصے

عرب کی تقسیم، ریگستانی، کوہستانی اور شاداب علاقوں میں یونانیوں اور رومیوں میں تو عام ہے لیکن خود عرب اس

تقسیم سے نابلد ہیں۔ اور یہ عجیب بات ہے کہ کوئی ملک جو زبان اور باشندوں کے لحاظ سے ہمیشہ ایک رہا ہو اپنے قدیم جغرافیہ کی شکل کو محفوظ نہ رکھ سکے۔ عرب کے ساحلی علاقے بحرین اور عمان، فارس کی حکومت کے مقابل ہیں۔ یمن کا علاقہ شاداب عرب کی حدود یا کم از کم محلِ وقوع کو ظاہر کرتا ہے۔ نجد نام کا خطہ اندرونی علاقے میں پھیلا ہوا ہے۔ اور حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ کی ولادت کے شرف نے حجاز کے خطے کو جو بحیرۂ احمر کے ساحل پر واقع ہے مشہور و معروف کر دیا ہے۔

بدوؤں کے اخلاق وعادات

مردم شماری کا دارومدار گذر اوقات کے سامان کی قلت یا کثرت پر ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کسی ایک چھوٹے سے زرخیز اور صنعتی صوبے کی آبادی اس وسیع جزیرہ نما کی آبادی سے زیادہ ہو (ابتدائی عہد میں) خلیج فارس، بحرِ ہند اور بحرِ احمر کے ساحل پر وحشی لوگ جن کا گذارہ مچھلی پر تھا اپنی خوراک کی تلاش میں مارے مارے پھرتے تھے۔ اِس ابتدائی اور بے سروسامانی کی حالت میں جس کو سماج کہنا سماج کا نام بدنام کرنا ہے۔ اِس بن مانس کو جو نہ صنعت وحرفت سے آگاہ تھا نہ قانون سے واقف۔ جو سمجھ سے عاری اور زبان سے ناآشنا تھا، حیوانِ مطلق کے گروہ سے علیٰحدہ کرنا مشکل ہے۔ اِس خاموش تغافل کی حالت میں نسلیں اور مدتیں گذر گئی ہوں گی اور اِن رکاوٹوں، حوائج اور مشاغل کی وجہ سے جو اس بے بس وحشی انسان کو تنگنائی ساحلِ بحر میں روکے ہوئے تھے وہ اپنی نسل بڑھانے سے معذور رہا ہوگا۔

لیکن اِس قدیم زمانے کے ابتدائی حصے ہی میں عربوں کی ایک بڑی جماعت نے اپنے آپ کو اِس مصیبت کی حالت سے نکال لیا تھا۔ چونکہ کف دست صحرا، شکاری لوگوں کی پرورش نہیں کرسکتا تھا اِس لئے انھوں نے یک لخت ترقی کرکے چرواہوں کی زندگی اختیار کرلی۔ جس میں شکاری کی زندگی سے زیادہ محفوظ اور منفعت بخش سیر حاصل ہے۔

ریگستان کی خانہ بدوش قوموں کا طرزِ زندگی اُس زمانہ سے لے کر اَب تک یکساں

چلا آتا ہے۔ اور موجودہ زمانے کے بدوؤں کی شکل وصورت میں ہم اُن کے اُن آباد و اجداد کے خدو خال کا پتہ لگا سکتے ہیں جو حضرت موسیٰ یا حضرت رسول خدا کے عہد میں بالکل ایسے ہی خیموں میں رہتے تھے اور اپنے گھوڑوں، اونٹوں اور بھیڑوں کو انہی چشموں یا چراگاہوں کی طرف ہنکاتے تھے۔

مفید جانوروں کے قابو میں آجانے سے ہماری محنت کم اور دولت زیادہ ہو جاتی ہے۔ عرب چرواہوں کو بھی ایک وفادار دوست (گھوڑا) اور ایک محنتی نوکر (اونٹ) ہاتھ آگیا تھا۔ علمائے طبیعیات کے قول کے مطابق عرب گھوڑوں کا اصلی وطن ہے۔ یہاں کی آب و ہوا اس شریف الطبع جانور کے قد و قامت کے لئے نہ سہی مگر تیزی اور پھرتی کے لئے بہت سازگار ہے۔ باربری اسپینی اور انگریزی نسل کے گھوڑوں کی خوبی عربی خون کی آمیزش ہی سے پیدا ہوئی ہے۔

بدو لوگ اس احتیاط کے ساتھ جو توہم کی حد تک پہنچ گئی ہے اپنے خالص نسل کے گھوڑوں کے کارناموں کی یاد محفوظ رکھتے ہیں۔ نر بہت گراں قیمت پر فروخت کئے جاتے ہیں اور مادہ کو تو شاید ہی کبھی جدا کیا جاتا ہو۔ کسی اچھی نسل کے بچھڑے کے پیدا ہونے کو عربی قبائل میں نیک فال سمجھا جاتا تھا۔ اور (اس موقع پر) ایک دوسرے کو مبارکباد دی جاتی تھی۔ گھوڑوں کو عرب اپنے اُن خیموں میں جہاں بال بچے رہتے ہیں اُنس و محبت کے ساتھ سدھاتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُن میں شرافت اور خاندان کے ساتھ اُلفت کا مادہ پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ صرف قدم چلنے اور سرپٹ دوڑنے کے عادی بنائے جاتے ہیں۔ مہمیز اور چابک کے لگاتار غلط استعمال سے اُن کے احساسات کو کند نہیں کیا جاتا۔ اُن کی قوتوں کو بھاگنے اور تعاقب کرنے کے مواقع کے لئے محفوظ رکھا جاتا ہے۔ جیسے ہی وہ ہاتھ کی تھپکی یا رکاب کا اشارہ پاتے ہیں تو ہوا کی طرح اُڑنے لگتے ہیں۔ اور اگر اُن کا سوار اُن کی رفتار کی تیزی کی وجہ سے زین سے جُدا ہو جائے تو فوراً رک جاتے ہیں یہاں تک کہ وہ پھر اپنی نشست جما لے۔

افریقہ اور عرب کے ریگستان میں اونٹ ایک مقدس اور بیش بہا چیز ہے۔ یہ مضبوط اور صابر بار بردار بغیر کھائے پئے کئی کئی دن تک سفر کر سکتا ہے۔ تازہ پانی کا ذخیرہ ایک بڑی تھیلی میں محفوظ رہتا ہے جو حقیقت میں اس جانور کا جس کے جسم پر محنت و مشقت اور غلامی کے نشانات پڑے ہوئے ہیں پانچواں پیٹ ہے۔ بڑی نسل کے اونٹ ہزار پونڈ تک بوجھ لے جا سکتے ہیں۔ اور ناقہ جو ہلکا پھلکا اور پھرتیلے بدن کا ہوتا ہے۔ دوڑ میں تیز سے تیز گھوڑی کو مات کر سکتا ہے۔

مُردہ یا زندہ اونٹ کے جسم کا ہر حصہ انسان کے لئے کارآمد ہے۔ اُس کا دودھ بکثرت ہوتا ہے اور اُس میں غذائیت ہوتی ہے۔ نوعمر اونٹ کا نرم گوشت بچھڑے کے گوشت کی طرح لذیذ ہوتا ہے۔ اِس کے پیشاب سے ایک قسم کا قیمتی نمک نکالا جاتا ہے۔ اِس کی مینگنیاں ایندھن کی قلت کو دور کرتی ہیں۔ اس کے لمبے لمبے بالوں سے جو ہر سال گر کر نئے پیدا ہوتے ہیں بدوؤں کے کپڑے، فرش فروش اور خیمے بُنے جاتے ہیں۔

برسات کے موسم میں وہ ریگستان کی کمیاب اور ناکافی گھاس پھوس پر گذارہ کرتے ہیں۔ موسم گرما کی شدت اور سرما کے قحط کے زمانے میں وہ اپنے ڈیرے خیمے ساحل کی طرف یمن کی پہاڑیوں میں یا فرات کے آس پاس لے جاتے ہیں۔ اکثر انھوں نے دریائے نیل کے ساحل یا شام و فلسطین کے دیہات پر پڑنے کا خطرناک اقدام بھی کیا ہے۔

خانہ بدوش عرب کی زندگی خطرہ اور مصیبت کی زندگی ہے۔ اور گو بعض اوقات وہ لوٹ یا تبادلہ کے ذریعہ سے اپنی کاریگری کا ثمر حاصل کر لے مگر یورپ کا ایک معمولی شہری عرب کے اُس صاحبِ اختیار امیر سے جو میدانِ جنگ میں ۱۰ ہزار سواروں کی کمان کرتا ہے زیادہ دولت و عیش کا مالک ہے۔

عرب کے شہر لیکن پھر بھی عربی قبائل اور سِتھیا قوم کے وحشی گروہوں میں ایک خاص

فرق پایا جاتا ہے. کیونکہ عربوں میں سے بہت سے لوگ شہروں میں رہتے تھے اور تجارت و زراعت میں مشغول تھے. ان شہری عربوں کے وقت اور صنعت کا ایک حصہ اپنے مویشیوں کے انتظام کی نذر بھی ہوتا تھا. وہ صلح اور جنگ میں اپنے بدوی بھائیوں سے ملتے جلتے تھے اور بدوی ان لوگوں کے تعلقات کی وجہ سے اپنی ضروریات کے سامان اور صنعت و حرفت اور علم کی شُد بُد حاصل کرتے تھے.

عرب کے بیالیس شہروں میں سے جن کے نام ابوالفدا نے گنائے ہیں سب سے پرانے اور سب سے زیادہ آباد شہر، عرب کے زرخیز خطہ یمن میں واقع تھے. صنعا کی مینار یں اور مارب کے حیرت انگیز حوض حمیری بادشاہوں کے بنوائے ہوئے تھے. لیکن اُن کے دنیاوی جاہ و جلال پر مدینہ و مکہ کی پیغمبرانہ عظمت کی وجہ سے پردہ پڑ گیا.

مکہ مکّہ و مدینہ، یہ دونوں شہر بحر احمر کے کنارے ایک دوسرے سے ۲۷۰ میل کے فاصلے پر واقع ہیں. موخر الذکر مقدس شہر یونانیوں میں مکروبا کے نام سے مشہور تھا اس کے آخری حرف (با) سے اس کی عظمت ظاہر ہوتی ہے. جو درحقیقت اپنے عروج کے زمانہ میں بھی کیا بلحاظ طول و عرض اور کیا بلحاظ مردم شماری مارسیلز سے نہیں بڑھا. کسی پوشیدہ مقصد نے، شاید توہم پرستی نے اس شہر کے بانیوں کو اس بنجر زمین کے انتخاب پر آمادہ کیا ہوگا.

تین خشک پہاڑوں کے دامن میں دو میل لمبے اور ایک میل چوڑے میدان میں انھوں نے اپنے مٹی اور پتھر کے مکانات کھڑے کر دیئے. زمین پتھریلی ہے. زمزم کے مقدس کنوئیں تک کا پانی کڑوا اور کسیلا ہے. چراگاہیں شہر سے فاصلہ پر ہیں. انگور تقریباً ستر میل دور طائف کے باغوں سے یہاں لائے جاتے ہیں.

مکہ کے حاکم قبیلہ قریش کا جوش و خروش اور اُن کی شہرت عربی قبائل میں نمایاں تھی. لیکن اُن کی بنجر زمین زراعت کے موافق نہ تھی. اس لئے اُن کی حالت تجارتی جدوجہد کے لئے

سازگار تھی۔ جدہ کی بندرگاہ کی وجہ سے جو صرف چالیس میل کے فاصلہ پر ہے وہ ابی سینیا کے ساتھ آسانی سے تعلقات رکھتے تھے۔ یہی عیسائی حکومت تھی جس نے پہلے پہل حضرت نبی کریم کے اصحاب کو اپنے ہاں پناہ دی۔ افریقہ کی دولت جزیرہ نما کے اس طرف جرعہ یعنی قطیف تک جاتی تھی جو بحرین کے صوبہ میں ہے۔ یہ وہ شہر ہے جس کے لئے مشہور ہے کہ کلدانیہ کے نکالے ہوئے لوگوں نے شور چٹان سے بنایا تھا۔ وہاں سے یہ سامان خلیج فارس کے موتیوں کے ساتھ بیڑوں پر فرات کے دہانہ تک پہنچایا جاتا تھا۔

مکہ :۔ دائیں طرف یمن اور بائیں طرف شام، ان دونوں کے بیچ میں مکہ تقریباً مساوی فاصلہ پر یعنی ایک مہینہ کی راہ پر واقع ہے۔ اوّل الذکر مکہ کے (تجارتی) کاروانوں کا سرمائی مستقر اور آخر الذکر گرمائی مستقر تھا۔ ان کاروانوں کی وقت پر آمد ہندوستان کے جہازوں کو بحر احمر کے تکلیف دہ سفر کی زحمت سے بچالیتی تھی۔ صنعا اور ماریب کی منڈیوں میں، عمان اور عدن کی بندرگاہوں پر قریش کے اونٹ خوشبودار مصالحوں کے قیمتی سامان تجارت سے لادے جاتے تھے۔ اور بصریٰ اور دمشق کے بازاروں سے غلہ اور مصنوعات خریدا جاتا تھا۔ اس منفعت بخش تبادلہ اجناس کی بدولت مکہ کی گلیوں میں دولت اور افراط بکھری بکھری پھرتی تھی۔ اور وہاں کے شریف زادے فنون جنگ کے شغف کے ساتھ ساتھ تجارت کو بھی اپنا مشغلہ بناتے تھے۔

عربوں کی فوجی آزادی عربوں کی ازلی آزادی کی اپنے اور پرائے سب قصیدہ خوانی کرتے چلے آئے ہیں اور فن مناظرہ کی بدولت تو یہ عجیب واقعہ اسمٰعیل کی اولاد کے حق میں ایک پیشنگوئی اور معجزہ بن گیا ہے۔ بعض مستثنیات جن کو نہ نظر انداز کیا جاسکتا ہے نہ چھپایا جاسکتا ہے، اس قسم کے طرز استدلال کو فضول اور لایعنی بنادیتے ہیں ولایت یمن یکے بعد دیگرے حبشیوں، ایرانیوں، مصری سلاطین اور ترکوں کے ماتحت رہتی چلی آئی ہے؛

حرمین شریفین تو کئی بار ایک سے تھین ظالم کے سامنے جھک چکے ہیں۔ عرب کے رومی صوبے میں تو (خصوصیت سے) وہ مخصوص صحرا شامل تھا جس میں اسمٰعیل اور اُن کے فرزندوں نے اپنے بھائیوں کے مقابل خیمے لگائے ہوں گے۔

خیر یہ مستثنیاتِ عارضی یا مقامی حیثیت رکھتی ہیں۔ بحیثیت ایک قوم کے عرب بڑے سے بڑے شہنشاہ سے بھی مغلوب نہیں ہوئے۔ سیساطرس ہو یا سائرس۔ پوپی ہو یا طریجان کوئی بھی عربوں پر فتح حاصل نہ کر سکا۔ ترکوں کا موجودہ بادشاہ ایک موہوم اقتدار رکھتا ہو تو رکھتا ہو مگر اُس کا سارا فخر صرف اِس بات تک محدود ہے کہ وہ ایک ایسی قوم کی دوستی کا خواہاں ہے جس کو اشتعال دلانا خطرناک ہے اور جس پر حملہ کرنا بے سود ہے۔

ان کی آزادی کے اسباب نمایاں ہیں اور اُن کے کردار اور اُن کے مُلک کے چپّے چپّے پر ثبت ہیں۔ ظاہری اسباب اُن کے اور اُن کے مُلک کے حالات میں مضمر ہیں۔ حضرت رسولِ خدا سے صدیوں پہلے جارحانہ اور مُدافعانہ جنگوں کے دَوران میں اُن کی ہیبتناک شجاعت کا سِکّہ اُن کے ہمسایوں کے دِلوں پر جم چکا تھا۔ صبر و استقلال اور پھرتی کی سپاہیانہ صفتیں شبانی زندگی کی منضبط عادتوں کی بدولت غیر محسوس طَور پر نشوونما پاتی ہیں۔

بھیڑوں اور اونٹوں کی نگہداشت کا کام قبیلے کی عورتوں پر چھوڑ دیا جاتا ہے لیکن جنگجو نوجوان گھوڑے پر سوار اپنے امیر کے علَم کے زیرِ سایہ ہمیشہ میدانِ جنگ میں حاضر رہتا ہے اور کمان، نیزہ اور خنجر کے استعمال کی مشق بڑھاتا رہتا ہے۔ اُن کی حریت اور آزادی کی طویل یاد اِس اَمر کی ضمانت ہے کہ وہ ہمیشہ آزاد رہیں گے۔ اور آنے والی نسلیں اپنے آپ کو خلفِ صالح ثابت کرنے کے لئے بے چین اور اپنی اِس موروثی خصوصیت کو قائم رکھنے کے لئے جوش و خروش کے ساتھ آمادہ رہتی ہیں۔ مشترک دشمنی کے حملے کے وقت اُن کی خانہ جنگیاں ملتوی ہو جاتی ہیں چنانچہ ترکوں سے ان کی پچھلی جنگ میں مکّے کا کارواں اسّی ہزار اتحادیوں نے لوٹ لیا تھا۔

جب وہ لڑائی کے لئے بڑھتے ہیں تو فتح وظفر کی امید اُن کی نظروں کے سامنے اور بھاگ کر صاف نکل جانے کا یقین اُن کے عقب میں ہوتا ہے۔

ان کے گھوڑے اور اونٹ جو آٹھ دس دِن میں پانچ پانچ سو میل کے دھاوے مارتے ہیں فاتح کی نظروں سے غائب ہوجاتے ہیں۔ ریگستان کے پوشیدہ چشمے اس کی تلاش وجستجو سے باہر ہوتے ہیں۔ ایک ایسے اوجھل دشمن کے تعاقب میں جو اُس کی کوششوں کو خاک میں ملادیتا ہے اور مرنے میں ریگستان کے بیچ میں کسی تپتے ہوئے گوشے میں آرام لیتا ہے اس کا ظفریاب لشکر بھوک پیاس اور تکان سے چکنا چور ہوجاتا ہے۔

بدوؤں کے ہتھیار اور اُن کا ریگستان صرف انھی کی آزادی کا ضامن نہیں بلکہ یہ شاداب عرب کے لئے بھی روک ہیں جہاں کے باشندے لڑائی سے الگ تھلگ رہنے اور زمین اور آب وہوا کی دی ہوئی نعمتوں کی افراط کی بدولت بزدل ہوگئے ہیں۔

اغسطس[1] (نے جب حملہ کیا ہے تو اُس) کا لشکر بیماری اور تکان کے مارے تتر بتر ہوگیا تھا۔ اور یہ صرف بحری قوت ہی ہے جس کی بدولت کبھی کبھی یمن کو کامیابی کے ساتھ زیر کیا جاسکا ہے۔

جب نبی کریم علیہ وآلہ الصلوٰۃ والتسلیم نے اپنا مقدس عَلَم بلند فرمایا تو یہ خطہ حکومتِ فارس کا ایک صوبہ تھا۔ لیکن پھر بھی سات حمیری شہزادے پہاڑوں میں حکمرانی کرتے تھے اور کسریٰ کے نائب السلطنت کو اپنے دور دراز ملک اور بدقسمت آقا کو بھول جانے کی ترغیب دی جاتی تھی۔ جسٹینین کے عہد کے مورخین نے آزاد عربوں کی حالت کا نقشہ کھینچا ہے جن کو مشرق کی طویل جنگوں کے زمانہ میں تعلق یا مفاد نے ٹکڑوں میں تقسیم کردیا تھا۔ قبیلہ غسان کو شامی علاقہ میں آباد ہونے دیا گیا۔

---

[1] ۲۵ سنہ ق۔م میں جب اغسطس روم کا قیصر تھا تو اس کے حکم سے ایلیس گیلس حاکم مصر نے عرب پر حملہ کیا۔ پلینی جو قدیم زمانہ کا مشہور ...... مورخ ہے لکھتا ہے کہ اس نے مدینہ کے قریب لنگر انداز کیا اور ایک ہزار میل تک دھاوا مارا۔ مگر بے سود۔ فوج گرم آب وہوا کی تاب نہ لاسکی اور بیمار پڑ گئی ؎

حیرہ کے شہزادوں کو بابل کے کھنڈروں سے تقریباً چار میل جنوب کی طرف ایک شہر بنانے کی اجازت دے دی گئی۔ میدانِ جنگ میں تو یہ لوگ پھرتی اور ہمت سے کام کرتے تھے۔ مگر اُن کی دوستی بے بقا، وفاداری ناپائدار اور دشمنی مستعجل تھی۔ اِن خانہ بدوش وحشیوں کو مشتعل کر دینا سہل مگر اُن سے ہتھیار رکھوا دینا مشکل تھا۔

جنگ کے دَوران میں ملنے جلنے کی وجہ سے انھوں نے روم اور فارس دونوں کی سلطنت کی کمزوری کا پتہ لگا لیا تھا اور وہ اُس کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگے تھے۔

یونانیوں اور رومیوں نے مکّہ سے لے کر فرات تک رہنے والے تمام عربی قبائل کو "سیراسنس" کا مبہم لقب دے رکھا تھا۔ یہ وہ لقب ہے جو عیسائی کی زبان پر خوف اور نفرت کے ساتھ آتا ہے۔

عربوں کی خانگی آزادی اور سیرت خانگی استبداد کے بندے خواہ مخواہ اپنی قومی حریّت کی شیخی بگھارتے ہیں۔ مگر عرب سچ مچ شخصی آزادی کا مالک ہے۔ خُدا کے دیئے ہوئے مخصوص اختیارات کو ہاتھ سے دیئے بغیر وہ ایک حد تک سوسائیٹی کی برکات سے بھی لُطف اندوز ہوتا ہے ہر قبیلے میں توہم، احسان، یا دولت کی وجہ سے ایک مخصوص خاندان اپنے ہمسروں پر سبقت لے جاتا ہے۔ ریاست اور امارت ہمیشہ اسی مخصوص نسل میں چلتی رہتی ہے۔ لیکن وراثت کا قانون بے ضابطہ اور غیر معیّن ہوتا ہے۔ اپنے دمفید مشوروں سے جھگڑے چکانے اور اپنی (اعلیٰ) مثال سے بہادروں کی رہنمائی کرنے کے سادہ مگر اہم عہدے کے لئے اپنے شریف اقرباء میں سے سب سے زیادہ لائق یا معمّر بزرگ کو چُن لیا جاتا ہے۔ ملکہ زینوبیہ کے اُن ہموطنوں نے عقل و فراست والی پرجوش عورتوں کو بھی حکمرانی کرنے کا موقع دیا ہے۔

چند قبیلوں کا ہنگامی طور پر ایک جگہ جمع ہو جانا لشکر کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ ذرا اور گہرا تعلق قائم ہوا تو ایک قوم بن گئی۔ اَب اُن کا بڑا سردار امیر الامرآء جس کا عَلَم

اُن کے سروں پر لہرا رہا ہے باہر والوں کی نظر میں شاہی خطاب کا مستحق ہو جاتا ہے۔
اگر عربی اُمرا اپنی قوت کا غلط استعمال کرتے ہیں تو اُن کو فوراً ہی یہ سزا مل جاتی ہے کہ اُن کی رعایا جو نرم اور پدرانہ سلوک کی عادی ہے اُن کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔
اُن کی رُوح آزاد ہے۔ اُن کے قدم غیر مقیّد۔ ریگستان کھُلا ہوا ہے۔ قبائل اور خاندان باہمی اور اختیاری سمجھوتے سے مجتمع رہتے ہیں۔
یمن کے نسبتاً نرم باشندے شاہی شان و شوکت کی تائید تو کرتے تھے لیکن اگر بادشاہ اپنی جان کو خطرے میں ڈالے بغیر محل سے نہیں نکل سکتا تھا تو حکومت کی عاملانہ قوّت اُمرا اور قاضیوں کے ہاتھ میں چلی جاتی تھی۔ ایشیا کے بیچوں بیچ مکّہ اور مدینہ کے شہر (یوں سمجھ لیجئے کہ) دولتِ مشترکہ کی شکل یا ہیولیٰ پیش کرتے ہیں۔ حضرت نبی کریم کے دادا اور اُن کے آباو اجداد، خارجی اور داخلی معاملات میں مُلک کے حاکم نظر آتے ہیں۔ لیکن ایتھنز کے پیری کلیس اور فلورنس کے میڈی چی کی طرح وہ اپنی عقل اور دیانت کی وجہ سے حکمران تھے۔ اُن کا اثر اُن کے ترکے کے ساتھ ساتھ تقسیم ہوتا رہا۔ اور امارت رسولِ کریم کے اعمام سے نکل کر قریش کی ایک نوخیز شاخ کے قبضہ میں چلی گئی۔
اہم مواقع پر وہ بزم شوریٰ منعقد کرتے تھے۔ نوعِ انسانی سے اپنی بات منوانے کے دو ہی طریقے ہو سکتے ہیں۔ یا تو قوّت کے زور سے اُسے دبا یا جائے یا اُس کو ہم خیال بننے کی ترغیب دی جائے۔ قدیم عربوں میں فنِ خطابت کا رواج اور شہرت اِس بات کا کھُلا ہوا ثبوت ہے کہ اُن میں جمہوری آزادی موجود تھی۔ لیکن اُن کی سیدھی سادی آزادی یونان اور روم کی جمہوریتوں کی اس لطیف اور مصنوعی مشینری سے جُدا تھی۔ جس میں ہر رکنِ جماعت کے شہری اور مُلکی حقوق میں غیر منقسم حصّہ رکھتا تھا۔ عربوں کی نسبتاً زیادہ سادہ ریاست میں قوم بالکل آزاد ہوتی ہے۔ کیونکہ مِلّت کا ہر فرد کسی آقا کی ذلیل اطاعت کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اس کا سینہ ہمّت و شجاعت۔ صبر و استقلال، اِقتصاد

پرہیزگاری کی سخت و ترش صفات سے مضبوط رہتا ہے۔ آزادی کی محبت اس کو خود اختیاری کی عادتوں پر عمل پیرا ہونے پر آمادہ کرتی رہتی ہے اور بے عزتی کا خوف اس کو تکلیف، خطرے اور موت کے ذلیل خوف سے محفوظ رکھتا ہے۔ اس کے ارادے کی پختگی اس کے ظاہری حرکات و سکنات تک سے نمایاں ہوتی ہے۔ اس کی گفتگو آہستہ وزن دار اور مختصر ہوتی ہے۔ وہ شاید ہی کبھی کھل کھلا کر ہنستا ہو۔ وہ صرف ایک ہی حرکت کرتا ہے کہ اپنی ڈاڑھی پر جو مردانگی کا قابلِ عزت نشان ہے ہاتھ مارتا ہے۔ اپنی عزت کے احساس نے اس کو اپنے ہم رتبہ لوگوں کے ساتھ بے تکلف اور اپنے سے بڑے رتبہ والوں کے ساتھ بے خوف ہو کر بات چیت کرنا سکھا دیا ہے۔

عربوں کی آزاد منشی ان کی فتوحات کے بعد بھی قائم رہی۔ خلفائے سابقین اپنی رعایا کی صاف گوئی اور آزاد بیانی کی قدر کرتے تھے۔ وہ جماعت مسلمین کو اپنا ہم خیال بنانے اور باخبر کرنے کے لئے (اکثر) منبر پر جاتے تھے۔ دار الخلافہ کے دجلے کے کنارے منتقل ہو جانے سے قبل عباسیوں نے ایرانی اور بازنطینی دربار کی متکبرانہ زرق برق رسمیں بھی اختیار نہ کی تھیں۔

مُلکی جنگیں اور ذاتی انتقام

اقوام اور افراد کا مطالعہ کرتے وقت ہم ان اسباب پر نظر ڈالتے ہیں جو ان کو ایک دوسرے کا دوست یا دشمن بنا دیتے ہیں یا ان کے سماجی کردار کو محدود یا وسیع یا دھیما یا تیز کر دیتے ہیں۔

عرب باقی دنیا سے الگ تھلگ رہتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ "اجنبی" اور "دشمن" کے لفظ کو مترادف سمجھنے لگے ہیں۔ ملک کے افلاس نے ایک اصولی قانون بنا دیا ہے جس کو وہ اب تک مانتے ہیں اور اس پر عمل پیرا ہیں۔ ان کا گمان ہے کہ جب زمین تقسیم ہو رہی تھی تو سیر حاصل اور زرخیز اقلیمیں نسل انسانی کی دوسری شاخوں کو دے دی گئی تھیں۔ اب نافرمان اسمٰعیل کی اولاد اپنا وہ حصہ جس سے وہ محروم رکھی گئی تھی واپس لینے کا حق رکھتی ہے خواہ جبر کا ہو

یا دھوکے سے۔

پلینی کے بیان کے مطابق عربی قبائل تجارت اور لوٹ مار دونوں کے مساوی طور پر عادی ہیں۔ وہ کارواں جو ریگستان میں سے گذرتے ہیں یا تو لوٹ لئے جاتے ہیں یا اُن سے فدیہ لے لیا جاتا ہے۔ ہمسایہ ممالک کے باشندے یونس اور سیسا سطرس کے زمانہ سے اُن کے غارتگرانہ جوش و خروش کا شکار ہوتے چلے آئے ہیں۔

جب کوئی بدو کسی تنہا مسافر کو دور سے آتا ہوا دیکھتا ہے تو غصے میں بھرا ہوا اُس کی طرف گھوڑا بڑھاتا ہے اور چلا کر کہتا ہے "کپڑے لتے اُتار کر رکھ دو" تمہاری چچی (یعنی میری بیوی) بے چاری ننگی بیٹھی ہے" اگر وہ فوراً ہی اِس حکم کی تعمیل کر دے تو رحم کا مستحق سمجھا جاتا ہے۔ مزاحمت ظالم کو اور برانگیختہ کرتی ہے۔ جو خون وہ (مسافر) اپنی جائز حفاظت کے لئے بہانا چاہتا ہے۔ اُس کا کفارہ صرف اُس کا خون ہی ہو سکتا ہے۔

کوئی اکا دکا قزاق یا چند ساتھی تو اپنے اصلی نام سے پکارے جاتے ہیں لیکن ایک پورے گروہ کی ترکتازیاں جائز اور قابلِ فخر جنگ کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔

ایک ایسی قوم کا مزاج جو نوعِ انسانی کے خلاف یوں آمادۂ جنگ بیٹھی تھی، لوٹ مار، قتل و غارت اور انتقام کی خانہ ساز اجازت سے اور مشتعل ہو گیا۔

یورپ کے قانون اساسی میں آج کل صلح و جنگ کرنے کا اختیار چند گنے چُنے معزز با اختیار آدمیوں کو حاصل ہے۔ اور اِس اختیار کو استعمال کرنے کا حق اور بھی کم لوگوں کو ہے۔ لیکن ہر ایک عرب بے خوف و خطر اور کھلم کھلا اپنے نیزے سے کسی ہموطن پر حملہ کر سکتا ہے۔

قومی اتحاد، زبان اور اخلاق کی ایک مبہم مشابہت پر مشتمل تھا اور ہر جماعت میں قاضی کا اقتدار اور اثر برائے نام تھا۔

زمانۂ جاہلیت (یعنی نبی کریمؐ کی آمد سے قبل) کی سترہ سو ۱۷۰۰ لڑائیوں کا حال روایتوں میں موجود ہے۔ کسی بد خلق گروہ کی عداوت کی وجہ سے لڑائی چھڑ جاتی تھی۔ کسی ہٹی ہوئی جنگ کا بیان

نظم یا نثر میں سُنا دینا حریف قبائل کی اولاد کے سینوں میں عداوت کی بجھی ہوئی آگ کو بھڑکا دینے کے لئے کافی ہوتا تھا۔ خانگی زندگی میں ہر آدمی یا کم ازکم ہر خاندان اپنے مقدمات کا خود ہی جج اور خود ہی بدلہ لینے والا تھا۔

خود داری کا وہ لطیف احساس جو نقصان سے زیادہ ہتک حرمت کو اہمیت دیتا ہے عرب کی لڑائیوں پر مہلک زہر پاشی کرتا ہے۔ ان کی عورتوں اور ڈاڑھیوں کی ہتک عزت بڑی جلدی ہو جاتی ہے۔ کسی ناشائستہ فعل یا قابلِ نفرت لفظ کا کفارہ صرف مُلزم کے خون ہی سے ہوسکتا ہے۔ اور اللہ رے اُن کا صبر آزما استقلال کہ مہینوں اور برسوں وہ انتقام کی گھات میں لگے رہتے ہیں۔ جرمانہ یا خونبہا کا رواج ہر زمانہ کے وحشیوں میں رہا ہے مگر عرب میں مقتول کے وارثوں کو اختیار ہے خواہ خونبہا قبول کریں یا قانونِ انتقام پر عمل درآمد کریں۔

عرب کے اعلیٰ طبقہ کی عداوت کا تو یہ حال ہے کہ قاتل کا سر لینے سے بھی انکار کر دیتے ہیں۔ بلکہ مجرم کے بدلے کسی بے گناہ کو فدیہ قرار دیتے ہیں۔ قاتل کے خاندان کے بہترین اور سربرآوردہ آدمی کو مار کر انتقام کی آگ بجھاتے ہیں۔ اگر وہ ان کے ہاتھوں مارا جاتا ہے تو اب اُن سے انتقام لینے کی باری آتی ہے۔ اور اُن کی جان ہر وقت خطرے میں ہے۔ اِس خونی قرضہ کا اصل اور سود اسی طرح جمع ہوتا رہتا ہے۔ فریقین میں سے ہر قبیلے کے افراد عداوت اور بدگمانی میں زندگیاں گذار دیتے ہیں اور بعض اوقات انتقام کے حساب کتاب کو طے کرتے ہوئے نصف صدی گذر جاتی ہے۔

یہ خونی جوش و خروش جس میں رحم اور عفو کا پتہ بھی نہیں چند اصول اخلاق نے پیدا کر دیا ہے۔ اِن اصول کی رو سے یہ ضروری ہے کہ اِن متحارب فریقوں کی عمر، قوت، تعداد، اور ہتھیار میں کچھ مساوات ہو۔

حضرت نبی کریم سے قبل عرب دو ماہ یا شاید چار ماہ کو مقدس سمجھتے تھے اور اِس زمانے میں اُن کی تلوار مذہبی احکام کی رو سے زیرِ نیام رہتی تھی۔ خارجی اور داخلی کسی قسم کی لڑائی

میں حصہ نہ لیتے تھے۔ یہ عارضی صُلح کا زمانہ اُن کی سرکشانہ اور غازیانہ عادات کا مضبوط ثبوت ہے۔

شہری عادات و خصائل

لوٹ مار اور انتقام کا جذبہ، تجارت اور ادبیات کی سکون بخش اثر سے اعتدال پر آگیا تھا۔ یہ تاریک جزیرہ نما چاروں طرف سے عہدِ قدیم کی مہذب ترین اقوام سے گھرا ہوا ہے۔ تاجر، نوعِ انسانی کا ہمدرد ہوتا ہے۔ سالانہ آنے جانے والے (تجارتی) کاروانوں نے علم اور شائستگی کے ابتدائی اصول شہروں اور ریگستان کے خیموں تک میں داخل کر دیئے۔ عربوں کا حسب و نسب کچھ ہی کیوں نہ ہو لیکن اُن کی زبان، زبانوں کے اُسی خاندان کی شاخ ہے جس سے عبرانی۔ سُریانی اور کلدانی زبانیں نکلی ہیں۔

قبائل کی آزادی کا اثر اُن کی مخصوص بولیوں پر بھی نمایاں تھا۔ لیکن اپنی زبان کے بعد ہر قبیلہ مکّے کے خالص اور صاف محاورات کو بجا طور پر ترجیح دیتا تھا۔

یونان کی طرح عرب میں بھی زبان کی تکمیل، اخلاق و آداب کی تہذیب پر سبقت لے گئی تھی۔ ان کی گفتگو میں شہد کے لئے ۸۰ سانپ کے لئے ۲۰۰ شیر کے لئے ۵۰۰ اور تلوار کے ۱۰۰۰ مختلف نام استعمال ہوتے تھے۔ اور یہ حال اس وقت تھا جب لمبی چوڑی لغت، جاہل قوم کی قوتِ حافظہ کے سپرد تھی۔ حمیریوں کی یادگاروں پر ایک متروک اور مخفی رسم الخط میں کتبے لکھے ہوئے تھے لیکن خطِ کوفی جس پر موجودہ خط کی بُنیاد رکھی گئی ہے، فرات کے کنارے ایجاد ہوا تھا۔ اور اس جدید ایجاد کی تعلیم مکّے میں ایک اجنبی آدمی نے پھیلائی جو حضرت نبی کریم کی ولادت کے بعد اس شہر میں آکر آباد ہو گیا تھا۔ فنِ صرف و نحو۔ عروض و معانی و بیان سے عرب کے آزاد فصحا نابلد تھے۔ لیکن ان کی قوتِ فہم تیز۔ ان کی قوتِ متخیلہ بھرپور اور اُن کی عقل و فراست پختہ، جچی تُلی تھی۔ اُن کے محنت سے تیار کئے ہوئے خطبے زور دار طریق پر سامعین کے سامنے بیان کئے جاتے تھے۔ اور اُن کے دل پر اُن کا اچھا خاصا اثر ہوتا تھا۔ ایک نوخیز شاعر کی جدّت اور کمال پر اُس کے اور اُس کے عزیز قبیلوں کے لوگ خوشیاں

مناتے تھے۔ شاندار دعوت کی جاتی تھی جس میں عورتیں اپنی شادی کی سی شان و شوکت کا مظاہرہ اپنے لڑکوں اور شوہروں کے سامنے کر کے دَف بجا بجا کر اپنے قبیلہ کی اِس خوش قسمتی کے گیت گاتی تھیں کہ ایک بہادر پیدا ہو گیا ہے جو اُن کے حقوق کی نگرانی کرے گا اور ایک نقیب نے آوازِ بلند کی ہے جو اُن کے نام کو حیاتِ جاوداں بخشے گا۔

دور و دراز مقامات پر رہنے والے یا دشمن قبائل ایک سالانہ میلے میں جمع ہوتے تھے جو ابتدائی مسلمانوں کے مذہبی تعصب کی وجہ سے بند ہو گیا۔ یہ ایک قومی اجتماع تھا جس کے اثر نے اِن وحشی لوگوں کو شائستہ بنانے اور میل جول پیدا کرنے میں ضرور امداد کی ہوگی۔ تیس روز شراب اور غلے ہی کے نہیں بلکہ فصاحت و بلاغت اور شاعری کے یعنی ذہن کے شغل میں گذر جاتے تھے۔ شاعر لوگ دِل کھول کر اِس انعامی مقابلے میں حصّہ لیتے تھے۔ اور فاتح کاشہ کار اُمراء و رؤساء کے خزانوں میں محفوظ کر دیا جاتا تھا۔ ہم اپنی زبان میں وہ سات اصل نظمیں پڑھ سکتے ہیں۔ جو سنہری حرفوں سے لکھ کر کعبہ کے معبد میں معلق کر دی گئی تھیں۔ عرب کے شعراء اپنے عہد کے مورّخ اور معلّمِ اخلاق ہوتے تھے۔ اور اگر ایک طرف وہ اپنے ہم وطنوں کے تعصّبات سے ہمدردی رکھتے تھے تو دوسری طرف اُن کی صفاتِ حسنہ کو بھی بڑھاتے چڑھاتے تھے۔ سخاوت اور شجاعت کا چولی دامن کا ساتھ اُن کے قصیدوں کا محبوب موضوع ہوتا تھا۔ اور جب وہ کسی بڑے خاندان کی سخت ہجو کرنا چاہتے تھے تو وہ بُرا بھلا کہتے کہتے یہ بیان کرتے تھے اُن کے مَرد دینے کا اور اُن کی عورتیں انکار کرنے کا نام بھی نہیں جانتیں۔

سخاوت کی مثالیں

وہی مہمان نوازی جس کا مظاہرہ حضرت ابراہیم نے کیا تھا اور جس کی تعریف ہومر شاعر نے کی ہے اب بھی عربوں کی خیموں میں موجود ہے۔ خونخوار بدّو جس سے سارا ریگستان کانپتا ہے بغیر سوال و جواب یا تامّل کے اس اجنبی مسافر کو گلے لگا لیتا ہے جو اُس پر اعتماد کر کے اُس کے خیمے میں داخل ہو جائے۔ اُس کے ساتھ مہربانی اور ادب سے سلوک کیا جاتا ہے اور وہ اپنے میزبان کی

مفلسی یا امیری میں حصہ دار ہو جاتا ہے اور جب وہ آرام کر چکتا ہے تو شکریے کے ساتھ دعاؤں کے ساتھ اور کبھی کبھی تحفہ تحائف کے ساتھ رخصت کیا جاتا ہے۔

اگر کوئی بھائی یا دوست حاجتمند ہو تو دل اور ہاتھ زیادہ کشادہ ہو جاتے ہیں۔ جو عامۃ الناس کی تحسین و آفرین کے مستحق ہوتے ہیں بہادرانہ کارنامے وہ ہیں جو تمیز اور تجربے کے تنگ اندازے سے بالا ہوں۔ ایک بحث شروع ہوئی تھی کہ مکے کے باشندوں میں سب سے زیادہ سخی کہلانے کا مستحق کون ہے۔ یکے بعد دیگرے ان تین آدمیوں کو آزمایا گیا جو سب سے زیادہ اس کے مستحق نظر آتے تھے۔ عبداللہ ابن عباس کو ایک لمبا سفر درپیش تھا انھوں نے پاؤں رکاب میں رکھا تھا کہ ایک سائل کی آواز سُنی۔ "اے ابن عم رسول! میں ایک مصیبت زدہ مسافر ہوں" وہ فوراً اتر پڑے اور زائر کو اپنا اونٹ معہ قیمتی ساز و سامان اور چار ہزار اشرفیوں کی ایک تھیلی کے عطا فرما دیا۔ صرف تلوار بچالی یا تو اس لئے کہ وہ اصلی فولاد کی تھی یا اس لئے کہ کسی عزیز کا تحفہ تھی۔

قیس کے غلام نے دوسرے سائل سے کہا کہ میرا آقا خواب راحت میں ہے مگر لو یہ سات ہزار اشرفیوں کی تھیلی ہے (بس اس وقت ہمارے پاس یہی ہے) اور لو یہ ایک نوشتہ ہے جس کے ذریعے تم کو ایک اونٹ اور غلام مل جائے گا۔ آقا جب خواب سے بیدار ہوا (تو یہ حال سُن کر) اُس نے وفادار غلام کی تعریف کی اور اُس کو آزاد کر دیا۔ مگر اُس کو یہ نرم سی ملامت بھی کی کہ میری نیند کا خیال کر کے تم نے میری سخاوت پر دھبہ لگایا ہے۔" ان بہادروں میں سے تیسرا عرابہ نابینا نماز کے وقت دو غلاموں کے کاندھوں پر سہارا لگائے ہوئے جا رہا تھا۔ اُس نے سائل کا سوال سن کر کہا "افسوس میرا خزانہ خالی ہے۔ لو تم ان غلاموں کو فروخت کر ڈالو۔ اگر تم ان کو قبول نہیں کرتے تو میں ان سے دست کش ہوتا ہوں" یہ کہہ کر اُس نے نوجوان غلاموں کو علیحدہ کر دیا۔ اور لاٹھی کے سہارے دیوار ٹٹول کر راستہ چلنے لگا۔

حاتم کی سیرت عربی صفات کا مکمل نمونہ ہے۔ وہ بہادر بھی تھا اور سخی بھی۔ فصیح البیان شاعر بھی تھا اور کامیاب لیڈر بھی۔ اس کے مہمان نواز دسترخوان پر چالیس اونٹ کباب کئے جاتے تھے۔ ایک دشمن سائل کی درخواست پر اس نے قیدی اور مال غنیمت دونوں واپس کر دئے تھے۔ اس کے ہم وطنوں کی آزادمنشی کے سامنے قانونِ عدل کی کچھ حقیقت نہ تھی۔ وہ فخر کے ساتھ رحم اور مہربانی کے فطری جذبے سے مغلوب ہو جاتے تھے۔

خطابت

اور

اُس کی مختصر تاریخ

بسلسلۂ ماسبق

وعظ گوئی خطابت کی ایک قسم وعظ گوئی بھی ہے۔ مذہبی حیثیت سے اس کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس لئے کہ واعظ درحقیقت خلیفۃ اللہ اور نائب رسول کی حیثیت رکھتا ہے۔ اُس کے موضوع کا تعلق روحانیات اور نجاتِ ابدی سے ہوتا ہے۔ وہ سامعین کے ایمانی جذبات کو برانگیختہ کر کے اُن تمام حقوق کو واضح کرتا ہے جو خدا کے اُس پر اور اُس کے خدا پر ہیں۔ وہ جو کچھ کہتا ہے خدا اور رسول کی طرف سے کہتا ہے اس لئے وہ دماغ میں جِلا، جسم میں حرارت اور دلوں میں عمل کا جوش پیدا کر دیتا ہے۔

مذہب کا اثر اور اُس کی ضرورت دُنیا میں اَب تک جتنے بڑے بڑے انقلابات رونما ہوئے ہیں اُن پر اگر ہم نظرِ غائر ڈالیں نیز اُن انقلابات کی آڑ میں جو مختلف عوامل پوشیدہ ہیں اُن کی بھی جستجو کریں تو ہم کو معلوم ہو گا کہ اُن حالات کے دَوران میں انسان ہمیشہ خیالات کا ایک مخصوص جامہ پہن لیتا ہے۔ اور انھیں مخصوص خیالات کا اُس پر غلبہ ہوتا ہے جن سے وہ اثر پذیر ہوتا ہے۔ اور وہی اُس وقت اُس کے اعمال کے محرّک ہوتے ہیں۔ لیکن یہ مجموعۂ خیالات جو اُس وقت انسان پر حاوی ہوتا ہے اُس کی تعبیر اگر ہو سکتی ہے تو صرف لفظِ "مذہب" یا "دین" سے۔

انسان کے لئے ہمیشہ ایک دین و مذہب کی ضرورت رہی ہے۔ جب تک کوئی مذہبی عقیدہ اُس کے دل و دماغ پر غلبہ حاصل نہیں کر لیتا اُس وقت تک اُس کی

قوائے عمل شل اور اس کے اعضاء بے حس وحرکت رہتے ہیں۔ مذہب کو لوگوں کے مشاعر و احساسات اور اعمال و افعال پر جو تسلط اور غلبہ حاصل ہے اُس کی بنا پر اس کی اہمیت سے کسی سمجھ دار شخص کو انکار نہیں ہو سکتا۔

دنیا پر جب سے آفتاب تمدن نور افگن ہوا ہے اُس وقت سے اب تک انسان ہمیشہ مذاہب ہی کے آگے سرنگوں رہا ہے اور بانیانِ مذاہب ہی کے لئے اُس نے مختلف زمانوں میں طرح طرح کے بت، ہیاکل اور معابد تعمیر کئے ہیں۔ دُنیا کا ہر وہ تمدن جو کبھی روئے زمین پر آب و تاب سے جلوہ گر ہوا اُس کے آگے آگے ہمیشہ مذاہب ہی کی مشعلیں رہنمائی کرتی رہی ہیں۔

ہر قوم کے لیے اُس کے عقائد اساسی نعمت ہوتے ہیں۔ اُن کی قدر کرنا اور شورشوں سے اُن کو محفوظ رکھنا اُس قوم کا اولین فرض ہوتا ہے۔ انھیں معلوم ہے کہ اُن کے زوال کا دن دراصل وہی ہے جب اُن کے عقائد کی بُنیادیں کھوکھلی ہو جائیں اور معتقدات نشانۂ ہدف بن جائیں۔

چونکہ لوگ ہمیشہ اپنے اپنے معتقدات کے پیچھے سرگرداں رہتے ہیں اس لئے واعظوں کا اُن پر بہت آسانی سے منتر چل جاتا ہے۔ وہ بڑی شان سے اُن کے افعال و اعمال کی نگرانی کرتے ہیں اور اُن کے قوائے عمل سے حسب موقع اپنی مرضی کے مطابق جو چاہتے ہیں کام لیتے ہیں اور اُن کے خوف زدہ دلوں کے لئے سامانِ امید فراہم کرتے رہتے ہیں۔ گویا سامعین اُن کے ہاتھ میں ایک آلۂ بے جان ہوتے ہیں۔ وہ انھیں جدھر چاہتے ہیں گھماتے رہتے ہیں۔

اتقا اور پرہیزگاری واعظ کو حقائق دینیہ اور احکام شرعیہ سے بخوبی واقف ہونے کے علاوہ دین دار اور متقی بھی ہونا چاہئے۔

یونان میں ڈیماستھینز ایک مشہور جادو بیان خطیب گذرا ہے۔ جو فنِ خطابت کے

اَسرار و دقائق کا بخوبی ماہر تھا۔ ایک مرتبہ لوگوں نے اُس سے دریافت کیا کہ "خطابت میں کامیابی کا اصل راز کیا ہے؟" اُس نے جواب دیا "عمل" لوگوں نے پوچھا "اُس کے بعد؟" اُس نے کہا "عمل" اُنھوں نے پھر یہی سوال کیا کہ "اُس کے بعد؟" اُس نے اِس مرتبہ بھی یہی جواب دیا کہ "عمل"۔

دُنیا میں کامیابی جس چیز کا نام ہے وہ دراصل تمام تر نتیجہ ہے اُس کے عمل اور پرہیز گاری کا۔ تاریخ میں صدہا ایسی ہستیاں گذری ہیں جو علم و فضل، عقل و دانائی کے اعتبار سے یگانۂ روزگار تھیں۔ لیکن اپنی بد اعمالیوں کی وجہ سے آج مرقعِ عبرت بنی ہوئی ہیں۔

دنیا میں گو صدہا واعظ پیدا ہوتے رہتے ہیں مگر غور سے دیکھا جائے تو ایسے بہت کم نکلیں گے جو وعظ گوئی کی درحقیقت اہلیت بھی رکھتے ہوں۔ مقررین اور واعظین کی فہرست میں ایسے لوگ بکثرت نظر آئیں گے جو اپنے مؤثرانہ خطبوں اور اسپیچوں کے ذریعے سے لوگوں کو مسحور کرتے تھے اور اپنے تقدس سے مرعوب کر کے لوگوں کو اپنے ذاتی اغراض کا شکار بناتے تھے۔ اور اس میں ایک حد تک کامیاب بھی ہوتے تھے مگر آخر ملمع کہاں تک اصل حقیقت کو چھپا سکتا ہے۔ کبھی نہ کبھی اُنھیں ناکامی کا منہ دیکھنا ہی پڑتا تھا۔

تاریخ میں اِس کی بکثرت مثالیں ملتی ہیں کہ بڑے بڑے پارسا جن کے علم و فضل اور تقدس کی دور دور تک شہرت تھی جب اُن کا جامۂ پارسائی چاک ہوا تو کیا کچھ داغ سیہ کاری دیکھنے میں نہیں آئے۔

دورِ اکبری کا مشہور عالم قاضی مخدوم الملک جو ایک عرصہ تک ہندوستان کی مسند شیخ الاسلامی پر بھی متمکن رہ چکا تھا اور جس کی پابندیِ شریعت کی ایک دُنیا مدّاح تھی جب اُس کی قلعی کھُلی تو دیکھنے والوں نے دیکھا اور سُننے والوں نے

حیرت واستعجاب کے کانوں سے سُنا کہ غصب کا سارا مال اُس کے یہاں سے برآمد ہوا۔ پھر آخر جو کچھ اُس کا حشر ہوا دُنیا سے پوشیدہ نہیں۔

روبس پیر ایک زبان آور خطیب تھا جسے انقلاب فرانس کے دَور اوّلین میں ایک خاص زعیمانہ اقتدار حاصل ہوگیا تھا۔ مگر اُس کی بداخلاقیوں نے اُس کی قسمت کا پانسہ پلٹ دیا۔ انقلابات کا جدید دَور اُس کے زوال کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ مُدت کی دبی ہوئی مخالفتیں اُبھریں جو بالآخر اُس کے نام ونمود، عزت و اقتدار کو خاک میں ملا کر رہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ جو بات واعظ کے لئے سب سے زیادہ ضروری ہے وہ یہ ہے کہ قبل اس کے کہ وہ مسندِ وعظ پر اپنے لئے کوئی جگہ حاصل کرے اُس کو چاہئے کہ وہ اپنے عمل اور کردار کی اصلاح کرے، اپنے ظاہر و باطن کو درست کرے۔ اپنے عزوم، ارادے، عقائد و خیالات میں پختگی پیدا کرے۔ دعوت الی الحق اور اشاعتِ دین میں دُنیا کا خوف، حکومت کا ڈر، جان و مال کی محبت، اعزا و اقربا کی ملامت، کسی چیز کی پروا نہ کرے۔ اپنے اندر قوتِ ایمانی پیدا کرے۔ یہ ایک ایسی قوت ہے کہ جس شخص میں یہ پیدا ہوجاتی ہے اُس کی قوتِ اثر اندازی میں دس گنا اضافہ ہوجاتا ہے۔

دنیا میں اَب تک جو لوگ تاریخی انقلابات کے باعث ہوئے ہیں۔ اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو وہ صرف چند مسکین ہستیاں نکلیں گی جن کی قوتِ ایمانی نہایت مضبوط اور مستحکم تھی۔

انسان کی اصلی دین داری کا ظہور اس وقت ہوتا ہے جب وہ اپنے ارادے اور اپنی ذات کو معبودِ حقیقی کے ارادے اور اُس کی ذات پر چھوڑ دیتا ہے اور اپنی مرضی کو اس کی مرضی کے لئے بالکل فنا کر دیتا ہے۔ جب یہ اعتقادی کیفیت انسان میں پیدا ہوجاتی ہے

تو اُس وقت تمام دوسرے خیالات کے گرد و غبار سے اُس کا شیشۂ دلِ پاک صاف ہو جاتا ہے اور اُس کے تمام افعال و اعمال کا محور اور مرجع صرف وہی ذات ہوتی ہے جس کی رضا جوئی اور ذات پر اُس نے اپنی مرضی اور شخصیت کو نثار کر دیا ہے۔

عموماً ہر شخص کی زبان، اُس کے خیالات اور جذبات کی صحیح ترجمان ہوتی ہے۔ ایک متقی اور خدا رسیدہ شخص کی زبان پر وہی الفاظ آتے ہیں جو دنیا کی بے ثباتی، کائنات کی بے چارگی، حمایتِ دینی، اور طاعتِ خداوندی کے مترادف ہوتے ہیں۔

مگر اِس کے برعکس ایک دنیادار اپنی بات چیت اور گفتگو میں انھیں الفاظ کا خوگر ہوتا ہے جن سے دُنیا پرستی، غفلت شعاری، عیش پسندی اور بدکرداری ظاہر ہوتی ہے

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے وہ صدہا خطبات جو نہ صرف خطابت و بلاغت کی جان سمجھے جاتے ہیں بلکہ حمیتِ دینی، غیرتِ مذہبی، خدا پرستی اور اُس کی رضا جوئی کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ اُٹھا کر دیکھیے تو آپ کو صاف معلوم ہو جائے گا کہ آپ کیا اوصاف تھے اور کن باتوں کی وجہ سے مذہب و دین کے مقدس صفحات پر آپ نے عزت و نام پایا ہے۔ بطور نمونہ کے ایک خطبہ درجِ ذیل ہے۔

اتقوا اللہ عباد اللہ و بادروا	بندگانِ خدا! خدا کے عذاب سے ڈرو، تقویٰ اختیار کرو
اٰجالکم باعمالکم وابتاعوا	اور اعمالِ خیر کے ساتھ اپنی موت کی طرف عجلت کرو۔
ما یبقی لکم بما یزول عنکم	اُس چیز کے عوض میں جو تمھارے پاس سے زائل ہونے والی ہے
وترحلوا فقد جد بکم واستعدوا	وہ چیز خریدو جو تمھارے پاس ہمیشہ رہنے والی ہے۔ تم
للموت فقد اظلکم وکونوا	کوچ کرو اور دیر نہ کرو، موت کے لئے تیار ہو جاؤ جس کا
قوماً صیح بھم فانتبھوا واعلموا	سایہ تم پر چھایا ہوا ہے۔ تم وہ قوم بن جاؤ جو آواز دینے پر
ان الدنیا لیست لکم بدار	بہت جلد بیدار ہو جاتی ہے اور جان لو کہ تمھارا اصلی
فاستبدلوا فان اللہ سبحانہ	گھر دُنیا نہیں ہے۔ تم اس کو تبدیل کر ڈالو۔ خدا تعالیٰ نے

لم یخلقکم عبثا ولم یترککم سدیٰ -	تم کو بے کار نہیں پیدا کیا ہے اور تم کو مہمل نہیں بنایا ہے۔
وما بین احدکم وبین الجنة او النار الا الموت ان ینزل به وان غایة تنقصها اللحظة وتهدمها الساعة لجدیرة بقصر المدة	تمہارے اور جنت یا دوزخ کے مابین، موت کے سوا کوئی حدِ فاصل نہیں ہے۔ تمہاری عمر اور بقا کی مسافت جس کو ایک ایک لمحہ فنا کئے ڈالتا ہے، تقلیلِ مدت کے لایق ہے

....

فیا لها حسرة علی کل ذی غفلة ان یکون عمره علیه حجة وان تؤدیه ایامه الی شقوة	کس قدر افسوس ہے اس غافل شخص پر جس کے لئے اس کی زندگی ایک حجت و برہان ہے لیکن وہ اپنا زمانہ شقاوت میں گذار رہا ہے۔
نسئل الله سبحانه ان یجعلنا وایاکم ممن لا تبطره نعمة ولا تقصر به عن طاعة ربه غایة ولا تحل به الموت ندامة ولا کآبة ÷	ہم خدا سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہم کو اور تم کو اُن لوگوں میں سے بنا دے جن کی نعمتیں انھیں تکبر اور سرکشی میں مبتلا نہیں کرتیں اور کوئی دنیاوی فائدہ انھیں عبادتِ پروردگار سے باز نہیں رکھتا اور نہ اُن کو موت کے بعد ندامت اور پشیمانی ہوتی ہے۔

(نہج البلاغہ ص۵۶)

تاریخ خطابت | قدیم ترین خطبات کا بیشتر حصّہ جو مدوّن ہو چکا ہے وہ صرف وہ ہے جو حضرت موسیٰ کلیم اللہ یا دیگر انبیائے بنی اسرائیل کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔

حضرت مسیح علیہ السلام سے قبل یونانیوں کے اندر بہت سے ماہرین خطابت پیدا ہو چکے تھے جنھوں نے اپنے زورِ بیان سے قوم و ملک میں ایک ہیجان پیدا کر دیا تھا۔ اسی عہد کی ایک گراں قدر ہستی امام الفلاسفہ ارسطاطالیس ہے جس نے اِس فن کی باقاعدہ داغ بیل ڈالی؛ اُس کے اصول وقوانین مرتب کرکے جامۂ تدوین سے آراستہ کیا۔

پانچویں صدی ہجری میں شیخ الرئیس ابوعلی حسین بن عبداللہ بن سینا نے ارسطو کی اِس کتاب کا ترجمہ عربی میں کیا جو کتاب الخطابہ کے نام سے مشہور ہے۔ بعدازاں چھٹی صدی ہجری میں علامہ ابن رشد اندلسی نے اِس کتاب کا خلاصہ کیا جس کا نام تلخیص الخطابہ ہے۔ اُس میں علمی طریقے سے مندرجہ ذیل مضامین پر بحث کی گئی ہے۔

(۱) خطابی قیاسات کی تعریف جو جلسوں میں تقریر کرتے وقت سودمند ہوتے ہیں۔

(۲) خطابی قیاسات کے اقسام یعنی مشاورہ، مخاصمہ، مشاجرہ وغیرہ وغیرہ۔

(۳) وہ تدابیر جو قوم کے مائل کرنے اور اُبھارنے یا کسی چیز کی تحقیر و تعظیم کرنے میں کارگر ہوتی ہیں۔

(۴) عذر یا عتاب کرنے کا طریقہ۔

(۵) کسی قصّہ یا لیکچر کے بیان کرنے کے وقت مضامین کی تمہید و ترتیب۔

عہدِ عیسوی | حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دور وہ تھا جب خطابت ابتدائی منازل طے کرکے مرتبۂ کمال کو پہنچ چکی تھی۔ آپ کے شاگرد واہیب بطرس، بولیس، وغیرہ خطابت کے بڑے ماہر تھے۔ اُن کے خطبات بڑی بڑی مجلد کتابوں میں موجود ہیں۔

جو اُن کے کمالِ خطابت کی زندہ یادگاریں ہیں۔ مذہبِ عیسوی اُن پر جتنا بھی فخر کرے کم ہے۔

عہدِ اسلامی زمانۂ جاہلیت میں قوتِ خطابت سے جو کام لئے جاتے تھے، اُن کا دائرہ محدود تھا اِس لئے اُس زمانے میں خطابت اور تقریر کو وہ عروج نہ ہوسکا جو شعر و شاعری کو حاصل تھا لیکن زمانۂ اسلام میں یہ حالت بدل گئی۔ سیاسی واقعات اور غزوات و فتوحات نے عرب کی پرجوش طبیعتوں کے لئے بہت سے نئے میدان کھول دئیے جن میں اُن کو زبان آوری کا جوہر دکھانے کا موقع ملا۔ اِس بنا پر اسلام کے بعد اگرچہ عربی شاعری میں زمانۂ جاہلیت کا زور باقی نہیں رہا تاہم اُس کی طاقت، خطابت اور تقریر کی طرف منتقل ہوگئی۔

درحقیقت خطابت اور شاعری کے ڈانڈے ملے ہوئے ہیں؛ اِسی وجہ سے اکثر ایسا دیکھا گیا ہے کہ جو خطیب ہوتا ہے وہ شاعر بھی ہوتا ہے۔ اور جو شاعر ہوتا ہے وہ خطیب بھی ہوتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ بعضوں کی طبیعت کا رجحان شاعری کی طرف زیادہ ہوتا ہے وہ شاعر بن جاتے ہیں اور بعضوں کی طبیعت کا میلان خطابت کی طرف زیادہ ہوتا ہے وہ آخر خطیب کے لقب سے مشہور ہوجاتے ہیں۔

علامہ جاحظ نے "الجمع بین الخطابۃ والشعر ومَن اشتهر بذلك"[۵] کا عنوان قائم کرکے اُن تمام ادبا کی ایک مکمل فہرست لکھی ہے جو خطبا بھی تھے اور شعرا بھی۔ خطبائے عرب میں بڑی جماعت وہ ہے جس کا دَور عہدِ اسلامی تھا۔ تاہم کچھ ایسے گذرے ہیں جن کا زمانہ اسلام سے قبل تھا۔ جن میں سے سحبان وائل باہلی خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ یہ شخص اپنے زمانہ کا ایک بلند پایہ خطیب اور امام مانا جاتا ہے۔ جس کی خطابت آج تک ضرب المثل ہے۔ کسی اسپیکر کی بہت زیادہ تعریف کرنی

---

۵ کتاب البیان والتبیین جز اول ص۲۳۔

ہوتی ہے تو کہا جاتا ہے "ھو اخطب من سحبان وائل"۔

سحبان کا خاص کمال یہ تھا کہ وہ خطبہ دیتے دیتے پسینہ پسینہ ہو جاتا تھا لیکن نہ دورانِ تقریر میں کہیں ٹھہرتا تھا اور نہ سارے خطبے میں کوئی لفظ دہراتا تھا۔ لوگ اس کی خطبہ کو خطبۂ شوہاء کہا کرتے تھے۔

قس بن ساعدہ ایادی نے عہدِ جاہلیت اور عہدِ اسلامی دونوں پائے تھے۔ آنحضرت صلعم نے ایک مرتبہ اس کو سوقِ عکاظ میں دیکھا کہ سرخ اونٹ پر بیٹھا ہوا خطبہ دے رہا ہے۔ آپ نے اس کے خطبہ کو بغور سنا اور اس کی بلاغت پر تعجب بھی کیا وہ کہہ رہا تھا:۔

ایھا الناس: اجتمعوا، فاسمعوا وعوا۔ من عاش مات ومن مات فات، وکل ما ھو آتٍ آت،	لوگو! جمع ہو اور سنو! اور یاد رکھو، جس کو زندگی عطا ہوئی ہے وہ مرے گا اور جو مر گیا اس کا قصہ ختم ہوا۔ اور جو کچھ ہونے والا ہے ہو کر رہے گا۔
مالی اری الناس یموتون ولا یرجعون ارضوا فاقاموا، ام حبسوا فناموا۔	مجھے کیا ہوا ہے کہ لوگوں کو دیکھتا ہوں کہ مرتے ہیں اور پھر واپس نہیں ہوتے، کیا وہ پسند کرتے ہیں اور ٹھہر جاتے ہیں یا روک لئے جاتے ہیں اور سو جاتے ہیں۔
یا معشر ایاد این ثمود وعاد، واین الآباء والاجداد این المعروف الذی لم یشکر والظلم الذی لم ینکر۔ اقسم قسماً باللہ ان للہ دیناً	گروہِ ایاد! ثمود و عاد کیا ہوئے، کہاں گئے آباء و اجداد، وہ احسان کیا ہوا جس کا شکر نہیں ادا کیا گیا اور وہ ظلم کدھر گیا جس کا کبھی انکار نہیں کیا گیا۔ میں خدا کی قسم کھاتا ہوں کہ بیشک خدا کا

آداب اللغۃ العربیہ جزء اول صفحہ ۱۰۰

ھُوَ ارضیٰ لہٗ من دینکم ھٰذا۔ (کتاب البیان والتبیین صفحہ ۱۶۸)	ایک دین ہی جس کو وہ تمہارے اِس دین سے زیادہ پسند کرتا ہے ۔

حضرت سہیل بن عمرو نہایت پر جوش خطیب تھے۔ حالتِ کفر میں وہ اسلام کی مخالفت پر تقریریں کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے آنحضرت صلعم سے عرض کیا کہ "اُن کے نیچے کے اگلے دو دانت تُڑوا دیجئے" تاکہ تقریر کرنے میں اُن کی زبان نہ چلنے پائے" آپ نے فرمایا اگرچہ میں نبی ہوں لیکن میں مثلہ نہیں کرسکتا۔ عمر! اس کو جانے دو۔ ممکن ہے کہ اُن کی تقریر سے کبھی اسلام کو فائدہ پہنچے۔

چنانچہ وہ مشرف بہ اسلام ہوئے اور رسول خدا صلعم کی وفات کے بعد جب تمام عرب میں اِرتداد کی ہَوا چل پڑی تو اُنھوں نے قریش کے سامنے ایک تقریر کی جس کا یہ اثر ہوا کہ تمام قبیلہ قریش اسلام پر قائم رہا اور کسی قسم کی بدامنی ظہور پذیر نہیں ہوئی۔ وھو ھٰذا :۔

ایھا الناس! ان یکن محمدٌ مات فان اللّٰہ حیٌّ لم یمت	لوگو! اگر محمد صلعم وفات پا گئے تو خدا زندہ ہی جو نہیں مَرا،
وقد علمتم انی اکثرکم قتباً فی برٍّ وجاریۃً فی بحرٍ، فاقرّوا امیرکم وانا ضامنٌ ان لم یتم الامر ان اردھا علیکم ۔	تم جانتے ہو کہ میں بہت زیادہ بری و بحری سفر کیا کرتا ہوں۔ میں اپنے تجربے کی بنا پر کہتا ہوں کہ تم اپنا خلیفہ مقرر کرلو۔ میں ضمانت کرتا ہوں کہ اگر معاملۂ خلافت طے نہ ہوا تو اُس کو میں تم پر لَوٹا دوں گا ۔

(کتاب البیان والتبیین صفحہ ۱۷۳)

اہلِ عرب کو فطرتاً زبان کا ذوق تھا اور قدرت نے جذبات اور مدرکات کے اظہار پر اُن کو ایسی قوت عطا فرمائی تھی کہ اُس زمانے کی بڑی سے بڑی شائستہ اور متمدن قومیں اُن کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتی تھیں۔ اُن کی آتش بیانی لڑائیوں کی آگ بھڑکا دیتی تھی جو صدیوں بجھائے نہیں بجھتی تھی۔ سخن سنجی، سخن فہمی، شعر گوئی اور زبان آوری کا بازار گرم تھا۔ عرب کا بچہ بچہ ہومر اور شیکسپیر ہو رہا تھا۔ اُن کے کسی قبیلہ میں جب کوئی نیا شاعر یا خطیب پیدا ہوتا تھا تو ہر طرف سے مبارکباد کے پیغام پہنچتے تھے۔ عورتیں اِس خوشی میں رقص و سرود کے جلسے منعقد کرتی تھیں اور سارے قبیلے میں خوشیاں منائی جاتی تھیں۔

ٹھیک اُسی زمانے میں جب عرب کی شاعری اور خطابت بلاغت کی معراج پر پہنچ چکی تھی اور اہلِ عرب اِس ذوق سے مخمور اور اِس نشہ میں سرشار نظر آ رہے تھے حجاز کی مقدس سرزمین مکہ سے ایک نئی آواز سُنائی دی جس کو سب نے حیرت و استعجاب کے کانوں سے سُنا۔ یہ داعیِ حق پیغمبرِ اسلام صلعم کی آواز تھی جو ایک ولولہ انگیز اور مغلوب نہ ہونے والی طاقت رکھتی تھی۔ اور بلاغت کے اُس مرتبہ کی مُدعی تھی جو بشری طاقت سے بالا تر ہے۔ سارا عرب مقابلے کے لئے تیار ہوا لیکن اُس عظیم الشان جبروت اور جلال نے مخالفانہ ہمتوں کو شکست اور ارادوں کو پست کر دیا۔

اَب کیا تھا؟ قوتِ خطابت نے اور زور پکڑا۔ اہلِ عرب کے مذہبی جوش اور اُن کی فطری بے باکی نے اِس قوت میں اور چار چاند لگا دیئے۔ جذباتِ بہیمیہ کا اظہار موقوف ہو گیا اور اُن کی زبان آوری، دعوتِ الی الحق، حمایتِ دین، ترغیبِ شجاعت اور تعلیمِ اخلاق میں صرف ہونے لگی۔

خطبائے اسلام اپنی تقریروں کو زیادہ سے زیادہ موثر بنانے کے لئے اکثر آیاتِ قرآنی سے استدلال کرتے تھے۔ بلکہ بسا اوقات آیات کے مجموعے سے پورا پورا

خطبہ تیار کر لیتے تھے۔ چنانچہ مصعب بن زبیر نے اہل عراق کو اپنے بھائی عبداللہ بن زبیر کی اطاعت پذیری پر آمادہ کرنے کے لئے جو خطبہ دیا تھا درج ذیل ہے:۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۝

طٰسٓمٓ ۝ تلک اٰیات الکتاب المبین ۝ نتلو علیک من نبأ موسیٰ وفرعون بالحق لقوم یؤمنون ۝ ان فرعون علا فی الارض وجعل اھلھا شیعاً یستضعف طائفۃ منھم یذبح ابناءھم ویستحیی نساءھم انہ کان من المفسدین ۝ (واشار بیدہٖ نحو الشام) ونرید ان نمن علی الذین استضعفوا فی الارض ونجعلھم ائمۃ ونجعلھم الوارثین ۝ (واشار بیدہ نحو الحجاز) ونمکن لھم فی الارض ونری فرعون وھامان وجنودھما منھم ما کانوا یحذرون ۝ (واشار بیدہٖ نحو العراق)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

طٰسٓمٓ۔ یہ کتاب مبین کی آیتیں ہیں۔ ہم تم کو موسیٰ اور فرعون کا سچا قصہ سناتے ہیں اُن لوگوں کے لئے جو ایمان لانا چاہیں۔ بے شک فرعون نے دُنیا میں سرکشی کی، اُس نے زمین کے رہنے والوں کے بہت سے گروہ کر دیئے بعض اُن میں سے کمزور تھے جو اپنے لڑکوں کو ذبح کرتے تھے اور اپنی عورتوں کے بارے میں شرم کرتے تھے بیشک وہ فساد کرنے والوں میں سے تھے (اور اپنے ہاتھ سے شام کی طرف اشارہ کیا) ہم چاہتے ہیں کہ اُن لوگوں پر احسان کریں جو ملک میں کمزور ہیں اور ان کو امام بنا دیں اور اُن کو مُلک کے وارثین میں سے کریں (اور ہاتھ سے حجاز کی طرف اشارہ کیا) اور ہم مُلک میں اُنھیں طاقتور بنا دیں اور فرعون اور ہامان اور اُن کے لشکروں میں سے اُن لوگوں کو دکھا دیں جو پرہیز نہیں کرتے ہیں (اور ہاتھ سے عراق کی طرف اشارہ کیا)

(آداب اللغۃ العربیہ جزء اول صـ۱۹۲)

قائد اور سپہ سالار مواقع جنگ پر اپنے خطیبانہ انداز بیان میں بہت ہی پرجوش خطبے دیا کرتے تھے، جس میں فوجوں کی ترتیب، صف بندی کے اصول، دشمن پر حملہ کرنے اور اس سے بچنے کے قواعد پر زور دیا جاتا تھا۔ اور فتح و شکست کے مواقع کو نمایاں کر کے مسلمانوں کے دلوں میں قومی غیرت اور دینی حمیت کے جذبات برانگیختہ کئے جاتے تھے اور انھیں بتایا جاتا تھا کہ بقائے حیات کے لئے صرف یہی ضروری نہیں کہ انسان اپنے دشمنوں کی مدافعت کرے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ خود سبقت کر کے ان کو فنا کرنے اور شکست دینے کی کوشش کرے۔

اس موضوع پر ان کے پرجوش خطبے ہی دراصل ان کی کامیابی کا اصلی راز ہوتے تھے۔ چنانچہ جنگِ یرموک میں حضرت خالد بن ولید کا خطبہ، جنگ قادسیہ میں حضرت مغیرہ کا خطبہ، غزوۂ فارس میں حضرت خلید بن منذر کا خطبہ، اور فتح اندلس میں حضرت طارق بن زیاد کا خطبہ مذکورۂ بالا بیان کی زرین مثالیں ہیں۔ جن کے ساحرانہ انداز بیان اور زورِ خطابت پر اگر تبصرہ کیا جاوے تو بڑی بڑی مجلد کتابیں تیار ہو سکتی ہیں۔

روم اور یونان کی تاریخیں پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں قومیں فن خطابت میں بہت کمال رکھتی تھیں۔ ان میں بہت سے خطباء ایسے گذرے ہیں جنھوں نے اپنی زبان کی طاقت اور زورِ بیان سے بڑے بڑے انقلابات برپا کر دیئے۔ ان کے خطبے آج بھی کمالِ خطابت کی بے مثال یادگار ہیں۔

خصوصاً یونان، تہذیب و تمدن، تعلیم و ترقی کے اعتبار سے بہت ہی امتیازی شان رکھتا تھا۔ وہاں اس فن کی باقاعدہ تعلیم دی جاتی تھی تاکہ وہ قوم و ملک کی بہتر سے بہتر طریقے پر خدمات انجام دے سکیں۔ اس موضوع پر سب سے پہلی تصنیف اسی خطۂ ارضی کی یادگار ہے۔

لیکن اہل عرب کو یہ خاص فخر و امتیاز حاصل ہے کہ جب ان پر ترقی کا سایہ بھی نہ پڑا تھا اس وقت بھی زبان آوری اور فصیح البیانی ان کے قومی خصائص میں داخل سمجھی جاتی تھی۔

اور اُن کے خطیب دُنیا کے بہترین اسپیکر مانے جاتے تھے۔

نوشیرواں نے جب خطبائے عرب کی تعریفیں سنیں تو اُس کو اُن سے ملاقات کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ اُس نے نعمان بن منذر سے کہا "میں خطبائے عرب میں سے کسی ایک سے ملنا چاہتا ہوں۔" نعمان نے ہر قبیلے سے دو دو تین تین زبان آور اسپیکر جمع کر کے اُس کی خدمت میں روانہ کیے جن میں قبیلہ بنی تمیم میں سے اکثم بن صیفی، حاجب بن زرارہ، قبیلہ بنو بکر میں سے حارث بن ظالم، قیس بن مسعود، قبیلہ بنو عامر میں سے خالد بن جعفر، علقمہ بن علاثہ، عامر بن طفیل وغیرہ جیسے بلند پایہ خطبا شامل تھے۔

اُن میں سے ہر ایک نے نوشیرواں کے سامنے اپنی جادو بیانی اور سحر آفرینی کا ثبوت دیا اور اپنی زبان آوری اور فصیح البیانی پر خراجِ تحسین حاصل کیا۔ جن کو علامہ احمد بن عبد ربہ نے عقد الفرید جزو ثالث میں مفصل بیان کیا ہے۔

ڈیموستھینس، خطبائے یونان کا امام مانا جاتا ہے لیکن اُس کے کل خطبات ۶۱ سے زیادہ نہ تھے۔ مسلمانوں میں حضرت علی مرتضیٰ کے خطبات سینکڑوں کی تعداد میں ہیں جن کو شریف مرتضیٰ نے ایک کتاب کی شکل میں جمع کر دیا ہے جس کا نام "نہج البلاغہ" ہے۔

ان خطبات میں جہاں ایک طرف سلاست و روانی پائی جاتی ہے وہاں دوسری طرف زورِ بیان اور ایسا جوش و اثر پایا جاتا ہے کہ سننے والوں کے دل لرز اُٹھتے ہیں۔ پھر زورِ خطابت کا عالم وہاں اور واضح ہو کر نظر آتا ہے جہاں حضرت علیؓ نے قوم کو جنگ پر ابھارا ہے اور اُن کے دلوں میں شجاعت و بہادری، اقتحامِ حرب اور اباءِ نفس کے شریف جذبات برانگیختہ کیے ہیں۔

نمونے کے طور پر آپ کا وہ مختصر خطبہ درج ذیل ہے جو آپ نے جنگِ صفین میں اُس وقت دیا تھا جب موقع نہایت نازک تھا۔ سرفرازی و سربلندی کا تاج یا ذلت و رسوائی کا تاریک انجام تقریر کی تاثیر و عدمِ تاثیر پر موقوف تھا۔ وہو ھذا :-

معاشر المسلمین!
استشعروا الخشیة و تجلببوا السکینة، وعضوا علی النواجذ فانه انبی للسیوف من الهام واکملوا اللامة، وقلقلوا السیوف فی اغمادها قبل سلها، و الحظوا الخزر واطعنوا الشزر ونافحوا بالظبا.. وصلوا السیوف بالخطا واعلموا انکم بعین اللّٰہ ومع ابن عم رسول اللّٰہ صلعم فعاودوا الکر واستحیوا من الفر، فانه عار فی الاعقاب و نار یوم الحساب. وطیبوا عن انفسکم نفسا وامشوا الی الموت مشیا سجحا، وعلیکم بهذا السواد الاعظم والرواق المطنب فاضربوا ثبجه. فان الشیطان کامن فی کسره۔

مسلمانو!
تم خوفِ خدا کو اپنے لئے شعار بنالو، اور تسکین و اطمینان اپنی طرف کھینچ لو، اور دانتوں سے دانت ملائے رکھو۔ اِس لئے کہ یہ حالت دشمن کی تلواروں کو کھوپڑی پر کارگر ہونے نہیں دیتی اور زرہ کو کامل کرلو، اور تلواروں کو کھینچنے سے پہلے نیاموں میں جنبش دے لو، اور چاروں طرف کنکھیوں سے دیکھتے جاؤ اور دائیں بائیں نیزے بازی کئے جاؤ اور دشمن کو تلوار کی باڑھ پر دھر لو اور تلواروں کو دشمن کے قدموں سے ملائے رکھو۔ تم خوب جان لو کہ تم خدا کی نظروں میں ہو اور ابنِ عم رسول کے ساتھ ہو۔ دوبارہ دشمن پر پلٹ پڑو۔ بھاگنے سے شرم کرو۔ اس لئے کہ بدنامی اس کا انجام ہے اور قیامت کے دن عذاب جہنم اُس کا بدلہ ہے اور اپنے نفس کو اُس کی خواہشوں سے خوش کرو۔ اور بطیب خاطر موت کی طرف آسانی کے ساتھ چلے چلو، تم اس زبردست جماعت اور طنابوں سے کسے ہوئے خیمے پر ٹوٹ پڑو۔ اور اس کے اندر بیٹھنے والوں پر تلواریں برساوو۔ اس لئے کہ شیطان اسی اطراف رواق میں چھپا ہوا ہے۔

قد قدّم للوثبة یدًا
واخّر للنکوص رجلا
فصمداً صمداً حتیٰ ینجلی
لکم عمود الحق وانتم
الاعلون والله معکم
ولن یترکم اعمالکم ۔

،، ،، ،، ،،

جو آگے بڑھنے کے لئے پیش دستی کرتا ہے
پھر واپس ہونے کے لئے پیر پیچھے ہٹاتا ہے۔
لڑو لڑو یہاں تک کہ قدرتی نشان
تمہارے لئے آشکارا ہو جائے۔ تم ہی کو
غالب رہو گے۔ خدا کی مدد تمہارے ساتھ
ہے۔ وہ تمہارے اعمال کو کم اور ضائع
نہیں کرے گا۔

(نہج البلاغہ ص۵۷)

ویدوں پر ایک سرسری نظر

وید ہندوؤں کی سب سے قدیم مقدس کتاب کا نام ہے۔ جو چار مجموعوں پر مشتمل ہے۔ (۱) رگ وید (۲) سام وید (۳) یجر وید (۴) اتھر وید۔

رگ وید بہ لحاظ مضامین آریہ نسل کے قبائل کی سب سے قدیم کتاب ہے۔ گو کتابی صورت میں وہ بعد میں آئی ہوگی۔ کیونکہ فن تحریر کی ایجاد رگ وید کے بھجنوں کے منظوم ہونے کے صدیوں بعد ہوئی ہے۔ اس کتاب کی قدامت کا اس سے ثبوت ملتا ہے کہ ہاسک نے ۷۰۰ ق م اس کی ایک شرح لکھی ہے لیکن تاریخ کا تعین نہیں کیا جاسکتا اور جن مورخوں اور سنسکرت دانوں نے جو تاریخیں بتائی ہیں اُن میں سینکڑوں برس کا فرق ہے۔ سب سے زیادہ یہ خیال صحیح معلوم ہوتا ہے کہ رگ وید کا زمانہ ۸۰۰ ق م کے قریب ختم ہوا۔ یہ کتاب دس حصّوں پر منقسم ہے۔ ۲ سے ۷ تک یہ حصّے تو قدیم سمجھے جاتے ہیں لیکن آٹھویں حصے میں ردّ و بدل ہے۔ اس کی زیادہ حیثیت نہیں۔ نواں، دسواں اور پہلا حصّہ، یہ بہت بعد کے ہیں کیونکہ ان تینوں حصّوں اور خصوصاً دسویں حصّے میں فلسفیانہ مضامین ہیں جو اوروں میں نہیں ہیں جن سے اُن کے مؤخر ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ اس لئے کہ فلسفیانہ خیالات بعد میں پیدا ہونے شروع ہوئے۔

رگ وید کا انداز شاعرانہ ہے اس میں ۱۰۲۸ گیت ہیں۔ اس کتاب کا کوئی خاص مصنف نہیں۔ طرز و انداز کے مختلف ہونے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب لاکھوں ذی فہم دماغوں کی صدیوں کی محنت کا نتیجہ ہے۔ رہا یہ امر کہ یہ کتاب کہاں تصنیف ہوئی۔ تو اس کے متعلق کوئی تصریح نہیں۔ البتہ اس کے مطالعہ سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعض حصّے افغانستان، بلوچستان کے علاقے میں لکھے گئے ہیں اور بعض حصّے

بیاس اور سرسوتی کے درمیان۔ کیونکہ ان میں جو موسم کے حالات بیان کیئے گئے ہیں وہ وہیں پائے جاتے ہیں۔ اور بعض حصّوں میں پنجاب کے میدانوں اور دریاؤں کا ذکر ہے جس کی وجہ سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ کچھ حصّے یہاں بھی لکھے گئے ہیں۔ مگر یہ یقینی نہیں۔

رگ وید میں جس مذہب کی تعلیم دی گئی ہے وہ فطرت پرستی سے موسوم کیا جاسکتا ہے۔ مگر وہ ہمارے موجودہ تصوّرات سے مختلف ہے۔ آریہ قوم نے کائنات کی ان تمام قوتوں کو جن سے انسان اور انسانی زندگی کو فیض پہنچتا تھا دیوتا قرار دے کر ان کی پرستش کو مذہبی شعار بنالیا تھا۔ اندر بادلوں پر سوار برق و رعد کا تازیانہ لیئے ہوئے آریوں کا محبوب دیوتا تھا۔ وارُن متر اور اگنی کی پوجا کی جاتی تھی۔ رگ وید کی بھجن ان دیوتاؤں کی تعریف سے لبریز ہیں۔ داسوں کو شکست دینے میں ان کا ہاتھ ہر جگہ نظر آتا ہے۔ رگ وید کے کسی بھجن میں چاردل ورنوں (ذاتوں) کا حوالہ نہیں ملتا۔ اس بنا پر یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ قیام پنجاب میں آریوں کا اجتماعی نظام سخت نہیں ہوا تھا۔ غالباً ذات پات کی تفریق بعد میں عمل میں آئی ہے۔

سام وید

وید کا دوسرا حصّہ سام وید ہے۔ یہ رگ وید کا اختصار ہے۔ اس کے اندر زیادہ تر گیت ہیں جو پجاریوں کے لئے تیار کئے گئے ہیں اور جن کو پجاری قربانی کے مختلف اوقات پر پڑھا کرتے ہیں۔

یجروید

تیسرا حصّہ یجروید ہے۔ یہ حصّہ تاریخی اعتبار سے بہت اہم ہے۔ اس حصّے میں صرف قربانی کے متعلق ہدایتیں پائی جاتی ہیں۔ گویا کہ یہ حصّہ قربانی کے قواعد اور منتروں کا مجموعہ ہے۔ اس میں اور سام وید میں منتر اور منتروں کے ٹکڑے ہیں جو رگ وید سے ماخوذ ہیں اور اس طریقہ پر ان کا سلسلہ رکھا گیا ہے کہ پوجا میں ہر حرکت اور ہر کام کے لئے ایک خاص منتر ہو۔ اور قربانیوں کے لئے بھی جن کی تعداد اس قدر بڑھ گئی تھی کہ متعدد برہمنوں یہاں تک کہ بعض خاص اوقات

میں سترہ برہمنوں کی ضرورت پڑتی تھی۔ یہ برہمن مختلف درجوں کے تھے۔ اور ہر ایک کے فرائض مخصوص اور محدود تھے۔ سام وید کے جملہ منتروں کی تعداد ۱۵۴۹ تھی اور سوائے ۷۰ کے سب رگ وید سے ماخوذ تھے۔ یجروید کے منتر بھی رگ وید سے ماخوذ ہیں۔ مگر منتروں کے درمیان نثر کی عبارتیں بھی ہیں جن میں ان برہمنوں کے لئے ہدایتیں درج ہیں جو اس کتاب کو استعمال کرتے ہیں۔

اتھروید

وید کے چوتھے حصّہ کو اتھروید کہتے ہیں۔ اس حصّے کا اضافہ عرصہ دراز کے بعد ہوا۔ جس کی صحیح تاریخ کے متعلق کوئی قیاس نہیں ہو سکتا۔ یہ اضافہ بہت بعد میں ہوا ہے۔ بلحاظ مضامین اور تخیل ان دونوں ویدوں میں بہت اختلاف ہے۔ اتھروید میں رگ وید کے منتر بہت کم ہیں اور جو ہیں بھی وہ اس کے جدید ترین حصّوں میں سے ہیں۔ بعض بھجنوں میں محاسن شعر و شاعری ضرور ہیں۔ مگر زیادہ تر منتر جھاڑ پھونک سے متعلق ہیں۔ رگ وید کے درخشاں اور خوش طبع دیوتاؤں کے مقابلہ میں جنھیں رشیوں نے مخاطب کیا ہے اس وید میں سیاہ اور ڈراؤنے بھوت ہیں۔ اس وید میں ہر ایک بُری چیز کو خواہ وہ قحط ہو یا بخار یا خود انسان کے بُرے خصائل ہر ایک کو ایک دیوتا بنا دیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ کس طرح اُن کو خوش کیا جائے۔ یا جادو سے اُن کے اثر کو دور کیا جائے۔ یا دوسروں کو اُن کے ذریعے نقصان پہنچایا جائے۔ جس کی وجہ سے پوجا بجائے عبادت کے سحر سے مستبدل ہوئی اور برہمن پجاری سے ساحر بن گئے۔

ویدوں پر اس مختصر تبصرے کے بعد اب ہمیں یہ بتلانا ہے کہ مختلف مذہبی عقائد کے متعلق اُن کی کیا رائے ہے۔ اور اس زمانے میں متبعین کو کس چیز پر چلنے کی تلقین کی گئی۔

وید اور پوجا

ویدوں کے مذہب میں بیرونی اثرات سے متاثر ہونے کے قبل بت پرستی کا وجود

: تھا۔ اس بارے میں ہندوستان کے آریہ اپنے ایرانی بھائیوں سے پیچھے نہ تھے۔ عالم کائنات ان کا معبد تھا اور وہ انسان کے بنائے ہوئے مکانوں میں اپنے دیوتاؤں کو نہیں بٹھاتے تھے۔ اور اپنے شاعرانہ خیالات میں کبھی اپنے دیوتاؤں کو انسانی شکل اور خصائل کے ساتھ بیان کرکے خدا کو انسانی شکل و صورت دے دیتے تھے۔ مگر انھوں نے کبھی بت نہیں بنائے ابتدائی زمانے میں معلوم ہوتا ہے کہ قدرت کی پرستش ہوتی تھی۔ یعنی قدرت کی قوتوں کو بہ حیثیت جداگانہ ہستیوں کے پوجتے تھے۔

مختصر یہ کہ اس عہد میں فطرت پرستی نہایت ہی مؤثر و دلکش شکلوں میں بڑی اعلیٰ و اکمل شان سے نظر آتی ہے۔ یہ آسمان جو ہمارے سروں پر ایک ہیبتناک جلال و جبروت سے جھکا ہوا ہے۔ یہ فرحت خیز و روح پرور ہوا جو کرۂ ارض کو اپنے احاطہ میں لئے ہوئے ہے۔ یہ شعلہ فشاں آگ جو ہمارے مطبخوں میں عجیب کیفیت سے جلتی ہے اور ہم کو گرمی و روشنی دیتی ہے۔ یہ نورانی صبح جو کسی حسین اور شرمیلی دلھن کے مانند ہم کو خواب غفلت سے چونکا کر دنیا کے کام کاج میں مشغول کردیتی ہے۔ یہی وہ سب دیوتا تھے جن پر قدیم زمانے کے ہندو شیدا ہی نہیں تھے بلکہ ان کی پرستش دل سے کرتے تھے۔

وید کے دیوتا

رگ وید کے گیتوں میں مختلف دیوتاؤں کا ذکر آتا ہے۔ معمولی دیوتاؤں کو چھوڑ کر رگوید میں تقریباً ۳۳ دیوتاؤں کا ذکر ہے۔ جن میں اس زمانہ میں ۲۰ دیوتاؤں کی زیادہ عبادت کی جاتی ہے۔ بعض ان میں کے حسب ذیل ہیں:۔

ان میں سب سے پہلا دیوتا دیائوس ہے۔ اس کا مادہ دیو ہے جس کے لغوی معنی درخشاں ہونے کے ہیں۔ ایک گرم یا نیم گرم ملک میں ایک قوم جس میں شاعری ودیعت تھی، آسمان کو سوائے نور درخشاں کے اور کیا کہہ سکتی تھی۔ اور پھر درخشاں کہنا تھا کہ چشم زدن میں آسمان بھی ایک دیوتا ہوگیا۔ اور دیوتا بھی ایسا جس کو تمام آریہ اقوام اپنا دیوتا مانتی تھیں۔ یہ

دیوتا، آسمان کا دیوتا تھا۔ اس کی تعریف میں رگ وید میں متعدد بھجن ہیں۔

حصۂ ہفتم میں جو ایک رشی مسمّی وسشٹھ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے یا کم از کم اس کے خاندان میں محفوظ تھا وارن کی تعریف میں بہت سے بھجن ہیں۔ مختصر بیانیہ فقروں میں اس کو مخاطب کیا گیا ہے جن کو اگر ایک جگہ جمع کیا جائے تو اس دیوتا کی نہ صرف جیتی جاگتی تصویر مع اس کے جملہ جسمانی خصوصیات کے بن جائے گی بلکہ بہت سے مشاہداتِ قدرت سے بھی اس کا تعلق معلوم ہو جائے گا جو آسمان کے متعلق ہیں۔ وارن پہلے تو آسمان تھا۔ پھر آسمان کا دیوتا ہو گیا اور اس طور پر وہ جملہ کرشمہ ہائے قدرت میں جلوہ گر نظر آنے لگا۔ جو آسمان پر نظر آتے ہیں۔ آفتاب اور ماہتاب اس کی آنکھیں ہیں۔ زمین کی سات ندیاں اس کی بہنیں ہیں بارش کا بھیجنے والا بھی وہی ہے۔ وارن کی تعریف کے بھجنوں میں سے چند اقتباسات نقل کئے جاتے ہیں جن سے وید کے اس عظیم الشان دیوتا کی خصوصیات ذہن نشین ہو سکیں گی۔ ایک رشی کا گیت ہے:۔

"ایک بھجن گاؤ جس سے شاہ وارن خوش ہو جائے۔ یہ بھجن اس کی تعریف میں گاؤ جس نے زمین کو اس طرح پھیلایا ہے جیسے قصّاب گھوڑے کے چمڑے کو دھوپ میں پھیلاتا ہے۔ وہی جنگلوں میں ٹھنڈی ہوائیں بھیجتا ہے گھوڑے (آفتاب) کو تیزی دیتا ہے۔ گایوں (بادل) کو دودھ دیتا ہے دماغ میں عقل پیدا کرتا ہے اور پانی میں آگ (بجلی) پیدا کرتا ہے۔"

(رگ وید حصّہ پنجم)

انسان کو جب اپنے معاصی پر پشیمانی ہوتی تھی تو وہ وارن ہی سے ترحّم و عفو کا خواستگار ہوتا تھا۔ رگ وید میں کئی توبہ کے بھجن ہیں جو بہت پُر اثر ہیں۔ جن میں کا ایک یہ ہے:۔

"اے وارن ابھی وہ وقت نہیں آیا ہے کہ میں خانۂ گلی میں داخل ہوں رحم، اے مہابلی رحم، اگر میں اِدھر اُدھر اس بادل کی طرح بھٹکوں جسے ہوا

پریشان کرتی ہے تو مجھ پر رحم کر، اے ذاتِ بے لوث میں نے
راہ راست کو کمزور ہونے کی وجہ سے چھوڑا ہے رحم کر رحم کر، اے وارن
جب ہم آسمانی دیوتاؤں کے دیکھتے ہوئے گناہوں کے مرتکب ہوں اور
تیرے قوانین کی خلاف ورزی کریں تو رحم کو رحم۔"

اِس دیوتا کی زیادہ دِن تک پرستش نہیں ہوئی اور زمانہ مابعد کی افسانیات میں وارُن، پانی کا دیوتا ہو گیا۔ اُس کی تمام آسمانی صفات غائب ہو گئیں اور اُس کی اخلاقی صفات میں سے بھی وہی لوگوں کے دِلوں میں جاگزیں رہیں۔ جو ڈرانے والی تھیں یعنی وہ صرف سزا دینے والا خیال کیا جانے لگا اور اِس رحیم اور انصاف پسند بادشاہ کو بے رحم اور بد طینت خیال کیا جانے لگا۔ جس کے متعلق یہ کہا گیا تھا کہ وہ گناہ گاروں پر بھی رحم کرتا ہے۔

اِس کے بعد اگنی کا ذکر آتا ہے۔ یہ آگ پاک کرنے والی اور انسان کی محافظ اور دوست ہے۔ اِس کے ساتھ ہندی آریاؤں کو بھی وہی محبت ہے جو ایرانیوں کو تھی جو اُس کی آتر کے نام سے پرستش کرتے تھے۔ مختصر یہ کہ یہ آگ کا دیوتا ہے اور اِس کے سوائے کوئی دیوتا اور ایسا نہیں ہے جو انسان کے ساتھ اُس کا مہمان اور دوامی رفیق بن کر رہے۔ اور روزمرّہ کے گھر کے کاموں میں اُس کی مدد کرے۔

اِن دیوتاؤں کے بعد پرتھوی کا جو زمین کی دیوی ہے ذکر آتا ہے۔ اس کی شان میں اچھّے اچھّے گیت ہیں۔ پھر اندر کا جو کڑک اور بجلی کا دیوتا سمجھا جاتا ہے ذکر آنے لگا۔ سورج کے مختلف اوصاف کو مختلف دیوتاؤں کی صورت دی گئی۔ مثلاً قوّت، حیات، سوریا سوِتری کی شکل دی گئی۔ پھلوں کو پکانے اور زرخیزی کی قوّت کو پوشن کی صورت دی گئی۔ اُس کی تیز رفتاری کو وشنو کی شکل دی گئی جو آجکل بھی بڑا دیوتا مانا جاتا ہے۔ اِن کے علاوہ شیو بھی اُس وقت بڑا دیوتا مشہور کیا جاتا تھا۔ اُس وقت اِس کا نام رگ وید میں رُدر تھا۔ یہ طوفان کا دیوتا تھا۔ اِس کے بعد طلوعِ آفتاب کی دیوی اوشس کا بہت ذکر آتا ہے۔ اِس کو انسانی صورت

دی جاتی تھی۔ چنانچہ سورج کو انسان اور وارُن اور اندر کو بیل کی شکل دی جاتی ہے۔ رگ وید کے دیوتاؤں میں سب سے بڑی خوبی قوت وجبروت ہے۔ کوئی اخلاقی قوت نہیں، غرض وید کے بھی وہی دیوتا اور دیویاں تھیں جن کو ہمارے اسلاف اور بڑے بوڑھے تین چار ہزار برس ہوئے انڈس کے کنارے پر پوجا کرتے تھے۔ قدرت کے دیوتاؤں کا تصور اور وہ بے ریا اور جوانمردانہ سرگرمی جس سے وہ پوجے جاتے تھے ایک جری اور فاتح قوم کی قوت و بے لوثی کو ثابت کرتا اور ایک گروہ کی ترقی کو جس نے ابھی چند روز گذرے کہ تہذیب میں معقول حد تک پیش قدمی کی تھی، منکشف کرتا ہے۔

وید اور وحدانیت

ویدوں میں وحدانیت کی تعلیم اور اُس عہد کے آریوں میں وحدانیت کا احساس تھا یا نہیں۔ یہ ایک مختلف فیہ مسئلہ ہے۔ جہاں تک ویدوں کا تعلق ہے اُن کے مطالعے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اِن ویدوں میں بہت سے دیوتاؤں کا ذکر ہے جس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ متعدد دیوتاؤں کے وجود کی تعلیم موجود ہے۔ متوفی آبا و اجداد کی پرستش کا بھی ذکر ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان پرستی بھی اُس کے خصائص میں سے ہے۔ ابتدائی زمانے سے یہ خیال بھی رائج تھا کہ خدا عالم کے ہر ذرّے میں موجود ہے۔ جیسے اِس اشلوک سے ظاہر ہوتا ہے

"وہ خدا سمندر جس کی راہیں ہیں وہی پانی کے اِس زمانے میں بھی موجود ہے۔"

اِن خیالات سے معلوم ہوتا ہے کہ مسئلہ ہمہ اوست (وحدتِ وجود) کی طرف زمانۂ قدیم سے رجحان تھا۔ اِس کے علاوہ بہت سے ایسے اشلوک ملتے ہیں جن کا مفہوم یہ ہے کہ مختلف دیوتا صرف اُس ذاتِ واحد کے مختلف نام ہیں، چنانچہ اُس عہد کے آریوں کے جو اعتقادات تھے وہ وحدانیت سے بہت قریب تھے اور اُن کے جانشین یعنی برہمن بھی جن کی قوتِ متخیلہ حد درجہ تیز تھی اس کے قریب قریب پہنچے مگر حقیقت کو معلوم کرنے میں

ناکامیاب رہے، وید کے قدیم شعرا بھی وحدانیت کے قریب پہنچ گئے تھے۔ کیونکہ جب وہ وارُن کی عبادت کرتے تھے جو گناہوں کی سزا دینے والا اور معاف کرنے والا ہے تو لوگوں سے کہتے تھے "ڈرو اُس سے جس کے ہاتھ میں چاروں پانسے ہیں قبل اِس کے کہ وہ اُنھیں پھینکے، اُس شخص کا راستہ سیدھا اور بے خار ہے جو نیک کام کرتا ہے۔" مگر نشانہ ذرا خطا کر گیا اور رسوم نے ارتقاءِ رُوحانی کا خاتمہ کر دیا۔ اِس عہد کا ایک شاعر ہستی یکتا کی عظمت کی مدح سرائی کرتا ہے مگر جب وہ تناقض کو دیکھتا ہے تو پوچھتا ہے کہ کِس دیوتا کے لئے ہم قربانی کریں یعنی اِن دیوتاؤں میں جن کو ہم اپنے دیوتاؤں میں مخاطب کرتے ہیں یہ ہستی یکتا کون ہے جس کے لئے آج ہم قربانی کرتے ہیں، وہ بھجن یہ ہیں :-

۱- ابتداء میں سنہرا بچہّ وجود میں آیا، وہ تمام موجودات کا واحد پیدا شدہ مالک تھا، اُس نے زمین اور اِس آسمان کو قائم کیا وہ دیوتا کون ہے جس کے لئے ہم قربانی کریں گے۔"

۲- "وہ سانس (حیات) دیتا ہے وہ طاقت دیتا ہے، اُسی کے حکم کی تمام دیوتا عظمت کرتے ہیں۔ اس کا پرتوِ حیات ازلی ہے۔ اُس کا سایہ موت۔ وہ دیوتا کون الخ "

۳- "وہ جس کے سبب سے آسمان درخشاں ہے اور زمین مضبوطی سے جمی ہوئی ہے اور وہ جس کے سبب سے آسمان بلکہ اعلیٰ ترین آسمان بھی قائم ہوا وہ جس نے ہوائی فضا کو ناپا وہ دیوتا کون الخ "

مندرجہ بالا نظم سے یہ اندازہ تو ہو جاتا ہے کہ اس زمانہ میں وحدانیت کا احساس ضرور ہو گیا تھا۔ مگر افسوس کہ وہ اپنے اس احساس میں ناکامیاب رہے اور وحدانیت کے پوری طور پر قائل نہ ہونے پائے۔

وید اور موت اور دیگر رسومات

کسی قوم یا قبیلے کے متعلق سب سے پہلے جو چیز ہم کو جاننا چاہیئے وہ یہ ہے کہ موت کے متعلق اُن کے کیا معتقدات ہیں اور مُردے کی لاش کے ساتھ وہ کیا سلوک کرتے ہیں اور کن رسوم کے ساتھ وہ لاش کو دفن کرتے ہیں۔

رگ وید کے دسویں حصہ میں بہت سے ایسے بھجن ہیں جن کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب کے آریہ ہندو اور اُن کے اسلاف گو زندگی سے محبت رکھتے تھے اور آرزو رکھتے تھے کہ اُن کی اور اُن کی اولاد کی حیات صد سالہ ہو مگر موت سے وہ ڈرتے نہ تھے اور گو وہ مُردوں کا احترام کرتے تھے اور اُنھیں محبت سے یاد کرتے تھے مگر یاس و نا امیدی کے ساتھ اُن کا ماتم نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ اُن کا عقیدہ تھا کہ مرنے والا اپنے آبا و اجداد اور بزرگانِ قوم کے ساتھ خوشی و خرمی سے زندگی بسر کرتا ہے اور اپنی اولاد کے آنے کا منتظر رہتا ہے۔

رگ وید کے دسویں حصے کے مختلف بھجنوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابتداءً لاش کو دفن کرنے کا رواج تھا۔ سب سے پہلے وہ لاش کو کسی متبرک مقام پر رکھتے تھے، متوفی کی کمان اُس کے ہاتھ میں ہوتی۔ اُس کی بیوی اُس کے سر کے قریب بیٹھی ہوتی۔ اور اعزا و اقربا ایک وسیع حلقے میں کھڑے ہوتے تھے، پجاری لاش سے کچھ دور اِس حلقے میں ایک پتھر رکھ دیتا۔ یہ پتھر حدِ فاصل تھا جس کے اِس طرف زندہ لوگ نہیں جا سکتے تھے اور عورت سے بھی یہ التجا کی جاتی تھی کہ اس کے آگے نہ آئے۔ اِس کے بعد پجاری مُردے اور ماتم کرنے والوں سے کچھ کہتا، پھر متوفی کا بھائی یا کوئی اور قریبی رشتہ دار بیوہ کا ہاتھ پکڑ کر کہتا۔

"اٹھ اے عورت اور عالمِ حیات کو دیکھ، جس کے پاس تو بیٹھی ہے اور جس نے تیرا ہاتھ ایک دن اپنے ہاتھ میں لے کر تجھ سے بیاہ کیا تھا وہ

مرچکا ہے اور اب تیرا نکاح ٹوٹ چکا۔"

پھر یہی شخص، بے جان ہاتھوں سے کمان لے کر کہتا ہے:۔

"مُردے کے ہاتھ سے میں نے کمان لے لی ہے تاکہ اِس سے ہمیں مدد ملے اور ہمیں قوت وشہرت حاصل ہو، تم یہیں ٹھہرے رہو۔ ہم بہادر لوگ جنگ میں دشمن کو زیر کریں گے۔"

اِس کے بعد تدفین شروع ہوتی ہے۔ یعنی لاش زمین میں رکھ دی جاتی ہے اور اس پہ مٹی ڈھیر کر کے ایک تودہ بنا دیا جاتا ہے جسے موت کا مسکن کہتے تھے۔

مُردوں کو صبر واستقلال کے ساتھ بغیر کسی بیہودہ گریہ وزاری کے رخصت کرنے کی یہ رسم نہایت قدیم تھی۔ مُردوں کو جلانے کی رسم جب جاری ہوئی تو اُس کے ساتھ دوسری رسوم کو بھی بدلنے اور دوسری عبارتوں کی تلاش کی ضرورت ہوئی جو سب دسویں حصّے میں موجود ہیں۔ گیر ہیا ستر (تمدّنی قوانین) میں زمانہ ما بعد کی رسوم کو حسب ذیل طریقے پہ بتایا گیا ہے اور یہ رسوم کم از کم اُن میں اُس وقت تک جاری تھیں جب وہ گنگا اور جمنا کے کناروں پہ پہنچے جہاں ویدک تمدّن کے بعد برہمنوں کے تمدّن کا آغاز ہوتا ہے،

مکانات سے دور چند خاص ہدایات کے بموجب ایک منتخب مقام پہ تمام اعزہ جمع ہوتے ہیں۔ بارہ سنگھے کی کھال چتا پہ بچھائی جاتی ہے جس پہ قربانی کی گھاس بچھا دی جاتی ہے۔ اور کھال کے اوپر لاش رکھی جاتی ہے اور بیوہ اُس کے سرہانے بیٹھتی ہے اور قربانی کی ضروری اشیاء، متوفی کے جسم پہ ایک خاص ترتیب سے رکھی جاتی ہیں اور مختلف طویل رسموں کے ادا کرنے کے بعد جلانے کی رسم ادا کی جاتی ہے۔ جسم کے خاکستر ہونے سے کچھ قبل، پجاری کچھ پڑھتا ہے اور لوگ اِس مقام سے چلے جاتے ہیں۔ راستے میں وہ صاف پانی میں نہاتے ہیں اور صاف کپڑے پہن کر شام تک وہیں رہتے ہیں۔ دس روز کے بعد متوفی کی جمع کی ہوئی ہڈیوں پر مٹی ڈالی جاتی ہے اور سنگ لوح رکھ دی جاتی ہے۔

حیاتِ مُستقبل

ویدک عہد کی آریہ قوم کو حیاتِ مستقبل پر پورا اعتقاد تھا، موت کو وہ خَتم کرنے والا کہتے تھے. مگر اِس سے مُراد صِرف دُنیاوی زندگی کے خَتم کرنے والے سے تھی۔ اُن کا عقیدہ تھا کہ انسان میں ایک جزو ہے جو نہ پیدا ہوتا ہے نہ مَرتا ہے اور جسمِ خاکی سے الگ ہوکر اپنے اصل مسکن کو چلا جاتا ہے اور ان دوستوں کے ساتھ مِل کر جو پہلے وہاں چلے گئے ہیں حیاتِ ابدی حاصل کر کے شادمانی کی زندگی بسر کرتا ہے. مگر اَب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ زندگی کیسی تھی. وہاں لوگوں کے کیا مشاغل رہتے تھے. تو اِس کا جواب صرف مبہم تخیلات میں ملتا ہے. جیسے اِس گیت میں :-

"یعنی بابرکت مُردے، دونوں بادشاہوں وارُن اور یاما کی عظمت کا ذکر کرتے ہیں. اور خوبصورت پتّے والے درختوں کے نیچے بیٹھے ہوئے مزے مزے کے کھانے کھاتے ہیں. اور سوما پیتے ہیں."

خدا ترس لوگوں کا تو یہ صلہ تھا کہ وہ نہایت آرام و آسائش کی زندگی بسر کرتے ہیں اور مرنے کے بعد مزے اُڑاتے ہیں. اَب سوال یہ ہے کہ دوسرے گنہگاروں کا کیا حشر ہوتا ہے اور اِن کے متعلق اُن کا کیا عقیدہ تھا؟ چونکہ گنہگاروں کے حشر کے متعلق آریوں کے خیالات حد درجہ مبہم ہیں اِس لئے اُس کا جواب دینا دشوار ہے، آریوں کی ہر چیز میں دوئی تھی. اِس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر نیک لوگ نورِ ازلی میں رہتے تھے تو بدکاروں کی جگہ دوامی تاریکی میں تھی. اور اِس کی تائید اِس سے بھی ہوتی ہے کہ وارُن کو سزا دینے والا دیوتا بتایا گیا ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ یہ دیوتا گنہگاروں کو غار میں ڈال دیتا ہے، مختصر یہ کہ خواہ خدا ترس انسان ہوں یا گنہگار، اُن کے لئے ویدک عہد میں حیات بعد الممات ہے.

وید اور ذات پات

ذاتوں کی تقسیم کا زمانہ رگوید کے بعد کا زمانہ ہے. رگ وید کے عہد میں ذاتوں کی تقسیم بالکل نہیں تھی۔ اور منتروں کے ایک ایسے ضخیم مجموعے (رگ وید) میں جس کی تصنیف و تالیف میں ایک مدت صرف ہوئی ہو اور جمہور کی عادات و روش اور دستور و رواج سے بھرا ہوا ہو ہمیں کوئی ایک فقرہ بھی ایسا دکھائی نہیں دیتا کہ اس عہد کے لوگ موروثی ذاتوں میں علیحدہ علیحدہ ہو گئے تھے۔ اور رگ وید کی دس ہزار چاؤں میں برادری کے ذاتی اصول کی نسبت جھوٹ کو بھی ایسا کوئی اشارہ نہیں ملتا جس سے تقسیم ذات کا پتہ چلے. اگر اس کا وجود ہوتا تو رگ وید میں اس کا کسی نہ کسی طرح پر اظہار ضرور ہوتا جس میں اس زمانے کے تمدن کا پورا عکس موجود ہے صرف ایک متاخر حصہ دہم میں جسے پرش کا بھجن کہتے ہیں اس کا ذکر ہے. مگر یہ بھجن نہایت مبہم اور اس کا مضمون نہایت غیر واضح ہے. البتہ یہ ضرور تھا کسی نے پوجا، کسی نے جنگ جدال، کسی نے تجارت وغیرہ اور کسی نے خدمت گذاری ہی کو اپنا پیشہ بنالیا تھا اور غالباً اسی وجہ سے بعد میں اسی صورت کو تقسیم ذات کی صورت دے دی گئی۔ اور غالباً یہ وہ وقت تھا جب شام وید، یجر وید اور اتھر وید اور دیگر مقدس کتابیں مرتب کی گئیں. چنانچہ سب سے پہلے منو کے دھرم شاستر میں ان چاروں ذاتوں کے فرائض اور باہمی تعلقات کو حسب ذیل طریقہ پر بیان کیا گیا ہے:۔

۱۔ برہمنوں کے اس (برہما) نے یہ فرائض قرار دیئے ہیں" ویدوں کا پڑھنا اور پڑھانا، اپنوں اور دوسروں کے لئے قربانی کرنا، خیرات لینا اور دینا۔"

۲۔ چھتریوں کو اس نے حکم دیا ہے کہ لوگوں کی حفاظت کریں، انعام و اکرام دیں قربانی کریں، وید پڑھیں۔ شہوت پرستی سے پرہیز کریں۔

۳۔ ویش ذات کا کام یہ ہے مویشی کی پرداخت کرنا، انعام دینا. قربانی کرنا، وید پڑھنا، تجارت کرنا، قرض دینا اور کاشت کرنا.

۴۔ شودروں کے لئے برہمہ نے صرف ایک فریضہ مقرر کیا ہے یعنی دوسری تینوں ذاتوں کی بلاچون وچرا خدمت گذاری کرنا۔

ویدوں کی اخلاقی تعلیم

ویدوں کے بعض منتروں کے شاندار تناسب اور ٹھیک انیسوں صدی کے سے خیالات نے بڑے بڑے (میکس مولر، گریفتھ) مستشرقین کو مبہوت کر دیا ہے جیسے جیسے ویدک تحقیقات میں ترقی ہوگی اور مطلب فہمی کے بہتر طریقے وجود میں آئیں گے، ویدوں کی عظیم الشان روحانی معنویت اور اُن کے اخلاقی مباحث کی بے نظیر کثرت ضرور آشکارا ہوکر رہے گی۔ خود اِن اصحاب کو بھی جو اِس خیال کے مؤید ہیں کہ تدریجی ترقی کا نظریہ دنیائے اخلاق پر حاوی ہے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ویدوں کی تعلیم فی الحقیقت عظیم الشان اور ملہمانہ ہے۔ یہ مقدس کتابیں، صفائے قلب اور قول وفعل میں صداقت اور شرافت پیدا کرنے والے خیالات پر مشتمل ہیں۔ ویدوں میں خدا کو صداقت، انصاف وکرم اور رحم، اِن جملہ صفات کا مخزن خیال کیا گیا ہے اور انسان کا یہ فرض قرار دیا گیا ہے کہ وہ اپنی دعاؤں میں بار بار اِن امور کا خیال رکھے۔ اور پھر اپنے اعمال کو ان کے مطابق بنائے۔ یہاں ہم صرف چند اشلوک درج کرتے ہیں، جن سے ویدوں کی اخلاقی تعلیم کا بخوبی اندازہ ہو سکے گا۔

۱۔ تمام اشیاء مجھے دوست خیال کریں۔ میں بھی تمام اشیاء کو دوست سمجھوں۔ یجروید

۲۔ آؤ ہم سب ایک دوسرے کی حفاظت کریں۔ سب مل کر کھائیں پئیں۔ مل جل کر بہادرانہ کام کریں۔ اور ایک دوسرے سے نفرت نہ کریں۔

۳۔ خواہ میں زمین پر رہوں یا آسمان پر۔ خدا کرے صداقت کا فرشتہ ہمیشہ ہمارا نگہبان ہو۔

۴۔ اے قادرِ مطلق تمام امراض اور ناپاک خیالات کو نکال۔ دشمنی کے تمام

رگ وید — خیالات کو ہم سے دور رکھ۔

اتھروید — ۵۔ میں ہر بشر سے محبت کروں خواہ وہ رذیل ہو یا شریف۔

۶۔ ایکدوسرے سے ایسے جوش محبت سے پیش آؤ جیسے ایک گائے اپنے بچھڑے سے۔

"
۷۔ اے بیٹی! اپنے والدین کی مطیع ہو۔ اپنے خاوند سے ہمیشہ لطف آمیز کلمات میں کلام کر۔

"
۸۔ بھائی اپنے بھائی سے نفرت نہ کرے۔ بہن، بہن پر نامہربان نہ ہو۔ نیک نیتی کے ساتھ ایک دوسرے سے گفتگو ہو۔

۹۔ پہلے مہمان کو دے تو۔ اس کی مہمان نوازی کرلو توخود کھاؤ۔

۱۰۔ طمانچے کا جواب طمانچے سے نہ دو، سراپ کے بدلے سراپ نہ دو، بلکہ طمانچوں اور بد دعاؤں کے بدلے دعاؤں کی بوچھار کردو۔ — رگ وید

۱۱۔ روشن اجسام میں امن ہو، بحر، خشکی، تری، دنیائے نباتات وحیوانات میں امن ہو، ہر جگہ شانتی ہی شانتی ہو، ہر جگہ سکون ہی سکون ہو!

یہ ہیں ویدوں کے وہ چند اشلوک جو ہمارے سامنے علم الاخلاق کے اعلےٰ اصول پیش کرتے ہیں۔ نسل انسانی کی تاریخ کے ایک نہایت قدیم باب کے اقتباسات میں اس قسم کے اصولوں کو دیکھ کر کہ جو تم کو بد دعا دے اس کو دعا دو، سب سے محبت کرو، ماں باپ کا کہنا مانو، بھائی بہن کی عزت کرو، ایماندار اور راستباز ہو۔ پہلے مہمانوں کو کھلاؤ پھر خود کھاؤ، دنیا میں امن وسکون کے متلاشی ہو، پروفیسر میکس مولر اور گرفتھ جیسے مشاہیر علماء بھی ویدوں کی بلند پایہ معنویت کے مقر ہیں۔

سچّائی کی جھلکی

اشخاص

طاہر	تیس سالہ خوبصورت نوجوان۔ مغربی تہذیب کا دلدادہ
زہرہ	طاہر کی نہایت حسین فیشن ایبل پچیس سالہ بیوی۔
نسیم	طاہر کا ستائیس سالہ نوجوان بھتیجا۔ اسی کے قدم بقدم
کلّو	مضبوط کاٹھی کا ساٹھ سالہ باورچی۔
نرگس	نوجوان طرحدار خادمہ۔

منظر

طاہر کے مکان کا ایک حصّہ

کمرہ نہایت ہی نفاست اور سلیقے کے ساتھ مغربی طرز پر آراستہ کیا گیا ہے۔ دو دروازے ہیں۔ اُن کے بیچ میں آتشدان ہے۔ آتشدان پہ طاقچہ۔ مقابل میں ایک بڑی کھڑکی۔

جب پردہ اُٹھتا ہے تو مسٹر طاہر آتشدان کے پاس کھڑے نظر آتے ہیں۔ کلّو میز کے پاس کھڑا ہے۔ میز پہ خالی برتن چُنے ہوئے ہیں۔

کلّو۔ سرکار وہ چاندی جو چوری ہوگئی تھی میرے خیال میں کسی ملازم ....

طاہر۔ (غمگین لہجہ میں) اُنھ! جانے بھی دو کلّو۔

کلّو —— نہیں سرکار ....

طاہر —— (بات کاٹ کر اسی لہجہ میں) تم ابا جان کے پاس بھی رہے ہو نہ ؟

کلّو —— جی ہاں سرکار۔

طاہر —— اور دادا جان کے پاس بھی ؟

کلّو —— جی حضور۔

طاہر —— اور میرے ....

کلّو —— (جلدی سے) جی نہیں سرکار۔

طاہر —— کلّو! میں نے تم کو ہمیشہ خیرخواہ پایا۔ آج کل میں ذرا پریشان ہوں۔

کلّو —— (ہمدردانہ لہجہ میں) کیا بات ہے حضور!

طاہر —— کلّو آجکل ایک عجیب قسم کا درد میرے ہوتا ہے۔"

کلّو —— کہاں حضور ؟

طاہر —— (ٹھنڈی سانس لے کر) آہ! نہ پوچھو!

کلّو —— نہیں سرکار کچھ تو فرمائیے۔

طاہر —— کیا بتائیں کلّو۔ تمھاری بیگم صاحبہ کی وجہ سے ناک میں دَم ہے۔ اچھا یہ تو بتاؤ تمھاری بیگم صاحبہ تمام دن کہاں غائب رہتی ہیں؟ کبھی میرے ساتھ کھانا نہیں کھاتی ہیں۔

کلّو —— غریب پرور مجھے کیا معلوم۔ میں تو اپنے دھندوں میں لگا رہتا ہوں۔

طاہر —— مجھے خوب معلوم ہے۔ (جیب سے ایک بیہ نکالتے ہوئے) اچھا اب میں ان تمام باتوں کا آج ہی تصفیہ کئے دیتا ہوں۔ یہ ایک چینی دوا ہے۔ اس کا نام "سچائی کی پھنکی" ہے۔ میرے ایک دوست نے پیکن سے بھیجی ہے۔ اس کی خاصیت یہ ہے کہ جو کوئی اس کی ایک خوراک استعمال کرلے تو وہ مجبور ہو جاتا ہے کہ

ایک گھنٹے تک سچ بولے۔

کلو —— تو حضور یہ تو اچھی دوا نہیں ہے۔

طاہر —— چاہے کچھ ہو میں اس کو آزماؤں گا ضرور۔

کلو —— مگر حضور مجھ پر نہیں۔

طاہر —— نہیں۔ میں اس کی ایک خوراک تمہاری بیگم صاحبہ کو دوں گا۔ (ڈبیہ میں کی ہدایات کے پرچہ کو نکال کر دیکھتے ہوئے) یہ دوا شربت کے ایک گلاس میں دینی چاہئے۔ تو اس کے ذائقہ کا احساس نہ ہوگا۔ اب ہم کو سب باتیں معلوم ہو جائیں گی۔ اچھا ذرا شربت انار کی بوتل تو دو (بوتل میں سے تھوڑا سا شربت لے کر اس میں دوا ڈال کر پھر بوتل میں ڈال دیتا ہے) مگر ہاں دیکھو کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔

کلو —— کہیں ایسا ہو سکتا ہے حضور۔

زہرہ کی آواز سنائی دیتی ہے

طاہر —— کون زہرہ ؟

کلو —— جی ہاں سرکار۔ بیگم صاحبہ ہی ہیں۔

کلو جاکر دروازہ کھولتا ہے۔ زہرہ داخل ہوتی ہے

زہرہ —— معاف کرنا طاہر بہت دیر ہو گئی۔ مگر میں مجبور تھی۔ تمہاری ضرورت کی تمام چیزیں دکان کی اوپری منزل پر تھیں۔ میں لفٹ کے ذریعہ اوپر گئی تو بیچ میں یکایک لفٹ رک گیا۔ مجھے بہت زور کا جھٹکا لگا اور لفٹ مین کو بھی بہت زور کی ٹکر ہوئی۔

طاہر —— ارے! زہرہ تم ....

زہرہ —— اب آپ لکچر بازی فرمائیں گے۔

طاہر —— نہیں فی الحال تو ارادہ نہیں ہے۔ ہاں یہ کہنا چاہتا تھا کہ ذرا سا شربت پی لو۔
تمہارے چہرہ پر زردی چھائی ہوئی ہے۔ تکان وغیرہ سب رفع ہو جائے گی
زہرہ —— نہیں اب تو تکان نہیں ہے (دستی بیگ میں سے آئینہ نکال کر دیکھتی ہوئی)
اور نہ میرا چہرہ زرد ہے۔
طاہر —— نہیں! نہیں! ہے۔ کیسے نہیں۔ دیکھو شربت پی لو۔ تکان رفع ہو جائے گی۔
زہرہ —— لیکن جی نہیں چاہتا۔
طاہر —— نہیں نہیں زہرہ ادھر آؤ۔ کم از کم میرے اصرار ہی سے سہی (شربت سے
گلاس بھر کر اور کلّو کی طرف دیکھ کر جو تمام باتیں بہت غور سے دیکھ رہا تھا) کلّو!
کلّو —— حضور۔
طاہر —— تم جاؤ۔

کلّو سلام کر کے چلا جاتا ہے

زہرہ —— مجھے تمہارے اس کھوسٹ باورچی پر ذرا بھی بھروسا نہیں ہے۔ تم نے
اُس سے پوچھا نہیں۔ شاید اُس کو معلوم ہو کہ چاندی کیا ہوئی۔
طاہر —— کیسی احمق ہو۔ جس نے لی ہوگی کیا وہ بتا بھی دے گا؟ ادھر آؤ یہ پی لو۔
زہرہ —— خیر اگر تم اصرار کرتے ہو تو پئے لیتی ہوں (گلاس لیتی ہے ویسے ہی کلّو داخل
ہوتا ہے)
کلّو —— حضور ٹیلیفون آیا ہے۔
طاہر —— (زہرہ سے) ابھی ایک منٹ میں آتا ہوں۔

جاتا ہے۔ جیب سے دستی نکالتے ہوئے ترکیب استعمال
دوا کا پرچہ گرا دیتا ہے۔ کلّو بھی ساتھ چلا جاتا ہے۔ زہرہ
پرچہ اُٹھاتی ہے۔ پڑھتی ہے اور کچھ سوچنے لگتی ہے،

زہرہ ــــ (خود ہی) "سچائی کی پھنکی" ہوں! یہی وجہ تھی کہ وہ مجھ سے اِس کے پینے پر اصرار کر رہے تھے۔ (شربت کے گلاس کی طرف دیکھتی ہے) اُفوہ! کس قدر ذلیل حرکت ہے۔ بدگمانی کی بھی انتہا ہوگئی۔ اچھا اب میں ابھی حضرت کو سبق دوں گی۔ (کاغذ کو اپنے کپڑوں میں چھپا لیتی ہے) اب مجھے کیا کرنا چاہئے؟ اچھا کہیں سے فرضی خطوط ملنے چاہئیں۔ خوب۔ یاد آیا (طاقچہ تک جاتی ہے) یہ بِل خطوط کا کام اچھی طرح دے سکیں گے۔ ان کو اچھی طرح خوبصورت فیتہ میں باندھنا چاہئے (بیگ سے فیتہ نکالتی ہے اور بِلوں کو باندھتی ہے پھر شربت کے گلاس کی طرف دیکھتی ہے) لاؤ اِسے پھینک بھی دوں۔ نہیں نہ کسی کو پلانا چاہئے۔ اچھا تو پہلے اِس بوڑھے کھوسٹ ہی کو کیوں نہ پلاؤں۔

گھنٹی بجاتی ہے۔ کلو داخل ہوتا ہے

کلو ــــ کیا حکم ہے حضور؟

زہرہ ــــ یہ لو شربت بچ گیا ہے۔ ابھی پی لو۔

کلو ــــ مگر غریب پرور مجھے شربت سے نزلہ ہو جاتا ہے۔

زہرہ ــــ نہیں تم کو پینا پڑے گا۔

کلو ــــ لیکن............حضور............

زہرہ ــــ لیکن ویکن کچھ نہیں............ اچھا بیٹھ جاؤ

کلو بیٹھ جاتا ہے

زہرہ ــــ اپنا منہ کھولو۔

کلو ــــ لیکن غریب پرور میں............

زہرہ ــــ (بگڑ کر) تم منہ کھولو (یہ کہہ کر اُس کی ناک پکڑ کر اُس کے منہ میں تھوڑا سا شربت ڈال دیتی ہے) ہاں اب تم جاؤ۔

کلو جاتا ہے۔ لیکن جاتے ہوئے زہرہ پہ گھونسا تانتا ہے جس کو وہ نہیں دیکھتی ہے اور اپنا منہ آستین سے رگڑتا ہے اور چلا جاتا ہے۔

زہرہ —— (خود ہی) اچھا اب میں اپنے کمرے میں چلی جاؤں اور ذرا سا پوڈر لگا لوں تاکہ چہرہ زرد نظر آنے لگے۔

ہنستی ہوئی چلی جاتی ہے۔ نرگس خادمہ داخل ہوتی ہے

نرگس —— معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ابھی بیگم صاحبہ آئی تھیں (چاروں طرف دیکھتی ہے) کلو کی طرف سے لاپروا ہوکر شربت کی بوتل اسی طرح چھوڑ گئی ہیں۔ اب اگر ملازم نہ پئیں تو بے وقوف ہیں۔

تھوڑا سا شربت لے کر پیتی ہے۔ اتنے میں طاہر داخل ہوتا ہے۔ نرگس جلدی ہی بوتل میز پہ رکھ کر چلی جاتی ہے۔ دوسرے دروازے سے زہرہ داخل ہوتی ہے۔

طاہر —— پیاری تم پھر زرد نظر آ رہی ہو۔ کیا تم نے شربت نہیں پیا۔

زہرہ —— (خالی گلاس دیکھ کر) دیکھو نہ اب ختم ہو گیا ہے

نسیم داخل ہوتا ہے۔

نسیم —— چچی جان تسلیم۔ آداب عرض ہے چچی جان

زہرہ —— اہا نسیم! کہو اچھے رہے تمہارے چچا جان آج صبح کہتے تھے کہ کل وہ تم کو سیر کرانے لے گئے تھے۔

طاہر اثبات میں کہنے کا اشارہ کرتا ہے۔

نسیم —— جی........ جی ہاں........ ہاں کل ہی تو۔

طاہر —— کیوں نسیم کل شام کو کلب میں کتنی دلچسپی رہی ؟

زہرہ —— خوب (نسیم سے) کیا تم کو شربت دوں ؟

نسیم —— ضرور........ شکریہ

طاہر —— (پریشان ہوکر) اگر میں تمھاری جگہ ہوتا تو کبھی نہ پیتا۔

زہرہ —— کیوں طاہر کس وجہ سے آخر؟

طاہر —— کچھ نہیں۔ یوں ہی ......

زہرہ —— لیکن ابھی تو تم ہی تعریف کر رہے تھے۔

طاہر —— ہاں لیکن ....

زہرہ —— (گلاس نسیم کو دیتے ہوئے) نسیم یہ لو۔

نسیم —— شکریہ چچی جان (گلاس لے کر پی لیتا ہے)

طاہر —— نسیم تم نے بہت جلدی کی (نسیم کو ٹالنے کی غرض سے) دیکھو نسیم تم ذرا لائبریری میں ٹھہرو میں ابھی آتا ہوں۔

زہرہ —— اس میں جلدی کی کیا بات تھی؟ میرا ارادہ تھا کہ میں کل شام کی دلچسپی کے بارے میں کچھ پوچھتی۔

طاہر —— نہیں پیاری اب اس وقت نہیں

زہرہ —— (طاہر کی بات کا خیال نہ کرتے ہوئے) کہو نسیم تمہارے چچا جان نے کل تم کو کہاں کہاں پھرایا۔

طاہر نسیم کو اشارہ کرتا ہے

نسیم —— (طاہر سے) چچا جان میں مجبور ہوں مجھے سچ سچ کہنا پڑے گا۔

طاہر —— (الگ) لعنت ہے ایسی دَوا پر۔

نسیم —— (زہرہ سے) چچا جان نے مجھ سے یہ کہا تھا کہ میں آپ سے یہ کہوں کہ میں اُن کے ساتھ تفریح کو گیا تھا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ ایک نوجوان لڑکی کے ....

طاہر —— (غصّہ میں) نسیم تم کو غلط واقعات بیان کرنے کی جُرأت کیسے ہوئی۔ فوراً

کمرے سے نکل جاؤ۔

نسیم —— چچا جان میں معافی چاہتا ہوں۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ آپ نے ایسا کیا ہے۔ بلکہ آپ نے مجھ سے یہ بھی کہا تھا کہ بھئی وہ لڑکی ہے ذرا بی ڈھب......

طاہر غصہ میں آ کر نسیم کا ہاتھ پکڑ کر دروازے کے باہر کر دیتا ہے

زہرہ —— یہ کیا قصہ ہے؟

طاہر —— میری خود سمجھ میں نہیں آتا معلوم ہوتا ہے شربت کی تیزی کا اثر دماغ پہ ہو گیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم اس کی باتوں کا کوئی اثر نہ لوگی۔

زہرہ —— یقیناً نہیں۔

ایسا ظاہر کرتی ہے گویا دوا نے اس پہ اپنا اثر کیا

زہرہ —— پیارے طاہر

طاہر —— کہو پیاری

زہرہ —— میری عجیب کیفیت ہو رہی ہے

طاہر —— (الگ) ہوں! دوا نے اثر کیا

زہرہ —— مجھے ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ گویا مجھے تمام باتوں کا اقرار کرنا پڑے گا۔

طاہر —— (انجان بن کر) کیا مطلب؟

زہرہ —— (رازدارانہ طور پہ آہستہ سے) پیارے طاہر اپنے پچھلے گناہوں کا اقرار۔

طاہر —— کیا؟

زہرہ —— میں نے تم سے ابھی کہا تھا کہ مجھے لفٹ میں جھٹکا لگا ....

طاہر —— تو پھر؟

زہرہ —— اور لفٹ مین سے ٹکر بھی ہوئی ....

طاہر —— ہاں ہاں تو پھر؟

زہرہ —— تو سب غلط تھا۔ لفٹ وغیرہ کا کوئی قصہ پیش نہیں آیا۔
طاہر —— اور نہ اوپری منزل ہی پر گئی تھیں؟
زہرہ —— ہاں۔
طاہر —— تو پھر کیوں دیر ہوئی؟
زہرہ —— میں تم سے اپنی خواہش کے خلاف کہنے پر مجبور ہو رہی ہوں۔ ہائے میرے اللہ .... (اپنا سر کھجلاتی ہے)
طاہر —— پیاری مجھ سے سب کہہ دو۔
زہرہ —— میں ممتاز کے پاس گئی تھی۔
طاہر —— (غصہ سے) کون ممتاز؟ .... وہ آوارہ، لچا، بدمعاش ......
زہرہ —— (بات کاٹ کر) نہیں ممتاز مصور۔
طاہر —— تم اس کے اسٹوڈیو (نگار خانے) میں گئی تھیں؟
زہرہ —— ہاں پیارے طاہر۔ اس کا بہت اصرار تھا کہ میں اس کی نئی تصویر کے لئے نمونہ بنوں۔
طاہر —— (غضبناک ہوکر) اور تم ...... لاحول ولا قوۃ، لاحول ولا قوۃ ......
زہرہ —— ہاں اس نے کہا کہ میرے جسم کی ساخت بہت اچھی ہے۔ کمر بہت پتلی ......
طاہر —— میں اس بدمعاش کو مار ڈالوں گا۔ (چیخ کر) میں ابھی جاتا ہوں۔

کلو دروازے سے داخل ہوتا ہے

کلو —— سرکار۔
طاہر —— (اپنے دونوں ہاتھوں میں اپنے منہ کو چھپا کر) نکل جاؤ، میرے سامنے سے نکل جاؤ۔
کلو —— حضور وہ چھپے جو غائب ہوئے تھے ......
زہرہ —— (الگ) کتنی عجیب دوا ہے۔

طاہر — (آگے بڑھتے ہوئے) تم نہیں جاؤ گے ؟

کلّو — حضور۔

طاہر کلّو کے پاس تک جاتا ہے لیکن وہ فوراً باہر چلا جاتا ہے

طاہر — تو یہ قصّے ہیں۔ اور کچھ گُل افشانی فرمائیے۔

زہرہ — اَب مجھ سے مزید تفصیل نہ پوچھو۔

طاہر — (چیخ کر) نہیں تمھیں کہنا پڑے گا۔

زہرہ — نہ پوچھو۔ گذری ہوئی باتوں کو جانے ہی دو۔ ابھی اور کچھ کہوں گی تو نہ معلوم تمہاری کیا کیفیت ہوگی۔

طاہر — یا میرے خُدا ابھی کچھ اور کہنا باقی ہے۔

زہرہ — بہت کچھ۔

کلّو داخل ہوتا ہے

کلّو — حضور۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مجھے سب سچ سچ کہنا پڑے گا...... حضور وہ ......شربت کی بوتل جو غائب ہوگئی تھی وہ اور دوسرے کسی ملازم نے نہیں بلکہ میں ....

طاہر — (ایک چمچہ کھینچکر مارتا ہے) نکل جاؤ۔

کلّو — بہتر ہے حضور۔

زہرہ — معلوم ہوتا ہے کہ اِس بُڈّھے کھوسٹ نے شراب پی ہے جو ایسی بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے۔

طاہر — خیر وہ تو وہ مجھے تم پر سب سے زیادہ اعتبار تھا لیکن تم نے ہی مجھے دھوکا دیا۔ سچ ہے دنیا میں کوئی اعتبار کے قابل نہیں۔ معلوم نہیں تم کِن کِن لوگوں کے پاس گئی ہو۔

زہرہ ــــ کیا ؟ میں نے تو صرف ایک بے چارے کا نام لیا تھا..... ابھی تک.....
طاہر ــــ کیا ایک کافی نہیں ہے ؟
زہرہ ــــ ممکن ہے بعض کے لئے کافی ہو لیکن میرے لئے تو نہیں۔
طاہر ــــ اُف۔ تم اپنے عشاق کا ذکر اس طرح مجھ سے نہ کرو۔ اری عورت تو نے میرا دل توڑ دیا۔
زہرہ ــــ اگر میرے امکان میں ہوتا تو تم سے علیحدگی اختیار کر لیتی۔ لیکن افسوس کہ میں مجبور ہوں۔ (طاقچے تک جا کر کاغذ کا بنڈل لاتی ہے) یہ چند خطوط ہیں ان کو پڑھو۔
طاہر ــــ ممتاز کے ؟
زہرہ ــــ (لاپروائی سے) ہاں اور دوسروں کے بھی۔
طاہر کاغذات کھینچ کر پڑھنا ہی چاہتا ہے کہ کلو داخل ہوتا ہے
کلو ــــ حضور۔ میرا قصور معاف کریں۔ میں اس وقت اُن ہیروں کے بٹنوں کے متعلق کہنا چاہتا ہوں، جو کھوئے گئے تھے۔ حضور وہ میرے ہی پاس تھے لیجئے یہ حاضر ہیں۔ (بٹن میز پر رکھ دیتا ہے)
زہرہ ــــ وہی غائب شدہ بٹن۔ ....
طاہر ــــ (کلو سے) چلے جاؤ ورنہ میں ....
میز پر سے چھری اُٹھاتا ہے۔
کلو ــــ بہتر ہے حضور۔
دوڑ کر باہر چلا جاتا ہے۔ طاہر دروازہ میں چٹخنی لگا دیتا ہے۔
طاہر ــــ اُف ! (چھری پھینک دیتا ہے) اُنھ کیا ہو سکتا ہے ؟ آخر ہو کیا سکتا ہے ؟
زہرہ ــــ ہاں ہاں ٹھیک ہے۔ پیارے ان چیزوں کا خیال ہی نہ کرنا چاہئے۔

طاہر —— شیطان ! ....

دروازے تک جاتا ہے۔

زہرہ —— کہاں جا رہے ہو ؟

طاہر —— اپنے مشیرِ قانونی کے پاس۔ ابھی فوراً طلاق کا انتظام کرتا ہوں۔

زہرہ —— ٹھہرو طاہر ٹھہرو۔ (اپنے جیب سے کاغذ نکالتی ہے) پہلے اسے تو پڑھ لو

(کاغذ لیتے ہوئے) تحریری اقبال ...... (کاغذ کو رکھتے ہوئے) آہ !

یہ .... کیا .... ہے۔

زہرہ —— جب تم ٹیلیفون پہ گئے تھے تو یہ تمھاری جیب سے گر گیا تھا۔

طاہر —— تو تم نے شربت ....

زہرہ —— بے وقوف تو نہیں تھی۔ ہاں کلّو اور نسیم نے ضرور پیا۔

طاہر —— اور تم نے نہیں ؟

زہرہ —— یقیناً نہیں میرے پیارے بے وقوف طاہر۔

طاہر —— اور (کاغذات کو دیکھتے ہوئے) یہ کیا ہیں ؟

زہرہ —— یہ بِل ہیں جن میں سے اکثر ابھی ادا نہیں ہوئے ہیں۔

طاہر زہرہ کو سینہ سے لگا لیتا ہے۔ ویسے ہی نسیم داخل ہوتا ہے۔

نسیم —— ارے معاف کیجئے گا۔ میں سمجھا تھا ....

زہرہ —— خیر کوئی بات نہیں۔

نسیم —— میں آپ سے شبِ گذشتہ کے متعلق اور کچھ کہنے آیا تھا۔

طاہر —— (چلّا کر) تم خاموش نہیں رہو گے !

نسیم —— لیکن میں ....

نرگس داخل ہوتی ہے

نرگس — سرکار میں کچھ عرض کر سکتی ہوں۔

زہرہ — ہاں ہاں ضرور لیکن ذرا ٹھہرو۔ تھوڑی دیر کے بعد۔

نرگس — لیکن بیگم صاحبہ مجھے اندر سے کوئی چیز مجبور کر رہی ہے کہ میں کہوں۔

زہرہ اور طاہر دونوں شربت کی بوتل کی طرف دیکھتے ہیں

زہرہ — (الگ) معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے بھی استعمال فرمایا ہے۔ (نرگس سے) اچھا نرگس کہو کیا کہتی ہو۔

نرگس — حضور میں چھوٹے سرکار نسیم میاں کے متعلق کچھ کہنا چاہتی ہوں۔

نسیم کے چہرے پر پریشانی کے آثار ظاہر ہوتے ہیں

زہرہ — ہاں ہاں کہو۔

نرگس — حضور روزانہ صبح کو جب میں نسیم میاں کے کمرے میں چھوٹی حاضری لے جاتی ہوں تو ....

کلو کھڑکی کے پاس آکر کہتا ہے :-

کلّو — حضور میں کھوئی ہوئی چاندی لے آیا ہوں۔

چاندی کی تھیلی میز کے اوپر خالی کر دیتا ہے

پردہ

تنقید و تبصرہ

رباعیات سحابی | مولفہ جناب مولوی علی اوسط صاحب اعظم گڈھی۔ ڈسٹرکٹ وسشن جج صوبہ متحدہ (ریٹائرڈ) لکھائی چھپائی اور کاغذ معمولی۔ حجم ۲۳۲ صفحے۔ قیمت فی نسخہ عا/

ملنے کا پتہ :۔ دفتر اخبار سرگذشت۔ علی گڑھ

مولوی علی اوسط صاحب ایک مشہور علمی خاندان کے فرد ہیں۔ باوجود اعلی عہدوں پر رہنے اور قانونی مصروفیتوں کے بھی ان کا علمی ذوق قائم رہا۔ اور انھوں نے سحابی متوفی ۱۰۱۰ھ کی رباعیات فراہم کرکے طبع کرائیں۔ متعدد قلمی نسخوں سے مقابلہ کرنے کے بعد نوسو رباعیاں ان کے نزدیک سحابی کی ثابت ہوئیں۔ اور انھیں کو انھوں نے جلی قلم سے لکھوا کر چھپوایا۔

عمر خیام اور سحابی کا مقابلہ کرتے ہوئے قابل مولف نے لکھا ہے کہ "جس زمانے میں حکیم عمر خیام تھے وہ زمانہ مسلمانوں کی سلطنت کے عروج کا تھا۔ عیش و عشرت کے سب سامان مہیا تھے۔ لہذا شراب، کباب معشوق کے خیالات دل میں آتے تھے .... سحابی گوشۂ عزلت میں رہتا تھا۔ چالیس برس تک اس نے نجف اشرف کے احاطے سے قدم باہر نہیں رکھا۔ اس غریب نے تو شراب بھی نہ دیکھی ہوگی۔ لہذا اس کی رباعیوں میں اس کا ذکر تک نہیں"۔

دراصل اسی میں عمر خیام کی مقبولیت اور سحابی کی گمنامی کا راز مستتر ہے۔ یعنی شاعری جس قسم کے خیالات چاہتی ہے وہ خیام کے یہاں موجود تھے۔ برخلاف اس کے سحابی نے مذہبی جذبات اور پند و نصائح کو اپنا موضوع بنایا جو کبھی کبھی تو لطف دیتے ہیں۔ لیکن دن رات کا مشغلہ نہیں بن سکتے۔ بے شک سحابی کا انداز بیان صاف اور تشبیہات بھی کہیں کہیں نادر ہیں لیکن جدت اور تنوع نہیں ہے۔ ایک ہی موضوع ہے جس پر اس نے عمر بھر رباعیات کہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسا کلام کیوں کر مقبول ہو سکتا تھا۔ مولف کا خیال ہے کہ رباعیاں عمر خیام سے شروع ہوئیں۔ اور سحابی پر ختم ہوگئیں۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے

خیام سے پہلے ابوسعید ابوالخیر نے رباعیاں لکھی ہیں جو اگرچہ صوفیانہ ہیں مگر زبان اور انداز بیان کے لحاظ سے سحابی سے کہیں بہتر ہیں۔ ان کا مجموعہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے عرصہ ہوا شائع کیا ہے بہر صورت مولف کی یہ علمی کوشش قابل داد ہے۔

البینات | مولفہ مولوی محمد سلیم صاحب۔ تقطیع خرد۔ ضخامت ۳۴۰ صفحے۔ لکھائی، چھپائی اور کاغذ عمدہ۔ قیمت درج نہیں۔ ملنے کا پتہ دفتر البینات۔ امراؤتی۔ برار۔

اس کتاب میں مولف نے قرآن کی تعلیمات کو چھ مختلف عنوانات، مذہبیات، جسمانیات، معاشرت، معاشیات، اخلاقیات اور اجتماعیات کے تحت میں لکھا ہے۔ پھر ان میں سے ہر ایک کے تحت میں ذیلی عنوانات قائم کرکے ان کے متعلق قرآنی آیات معہ سلیس اردو ترجمہ کے درج کر دی ہیں اپنی طرف سے بجز اس کے کہ کہیں کہیں چند جملے توضیح کے لئے لکھ دئے ہیں اور کچھ نہیں لکھا ہے ہمارے نزدیک اس قسم کی کتابیں مسلمانوں کے لئے زیادہ مفید ہیں۔ اور ان کو بہ نسبت تفسیروں اور ترجموں کے قرآن سے زیادہ قریب کرنے والی ہیں۔ ہم کو خوشی ہوتی ہے کہ قرآن کی خالص تعلیم کی طرف اب عام رجحان ہو رہا ہے اور توجہ بڑھ رہی ہے جو ہمارے خیال میں اسلامی روح کی بیداری کی علامت ہے

الخیر الکثیر | حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمتہ اللہ علیہ کی نایاب تصنیف جو اب تک غیر مطبوع تھی دیوبند کی مجلس علمی کی کوشش سے پہلی بار چھپ کر شائع ہوئی ہے۔ یہ کتاب فلسفہ اسلام اور اسرار شریعت کے متعلق نادر تصنیف ہے۔ اس کو شاہ صاحب موصوف کا ایک بلند پایہ علمی اور دماغی کارنامہ سمجھنا چاہیئے۔ ارکان مجلس علمی اہل علم کے شکریہ کے مستحق ہیں جنھوں نے نہایت کوشش سے متعدد قلمی نسخوں کا مقابلہ کرکے اس کو عمدہ کتابت کے ساتھ اچھے کاغذ پر طبع کرایا۔ ضخامت ۲۰۲ صفحات ہے۔ قیمت فی نسخہ عہ ملنے کا پتہ:۔ مولانا محمد ادریس صاحب صدر مدرس مدرسہ صدیقیہ۔ پھاٹک حبش خان دہلی۔

خاتم النبیین | مصنفہ مولانا انور شاہ صاحب مرحوم۔ بزبان فارسی ضخامت ۶ جزو تقطیع ۲۰×۳۰
کتابت وطباعت اچھی اور کاغذ اعلیٰ۔ قیمت درج نہیں۔ ملنے کا پتہ:۔ مولانا محمد ادریس
صاحب مدرس مدرسہ صدیقیہ پھاٹک حبش خاں۔ دہلی۔

مولینا انور شاہ صاحب مرحوم نے یہ کتاب قادیانیوں کی تردید میں لکھی ہے جو ختم نبوت کے مسئلے میں قرآن سے مخالفت کرتے ہیں۔ شاہ صاحب نے عقلی اور نقلی دلائل سے اس فرقے کی غلطیاں واضح کی ہیں۔ چونکہ اُن کا مقصد یہ تھا کہ باشندگانِ کشمیر وبلوچستان خصوصیت کے ساتھ اس فتنے میں پڑنے سے محفوظ رہیں اس لئے انھوں نے اس کتاب کو فارسی زبان میں لکھا۔ یہ اُن کے آخر عمر کی تصنیف ہے جس کو وہ خود اپنی طرف سے چھپوانا چاہتے تھے۔ مگر زندگی نے وفا نہ کی اس لئے ان کے بعد دیوبند کی مجلسِ علمی نے نہایت عمدگی کے ساتھ اس کو شائع کیا ہے۔ چونکہ یہ فارسی میں ہے اور اب فارسی کا رواج ہندوستان سے اٹھتا جا رہا ہے اس لئے مجلسِ علمی نے اس کے مقدمہ میں یہ اعلان کر دیا ہے کہ عام مسلمانوں کے لئے وہ عنقریب اس رسالے کی شرح اردو زبان میں شائع کر دے گی۔ مجلسِ علمی کا یہ کام قدر کرنے کے قابل ہے۔

نگارستانِ کشمیر | مصنفہ قاضی ظہور الحسن صاحب ناظم سیوہاروی، کتابت وطباعت اچھی
کاغذ عمدہ۔ ضخامت ۱۰۰ صفحے تقطیع ۲۰×۲۶۔ قیمت فی نسخہ عہ/
ملنے کا پتہ:۔ مولوی محمد ادریس میرٹھی۔ مکتبہ شرفیہ۔ دہلی۔

قاضی صاحب موصوف نے اس کتاب میں کشمیر کا جغرافیہ اور آغاز عہد سے لے کر آج تک کی اس کی تاریخ نہایت معتمد ماخذوں سے جو مل سکتے تھے لے کر لکھی ہے۔ وہاں کے راجاؤں اور بادشاہوں کے علاوہ امرار، شعرار، فضلار اور صوفیہ وغیرہ کے حالات اور اُن کے کارنامے بھی بیان کئے ہیں جن کے ذیل میں بہت سے علمی، ادبی، تاریخی اور مذہبی مسائل بھی زیر بحث آگئے ہیں۔ قاضی صاحب کا زاویہ نگاہ خالص اسلامی ہے۔ اور تحریر کا انداز کہیں محققانہ ہو

اور کہیں مناظرانہ۔ مخالفوں کے جوابات خود انھیں کی کتابوں سے دئے ہیں۔
کتاب شروع سے آخر تک دلچسپ ہے اور نہایت محنت سے لکھی گئی ہے۔

دستور پہلوی | مصنفہ جناب دین محمد صاحب ایم اے۔ بزبان فارسی۔ صاف ٹائپ میں اچھے کاغذ اور بڑی تقطیع پر بمبئی میں چھاپی گئی ہے۔ ضخامت ۴۴۲ صفحے۔ قیمت فی نسخہ عہ
ملنے کا پتہ:۔ دین محمد صاحب بی اے۔ الریاض ہال بازار۔ امرت سر۔ پنجاب۔

ایران کی قدیمی زبان فرس باستانی کے نام سے مشہور ہے جو ہخامنشی بادشاہوں کے عہد میں بولی جاتی تھی (۵۵۸ سنہ ع سے ۳۳۰ سنہ ق تک) جس کی یادگار اب سوائے چند پرانے کتبوں کے جو پرسی پولس (تخت جمشید) بہستان (بے ستون) میں پائے گئے ہیں اور کچھ نہیں ہے۔ پھر اسکندر مکدونی کی تاخت و تاراج کی وجہ سے ایران میں طوائف الملوکی پھیل گئی۔ جو تقریباً سو سال تک رہی ۲۲۶ سنہ ق۔م میں اردشیر بابکان نے ساسانی حکومت کی بنیاد ڈالی جو اسلامی فتوحات یعنی عہد یزدگرد تک رہی۔ اس دورۂ اشکانی اور عہد ساسانی کی زبان پہلوی کہی جاتی ہے جو رسمی دینی اور ادبی حیثیت سے مستعمل تھی۔ یہ کتاب اسی زبان کے رسم الخط اور صرف و نحو کے متعلق ہے جو نہایت کد و کاوش اور تحقیق کے ساتھ لکھی گئی ہے۔ اس کے مخاطب عوام نہیں ہیں بلکہ یہ ان خواص کے لئے ہے جو ایران کی قدیم لسانی تحقیقات سے ذوق رکھتے ہیں۔ زردشت کی کتاب اوستا کے متعلق مصنف نے لکھا ہے کہ ہخامنشان کے عہد میں اس کے صرف دو ہی نسخے ایران میں تھے جب اسکندر نے استخر (پایۂ تخت) ایران کو جلا دیا تو ایک نسخہ جل گیا دوسرا نسخہ وہ اپنے ساتھ لے گیا۔ جس میں سے طب، نجوم، فلسفہ، اور جغرافیہ کے متعلق جو حصہ تھا اس کو یونانی میں منتقل کراکے بقیہ کو برباد کر دیا۔ اوستائے قدیم بہت بڑی کتاب تھی جو ۸۱۵ فصلوں پر تمام ہوئی تھی۔ اور مورخین قدیم کے بیان کے مطابق گائے کے بارہ ہزار چرم کے پارچوں پر لکھی جاتی تھی۔ عہد ساسانی میں جب اولین شہنشاہ نے اس کو فراہم کرانے کی کوشش کی تو موبدوں نے اپنی یادداشتوں سے جو کچھ جمع کیا وہ صرف ۳۴۸ فصلیں

تھیں۔ وہ بھی دستبرد زمانے سے رفتہ رفتہ فنا ہوتی رہیں۔ تاآنکہ اب جو کچھ حصہ اوستا کا رہ گیا ہے وہ دورۂ ساسانی کے اوستا کے چہارم سے زیادہ نہیں ہے۔

مصنف نے پیشدادیوں کے عہد کی بحث کو غالباً اپنے موضوع سے خارج سمجھا مگر ہم اوستا کی طرح اس کتاب میں دساتیر کے متعلق بھی تاریخی بحث دیکھنا چاہتے تھے۔

مصنف نے اس کتاب کی تصنیف میں نہ صرف مشرقی اور مغربی علما کی تحقیقات اور ان کی علمی اور تاریخی کتابوں سے فائدہ اٹھایا ہے۔ بلکہ بعض موجودہ اہل علم سے بھی استفادہ کیا ہے اس لئے ان کی یہ کتاب تحقیقاتی حیثیت سے بلند مرتبہ رکھتی ہے۔ انھوں نے نہ صرف زبان اور اس کے قواعد سے بحث کی ہے بلکہ ایرانی زبان جن خطوط میں لکھی جاتی تھی۔ ان کی تحقیقات بھی تفصیل کے ساتھ لکھی ہے۔ ہم اس کو اہل علم کے لئے ایک بیش قیمت تحفہ سمجھتے ہیں۔

(ا۔ ج)

رسائل:

شاہکار۔ ماہوار | ایڈیٹر پروفیسر تاجور۔ تقطیع ادبی دنیا کے برابر۔ ضخامت ۲، صفحے قیمت سالانہ للعہ فی پرچہ ۸ر مقام اشاعت۔ دفتر شاہکار۔ لاہور

مولانا تاجور بہت کہنہ مشق اخبار نویس ہیں۔ پہلے وہ مخزن کے دور ثانی کے ایڈیٹر تھے۔ پھر انھوں نے اپنا رسالہ ادبی دنیا نکالا جس سے اب وہ قطع تعلق کر چکے ہیں۔ لیکن وہ اب تک کامیابی سے جاری ہے۔ اب اپریل سے انھوں نے شاہکار کے نام سے ایک اور شاندار اور بھاری بھرکم رسالہ ملک کے تعلیمی رہنماؤں اور افسرانِ تعلیم کے مشورے سے جاری کیا ہے اس کے مقاصد میں ایک اہم مقصد یہ ہے کہ طلبا کو خالص ادبی تعلیم دی جائے۔ زیرِنظر رسالہ جلد کا پہلا نمبر ہے اس میں شروع میں ہیڈماسٹر صاحبان کی خدمت میں ایک درخواست ہے۔ تیسرے صفحے پر "اداریہ" ہے جس میں جناب مولینا راشد صاحب نے رسالے کے مقاصد پر بہت تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ یہ مقالہ افتتاحیہ تکلیف دہ حد تک طویل ہوگیا ہے پھر جناب تاجور صاحب کے شذرات ہیں

اس میں انھوں نے رسالے کا لائحہ عمل یا پروگرام بتایا ہے ۔ اس کے بعد مرزا محمد سعید صاحب ایم اے کا مذہب اور باطنیت پر ایک علمی مضمون ہے ۔ پھر مولانا عبداللہ العمادی کی ایک فارسی نظم ہے ، پھر بزم تحقیق کے عنوان سے چند استفسارات اور مولانا احسن مارہروی اور جناب کیفی دہلوی کی جانب سے ان کے جوابات ہیں ۔ اس کے بعد خواجہ حسن نظامی کے قلم سے بہادر شاہ کی پوتی کی ایک غم انگیز داستان ہے ۔ تغلق نامے پر مقبول احمد صاحب صمدنی مصنف حیات جلیل کا ایک مضمون ہے ۔ بہادر شاہ اور مرزا غالب کے عنوان سے ہیش پرشاد لیکچرر ہندو یونیورسٹی کا ایک دل چسپ مضمون ہے ۔ پھر خیالات کے عنوان کے ماتحت جناب تاجور نے ۔ اصول بیانی و اصول اختیاری ، کیرکٹر ، اور ہندو مسلم اتحاد پر اظہار خیال فرمایا ہے ۔ مشاہیر عالم کے تحت میں مشہور فرانسیسی محب وطن موسیو پو انکارے کے حالات ہیں ۔ غیر معروف جرنلسٹ صاحب کا ایک دل چسپ افسانہ ہے ۔ تعلیمات کے زیر عنوان دلی کی تعلیمی کانفرنس اور دوسرے تعلیمی و علمی اجتماعات کی روداد یں اور ان پر اظہار رائے ہے جناب سید حسن برنی صاحب نے چند نادر قلمی مصاحف کے عنوان سے ایک پر از معلومات مضمون لکھا ہے ۔ پھر ریحانہ کے عنوان سے ایک سبق آموز افسانہ ہے ۔ تعلیمی ادارات کے تحت میں تقسیم اسناد کے خطبات کی فہرست اور ان خطبوں پر اظہار رائے ہے ۔ اصطلاحات کے تحت میں عامل اور جوتشی کی خبر لی گئی ہے ۔ سینما کے تحت میں تماشائی صاحب نے صنعت فلم سازی پر خامہ فرسائی کی ہے ۔ شخصیات کے زیر عنوان مولانا ظفر علی ، چودھری ظفر اللہ خاں بیرسٹر و رنبیر کے حالات ہیں ۔ تنویرات کے تحت میں علمی اور کچھ سیاسی خبریں ہیں ۔ مضامین کے بیچ بیچ میں نظمیں اور غزلیں بھی ہیں اور اکثر بلند معیار ہیں ۔ آخری منزل کے عنوان سے ایک ہندوستانی مصور کی سہ رنگی تصویر بھی ہے اور بہت خوب ہے ۔ رسالے کے بعض عنوانات مستقل ہیں ۔ مثلاً بزم تحقیق خیالات ، مشاہیر عالم ، تعلیمات ، تعلیمی ادارات ، اصلاحات ، شخصیات ، تنویرات ۔ اس میں شک نہیں کہ رسالہ نہایت محنت اور سلیقے سے مرتب کیا گیا ہے مضامین بھی کہنہ مشق اور مشہور اہل قلم حضرات سے حاصل کئے گئے ہیں مستقل عنوانات کے تحت میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بھی بہت خوب ہے بحیثیت مجموعی یہ رسالہ طلبا، اور عوام کے لئے

بہت مفید ہے البتہ اداریہ کے بارے میں اتنی گذارش ہے کہ یہ اس قدر طویل نہ ہونا چاہئے کہ پڑھتے پڑھتے طبیعت اکتانے لگے۔ مضمون نگاروں سے بھی مضمون مختصر اور دلچسپ لکھوائے جائیں۔ شخصیات کا عنوان بھی ہمارے خیال میں کچھ ایسا موزوں نہیں ہے اس میں کچھ تقلید کی بو آتی ہے۔ ویسے بھی اس میں فائدہ کم ہے۔ خرابیاں زیادہ۔ ٹائٹل ممکن ہے طلبار کے لئے جاذب نظر ہو تاہم بہت شوخ ہے تقطیع کے بارے میں کچھ کہنا شاید بعد از وقت ہو۔

ادب لطیف (ماہوار) | ایڈیٹر چودھری برکت علی بی اے تقطیع بڑی۔ ضخامت ۴۸ صفحات، کتابت وطباعت روشن۔ کاغذ متوسط۔ چندہ سالانہ ہے رفی پرچہ ۴ر۔ مقام اشاعت۔ لاہور

یہ پرچہ مارچ کے مہینے سے نکلنا شروع ہوا ہے۔ ہمارے سامنے اس کا پہلا نمبر ہے۔ شروع میں نذر اولین کے عنوان سے ایڈیٹر صاحب کا افتتاحیہ مضمون ہے۔ جس میں انھوں نے رسالے کے مقاصد پر روشنی ڈالی ہے۔ پھر ادب لطیف کے عنوان سے جناب حکیم احمد شجاع صاحب بی اے سابق ایڈیٹر ہزار داستان کا مضمون ہے۔ اس میں انھوں نے بتایا ہے کہ ادب لطیف صحیح معنوں میں کیا چیز ہے اور اس ادب لطیف (رسالے) کو کیسا ہونا چاہیئے۔ اس کے بعد دوسرے مضامین نظم و نثر ہیں۔ مضمون نگاروں میں چند اچھے اچھے لکھنے والوں کے نام نظر آتے ہیں۔ مثلاً قاضی عبدالغفار صاحب۔ چودھری افضل حق صاحب ایم ایل سی۔ پروفیسر علم الدین صاحب، ایم اسلم صاحب، شاہد احمد صاحب مسز عبدالقادر صاحبہ وغیرہ۔ رسالے کی ظاہری شان بھی اچھی ہے۔ شروع میں ایک تصویر بھی ہے بحیثیت مجموعی رسالہ ہونہار معلوم ہوتا ہے۔ اور اگر ایڈیٹر صاحب کی کوشش اسی طرح جاری رہیں تو لاہور کے رسائل میں بہت جلد ایک خاص حیثیت حاصل کرے گا۔

رتن ماہوار | ایڈیٹر شانتی سروپ نشاط۔ سائز بڑا۔ ضخامت ۴۰ صفحات، لکھائی، چھپائی روشن کاغذ اچھا۔ قیمت سالانہ (عام) فی پرچہ ۳ر۔ مقام اشاعت دفتر رسالہ رتن۔ جموں۔

یہ رسالہ بچوں کے لئے ریاست جموں سے نکلتا ہے ۔ ایڈیٹر صاحب اسے بچوں کے لئے دلچسپ اور مفید بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مضامین، نظموں اور قصوں کے انتخاب میں بچوں کے فائدے کا خیال رکھا جاتا ہے۔ انعامی معمے اور دلچسپ لطیفے بھی شائع کئے جاتے ہیں۔ رسالہ بچوں کے لئے مفید ہے ۔ اگر ایڈیٹر صاحب رسالے کی زبان اور آسان کردیں اور مضامین کے انتخاب میں ذرا سختی سے کام لیں تو اچھا ہو مثلاً زیر نظر پرچے میں "بچپن" والا مضمون بچوں کے لئے نہ مفید ہے اور نہ اس سے انھیں کچھ دلچسپی ہوسکتی ہے ۔

سالنامہ پھول باغ (ماہوار) ایڈیٹر صاحبزادہ کوشان سنگت پوری ، سائز بڑا ۔ ضخامت ۱۰۰ صفحے قیمت سالانہ سے رسالانہ نمبر کی عمر ۔ مقام اشاعت ریاست پٹیالہ ۔

یہ رسالہ نوجوانوں اور طلبائے مدارس کے لئے پٹیالہ سے ماہوار نکلتا ہے ۔ زیر نظر نمبر اس کا سالانہ نمبر ہے ۔ ایڈیٹر صاحب نے اچھے اچھے لکھنے والوں کے مضامین نظم و نثر جمع کئے ہیں رسالے میں مہاراجہ پٹیالہ ۔ افسران ریاست اور چند مضمون نگاروں کی تصویریں بھی ہیں ۔ کتابت طباعت میں ترقی کی گنجائش ہے

اُمہات سالانہ نمبر مدیرہ قمر النسا بیگم صاحبہ ، تقطیع بڑی ضخامت ۱۱۲ صفحے کاغذ اور کتابت وطباعت معمولی ۔ قیمت سالانہ ہے رخاص سالانہ نمبر ۸ ۔ مقام اشاعت بھوپال ۔

یہ بھوپال کے مشہور زنانہ ہفتہ وار رسالے کا سالنامہ ہے ۔ اور محنت اور سلیقے سے ترتیب دیا گیا ہے ۔ مضامین نظمیں افسانے وغیرہ سب مفید اور نتیجہ خیز ہیں ، البتہ کتابت وطباعت میں بہت کچھ ترقی کی گنجائش ہے ۔ شاید بھوپال میں اس سے بہتر انتظام ممکن نہ ہوگا ۔

اصول تعلیم | مصنفہ خواجہ غلام السیدین صاحب پروفیسر تعلیمات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ شائع کردہ ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد۔ حجم ۴۴۵ صفحے تقطیع ۲۰×۲۶، کاغذ، کتابت، طباعت اکیڈمی کی اور کتابوں کی طرح نہایت عمدہ۔ قیمت ۶؎ (چھ روپے)

واحد ایجنٹ :۔ کتابستان ۔ ۱۷ (الف) سٹی روڈ ۔ الہ آباد ۔

خدا کا شکر ہے کہ مدتوں کے بعد اردو میں ایک اعلیٰ درجے کی کتاب نظر آئی ۔ اصول تعلیم ان کتابوں میں سے ہے جنھیں دیکھ کر امید ہوتی ہے کہ اردو ہندوستان کی اور سب زبانوں پر بڑھ جائے گی اور ایک دن یورپ کی ترقی یافتہ زبانوں کا مقابلہ کرے گی

تعلیم کے متعلق اردو میں ابھی تک چند ترجموں کے سوا کچھ نہیں ہے ۔ تہذیب الاخلاق کے مضامین یا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے خطبہ ہائے صدارت میں جن کا ذکر اصول تعلیم کے فاضل مصنف نے اپنے دیباچے میں کیا ہے ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیم کے عملی مسائل کے متعلق مفید معلومات موجود ہے ۔ لیکن نظری اور علمی بحث کا کہیں نام بھی نہیں ہے ۔ یہی کتاب ہے جس سے ہماری زبان میں علم تعلیم یا فلسفۂ تعلیم کی بنیاد پڑتی ہے اور اگر بنیاد سے عمارت کا کوئی اندازہ ہو سکتا ہے تو ہم بے تامل کہیں گے کہ انشاء اللہ ہمارا آیندہ نظریۂ تعلیم نہایت معقول اور مستحکم ہوگا ۔

فاضل مصنف نے کتاب کے تین حصے کئے ہیں ۔ پہلے حصے کا عنوان تعلیم و تمدن ہے ۔ اور اس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ تعلیم تمدنی زندگی میں کیا اہمیت رکھتی ہے اور اسے قوم کی 'معاشرت' معیشت اور سیاست سے کیا تعلق ہے ۔ دوسرے حصے میں جس کا عنوان 'درسی تعلیم' ہے ۔ ذہنی تعلیم کی ماہیت اور حقیقت اس کے وسائل یعنی نظام تعلیم اور نصاب تعلیم کی بحث ہے اور اسی کے ساتھ جسمانی تربیت کے مسئلے پر گہری نظر ڈالی گئی ہے ۔ تیسرے حصے میں جس کا عنوان ۔ اخلاقی اور معاشری تربیت ہے ۔ اخلاق کا مفہوم معین کرکے ذہنی اور اخلاقی تربیت کا تعلق اور ضبط و تادیب کا جدید نظریہ بیان کیا گیا ہے اور معلم کی شخصیت کو اخلاقی تربیت کا ایک اہم عنصر قرار دے کر طلبہ کی اخلاقی سیرت کی تعمیر کے اصول قائم کئے گئے ہیں ۔ مصنف کی فاضلانہ بحث کا لب لباب یہ ہے کہ تعلیم کوئی

مجرد چیز نہیں۔ بلکہ اس کی جڑیں تمدنی اور معاشرتی زندگی میں پیوست ہیں جس سے جدا ہو کر اس کا پنپنا محال ہے۔ اس لئے تعلیم کا حقیقی ذریعہ زندگی کو سمجھنا چاہیئے۔ اور مدرسے کو بھی زندگی کا ایک چھوٹا سا نمونہ بنانا چاہیئے۔ تعلیم محض ماحول کے اثرات انفعالی طور پر قبول کرنے کا نام نہیں بلکہ اس ماحول پر اثر بھی ڈالا جاتا ہے یعنی ہر قسم کی تعلیم خواہ وہ اخلاقی ہو یا ذہنی عمل سے گہرا تعلق رکھتی ہے اس لئے اس کی بنا عمل پر ہونی چاہیئے۔ موجودہ زمانے میں دنیا کا تمدن جمہوریت کا رنگ اختیار کر چکا ہے اور ہندوستان پر بھی یہ رنگ چڑھتا جاتا ہے۔ اس لئے تعلیم ابتدا سے جمہوریت کے سانچے میں ڈھالنا ضروری ہے تاکہ آئندہ نسل جمہوری معاشرت کے لئے طیار ہو جائے۔

کتاب کے مضامین، مصنف کی مہارت فن، وسعت مطالعہ، دقت نظر اور جدت فکر کی شہادت دیتے ہیں۔ اور اس کی صاف، سلیس، شگفتہ عبارت ان کے ذوق ادب اور سلیقۂ تحریر کا عمدہ نمونہ ہے۔ ہم مصنف کو اور ہندوستانی اکیڈمی کو اس کتاب کی اشاعت پر مبارکباد دیتے ہیں۔

قطعۂ استقبالیہ

(مسلم یونیورسٹی کے اس جلسہ میں پڑھا گیا جو سیّد سجاد حیدر صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا تھا)

ادیب نکتہ شناس و خطیب خوش تقریر
زباں میں اُن کی حلاوت بیاں میں لذّت ہے

فصیح و شُستہ و برجستہ ہی سخن اُن کا
نیا خیال ہے، طرزِ ادا میں جدّت ہے

وہ جذبِ قلب کی لفظوں میں کھینچ دیں تصویر
کچھ ایسی خامۂ رنگیں پہ اُن کو قدرت ہے

وہ کون؟ خالدہ خانم، کہ جن کا ہر ہر لفظ
ادب کی جان ہی، سرمایۂ فصاحت ہے

جھلک رہی ہے مئے خوشگوار شیشہ میں
یہ حسن و دلکشی و ندرتِ عبارت ہے

نہیں نگینے یہ الفاظ آبگینے ہیں
حباب میں بھی نہیں اِن میں جو نزاکت ہے

وہ خالدہ جو ہیں ترکی کی زندہ اک تاریخ
کچھ اپنی قوم سے اِس طرح اُن کو نسبت ہے

بلند فکر، مُدبّر، وزیرِ با تدبیر
حیات جن کی اک عالم کو درسِ حکمت ہے

وطن پرست و رضاکار و پیکرِ اخلاص
کہ جن کے صدق و وفا کی جہاں میں شہرت ہے

اگرچہ اُن کو تعلق ہے صنفِ نازک سے
کئے ہیں کام وہ مردوں کو جن پہ حیرت ہے

وہ قوم ترک مجسّم ثبات و استقلال
ہے جس کے سینوں میں جرأت دلوں میں غیرت ہے

جو سر کو بیچ کے لیتی ہے مول آزادی
عزیز ایسی کچھ اس کو متاعِ حرمت ہے

یہ ایسی قوم کا ہے اِک عزیز سرمایہ
یہ ایسی کان کا اِک لعلِ بیش قیمت ہے

زبانِ حضرتِ سجّاد سے سُنیں احباب
ادب میں قوم میں اپنی جو اُن کی عزّت ہے

میں بے ہُنر ہوں کہوں کیا زراہِ استقبال
زباں میں زور نہ میرے قلم میں طاقت ہے

زبانِ حضرتِ غالب سے ہاں مگر یہ کہوں
"وہ آئیں گھر میں ہمارے خُدا کی قدرت ہے

کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں!!"

نذرِ خالدہ

(یہ نظم خالدہ خانم صاحبہ کے استقبال کی تقریب میں مسلم یونیورسٹی میں پڑھی گئی تھی)

دل مسرت کی فراوانی سے دیوانہ ہے آج
نورِ عشرت سے منور یہ سیہ خانہ ہے آج

کیف صہبائے طرب میں غرق میخانہ ہے آج
ہر شجر ساقی ہے اور ہر پھول پیمانہ ہے آج

غنچہ و گل تھے یہی لیکن یہ رعنائی نہ تھی
اس گلستاں میں بہار اس دھوم سے آئی نہ تھی

نرگسِ مخمور ہے لذت کشِ خوابِ نشاط
پھوٹ نکلا ہے گل ولنسریں سے سیلابِ نشاط

اہلِ محفل کے لئے مشکل ہے اب تابِ نشاط
آج پیمانوں سے چھلکے گی مےِ نابِ نشاط

پرفشاں ہے جذبۂ پنہاں ابھرنے کے لئے
مضطرب ہے ذرہ ذرہ رقص کرنے کے لئے

پھر ادھر آئے نہ آئے یہ شمیم جاں فزا
پھر میسر ہو نہ ہو ایسا سماں ایسی ہوا

چھیڑ اس انداز سے اے مضطب رنگیں نوا
ٹوٹ جائے آج اک اک تار تیرے ساز کا

مطرب

ذکر حسن بت کا مہ و پرویں کے کاشانے میں ہے
اللہ اللہ آج وہ اپنے صنم خانے میں ہے

خالدہ! تو ہے بہشتِ ترکمانی کی بہار
تیری پیشانی پہ نورِ حریت آئینہ کار

تیرے رخ سے پرتوِ حسنِ صداقت آشکار
تیرے جلووں کی لطافت سے فرشتے شرمسار

گل پشیماں، قلبِ بلبل رشک سے دو نیم ہے
تیری باتوں میں خمارِ کوثر و تسنیم ہے

اے مقدس حور اے پروردۂ موجِ نسیم
روحِ عشرت گاہ ساحل جانِ طوفانِ عظیم

تو نے ترکوں کو دکھائی ہے صراطِ مستقیم
پھونک ڈالے ہیں تعصب کے حجاباتِ قدیم

ضعف دکھلایا کبھی گر فطرتِ احرار نے

آگ برسادی ہو تیرے نطق گوہر بار نے

رہ چکی ہو ہاتھ میں تیرے وہ تیغ بے نیام — جس کی جنبش نے بدل ڈالا حکومت کا نظام
ترک افتادہ کو تو نے ہی دیا اذنِ خرام — تیرے ہی ہاتھوں نے چھلکائے ہیں آزادی کے جام

تو نے جو احساں کئے ہیں ملت احرار پر
نقش ہیں اب تک سمرنا کے در و دیوار پر

ہاں بتادے ہم کو بھی اے روح اربابِ نیاز — کس طرح مٹتا ہو آخر زنگِ خوں کا امتیاز
دل پہ کیونکر فاش ہوجاتے ہیں آزادی کے راز — چھیڑتے ہیں کس طرح محفل میں بیداری کا ساز

تیری آنکھوں میں سرورِ عشرتِ جمہور ہے
آہ یہ نعمت ہمارے دسترس سے دور ہے

محرم درد و مسرت راز دار صبح و شام — خامشی محفلِ فطرت ہو تجھ سے ہم کلام
تیری ہستی آسمانِ ترک کا ماہِ تمام — تو محبت ہر نفس تیرا محبت کا پیام

گلشن مشرق میں مانندِ صبا آئی ہے تو
صبح روشن کا پیام جانفزا لائی ہے تو

قربت گل کس قدر جاں بخش ہو خاروں سے پوچھ — چاندنی تنویر میں کیا لطف ہو تاروں سے پوچھ
نشۂ صہبا میں کیا لذت ہو مے خواروں سے پوچھ — چارہ سازی میں مزا کیا ہو یہ بیماروں سے پوچھ

روح و دل کو جگمگادے جلوہ آرائی تری
کم سے کم اتنا تو کر جائے مسیحائی تری

کوئی دم میں اس گلستاں سے نکلنا ہو ہمیں — فرشِ گل سے دور انگاروں پہ چلنا ہو ہمیں
خارزارِ غم کو پیروں سے کچلنا ہو ہمیں — جادۂ منزل پہ گرنا ہے سنبھلنا ہو ہمیں

درس ایسا دے کہ دل بیگانۂ منزل نہ ہو
فکر لا طائل نہ ہو اندیشۂ باطل نہ ہو!

جو نظر ہے مدعا پرداز ہے
پھر بھی اپنا راز اپنا راز ہے

لطف میں اب جور کا انداز ہے
مژدہ اے دل ابتدائے ناز ہے

کچھ تو کہیے لن ترانی ہی سہی
ذرہ ذرہ گوش بر آواز ہے

کاروانِ دل بھی پیچھے رہ گیا
زندگی کتنی سبک پرواز ہے

اللہ اللہ شورشِ ضبطِ سکوت
ہم زبانِ حالِ دل کا راز ہے

پرتوِ حسنِ تبسم دیکھنا!
گلستاں دنیائے سوز و ساز ہے

درد کا انجام دیکھا چاہئے
ابتدا تو حشر کا آغاز ہے

کون اٹھا چاہتا ہے بزم سے
رنگِ محفل مائلِ پرواز ہے

ذرہ ذرہ آئینہ ہے حسن کا
پھر بھی رازِ حسن اب تک راز ہے

گفتگو تک راز تھا ایمائے دل
اب خموشی مدعا پرداز ہے

کوکب اپنا رہنما ہی نورِ عشق
ہر شعارِ دل پرِ پرواز ہے

شذرات

پچھلے پرچے میں ہم تصدق احمد خاں صاحب شروانی مرحوم کی اندوہناک خبر شائع کر چکے ہیں مرحوم کا ماتم سارے ملک میں ہوا۔ اور اب تک ہو رہا ہے۔ جامعہ ملیہ میں اس سانحے کے دوسرے دن تعزیت کا جلسہ منعقد ہوا جس میں چھوٹے بڑے طلبا اور اساتذہ جمع ہوئے۔ کلام مجید کی تلاوت اور فاتحہ خوانی کے بعد شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب نے ایک موثر اور مختصر تقریر کی جس میں خاص طور پر چھوٹے بچوں سے خطاب تھا۔ مرحوم کی زندگی کے مختصر حالات بیان کر کے جناب شیخ الجامعہ نے ان کے خلوص اور جوش، سادگی اور ایثار، حق گوئی اور حق پسندی، بے خوفی اور بہادری کے اوصاف کو نمونے کے طور پر پیش کر کے خدا سے دعا کی کہ جامعہ کے ہر فرد کو ان کی تقلید کی توفیق دے۔ اس کے بعد چھٹی کا اعلان فرمایا۔ اور طلبہ کو ہدایت کی کہ اپنی اقامت گاہوں میں جا کر قرآن مجید کی تلاوت کریں اور مرحوم کے لئے مغفرت کی دعا مانگیں۔

جامعہ کی عمارت کے لئے چندے کا کام شروع ہو گیا ہے تجویز یہ ہے کہ جناب شیخ الجامعہ اور شفیق الرحمٰن صاحب قدوائی ناظم حلقہ ہمدردان جامعہ۔ ۲۲ اپریل سے صوبہ متحدہ کا دورہ شروع کریں۔ سب سے پہلے میرٹھ، مظفر نگر، سہارنپور، بجنور، مرادآباد، بریلی، شاہجہاں پور کا ارادہ ہے۔ اس کے بعد مشرقی اضلاع کی باری آئے گی، ہر ضلعے کے سربرآوردہ اصحاب سے خط و کتابت ہو رہی ہے۔ جامعہ کی طرف سے یہ شرط ہے کہ جس ضلعے میں جامعہ کا وفد جائے وہاں سے کم سے کم ایک ہزار یکمشت اور پچیس روپے ماہوار کی مدد ملے۔ اکثر مقامات سے وعدہ کیا گیا ہے کہ اس سے بہت زیادہ چندہ ہو جائے گا۔ خدا کرے یہ امیدیں بر آئیں اور یہ وعدے پورے ہوں۔

خدا کا شکر ہے کہ دہلی شہر جو جامعہ کا گھر ہے اپنی شان کے مطابق جامعہ کی مدد کر رہا ہے۔ یکم مارچ کے جلسے میں دہلی کی طرف سے پچاس ہزار کی مالیت کی جائداد اور اٹھارہ ہزار نقد کے وعدے ہوئے تھے وعدوں کی رقم وصول ہو رہی ہے اور اس کے علاوہ کم سے کم بارہ ہزار روپے کی مزید امداد کا اہل دہلی نے ذمہ لیا ہے۔ جناب حاجی محمد ابراہیم صاحب کی صدارت میں ایک کمیٹی بنائی گئی ہے جس میں شہر کے تمام معزز تاجر اور محبان ملت شامل ہیں۔ یہ حضرات چندے کی وصولی کا انتظام خود کر رہے ہیں اور انھوں نے جامعہ کے لوگوں سے کہہ دیا ہے کہ آپ باہر کام کیجئے گھر کا کام ہم پر چھوڑ دیجئے۔ جزاہم اللہ تعالےٰ۔ اگر ان باہمت اصحاب کی کوشش کامیاب ہوئی اور انشاءاللہ ضرور کامیاب ہوگی تو دہلی کا مجموعی چندہ (پچاس ہزار کی جائداد کو ملا کر) اسی ہزار سے زیادہ ہو جائے گا۔ امید ہے کہ ہندوستان کے دار السلطنت اور سب سے بڑے اسلامی مرکز کی یہ شاندار مثال اور مقامات کے لوگوں میں بھی فیاضی، علم دوستی اور ملت اسلامی کی محبت اور خدمت کے جذبات کو بیدار کر دے گی، اور جامعہ کا وفد ہر شہر اور ہر قصبے میں کامیاب ہوگا۔

ہم نے جنوری کے پرچے میں رسالہ جامعہ کے قارئین کرام سے اپیل کیا تھا کہ عمارت کے فنڈ میں اپنے حلقے کی طرف سے کم سے کم ایک ہزار روپے کی امداد عطا فرمائیں۔ آج ہم پھر اس کی یاد دہانی کرتے ہیں جامعہ کا ہر شعبہ اس سعی میں سرگرم ہے کہ اپنی اپنی حیثیت کے مطابق اس مبارک کام میں حصہ لے۔ رسالہ جامعہ نے آج تک کبھی چندے کا کوئی فنڈ نہیں کھولا، اور یہ چیز اس کے مقاصد میں داخل نہیں ہے۔ لیکن موقع ایسا ہے کہ ہم اس قسم کا اپیل کرنے پر مجبور ہو گئے۔ قارئین جامعہ سے التجا ہے کہ جب رسالے کا چندہ بھیجیں تو اس کے ساتھ عمارت کے فنڈ کے لئے بھی تھوڑی بہت رقم روانہ فرمائیں یا جب ان کے شہر میں جامعہ کا وفد پہنچے۔ تو رسالۂ جامعہ کے اپیل کا حوالہ دے کر حسب توفیق چندہ عطا فرمائیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جامعہ

جلد ۲۴ | اپریل سنہ ۱۹۳۵ء | نمبر ۴

فہرست مضامین

محمد مجیب بی اے (آکسن)، پرنٹر و پبلیشر نے جامعہ برقی پریس میں چھپوا کر شائع کیا

یاد رکھنے کی بات

مشہور مصنفین اُردو مثلاً مرزا غالب خواجہ حالی، علامہ شبلی۔ مولانا آزاد۔ مولانا شرر علامہ اقبال۔ منشی پریم چند اور اُردو کے جملہ مصنفین کی بلند پایہ تصانیف و تراجم اور لاہور لکھنؤ، الہ آباد، حیدرآباد، اورنگ آباد، اعظم گڈھ وغیرہ مقامات کی سب کتابیں ہر وقت ہمارے یہاں موجود رہتی ہیں۔ شائقین فہرست طلب فرما کر اپنی پسندیدہ کتابیں منتخب فرمائیں۔

رعایت۔ مطبوعات جامعہ پر محصول ڈاک اور پیکنگ بالکل معاف ہوسکتا ہے بشرطیکہ

(الف) فرمائش مبلغ دو روپے سے کم نہ ہو۔

(ب) رقم بذریعہ منی آرڈر پیشگی ارسال کی جائے۔

مطبوعات جامعہ کے علاوہ دوسری کتابوں پر اس شرط کے ساتھ کہ فرمائش مبلغ (عہ) سے کم نہ ہو اور رقم پیشگی پہنچ جائے محصول ڈاک معاف کیا جائے گا۔ البتہ ان کتابوں پر جو ہمیں بھی کسی خاص رعایت سے نہیں ملتیں یہ ممکن نہ ہوگا۔

ہندوستان کا تعلیمی نصب العین

(فلسفہ تاریخ وتمدن کی روشنی میں)

قبل اس کے کہ ہم ہندوستان کا تعلیمی نصب العین اس کے تمدن کی تاریخی روشنی میں متعین کرنے کی کوشش کریں ہمیں تعلیم کے متعلق مختصراً اپنے خیالات کا اظہار کر دینا چاہیے۔

تعلیم انسان کی فطری قوتوں اور خارجی اثرات کے تعامل سے پیدا ہوتی ہے۔ وہ نتیجہ ہے داخلی اور خارجی دنیا، من تو انسان اور کائنات کے باہمی تاثرات کا۔ انسان کی فطری قوتیں دو قسم کی ہیں۔

۱۔ حیاتی مثلاً ناک، کان، آنکھ، ہاتھ، پیر وغیرہ۔ غرض انسان کا پورا جسم۔

۲۔ نفسی۔ جس میں انسان کی تمام ذہنی اور عقلی، معاشی اور سیاسی، جمالی اور اجتماعی، اخلاقی اور مذہبی قوتیں اور اس کے جذبات اور احساسات وغیرہ شامل ہیں۔

حیاتی اور نفسی قوے تعلیمی عمل کے لیے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر یہ نہ موجود ہوں تو تعلیمی عمل وجود ہی میں نہیں آسکتا۔ اس بنا پر علم النفس سے واقفیت تعلیم سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ انسان کی بنیادی قوتیں ان کی ترقی وتنزل کے اسباب۔ ان کے باہمی تاثرات کے قوانین۔ ان کی نفسی نشو ونما کی مختلف اہمیت وغیرہ کا صحیح علم حاصل کر سکیں۔ روسو اور پیسٹالوزی کا پیدا کردہ خیال اب ایک حقیقت مسلمہ ہے۔ جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

جہاں انسان ان قوے کے ذریعے خارجی دنیا کے اثرات قبول کرتا ہے۔ یعنی اُن کو اپنے نفسی قویٰ کے مطابق ڈھالتا ہے۔ وہاں خارجی قوتیں بھی اس پر اپنا اثر ڈالتی ہیں۔

ان خارجی قوتوں پر ہم تین مختلف عنوانوں کے تحت میں غور کریں گے۔ یعنی

۱۔ تمام کائنات بحیثیت مجموعی۔

۲۔ انسانی تمدن

۳۔ اور ان دونوں کے تحت میں مرتب کردہ ایک مخصوص نظام تعلیم

۱۔ کائنات بحیثیت مجموعی انسانیت کی تعلیم و تربیت میں مصروف عمل رہتی ہے۔ کائنات کا ہر فعل انسانی نفس پر اثر پذیر ہوتا ہے۔ جس سے انسان اپنے آپ کو مطلق آزاد نہیں کر سکتا۔ سیاروں کی گردش، چاند کی چمک آفتاب کا طلوع وغروب۔ زمین کی حرارت و برودت، موسموں کی تبدیلی، فصلوں کی نشوونما، غرض فطرت کی ہر نیرنگی اور ہر تغیر انسان کے جسم اور نفس پر اثر ڈالتا ہے۔

انسانی نفس اُن تاثرات کو ساکت و جامد قبول نہیں کر لیا کرتا بلکہ انھیں اپنے تخلیقی عمل کے تحت میں لاتا ہے۔ اسی لئے مختلف نفوس پر تواس میں فطرت کے مختلف اثرات مرتب ہوتے ہیں عقلیت پسند طبیعتیں فطرت میں عقل کی کار فرمائی دیکھتی ہیں۔ اور وہ علت و معلول کا میکانکی سلسلہ ختم کرنا چاہتی ہیں۔ ثبوتیت صرف تجربے پر اکتفا کرتی ہے اور کسی نفس سے جو خود بھی آزادانہ عمل کر سکے انکار کرتی ہے۔ بخلاف اس کے عینیت تمام فطرت میں صرف مدرک کا جلوہ دیکھتی ہے اور مدرک یعنی خارجی دنیا کو ایک حقیر اور فانی چیز سمجھتی ہے۔

تصور کائنات صرف افراد ہی کا نہیں بلکہ بحیثیت مجموعی اقوام کا بھی ہوتا ہے اور اسی بنیاد پر قوم کے تمام تمدن کی بنیاد ہوتی ہے۔ یہ چیز کسی قوم کے مختلف تمدن کے عناصر میں ایک وحدت اور یگانگت پیدا کرتی ہے۔ وہ تمام قوم کی ذہنی زندگی میں ایک سر رشتہ کا کام دیتی ہے۔ یہ چیز اگر کسی قوم سے جدا کر دی جائے تو وہ اس قافلے کی طرح ہو جاتی ہے جس کا کوئی منزل مقصود نہ ہو اور جو صحرا میں آوارہ پھر رہا ہو اور بالآخر اپنی بے راہ روی کے باعث صحرا کے ہلاکت آفریں جھونکوں سے تباہ و برباد ہو جائے۔

موجودہ جرمن قوم کے تمام ایوان تمدن کی بنیادیں جرمن عینیت پر استوار ہیں۔ ان کے شعرا ان کے فلاسفہ، ان کے داعیان مذہب باوجود گوناگوں اختلافات کے اس مرکزی چیز پر متفق ہیں۔ اسی طرح اہل یونان و روما، اہل چین و جاپان، اہل عرب اور ہند کا ایک مخصوص تصور کائنات رہا ہے۔ جب تک اس تصور میں اتحاد رہا وہ اقوام اپنا ایک مستقل وجود قائم رکھ سکیں۔ لیکن جوں ہی کہ یہ سلسلہ ہاتھ سے چھوٹ گیا

وہ انتشار و ذلت کے گڑھوں میں جاگریں۔

فطرت کی نیرنگیاں چونکہ مختلف افراد اور اقوام پر مختلف اثرات مترتب کرتی ہیں اس لئے تعلیمی نصب العین کے متعین کرنے میں یہ تصور کائنات بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔

۲۔ دوسری خارجی قوت جو انسان پر اپنا اثر ڈالتی ہے اور اس کی تعلیم و تربیت میں حصہ لیتی ہے وہ انسانی تمدن ہے۔ اس قوت سے انسان مقابلتہً کسی قدر آزاد بھی ہوسکتا ہے۔ مگر کلیتاً نہیں۔ تمدن انسان کے مختلف نفسی قویٰ کے خارجی دنیا میں اظہار کے باعث پیدا ہوتا ہے اور پھر یہ خود انسانی نفس پر اثر ڈالتا ہے اور اس کی تشکیل میں ممد یا مزاحم ہوتا ہے۔ انسان کے تمام سیاسی، اجتماعی، معاشی، اخلاقی اور مذہبی نظامات اسی لئے پیدا ہوئے ہیں کہ یہ قوتیں انسان میں موجود رہیں۔ انھیں داخلی قوتوں نے ان نظامات میں خارجی صورت اختیار کرلی ہے حسین بت۔ نازک و لطیف اشعار، رنگ برنگ کی تصاویر۔ عالی شان عمارتیں، روح پرور موسیقی کہاں ہوتی اگر انسان کا جمالی احساس مختلف طریقوں سے خارجی جلوہ اختیار نہ کرلیتا۔

یہ تمدن کا ورثہ انسان کی تعلیم میں مواد کا کام دیتا ہے جس کے ذریعے انسانی قوے کی نشو ونما ہوتی ہے۔ جس طرح تصور کائنات مختلف ہوتے ہیں اسی طرح قوموں کے تمدن بھی۔ بعض اقوام پر جمالیاتی رنگ غالب ہوتا ہے۔ تو بعض پر اخلاقی، بعض پر معاشی اور سیاسی تو بعض پر مذہبی۔ اسی لئے دنیا میں تمدنوں کا یہ تنوع ہے۔ یونانی اور اہل ایران ایک جمالیاتی تمدن کے حامل تھے تو انگلستان اور اہل روم ایک سیاسی تمدن کے چینی ایک اخلاقی تمدن کے علمبردار ہیں تو اہل ہند کا مجموعہ ایک مذہبی تمدن کے۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ دوسرے عناصر مطلقاً کسی تمدن میں موجود نہیں ہوتے بلکہ اس کا صرف اس قدر مفہوم ہے کہ ایک عنصر دوسرے عناصر پر چھایا ہوا رہتا ہے۔ ہم ہندوستانی اپنی ہر معاشی، سیاسی اور اجمالی چیز کو مذہب کی عینک سے دیکھتے ہیں۔ بخلاف اس کے اہل یونان اپنی ہر چیز کو حتیٰ کہ مذہب کو بھی ایک جمالی نقطۂ نظر سے۔ ہمارا اٹھنا بیٹھنا بھی ایک مذہبی فعل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اہل یونان کا خدا کا تخیل بھی ایک متناسب ہم آہنگ اور حسین وجود کا تھا۔

غرض مختلف قومی خصائص کی بنا پر مختلف تمدن ہوتے ہیں اور انھیں کے سایے میں اس قوم کی تعلیم و تربیت ہونی چاہیئے۔ اگر اس کے خلاف کہا جائے تو اس کی مثال یہ ہوگی کہ ہم آم کا درخت سائبیریا کے

برفانی چٹانوں میں اگانا چاہیں جس کے لئے وہ محض نا سازگار ہیں۔
لیکن کسی قوم کا موجودہ تمدن صرف تاریخ ماضی کا ورثہ ہی نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ حال کی تمام تحریکوں اور مستقبل کی تمام امیدوں سے متاثر ہوتا ہے

۳۔ کسی قوم کے تصور کائنات اور تمدن کی بنیادوں پر اس کا تعلیمی نصب العین تعمیر کیا جاتا ہے۔ یہ نصب العین اب اپنے لئے ایک محدود دائرہ عمل اختیار کر لیتا ہے۔ جہاں وہ اپنی تشکیل چاہتا ہے۔ یہ تعلیمی نصب العین اب بلا واسطہ تعلیمی اداروں کے ذریعے جو نظام تعلیم کا اہم جزو ہیں کسی قوم کی موجودہ بچوں کی جسمانی اور نفسی تربیت اس کے تمدن کے سانچے میں کرنا چاہتا ہے تاکہ وہ بعد میں تمدنی زندگی میں حصہ لے سکیں۔ اس کو ترقی کے منازل پر پہنچا سکیں اور اپنے لئے ایک تصور کائنات بنا سکیں۔

یہ ہے ہمارے نزدیک تعلیم کا مقصد جو ساکت و جامد طور پر تاثرات کا قبول کر لینا ، معلومات کا فراہم کر لینا نہیں ہے بلکہ ایک تخلیقی فعل ہے ۔اور جو اپنی تخلیق کے لئے خارجی اشیا میں مواد تلاش کرتا ہے۔

اسی اصول بحث سے یہ ظاہر ہو گیا ہوگا کہ ہم ہندوستان کے بچوں کی تعلیم ان کے اپنے تصور کائنات اور قومی تمدن کی بنا پر کرنا چاہتے ہیں لیکن ساتھ ہی ان تمام مفید تحریکات سے بے نیاز نہیں ہونا چاہتے جو ان کے تعلیم و تمدن پر اثر انداز ہوتی ہیں قبل اس کے کہ ہم اس تعلیمی نصب العین کا صاف صاف تعین کریں ہم کو تلاش کرنا چاہئے کہ وہ کون سے تصور کائنات ہیں جن پر ہمارے ہندوستانی تمدن کی بنیاد استادہ ہے۔ ہمارے تمدن کے کیا عناصر ہیں، ان کے اوپر کون سا رنگ غالب ہے اس تمدن کے کون سے عناصر بحیثیت مجموعی انسانیت کے ارتقا میں مضر اور مفید ہیں۔

ہندوستان میں چند زبردست قوتیں کارفرما ہیں۔ جو ہندوستان کے تمدنی نصب العین اور اس کے تحت میں اس کا تعلیمی نصب العین متعین کریں گی۔ ان قوتوں کا تاریخی روشنی میں ہم مطالعہ کریں گے۔ ان کے مخصوص خصائص کا ہم ذکر کریں گے۔ ان کے متضاد عناصر کو دیکھیں گے اور ہم اپنے عصر کے لئے ایک تمدن اور تعلیمی نصب العین متعین کرنے کی کوشش کریں گے۔

ہماری یہ کوشش اس عقیدے پر مبنی ہے کہ جس طرح ہر قوم کا ایک علیحدہ تمدنی نصب العین ہوتا ہے

اسی طرح ہر عصر کا بھی ایک علیحدہ تمدنی اور تعلیمی نصب العین ہوتا ہے ۔ یہ نصب العین نتیجہ ہوتا ہے ماضی کی روایات حال کی ضروریات اور مستقبل کی امیدوں کا ۔

ہندوستان کی ابتدائی تاریخ میں جو آریاؤں کا تعلیمی نصب العین تھا وہ اب ہمارے لئے کافی نہیں ہے چونکہ وہ نتیجہ تھا خاص ضروریات اور مخصوص تخیلات کا ۔ عہد عباسیہ کا تعلیمی نصب العین بھی جو درس نظامی کی شکل میں اب تک ہمارے یہاں موجود ہے ہمارے لئے مفید نہیں ہے ۔ اس وقت ایک خاص طرز کی اسلامی حکومت قائم تھی اور اسلامی علوم اور یونانی علوم و فنون کا امتزاج ہو رہا تھا ۔ یونانی علوم و فنون بہت کچھ غلط ثابت ہو چلے ہیں اور ہم انھیں فرسودہ بنیادوں پر اپنے نظام تعلیم کی بنیاد نہیں رکھ سکتے ۔

یورپ میں اٹھارویں صدی عیسوی میں عقلیت چھائی ہوئی تھی ۔ نہ صرف فلسفہ بلکہ ہر مسئلہ کا حل عقل کے ذریعے ڈھونڈا جاتا تھا ۔ اور یقین کیا جاتا تھا کہ عقل تمام عقدہ ہائے کائنات کو سلجھا سکتی ہے ۔ مذہب عقلی استدلال کا نتیجہ تھا ۔ اس بنا پر وہاں کا تمدنی اور اس کے ساتھ تعلیمی نصب العین عقلیت پر رکھا گیا اور صرف عقل کی نشو و نما تعلیمی اداروں کا مقصد قرار پایا ۔ انیسویں صدی عیسوی میں اس دور کی بجائے ایک نامی دور ظہور پذیر ہوا اب صرف عقل کی نشو و نما پر بھی زور دیا جانے لگا مختلف صورتوں میں یہ خیال اب تک قائم ہے اس لئے وہی تعلیمی نصب العین گو کہ اس میں بہت کچھ تغیر اور گہرائی پیدا ہوئی چلا جا رہا ہے ۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر دور میں خاص تحریکیں زور پکڑ جاتی ہیں اور انسانی نفس کے خاص عناصر کا غلبہ ہوتا ہے مثلاً کبھی شعوری عناصر کا تو کبھی غیر شعوری کا ۔ یعنی کبھی عقل کا تو کبھی مذہب کا ، کبھی اجتماعیت کا ۔ تو کبھی انفرادیت کا ۔ بقول ہیگل ہر اثبات ایک نفی پیدا کرتا ہے ۔ جو خود بخود امتزاج ڈھونڈھتی ہے ۔ ایک توجیہہ یہ ہو سکتی ہے ۔ بہر صورت فلسفۂ تاریخ اب تک اس گتھی کو کماحقہٗ سلجھانے سے عاجز ہے ۔ انھیں تحریکات کے باعث جہاں تمدنی نصب العین تبدیل ہوتا ہے وہاں تعلیمی بھی ۔

جس طرح دنیا ہر لحظہ تغیر پذیر ہے نظامات تعلیم بھی ۔ اگر کوئی چیز نامی اور زندہ ہے تو یہ ضرور ہوگا ۔ ہمیں سکون اور استقلال کی اس طرح تلاش نہ کرنی چاہیئے ۔ تاہم ایک عرصے کے لئے عام بنیادی خیالات زندگی کے لئے کافی ہوتے ہیں اور انھیں کا ہمیں مطالعہ کرنا چاہیئے ۔

اوپر کہا جا چکا ہے کہ تعلیم کا مقصد انسانی جسم و نفس کا کُلی نشو و نما ہے۔ ہر وہ تحریک یا اس تحریک کے عناصر جو اس نشو و نما میں مدد پہنچائیں تعلیم کے لئے مفید ہیں اور باقی مضر۔ ہر زمانے کی تحریکات سے ہم کو تعلیم کے لئے تعمیری اجزا کو لے لینا چاہئے اور تخریبی کو علیحدہ کر دینا چاہئے۔

جس طرح ہر اعلیٰ نظام تعلیم کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایک مخصوص تصور کائنات اور ایک مخصوص تمدن کا تخیل پیش نظر رکھے اس طرح ہر بڑی تحریک کا جو زندگی کی گہرائیوں سے اٹھتی ہے، ایک مخصوص نظام تعلیم بھی ہوتا ہے۔ وہ اپنے تصور کے مطابق انسانیت کی اسی طرح تعلیم و تربیت کرنا چاہتی ہے۔ ہمیں ہندوستان کی موجودہ عظیم الشان تحریکوں سے ان کے تعلیمی عناصر اور اس کی تعلیمی تحریکوں میں سے اس کے تصور کائنات پیدا کر کے دکھانا ہے تاکہ ہم ایک مشترک ہندوستان کے تعلیمی نصب العین مرتب کر سکیں۔

ہندوستان میں اس وقت چار زبردست تحریکیں جاری ہیں یا بالفاظ دیگر چار اہم قوتیں ہیں جو ہمارے لئے تعلیمی عنصر کا کام دے سکتی ہیں۔ یعنی

۱۔ ہندویت

۲۔ اسلام

۳۔ قومیت اور

۴۔ انسانیت

ہمیں ان چاروں تحریکوں میں تلاش کرنا ہے کہ ان کے کون سے عناصر شخصیت کے ارتقا میں مفید ہیں اور کون سے مضر

۱۔ ہندویت۔ ہندویت ہندوستان میں سب سے زیادہ اب تک حاوی رہی ہے۔ اور اس وقت بھی ہے۔ ہمیں اس وقت اس ہندویت سے بحث نہیں ہے۔ جو وہ گذشتہ زمانے میں رہ چکی ہے۔ بلکہ ہم اسے موجودہ ہندوستان کے ایک تمدنی عنصر کی حیثیت سے دیکھنا چاہتے ہیں۔

ہندویت کی توضیح کرنا بہت مشکل امر ہے۔ یہ کوئی خاص مذہب نہیں ہے۔ کیونکہ اس میں بہت سے مذاہب شامل ہیں۔ توحید سے لے کر سینکڑوں بتوں کی پرستش اس میں پائی جاتی ہے۔ جہاں اس میں نہایت

اعلیٰ فلسفیانہ نظام ہیں وہاں اس میں نہایت لغو قسم کی رسوم بھی شامل ہیں جو فطرت کی توہم پرستی پر مبنی ہیں۔ اس کی ابتدا آریاؤں نے کی تھی جو فاتحانہ طور پر ہندوستان میں داخل ہوئے۔ جنھوں نے نہ صرف اپنی حکومت قائم کی بلکہ اپنے مذہب کو بھی جو فطرت کی پرستش پر مبنی تھا یہاں رائج کر دیا۔ لیکن خود ان کا مذہب بھی مفتوحین کے عقائد سے اثر قبول کئے بغیر نہ بچ سکا۔ باوجود اس تاثر کے پھر بھی ہندو مذہب جس کو آریا مذہب کہنا زیادہ موزوں ہے ایک اشرافیت مذہب رہا جس نے اپنا سر رشتہ ہمیشہ راجاؤں سے قائم رکھا اس نے اپنی یہ مذہبی اور نسلی اشرافیت اور ذات پات کی قیود برہمنوں کے علیحدہ طبقے کے قیام کی غرض سے قائم رکھیں۔

مابعد الطبیعاتی مسائل سے ہندو قوم کو ہمیشہ دلچسپی رہی ہے۔ اور ان کے فلسفیانہ نظام عقل کی کوششوں کے بہترین ثمرے ہیں۔ باوجود اس فلسفیانہ شغف کے مذہب ان کی فطرت کا جز رہا۔ وہ مذہب جو عقلیات پر مبنی اور بہت کچھ مابعد الطبیعاتی غور و فکر کا نتیجہ تھا۔

ان خصائص کے جہاں اچھے نتائج مرتب ہوئے۔ وہاں بہت کچھ مضر بھی۔ مثلاً نسلی، علمی اور مذہبی تفوق کے جذبے نے عوام کو اونچے لوگوں کے طبقے سے بالکل بیگانہ کر دیا۔ اور ذات پات کی تفریق نے جو شروع میں معاشی ضروریات پر مبنی تھی منو کے قوانین کے مطابق ایک مذہبی شکل اختیار کر لی۔ بدھ مت کی تحریک ایک اعلان بغاوت تھی اشرافیت کے خلاف مگر وہ خود فنا ہو گئی اور اس کے پائدار اثرات نہ رہ سکے۔ بدھ مذہب کی اخلاقی جمہوریت کی بجائے دوبارہ شنکر اچاریہ کے فلسفے نے اپنا اثر جما لیا جو اشرافیت کی حمایت میں تھا۔

بدھ مت کے بعد دو تحریکوں کے اثرات ہندویت پر کسی قدر پائدار مترتب ہو سکے یعنی اسلام اور عیسائیت۔ اسلام سے تصادم کے باعث ہندویت کے لاشے میں ایک نئی جان پڑ گئی۔ وہ قوم جو تمام دنیا سے الگ تھلگ گوشہ نشینی میں زندگی گذار رہی تھی پھر ذہنی غور و فکر کی طرف متوجہ ہوئی توحید کے دھندلے سے خیالات ہندومت میں مفقود نہ تھے۔ لیکن پہلے وہاں اس خیال نے ایک ہمہ اوست کے عقیدے کی شکل اختیار کر لی تھی ہندو دھرم یا بھگتی کی تحریک جو عقیدۂ توحید پر مبنی ہے اسلام کی مرہون منت ہے۔ اس کے بعد پھر تو بہت سی تحریکیں پیدا ہوئیں جو توحید کے عقیدے پر ہندومت اور اسلام کو ایک کرنا چاہتی تھیں مثلاً گرونانک

اور کبیر کی تعلیمات اور جدید زمانے میں رام موہن رائے کی تحریک برہمو سماج کا قیام - برہمو سماج پر جس قدر اسلام کے اثرات مترتب ہوئے اسی قدر عیسائیت کے بھی - آریہ سماج کی تحریک ہندو دھرم کو دوبارہ اس کی اصلی قدیم حالت میں دیکھنا چاہتی - وہ اسلام کے خلاف جس کو وہ خارجی عنصر سمجھتی ہے پیدا ہوئی مگر اپنے احیا کے لئے اس نے اسلام کا نمونہ اپنے سامنے رکھا - مثلاً ایک پرشیور کا تخیل چاہے وہ حقیقی توحید سے کتنا ہی مختلف کیوں نہ ہو - ایک کتاب اور ایک دھرم جو بغیر ذات پات کے ہو قائم کرنے کی کوشش -

نہ صرف اسلام کا ہندویت کے مذہبی تصورات پر بلکہ بحیثیت مجموعی اس کے تمام تمدن زندگی پر اثر پڑا - اسلام کے بعد سب سے زیادہ اثر اس پر مغربیت کا پڑا - مغربیت کے دو اہم عناصر تھے - ایک عیسائیت دوم وہ تمدن جس نے وطنیت کے تخیل کے زیر سایہ نشوونما پائی عیسائیت کا اثر اس قدر زیادہ نہیں پڑا - جس قدر کہ وطنیت کا - اس تخیل کے تحت میں ہندوستان میں ایک ایسا گروہ پیدا ہوا جو ہندوستان کو مغربی وطنیت کے رنگ میں رنگ دینا چاہتا تھا - وہ اپنے ماضی کو فراموش کر کے صرف مستقبل کی طرف دیکھنا چاہتا ہے اور مستقبل کی کامیابی اس کے نزدیک مغرب کی تقلید میں مضمر تھی - گو سطحی خیال کا اثر بہت جلدی کم ہو گیا اس کے بعد ایک ایسے خیال نے ہمہ گیر رنگ اختیار کر لیا جو وطنیت کا قائل ہے ۱ اس کو اپنے ماضی کی روایات پر قائم کرنا چاہتا ہے، جو ہندو دھرم اور تہذیب کو برقرار رکھنا چاہتا ہے - گروہ ہندویت جو وطنیت کے تخیل میں ممد ہو - جس کی وطنیت کے قصر کی تعمیر میں بنیاد کا کام دیں - ٹیگور اور گاندھی کے یہی بنیادی خیالات ہیں - گو کہ دونوں میں جزوی اختلافات موجود ہیں - ٹیگور کی نظریں زیادہ تر مستقبل کی طرف اٹھتی ہیں بہ خلاف گاندھی کے جو بہت حد تک عہد ماضی کو زندہ کرنے کے درپے ہیں - ٹیگور ہندوستان کے تمدنی نصب العین کو حال کی تحریکوں سے زیادہ متاثر کرنا چاہتا ہے - مگر گاندھی کے نزدیک ہندویت اصلی مطمح نظر اور انسانیت کا تخیل ایک ہی چیز ہے -

اس مختصر سی تاریخی نظر سے واضح ہو گیا ہو گا کہ ہم ہندویت کو ایک مرکب گوناگوں تحریکوں کا سمجھتے ہیں - جس میں کئی ہزار برس کے تاریخی اثرات بھی شامل ہیں اور جدید تحریکات بھی - اس میں تعمیری عناصر بھی ہیں ۱۱۰ تخریبی بھی

وہ تحریک جو ہندویت کو بعینہٖ آج سے ہزاروں برس پہلے کی شکل میں دیکھنا چاہتی ہے اس بنا پر غلط ہے کہ وہ حال اور مستقبل کی قوتوں سے بیگانہ ہو جانا چاہتی ہے۔ وہ تحریک جو بلا کسی وطنی اور قومی امتیاز کے ایک عام سطحی انسانیت پیدا کرنا چاہتی ہے۔ وہ بھی اس بنا پر غلط ہے کہ وہ اپنے ماضی کو فراموش کر دینا چاہتی ہے۔ اور اس تمام تمدن کے قصر کو جو صدیوں کی کاوش کا نتیجہ ہے اور جو ہندوستان کے خاص خصائص کا مظہر ہے برباد کر دینا چاہتی ہے۔

اول الذکر تحریک کے باعث بحیثیت مجموعی انسانیت کے نشو و نما سے ہم محروم ہو جاتے ہیں دوسری تحریک کے باعث ہندو نفس کو اپنے مخصوص اور امتیازی کیفیات کے اظہار کا موقعہ نہیں ملتا جو انسانیت کے لئے اسی قدر ضروری ہے۔

ظاہر ہے کہ صرف ایک تیسری صورت جو دونوں کے امتزاج پر مبنی ہو صحیح ہو سکتی ہے یعنی ایک ایسا وطنیت کا تخیل جو ہندویت کے ان بہترین اخلاقی اور بحیثیت مجموعی ان تمام اعلیٰ تمدنی روایات پر مبنی ہو جو ہندوستان میں ایک قومیت کے قیام میں ممد ہو سکیں صرف یہی تحریکیں ہمارے موجودہ نصب العین میں ایک زبردست عنصر کا کام دے سکتی ہے۔

۲۔ اسلام :۔ دوسرا اہم عنصر ہندوستان کے تعلیمی نصب العین کے متعین کرنے میں اسلام ہے۔ وہ اسلام جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں چودہ سو برس کی تاریخ کا۔ دنیا کی ہر تحریک کی طرح اسلام بھی بہت سی تحریکوں سے متاثر ہوا اور مختلف ممالک میں مختلف تحریکوں سے امتزاج کے باعث اس نے مختلف شکلیں اختیار کر لیں۔

اسلام بغاوت ہے بت پرستی اور شرک کے خلاف۔ اس نے صرف ایک خدائے واحد پر ایمان لانے کی تعلیم دی تھی اور اس کی مابعد الطبیعاتی تشریحات سے منع کر دیا تھا۔ وہ اخلاقیات کا ایک صاف اور سادہ نظام تھا اور اس کے احکامات کی بنیادیں جمہوریت پر رکھی گئی تھیں۔ یہ اس مذہب کی بنیادیں، ایمان و ایقان، عمل و جدوجہد پر رکھی گئی تھیں۔ فلسفیانہ غور و فکر اور گوشہ نشینی پر نہیں لیکن جونہی کہ اس دین کو ان اقوام نے قبول کیا جن کی سرشت میں فلسفیانہ غور و فکر تھا جن کو فطرت

نے ماقوق الطبیعی مسائل پر غور کرنے کے لئے پیدا کیا تھا جن میں مذہبی عنصر کی بجائے عقلی عنصر غالب تھا اسلام میں بھی یہ عناصر شامل ہوگئے ۔ ایک طرف یونانی علوم وفنون کے اثر سے عہد عباسیہ میں فلسفیانہ غور وفکر اسلام میں داخل ہوگیا ۔ اب صرف خدا پہ یقین کرنا نہیں تھا ۔ بلکہ اس کی ماہیت اور اس کی صفات کا بھی پتہ چلانا ۔ ارسطو کے فلسفے سے جس کو مسلمان غلط سمجھے ۔ اسلام میں عقلیت کی تحریک پیدا ہوئی اور اسلامی علم الکلام کا مقصد عقلی دلائل سے اسلامی احکامات کی حمایت کرنی تھی ۔ اخوان الصفا کی تحریک اس سے بھی زیادہ عقلیت پر مبنی تھی ۔ جن کے نزدیک تمام مذہبی احکامات کے لئے عقل معیار صداقت تھی ۔

دوسری نوفلاطونی ، ایرانی اور ہندی اثر سے تصوف نے بھی اسلام میں ایک مکمل نظام کی صورت اختیار کرلی ۔ قرآن کی تعلیمات میں جس طرح عقلیت کے عناصر پائے جاتے ہیں ۔ اسی طرح تصوف کے بھی ۔ جہاں شعوری طور پر عقلی قوانین کی بنا پر کائنات کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے وہاں لا شعوری طور پر کائنات کو محسوس کرنے کا خیال بھی موجود ہے ۔ بنیادی خیال ان سب میں مسئلہ توحید تھا ۔ ایک خدائے واحد کا یقین ۔ یعنی تمام کائنات کے لئے ایک واحد مقصد اور نصب العین کا خیال ۔ چاہے اس کی مابعد الطبیعاتی تشریح انسانی عقل اور روشنی کے مطابق کچھ ہی کیوں نہ ہو اس کی فلسفیانہ تشریح ہر زمانے کے علوم وفنون کی ترقی پر منحصر ہو جن کی بنیادوں پر فلسفہ ایک تصور کائنات قائم کرتا ہے ۔ جس قدر کہ علوم وفنون ترقی کرتے جاتے ہیں اس تصور میں وسعت اور جامعیت پیدا ہوجاتی ہے ۔ بقول کانٹ عقل کا یہ خاصہ ہے کہ وہ مابعد الطبیعاتی کی گتھیوں کو سلجھانے میں الجھے ، اور جب تک انسان میں عقل موجود ہے وہ اپنی کاوشوں سے باز نہیں آسکتا ۔ اسی لئے انسان ہمیشہ اپنی ذہنی تسکین کے لئے فلسفیانہ نظامات بناتا رہے اور بناتا رہے گا ۔

اس کے علاوہ اسلام کی مذہبی اور اخلاقی تعلیمات کا عملی نمونہ یعنی رسول اللہ کا اسوۂ حسنہ مسلمانوں کے لئے ہمیشہ شمع ہدایت کا کام دیتا رہا ۔ نہایت متضاد مابعد الطبیعاتی خیالات رکھنے والے ائمہ اسلام مثلاً ابن رشد جو عقلیت پسند تھے اور فلسفۂ ارسطو کے متبع اور امام غزالی جنھوں نے

اسلام کی بنیاد اسی تصوف پر استوار کی ہے۔ امام حنبل جنھیں قرآن کے ظاہری اور لفظی معنی پر ایمان لانے میں حد درجہ غلو تھا حتیٰ کہ خدا کی جسمانیت تک کے قائل تھے اور اخوان الصفا جو عقلیت پسند تھے اور بہت زیادہ تاویل کے قائل تھے۔ رسول اللہ کے اسوۂ حسنہ کے اتباع پر متفق ہیں۔

ہندوستان میں اسلام عقلیت کی تحریکوں سے زیادہ تصوف سے متاثر ہوا۔ جہاں کروڑوں ہندوستان کے باشندوں نے اسلام قبول کیا۔ وہاں انھوں نے اپنے خیالات بھی اس میں شامل کر لئے۔ اسلام میں بھی ایسی تحریکیں پیدا ہوئیں جو دونوں مذاہب کو یکجا کرنا چاہتی تھیں جس میں خاص طور پر دکن میں ست پنتھوں کی تحریک ہے۔ لیکن مذہبی اعتبار سے ہندویت نے اسلام پر بہت ہی تھوڑا اثر کیا۔ بخلاف اس کے ہندویت خود اسلام سے بہت زیادہ متاثر ہوئی ہے۔ البتہ تمدنی اعتبار سے مسلمانوں کا اثر ہندوؤں پر کافی پڑا ہے۔ شعر و شاعری۔ موسیقی رسم و رواج غرضکہ ہر جگہ اسلام پر ہندویت کا اثر نظر آتا ہے

دوسرا اثر مسلمانانِ ہند پر اہلِ مغرب کا ہوا۔ اس تصادم سے مسلمانوں میں قومیت کا خیال پیدا ہوا۔ شروع میں تو یہ خیال سوائے اس کے کچھ نہ تھا کہ اسلام کو اس کے چودہ سو برس پہلے کے رنگ میں دوبارہ زندہ کیا جائے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ خیال مسلمانوں نے اہلِ مغرب سے لیا ہے کیونکہ رسول اللہ نے خود ایک عرب قوم کی تعمیر کی تھی مگر اس عصرِ جدید میں جو چیز حرکت کا باعث ہوئی۔ وہ یقیناً طوفانِ مغرب ہے۔ سرسید اور ان کے معاون اس خیال کے بانی مبانی ہیں۔ اور اس تحریک کو عموماً علیگڈھ کی تحریک سے موسوم کیا جاتا ہے۔ حالی اور اقبال کی شاعری میں اس کی ترجمانی کی گئی اور بحیثیت مجموعی یہ خیال اب تک مسلمانوں پر حاوی ہے۔

قومیت اور وطنیت کا دوسرا مفہوم یعنی یہ کہ اہلِ مغرب کی اندھی تقلید کی جائے خوش قسمتی سے مسلمانانِ ہند میں تقریباً کوئی جگہ نہ پا سکا۔ چاہے یہ خیال دوسرے ممالک اسلامیہ پر کتنا ہی مسلط کیوں نہ ہو گیا ہو اس معاملے میں مسلمانانِ ہند۔ ہندوؤں سے زیادہ صحیح اصولوں پر قائم رہے ہے۔

تیسرا خیال جو مسلمانانِ ہند میں پیدا ہو رہا ہے وہ یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات اور روایات پر

قائم رہتے ہوئے ہندوستانی قوم کی تشکیل میں مدد ہوں۔ ماضی کو ہم بھلانہ دیں لیکن مستقبل کی طرف سے چشم پوشی بھی نہ کی جائے۔

ایک ادارے کی حیثیت سے جامعہ ملیہ اسلامیہ ان خیالات کی حامی ہے جس کی تشکیل میں مولانا محمود الحسن اور حکیم اجمل خاں، مولانا محمد علی اور مولانا ابوالکلام کا ہاتھ شامل ہے۔ اور جس کی باگ اس وقت ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو زمانے کی صحیح ضروریات کا احساس رکھتے ہوئے مسلمانوں کے بہترین رہبر ہیں۔

غرض وہ اسلام جس کو ہم اپنے تمدنی اور تعلیمی نصب العین کا اہم جزو سمجھتے ہیں نتیجہ ہے بہت سے تاریخی اثرات کا۔ گوکہ بنیادی اصول وہی ہیں جو رسول اللہ نے یہ حکم دحی قائم فرمائے تھے۔

ہمارا نصب العین ہے کہ اسلام اور سب سے زیادہ شخصیت کی نشوونما میں مدد پہنچا سکتا ہے اور اس چیز کی اجتماعی شکل یعنی قومیت کے قیام میں بھی ایک مخصوص قوم کو اس کے مخصوص ماحول کے مطابق نشوونما دیتا ہے۔

۲۔ قومیت:۔ ہم نے اب تک قومیت کا ضمناً ہندویت اور اسلام کے سلسلے میں ذکر کیا ہے لیکن اب ہم اس پر ایک مستقل تمدنی تحریک کی حیثیت سے نظر ڈالیں گے اور بتائیں گے کہ ہمارے تعلیمی نصب العین کے تعین کرنے میں اس کا کس قدر گہرا اثر ہے۔ ہندوستان میں قومیت کا تخیل کچھ نیا نہیں ہے۔ عہد قدیم سے ہندوستان کے شعرا فلاسفہ اور شہنشاہ اس کے خواب دیکھتے آئے ہیں۔ جس میں کبیر، نانک اور اکبر اعظم خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ لیکن جدید زمانے میں جس چیز نے اسے قوت دی وہ مغربی اقوام سے تصادم تھا خاص طور پر انگریزوں سے۔ ہندوستان میں قومیت کے قیام کے لئے ضروری عناصر میں سے بعض موجود تھے اور بعض مفقود۔ ان سے بعض ایسی تحریکیں پیدا ہوئیں جو ہندوستان کی قومیت کے لئے مفید تھیں۔ مگر اس کے ساتھ بعض ایسی بھی وجود میں آئیں جو مضر تھیں

نسل، مذہب، زبان، تاریخ، معاشی اور سیاسی مفاد۔ اور سب سے آخر مگر سب سے اہم تر

باہم متحد ہونے کا جذبہ عموماً قومیت کی تعمیر میں اہم عناصر خیال کئے جاتے ہیں۔ مختلف تحریکوں نے مختلف عناصر پر زور دیا۔ چنانچہ مختلف قسم کی تحریکات پیدا ہوئیں جن کا ہم اجمالاً ذکر کر چکے ہیں۔ وہ تحریکیں یہ ہیں

۱۔ قومیت کی وہ تحریک جو بعض مغربی اقوام کی تقلید میں صرف معاشی اور سیاسی مفاد کو قومیت کی بنیاد قرار دینا چاہتی ہے۔

۲۔ قومیت کی وہ تحریک جو اپنی بنیاد صرف تاریخ ماضی پر رکھنا چاہتی ہے۔

۳۔ قومیت کی وہ تحریک جو مستقبل کے مقاصد کو پورا تو کرنا چاہتی ہے مگر ساتھ ہی ساتھ گذشتہ تاریخ کی ان روایات کو لے لینا چاہتی ہے جو صحیح قومیت کی تعمیر میں ممد ہوں۔

ان مختلف تحریکوں کے اثر سے مختلف تعلیمی نصب العین اور ہر نصب العین کے تحت میں الگ الگ تعلیمی ادارے قائم کئے گئے۔ انگریزوں کا ہندوستان میں انگریزی تعلیم کے رواج دینے میں اس سے زیادہ کچھ مقصد نہ تھا۔ کہ وہ اپنی حکومت کے مشین کے لئے پرزے بہم پہنچائیں۔ لیکن اس انگریزی تعلیم کے ذریعے ہندوستانی نوجوان مغربی علوم و فنون سے واقف ہو گئے اور ان میں مغربی انداز پر ہندوستان میں ایک قوم پیدا کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ انگریزی نظام تعلیم کے تخریبی پہلو کو نظر انداز کر کے صرف تعمیری پہلو پر نظر ڈالی جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ وہاں سے ایسے لوگ پیدا ہوتے جو ہندوستان میں مغربی وضع کی قومیت کا قیام چاہتے تھے۔ مسلمانوں میں انگریزی تعلیم نے سرسید کی کوششوں کے باعث رواج پایا۔ سرسید کے پیش نظر تقریباً ایک صحیح تعلیمی نصب العین تھا جو مذہب اور مغربی علوم کے صحیح امتزاج پر مبنی تھا۔ مگر نہ وہ نہ اور ان کے بعد آنے والے زمانے کی رو کا مقابلہ کر سکے اور مسلمانوں کی تعلیم بھی صرف اس زمانے کے انگریزی نظام تعلیم کی اندھی تقلید ہو کر رہ گئی۔

دوم قومیت کی وہ تحریک جو ماضی پر اپنی بنیادیں رکھنا چاہتی ہے اس نظام تعلیم کا باعث ہوئی جس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلافات کو اور بڑھا دیا۔ حقیقتاً اس تحریک کو ہم ہندوستانی قومیت کی تحریک کہہ نہیں سکتے۔ مگر لفظ قوم کا ہمارے یہاں استعمال بہت مختلف فیہ ہے اور اب تک یہ لفظ اس معنی کے لئے مخصوص نہیں ہوا ہے جس میں ہندو اور مسلمان ایک متحدہ قومیت کے عناصر سمجھے جائیں۔

ہندوؤں میں آریہ سماجیوں نے آریہ ورت کے پرانے نظام تعلیم کو زندہ کیا، اور مسلمانوں نے اس نظام تعلیم کا دوبارہ احیا کیا جو ان کے مخصوص تمدن کی پیداوار تھا اور ان کے مخصوص مذہبی ضروریات کو پورا کرتا تھا اس تحریک کو ہم عموماً دیو بند کی تحریک سے موسوم کرتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ متضاد چیزیں تھیں۔ اس سے ہندوستان کی متحدہ قومیت کا خیال پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔

پہلے اور دوسرے تعلیمی نصب العین کے جو مضر نتائج مرتب ہوئے ان سے ایک نئے اور جامع نصب العین کی طرف توجہ دلائی۔ ایک طرف تو مغرب کی اندھی تقلید کے باعث ہماری نسلیں ہندوستان کی بہترین روایات سے بے پروا ہو گئیں۔ دوسری طرف صرف یکطرفہ مذہبی فرقہ وارانہ تعلیم کے باعث متعصب اور کوتاہ نظر، تیسرا تعلیمی نصب العین ان خامیوں کو دور کرنا چاہتا ہے۔ جہاں وہ ایک متحدہ تمدنی نصب العین کا مظہر ہے۔ وہاں اس تمدن پر اثر ڈال کر اس کو اور زیادہ موثر بھی بنانا چاہتا ہے۔ اس کے باعث ہندوستان میں مختلف قومی مدارس قائم ہوئے۔ ظاہر ہے ان مدارس میں ہندو اور مسلمانوں کی بہترین روایات کی حفاظت اور تعلیم ہی چاہیئے۔ لیکن اسی طرح کہ وہ ایک متحدہ ہندوستان کی قومیت میں مفید ثابت ہوں مضر نہ ہوں۔ ہمارا خیال ہے کہ اسلام کی بنیادی روح اور ارکان ہندوستان کی قومیت میں ممد ہیں مضر نہیں۔ یہ ہندوستان کے قصر قومیت کو اور زیادہ حسین اور دل کش بنانے کا باعث ہوں گے۔ خدائے واحد کا تخیل، جمہوریت اور عالمگیر برادری کا خیال۔ صاف اور سادہ اخلاقی تعلیمات توہم پرستی کی مخالفت اور حقیقت پسندی کا ذوق، نظام اجتماعی وغیرہ۔ اسلام تعلیم کے وہ بے بہا جواہر ہیں۔ جو ہندوستانی قومیت کی تعمیر میں بہترین عناصر ثابت ہو سکتے ہیں۔ اس طرح ہندوؤں کی فلسفیانہ نظر ان کے غور و فکر کی گہرائی، ان کی ریاضی، ان کا جمالی احساس۔ جس کا اظہار ہندوستان کے فنون لطیفہ میں ہوتا ہے۔ ہمارے لئے بیش بہا اجزا ہیں جن کے بغیر ہمارا آئندہ قومی تمدن محض ایک بے جان چیز ہوگا۔

ایسے قومی مدارس میں ہندو اور مسلمانوں کو اس طرح تعلیم ہونی چاہیئے کہ وہ ایک دوسرے کے

اچھے پہلوؤں سے واقف ہوسکیں۔ قومی تعلیم کے خیال کے ساتھ مشترک زبان کا خیال پیدا ہونا لازمی امر تھا۔ اور وہ مشترک زبان صرف وہی ہوسکتی ہے جو کسی قوم کے تمام ارکان کی نہیں تو کم از کم اکثریت کی زبان ضرور ہو۔ ہر قوم اپنے عمیق ترین جذبات اور احساسات کا اظہار صرف اپنی مادری زبان میں کرسکتی ہے۔ جس طرح جسم بغیر روح کے زندہ نہیں رہ سکتا اسی طرح کسی قوم کی ذہنی زندگی اس کی اپنی زبان کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی ہر قوم اپنا تصور کائنات صرف اپنی زبان میں بدرجہ اتم ظاہر کرسکتی ہے۔ زبان کے متعلق میکانکی نقطۂ نظر غلط ہے۔ زبان ایک نامی چیز ہے جہاں وہ ذہنی زندگی کے اظہار کا ذریعہ ہوتی ہے۔ وہاں وہ خود ذہنی زندگی کی پیداوار بھی ہوتی ہے۔ ہندوستان میں قومیت کے خیال کے ساتھ قومی زبان کا خیال بھی پیدا ہوا، اور قومی تعلیم صرف قومی زبان یعنی ہندوستانی ہی کے ذریعے ممکن ہوسکتی ہے۔ دوسرا اہم مسئلہ اس کے ساتھ لازمی ابتدائی جبریہ تعلیم کا پیدا ہوتا ہے۔ قومیت کا صحیح ارتقا ممکن نہیں ہے جب تک کہ کسی قوم کے تمام ارکان بغیر تمیز کے اپنی نشوونما کے موقع نہ پائیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ بغیر مفت اور عام ابتدائی تعلیم کے نہیں ہوسکتا جو پورے تعلیمی قصر کی بنیاد ہے اور قوم کی تعمیر میں غالباً سب سے اہم ضرورت۔

ہم جب اس قدر متحدہ قومیت پر زور دے رہے ہیں تو اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ پھر کیوں تعلیم ایک نہ کردی جائے تاکہ یہ تفریق ہی مٹ جائے۔ لیکن ہمارا مقصد مختلف اقوام کے مخصوص خصائص کو فنا کرنا نہیں ہے بلکہ اُن کے بنیادی امتیازات کو باقی رکھنا ہے۔ لیکن اس طرح کہ وہ متحدہ عمارت کے لئے باعثِ خوش نمائی ہوں۔ ہندو قوم زیادہ تر فلسفہ اور عقلیات سے دلچسپی رکھتی ہے بخلاف اس کے مسلمان ایمان و ایقان سے۔ شخصیت کے یہ دونوں اہم پہلو ہیں۔ اور دونوں اقوام نے اپنے مخصوص رنگ میں اس کا اظہار کیا ہے۔ ان کا تلف کرنا گویا کہ انسانیت کی ایک اہم قوت کو نشوونما سے روکنا ہے۔ ہم مشین کی طرح ایک ہی قسم کی اینٹیں بنانا نہیں چاہتے بلکہ شخصیتیں پیدا کرنا چاہتے ہیں جو نامی اور زندہ ہوں۔ خدا اپنی خدائی کا مظاہرہ یکسانیت سے زیادہ تنوع میں کرنا چاہتا ہے۔ اللہ کے باغ میں بہت سے رنگ برنگ کے پھول اور پھلوں کی ضرورت ہے۔ تاکہ اس کی خوش نمائی اور حُسن دوبالا ہو۔ ہندو اور مسلمان باوجود اپنے اختلافات کے ایک اور اعلیٰ مرکز پر متحد ہوسکتے ہیں یعنی یہ کہ دونوں میں ایک مافوق الطبیعی جذبہ پایا جاتا ہے

جو ایک مذہبی شکل اختیار کر لیتا ہے گو کہ ایک تشفی قلب ایمان کے ذریعے چاہتا ہے۔ اور دوسرا فلسفیانہ فکر کے ذریعے سے۔

مختصر یہ کہ ہندوستان کی قومیت کے تخیل اور اس کے تحت میں اس کا قومی تعلیم کا نصب العین مندرجہ ذیل عناصر پر استوار ہونا چاہیے۔

۱۔ اس تصور پر جو کائنات میں ایک مقصد اور وحدت دیکھتا ہے جس کو ہم مذہبی اور مافوق الطبیعی جذبے سے تعبیر کرتے ہیں۔

۲۔ ہندوستانی تمدن کی بنیادوں پر۔

۳۔ قومیت کے تخیل پر جو ہندویت اور اسلام کو یکجا کر سکے اور اس طرح ہندوستان میں ایک قوم پیدا کر سکے۔

ان بنیادی اصولوں کو قائم رکھتے ہوئے ہم دنیا کے دوسرے تمام تمدنوں کے مفید اثرات ان کے علوم و فنون۔ ان کی صنعت و حرفت وغیرہ لینے کے لئے آمادہ ہیں۔ لیکن اس طرح کہ ہم ان کو اپنا لیں جو ہماری تہذیب میں جذب ہو سکیں اور جو ہمارے ارتقا میں ممد ہوں۔ اہل مغرب کے علوم و فنون، ان کی صنعتی و حرفتی ترقی عہد جدید میں مسلم ہے اور ہم اپنی قومیت کی تعمیر میں ان سے بہت کچھ مدد لینا چاہتے ہیں۔ خاص طور پر سائنس اور صنعت میں ہمیں ان سے بہت کچھ حاصل کرنا ہے۔ اور ہمارا انتظام تعلیم بغیر ان چیزوں کے بالکل نامکمل رہے گا۔ اور ہمیں کبھی اس قابل نہیں بنا سکے گا کہ ہم دنیا کی تگ و دو میں اپنا وجود قائم رکھ سکیں

چوتھا عنصر ہمارے تعلیمی نصب العین کے تعین کرنے میں انسانیت کا ہے۔ یہ انسانیت کا تخیل بھی مختلف قسم کا ہو سکتا ہے ایک تو ایسا کہ جو صرف معاشی مفاد پر مدنظر ہو۔ مثلاً موجودہ زمانے کی اجتماعیت کی تحریک ایک خالص مادی تحریک ہے۔ کارل مارکس تاریخ کی مادی تاویل کرتا ہے اس کے نزدیک تمام تمدن صرف انسان کے معاشی جدوجہد کی پیداوار ہے۔ مذاہب کے قیام میں وہ سرمایہ داری کا ہاتھ دیکھتا ہے۔ حقیقتاً اس کا نظریہ انسانی نفس کے دوسرے عناصر کی حقیقت نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔ جس طرح معاشی جذبہ انسان میں بالذات اپنی جگہ رکھتا ہے اسی طرح جمالی اور مذہبی جذبہ بھی۔ انسانیت کا یہ

یہ تخیل جو گذشتہ تمام تمدن کو برباد کر کے انسان کو صرف پیٹ کا بندہ کر دے ہماری قوم کی بنیادی خصوصیت کے خلاف ہے۔ جس میں اسلام اور ہندویت مشترک ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہم عوام کی اس تباہ حالی اور بربادی کو نظر انداز کر دینا چاہتے ہیں۔ جو سرمایہ داری کے ہاتھوں ہو رہا ہے۔ اور اس فلاکت کے دور کرنے کے لئے اگر ضرورت ہو تو ہم اجتماعیت کا تمام نظام معاشی قبول کر لینے کے لئے اور اپنے نظام تعلیم میں زراعت اور صنعت و حرفت کو بہت اہمیت دینے کے لئے آمادہ ہیں لیکن تمدن کا وہ نصب العین جو مکمل طور پر مادیت پر مبنی ہو۔ ہمارے تعلیمی نصب العین کے لئے قابل قبول نہیں ہو سکتا دوسرا انسانیت کا نصب العین بھی جو صرف اصلاحیات پر مبنی ہو۔ اور مذہب سے واسطہ نہ رکھے۔ ہمارے لئے قابل قبول نہیں ہو سکتا اس لئے کہ ہم فطرۃً مجبور ہیں کہ ایک ہستی پر ایمان رکھیں جو ہماری دعاؤں کو سننے والی ہو۔ جس کا باطنی اعتقاد مصیبت کی گھڑیوں میں ہمیں سہارا اور امید دے۔ ہم اپنی قوم کے اس بنیادی خصوصیت کو جسے ہم نہایت عزیز رکھتے ہیں اور جس پر ہمارے تمام تمدن کا قصر استادہ ہے ترک کرنا نہیں چاہتے۔ ورنہ ہم بھٹکے ہوئے مسافر کی طرح بے راہ و منزل ہو جائیں گے۔ اور اپنی زندگی کی اس باطنی قوت کو کھو بیٹھیں گے جو قوموں کی زندگی کا باعث ہوتی ہے۔

اب صرف یہی باقی رہ جاتا ہے کہ ہم ایک ایسی انسانیت کے قائل ہوں جو عالم گیر برادری اور ایک واحد ہستی کے تصور پر قائم ہو۔ یہ اسلام کا ہمیشہ سے بنیادی خیال رہا ہے اور ہندویت کا ارتقا بھی اسے اسی طرف سے جا رہا ہے۔

ہم نے اس وقت تک ہندوستان کے نصب العین کا تعین کرنے میں صرف ہندویت اور اسلام کا ذکر کیا ہے اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہم دوسرے فرقوں مثلاً سکھ، پارسی، یہودی، عیسائی بدھ وغیرہ کے بہترین اثرات قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ہم ان کا اسی طرح حق وجود تسلیم کرتے ہیں۔ اور ہمارا یقین ہے کہ وہ بھی ہندوستان کی قومیت کی تشکیل میں ممد ثابت ہو سکتے ہیں۔ اور ہمارے ہندوستانی قومی تمدن کی تمام بنیادوں پر ہم سے آ کر مل سکتے ہیں۔

غرض ہمارے تمدن کی تاریخی روشنی میں ہمارا تمدنی نصب العین اور اس کے تحت میں

ہمارا تعلیمی نصب العین یہ قرار پایا کہ ہم اپنے نوجوان نسلوں کی جسمانی اور نفسی تربیت جس میں معاشی سیاسی، اجتماعی، جمالی، اخلاقی، مذہبی قوی شامل ہیں۔ ان کے تمدن کی بہترین روایات پر اس طرح کریں کہ وہ ایک تمدن قومیت کے قیام کا باعث ہو وہ قومیت جو انسانیت کے لئے مفید اور کارآمد ثابت ہوسکے۔

انسانیت مقصود بالذات نہیں ہے۔ وہ بھی ایک عالم ہے بہت سے عالموں میں سے جن کا تصور انسانی عقل کے خلاف نہیں ہے لیکن جن کا احصا اور ادراک انسانی عقل و فکر سے باہر ہے چونکہ عقل اپنی قوتوں میں محدود ہے۔ اس کی رسائی حقیقت کی تلاش میں صرف ایک خاص زینے تک ہوسکتی ہے۔ اس کے بعد نفس بحیثیت مجموعی جس میں شعوری اور غیر شعوری عناصر دونوں شامل ہیں حقیقت کا بہت حد تک ادراک کرتا ہے کلیتاً تو حقیقت کا ادراک اسی وقت ہوگا جب انسان انسان نہ رہے بلکہ خدا ہو جائے۔

جس طرح تمدن مظہر ہے انسانی نفس کا۔ اس طرح تمام کائنات مظہر ہے ایک نفس واحد کی جو اپنے اظہار کے لئے مختلف جلوے اور مختلف رنگ و بو ڈھونڈھتا ہے۔

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں

ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں۔ (غالب)

یہ حسن کی خود بینی نئے اسلوب سے ہر وقت، ہر زمانے اور ہر عصر میں جاری ہے۔ اسی تخلیقی فعل میں مدد پہنچانے کا نام تعلیم ہے۔ اور یہ فعل جس خاص اسلوب اور رنگ سے کسی زمانے اور کسی قوم میں ظاہر ہوتا ہے اس کو سمجھنے کا نام اس زمانے کے تمدنی اور تعلیمی نصب العین کو سمجھنا ہے۔

کس قدر عظیم الشان اور روح پرور ہے یہ خیال کہ ہم کائنات کی ایک کڑی ہونے کے باعث تمام ابدی سلسلے پر اثر ڈال سکتے ہیں۔ آرزوؤں کی اس بلندی کے ساتھ ہم اپنے ماحول کو دیکھتے ہیں تو دل بیٹھا جاتا ہے۔ ہر طرف نفاق کی گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں۔ نہ صرف ہندو اور مسلمان بلکہ ایک ایک فرقہ اور ایک ایک جماعت میں جنگ چھڑی ہوئی ہے۔ ہر شخص اور ہر جماعت اپنی بقا اور برتری کی

کوشش میں ہے اور دوسرے کو نیست و نابود کر دینا چاہتی ہے ان واقعات کو ان مایوسانہ نظروں سے دیکھنا۔ حقیقتاً ہمتوں کی پستی ہے۔ یہ زندگی کی قوتیں ہیں جو ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہیں بعض تحریکیں ختم ہو جانے سے پہلے اب گویا سانس توڑ رہی ہیں۔ بعض نئی قوتیں پیدا ہو رہی ہیں جو اپنا حق وجود ثابت کرنا چاہتی ہیں۔ اکثر جگہ ان میں سخت جنگ چھڑی ہوتی ہے۔ اور اکثر جگہ ایک امتزاج پیدا ہو رہا ہے۔ ہندوستان اس لحاظ سے کہ فطرت یہاں تمام دنیا کی نسلی، مذہبی اور مقامی اختلافات کا ایک امتزاج چاہتی ہے سب سے زیادہ کشمکش کا آماجگاہ ہے۔ یہاں نہ صرف ہندو اور مسلمان آباد ہیں بلکہ دنیا کے ہر مذہب کے پیرو۔ یہاں نہ صرف آریہ اور سامی نسل کے لوگ بستے ہیں بلکہ تقریباً تمام دنیا کی نسلوں کے۔ انسانیت کے ہم آہنگ امتزاج سے فطرت ایک نئی انسانیت پیدا کرنا چاہتی ہے۔ جو دنیا کے لئے ایک نمونہ ہو۔

اس عظیم الشان مشن پورا کرنے کے لئے ہم بھیجے گئے ہیں۔ خدا ہم ہندوستانیوں کے ہاتھ سے جو اس وقت سب سے زیادہ مظلوم اور بے بس ہیں اپنا کام کرانا چاہتا ہے۔ اب یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم ثابت کریں کہ ہم کس حد تک اس عظیم الشان امانت کا بار اٹھانے کے قابل ہیں۔

اب رہی یہ کشمکش، یہ جد و جہد، یہ اختلافات، یہ موت کی نہیں زندگی کی دلیل ہیں
اس کشاکش پیہم سے زندہ ہیں اقوام۔

آزادی

آزادی کا مفہوم آزاد ہونا یعنی پابند نہ ہونا، مجبور نہ ہونا، محکوم نہ ہونا بلکہ مختار، حاکم اور قادر ہونا۔ یہ صفتیں اپنی انتہائی تکمیل کے ساتھ، اپنی مطلق اور غیر اضافی شکل میں، تو صرف اُسی ذاتِ بے ہمتا اور لاثانی میں جمع ہو سکتی ہیں جسے مذہبی عقیدے والے خدا کہتے ہیں۔ لیکن جب مجبور اور معذور افرادِ نوعِ انسان کے ساتھ آزادی کی صفت کو منسوب کیا جاتا ہے تو اُس وقت آزادی کا جو مفہوم ہمارے پیشِ نظر ہوتا ہے اس میں کم و بیش پابندی کا پایا جانا ناگزیر ہے، ہرچند یہ ممکن ہے کہ مثالی حالات میں اِن پابندیوں کا احساس معدوم ہو جائے۔

تصوف اور مذہب کی اصطلاح میں آزادی کی انتہائی معراج یہ سمجھی جاتی ہے کہ جزو، کل میں مل جائے۔ مخلوق، خالق کی مرضی اور مشیت کو اپنی خواہش اور تمنا کے عین مطابق پانے لگے۔ جب تسلیم و رضا کے اس مرتبے پر کوئی شخص پہنچ جاتا ہے کہ مذہب کی کوئی پابندی اُس کے لئے خارجی پابندی باقی نہیں رہتی بلکہ اُس کی طبیعت اپنے اندرونی میلان سے وہی کام کرنے لگتی ہے جو اُس کے خدا اور رسول کا فرمان ہے یا جب جسم کی قیود اور آلودگیوں سے بے نیاز ہو کر آدمی روح کائنات سے ہم کلام بلکہ اُس میں جذب ہو جاتا ہے تو ایسی حالت کو مذہب اور تصوف کی اصطلاح میں آزادی کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔

اِسی طرح اخلاقیات میں جب ایک شخص اُن پابندیوں کو جو عقل و تمیز، نفسِ لوّامہ یا اجتماعی نفس اُس پر عائد کرتے ہیں پابندی سمجھنا ترک کر دیتا ہے اور بے عقلی، جہالت اور نفسِ امّارہ کی سرکشی پر اِس قدر قابو حاصل کر لیتا ہے کہ اُس کے اندر ادنیٰ خواہشات اور اعلیٰ خواہشات کی ہر قسم کی کشمکش ختم ہو جاتی ہے اور صراطِ مستقیم پر چلنا اُس کے لئے دشوار نہیں رہتا تو ایسی حالت کو اخلاقی آزادی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

سیاسیات میں بھی آزادی کا نصب العین اِسی نوعیت کا متعین کیا جا سکتا ہے جب افراد اور حکومت کے باہمی تعلقات ایسے ہو جائیں کہ جماعت کا ہر فرد یہ سمجھنے لگے کہ حکومت جو کچھ کر رہی ہے وہ بالکل وہی ہے جو وہ خود کرتا تو ایسی حکومت کو مکمل آزاد حکومت کہنا چاہیے۔ ایسی حالت میں حکومت کے احکام خارجی نہیں رہتے۔ اُن کی اطاعت مجبوری کی اطاعت نہیں ہوتی سزا کے ڈر سے لوگ قوانین کی پابندی نہیں کرتے بلکہ خود اپنے اوپر اپنی ذات کی حکومت ہو جاتی ہے۔ قوانین، اصولِ زندگی کا مرتبہ حاصل کر لیتے ہیں جس پر عمل کر کے خوشی اور اطمینانِ قلب حاصل ہوتا ہے۔ راجیہ، سوراجیہ ہو جاتا ہے۔ جس وقت یہ بات پیدا ہو جاتی ہے تب ہی قوائے جسمانی اور دماغی کو تربیت دینے اور مکمل کرنے کا لوگوں کو حوصلہ اور موقع ہوتا ہے۔ علم، ادب اور فنون، ترقی کرتے ہیں۔ تہذیب و تمدن پھولتے پھلتے ہیں۔ مادی، اخلاقی اور روحانی ترقیاں ہوتی ہیں۔ ہم آہنگی اور مسرت سے فضائیں معمور ہو جاتی ہیں۔

آزادی کے اِس مفہوم کے متعلق یہ خیال کرنا کہ انسانی ذہن نے اسے اپنی تاریخ کے ابتدائی عہد ہی میں سمجھ لیا ہوگا صحیح نہیں ہے۔ دنیا کے مفکروں اور مصلحوں نے نسل بعد نسل بتدریج اِس تخئیل کو ترقی دی ہے اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ اِسی طرح اِس مطمحِ نظر کے حاصل کرنے کی کوششیں بھی ناکام اور کامیاب ہو ہو کر رفتہ رفتہ زیادہ صحیح، ہمہ گیر، مضبوط اور مؤثر ہوتی جا رہی ہیں۔ آزادی کی جنگ کا محاذ مختلف ملکوں اور مختلف زمانوں میں بدلتا رہا ہے۔ کبھی آزادی کا ایک رُخ لوگوں کی نگاہ کے سامنے نمایاں رہا ہے کبھی دوسرا۔ لیکن آزادی کی روح ایک عرصہ سے کام کر رہی ہے۔ اور اس کا حلقۂ اثر روز بروز وسیع ہو رہا ہے۔

آزادی کی شکلیں روسو نے اپنی معرکۃ الآرا کتاب "معاہدہ معاشری" کی ابتدا اِس جملہ سے کی تھی کہ "انسان آزاد پیدا ہوا لیکن وہ ہر جگہ پابہ زنجیر ہے" تاریخ کے مطالعہ سے روسو کے اس بیان کی تائید نہیں ہوتی بلکہ ہم مجبور ہو جاتے ہیں کہ اُس کے اِس مشہور جملے کی تصحیح یوں کریں کہ "انسان، غلام پیدا ہوا لیکن وہ آہستہ آہستہ آزاد ہوتا جا رہا ہے۔" انسان نے آزادی کی منزلِ مقصود کو

جن جن مورچوں سے رفتہ رفتہ تسخیر کرنے کی کوشش کی ہے اُن میں سے زیادہ اہم کو اختصار کے ساتھ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:-

مدنی آزادی تاریخی اعتبار سے آزادی کے لئے جو انتہائی کوشش کی گئی وہ یہ تھی کہ مطلق العنان فرماں رواؤں کی دراز دستیوں سے افراد کو محفوظ کیا جائے۔ اور یہ اس طرح کہ رعایا کی طرف سے مطالبہ کیا گیا کہ اُن پہ حکومت، قانون اور دستور کے مطابق کی جائے۔ اس کا منشا یہ تھا کہ بادشاہ کے اختیارات محدود ہو جائیں اور ہر شخص کو یہ بات ٹھیک ٹھیک معلوم ہو جائے کہ اس کی پابندی کی حد کس قدر ہے۔ منطقی حیثیت سے بھی یوں ہی ہونا چاہیے تھا۔ کیونکہ جب ایک شخص کو کسی دوسرے شخص کے خلاف کوئی قانونی حق حاصل نہیں ہوتا تو وہ بالکل اُس کی مرضی اور طبیعت کے تلون کا پابند ہوتا ہے اور غلاموں کی طرح اس کے اشاروں پر چلنے کے لئے مجبور ہوتا ہے۔ اس لئے ہمہ گیر آزادی کی اولین شرط ہمہ گیر پابندی ہے۔ اگر اس قسم کی پابندی نہ ہو تو کچھ لوگ آزاد رہیں گے جو جو چاہیں گے کر سکیں گے اور کچھ پابند ہوں گے اور وہی کر سکیں گے جن کی آزاد لوگ اُنھیں اجازت دیں گے۔ مگر جب قوانین مقرر ہو جائیں گے اور حکمران بھی اُس کے اسی طرح پابند ہو جائیں گے جیسے محکوم تو من مانی حکومت باقی نہ رہے گی۔ قوانین سے اس میں شک نہیں کہ ایک فرد کی آزادی محدود ہو جاتی ہے، اور وہ دوسروں کے ساتھ جس قسم کا چاہے اپنی مرضی کے مطابق برتاؤ نہیں کر سکتا لیکن اُسے فائدہ یہ حاصل ہوتا ہے کہ دوسرے بھی اس کے خلاف اپنے غیر محدود اختیارات استعمال کرنے سے معذور ہو جاتے ہیں۔ جس طرح ایک فرد کو قانون پابند کرتا ہے اسی طرح اُس جماعت کے جملہ افراد کو جس میں حاکم و محکوم، ادنیٰ و اعلیٰ، امیر و غریب، گورے اور کالے، مسلمان اور کافر سبھی شامل ہیں، بلا تفریق مساوی انداز سے پابند کرتا ہے۔ جب ایسا ہوتا ہے تو من مانے احکامات اور زور آور زبردستی سے لوگوں کو نجات مل جاتی ہے۔ معاشری زندگی میں آزادی کی یہی ایک صورت قابل عمل ثابت ہوئی ہے۔

انگریزی پارلیمنٹ نے سترھویں صدی میں آزادی کی جنگ اسی مورچے سے شروع کی تھی۔ پٹی شن آف رائٹ اور ہے بیس کارپس ایکٹ اسی مدنی آزادی کے حصول کے ذرائع تھے قانون کی

عملداری قانون کی نگاہ میں مساوات، غیر جانب دار عدالتیں، یہ مطالبے تھے جو اُس وقت پیش کئے گئے تھے۔ حکومت اپنی مرضی کے مطابق لوگوں کو جب چاہے گرفتار اور قید نہیں کر سکتی، نہ سزا دے سکتی ہے نہ اُن کے مال و جائداد پر قبضہ کر سکتی ہے۔ اِس قسم کے تمام کام قانون کے مطابق ہونے چاہئیں۔ عدالت کو حکومت کے اثر سے آزاد ہونا چاہئے۔ صفائی کی ہر شخص کو سہولت ملنی چاہئے۔ عدالت تک ہر شخص کی رسائی آسان ہونی چاہئے۔ مقدمے کی پیروی اِس قدر گراں نہ ہونی چاہئے کہ نادار لوگ عدالت کے منافع سے محروم رہیں۔ پڑھے لکھے باعزت اور ذی مرتبہ لوگوں کو جاہلوں اور کم حیثیت لوگوں کے مقابلے میں اپنی علمیت، وقار، مذہبی یا نسلی تفوق سے ناجائز فائدہ حاصل کرنے کا موقع نہ دینا چاہئے۔ یہ مدنی آزادی ہے۔

مالی آزادی اِس سے قریبی طور پر وابستہ مالی آزادی کا مسئلہ ہے جس کو آسانی سے اِس لئے سمجھ سکتے ہیں کہ اِس سے لوگوں کے روز مرہ کے کاروبار پر براہِ راست اثر پڑتا ہے۔ جب حکومت من مانے طریقوں سے محاصل عاید کرتی ہے اور اُس کے اختیار پر کسی قسم کی پابندی نہیں ہوتی تو لوگ عاجز ہو کر انقلاب کے خواہشمند ہو جاتے ہیں۔ انگلستان میں اسٹوارٹ بادشاہوں نے، امریکہ میں جارج سوم نے اور فرانس میں لوئی شانزدہم نے اپنے محاصل کے خراب انتظام سے لوگوں میں بدظنی اور بے اطمینانی کی کیفیت پیدا کر دی۔ رعایا کا مطالبہ یہ تھا کہ حکومت کو اُس وقت تک محاصل عائد کرنے کا حق نہیں ہے جب تک وہ نمایندگی کے حق کو تسلیم نہ کر لے یعنی اُن لوگوں کے نمایندوں سے جن پر محاصل عائد کئے جا رہے ہیں اِس بارے میں استصواب نہ کر لے اور اُن کے اعتراضات کا تشفی بخش جواب نہ دے لے۔ یہ مالی آزادی ہے۔

ذاتی آزادی یہ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ آزادی کا امکان اُسی وقت پیدا ہوتا ہے جب آدمیوں کے بجائے اصول و قوانین کی حکومت ہوتی ہے۔ اور اُن کی اطاعت، جماعت کے تمام افراد پر لازمی ہوتی ہے۔ لیکن اِس سے مسئلے کا پورا حل نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ ہو سکتا ہے کہ قوانین موجود ہوں اور حکمران اُن قوانین کی خلاف ورزی بھی نہ کرتے ہوں لیکن پھر بھی (۱) قوانین بنانے والے یا تو ایک مطلق العنان

بادشاہ اور اُس کے تنخواہ دار مشیر ہوں یا اُمراء اور حُکام کی ایک مختصر جماعت اِس کام کو انجام دیتی ہو (۲) قوانین بذاتِ خود انصاف اور مساوات پر مبنی نہ ہوں بلکہ اُن سے آبادی کے کچھ حصّے یا اکثر حصّے یا قوانین بنانے والوں کو چھوڑ کر باقی اور تمام لوگوں کی حق تلفی ہوتی ہو۔ اِس لئے ضرورت اِس بات کی ہے کہ ایک طرف تو قوانین بنانے والی مناسب ترین جماعت کا تعین کر دیا جائے اور دوسری طرف اِس امر کی صراحت کر دی جائے کہ کن کن صورتوں میں محض قانون کو حَکَم بنانے سے آزادی کے حصول کا مسئلہ حل نہیں ہو جاتا بلکہ ایسے موقعوں پر خراب اور ظلم پرور قوانین کی تنسیخ کا مطالبہ نہایت ضروری ہو جاتا ہے۔ اِس مسئلہ کا اول الذکر حصّہ سیاسی آزادی سے متعلق ہے جس پر آگے چل کر بحث کی جائے گی۔ فی الحال اِس مسئلہ کے دوسرے حصّے سے جسے "ذاتی آزادی" کے نام سے موسوم کرنا مناسب ہے بحث کی جاتی ہے۔

اِس ذیل میں بُنیادی حیثیت خیال کی آزادی کو حاصل ہے یعنی اپنے ذہن میں ایک رائے قائم کرنے کے لئے ہر شخص آزاد ہے اور اپنی اِس ذہنی رائے کی وجہ سے وہ کسی سزا کا مستحق قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اِس حق سے انکار انتہائی ظلم ہے، کیونکہ خیال کا قلعہ تو کم از کم ایسا ہونا چاہئے جو اغیار کی دستبرد سے قطعاً محفوظ ہو۔ لیکن خیال چونکہ معاشرتی روابط کا نتیجہ ہوتا ہے اِس لئے اس کی آزادی اِس وقت تک بے کار ہے جب تک مبادلۂ خیال کی آزادی بھی نصیب نہ ہو۔ اِس لئے تقریر، تحریر، طباعت اور مباحثے کی آزادی بھی ضروری ہے۔ مگر یہاں مسئلہ نازک اور پیچیدہ ہو جاتا ہے کیونکہ ایک ایسا نقطۂ اتصال بھی ہوتا ہے جہاں قول و فعل کا فرق اِس قدر دُھندلا ہو جاتا ہے کہ آزاد تقریر اور لوگوں کو بدامنی اور بغاوت پر اُبھارنا مترادف مفہوم کے حامل ہوتے ہیں۔ ایسے موقع پر اس کے مقابلے میں آزادی کھڑی ہوتی ہے اور انتخاب نہایت دشوار ہو جاتا ہے۔ مذہبی آزادی کے مسئلے میں بھی بعض اوقات اِس قسم کی دشواریوں کے امکانات پیدا ہو جاتے ہیں، مثلاً بعض مذاہب میں آدم خوری، انسانی قربانی اور جادوگرنیوں کا جلا ڈالنا جائز ہے لیکن کوئی جدید حکومت اِن رواجوں کی کبھی بھی روادار نہیں ہو سکتی۔ ہندوستان میں تعدد ازدواج کو برطانوی قانون جائز قرار دیتا ہے لیکن

اگر ہندو اور مسلمان انگلستان میں ایک سے زائد شادی کرنا چاہیں تو شاید نہیں کرسکتے۔

جب صورتِ حال یہ ہے تو پھر مذہبی آزادی کا کیا مفہوم ہے؟ اِس کے مفہوم پر خارجی اور باطنی دو حیثیتوں سے بحث کی جاسکتی ہے۔ خارجی حیثیت سے تو اِس کے معنی یہ ہوں گے کہ مذہبی خیالات اور اُن کے اظہار میں ہر شخص کو آزادی حاصل ہو۔ مزید برآں ہر شخص کو اِس بات کی بھی آزادی ہو کہ جس شکل میں چاہے عبادت کرے۔ لیکن اِس شرط کے ساتھ کہ اُس کے ایسا کرنے سے دوسرے کو نقصان نہ پہنچے اور امنِ عامّہ میں خلل واقع نہ ہو۔ اِس شرط میں یہ بات بھی مخفی ہے کہ مذہبی خیالات کے اظہار میں متانت، اعتدال اور ضبط سے کام لیا جائے تاکہ دوسروں کے احساسات کی توہین نہ ہو۔ اِس کے علاوہ مذہبی آزادی اُس وقت تک ناقص سمجھی جائے گی جب تک کسی شخص کو بھی مذہب کی وجہ سے عہدوں یا تعلیمی منافع سے محروم رکھا جائے گا۔ مکمل آزادی کے معنی یہاں بھی مکمل مساوات کے ہیں۔ باطنی طور پر مذہبی آزادی سے مراد یہ ہے کہ ہر شخص کو دوسرے شخص کو تبلیغ کے ذریعے سے اپنا ہم مذہب بنانے کا حق حاصل ہے۔ لیکن شرط پھر وہی ہے کہ ایسا کرنے سے دوسروں کے مساوی حقوق پامال نہ ہوں۔ اور امنِ عامّہ میں خلل واقع نہ ہو۔

معاشری آزادی | زندگی کے روحانی رُخ کے بعد اَب ہم اُس کے عملی رُخ کی طرف متوجّہ ہوتے ہیں۔ یہاں آزادی کو اُن رُکاوٹوں سے جنگ کرنی پڑتی ہے جو سوسائیٹی کے درجہ بہ درجہ طبقوں میں تقسیم ہونے سے پیدا ہوتی ہیں۔ ایک طبقے کو دوسرے پر فضیلت ہوتی ہے اور یہ امتیازات مستقل ہوکر ترکہ اور وراثت کے ذریعہ سے منتقل ہونے لگتے ہیں۔ اوپر کے طبقہ والے نیچے طبقہ والوں کو ذلیل سمجھتے ہیں اور اُن سے معاشری تعلقات رکھنا اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ ہندوستان میں خصوصیت کے ساتھ طبقوں کی اِس تفریق نے ذات پات کی شکل میں ایسی انتہائی صورت اختیار کی ہے کہ نیچی ذات کے لوگوں کا سایہ بھی جس جگہ پڑجاتا ہے وہ ناپاک سمجھی جاتی ہے۔ نیچی ذات والوں کو اجازت نہیں ہے کہ وہ اونچی ذات والوں کے مندروں میں عبادت کرسکیں۔ اُن کے کنوئیں سے پانی بھرسکیں یا اُن کے بچوں کے ساتھ بیٹھ کر اسکولوں میں تعلیم پاسکیں۔

اونچی ذات کے ساتھ کھانے پینے میں شرکت اور شادی بیاہ کے امکانات تو قطعی طور پر بعید از قیاس ہیں۔ انھیں صرف ذلیل ترین پیشوں کے اختیار کرنے کی اجازت ہے اور ترقی کے تمام امکانات ان کے لئے اور ان کی آئندہ نسلوں کے لئے ہمیشہ ہمیشہ کے واسطے مفقود ہیں۔ یہ تفریق یہاں کے مذہب، رواج اور قانون کے نزدیک بھی جائز ہے۔ یورپ میں بھی اس شدید شکل میں تو نہیں لیکن کم و بیش اسی قسم کے امتیازات مختلف زمانوں میں پائے گئے ہیں جن کے خلاف جدوجہد کر کے انھیں توڑنے کی وقتاً فوقتاً کوششیں کی گئی ہیں۔ مثلاً بعض عہدے ہوتے تھے جو صرف موروثی امراء اور لاٹ پادریوں کے لئے وقف ہوتے تھے یا بعض پیشے تھے جن کا اجارہ بعض مخصوص جماعتوں کو حاصل تھا۔ یا تعلیم کی سہولتیں تھیں جن سے غیر دولتمند لوگ فطری اہلیت کے باوجود فائدہ نہیں اٹھا سکتے تھے۔

معاشری آزادی کا مطالبہ یہ ہے کہ ان بندشوں کو توڑ کر مساوات قائم کی جائے اور ہر شخص کو ترقی کے لئے مساوی مواقع فراہم کئے جائیں۔ لیکن اس مسئلہ میں بھی بعض نازک دشواریاں پیدا ہوتی ہیں۔ اگر ایک طرف انفرادیت کی ترقی کے لئے جماعت بندی کو توڑنا ضروری ہے تو دوسری طرف فرقہ بندی اور جماعت سازی مثلاً ٹریڈ یونین وغیرہ کی مشترکہ کوشش سے افراد کے حقوق کی اس طرح نگہداشت ہوتی ہے اور بعض ایسے دوسرے معاشری منافع پیدا ہوتے ہیں جنھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس قدر بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ معاشری آزادی کا ان حالات میں یہ مقصد ہونا چاہئے کہ ایسی جماعتوں کی رکنیت میں وراثت کے اصول کو جاری نہ ہونے دیا جائے۔ نیز ان جماعتوں میں داخل ہونے کے واسطے مصنوعی پابندیاں حائل نہ کی جائیں یعنی ایسی کوئی دشواری پیدا نہ کی جائے جس کا منشاء یہ ہو کہ برادری میں نئی بھرتی کا سلسلہ مسدود ہو جائے اور جماعت بندی سے جو فائدے حاصل ہوتے ہیں ان پر صرف ایک محدود حصہ آبادی کا اجارہ رہے۔

اسی ضمن میں یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ جنسی قیود بھی فرقہ بندی کی قیود سے بہت مشابہ ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ بعض پیشے ایسے ہوتے ہیں جن کے لئے عورتیں طبعاً موزوں نہیں ہوتیں۔ ایسی صورتوں میں

اہلیت کے جو امتحانات ہیں اُن کے فیصلوں کو کافی سمجھنا چاہئے اور عورتوں کو محض عورت ہونے کی وجہ سے آزاد مقابلے میں شرکت سے محروم رکھنا مناسب نہیں ہے۔

معاشی آزادی | معاشرتی آزادی ہی کی ایک شاخ معاشی آزادی بھی ہے لیکن اس کے مسائل اس قدر پیچیدہ ہیں اور افراد اور جماعت کے حقوق و فرائض یہاں باہم اس درجہ دست و گریباں نظر آتے ہیں کہ ایک قطعی رائے کا اظہار بہت دشوار معلوم ہوتا ہے۔ معاہدے کی آزادی، اپنے تمام افعال کے لئے افراد کا ذاتی طور پر ذمہ وار ہونا، تجارتی انجمنیں بنانے کی آزادی، آزاد تجارت۔ اُن کے حامیوں اور مخالفوں میں سالہا سال سے مستقل کشمکش کا سلسلہ جاری ہے۔ اس گتھی کو سلجھانے کے لئے بھی مساوات کے گُر کو سامنے رکھنے کی ضرورت ہے۔ ایسی تمام جماعتی پابندیاں جو مساوی سطح پر لانے کے بعد آزادی کے فوائد حاصل کرنے کے امکانات پیدا کرتی ہیں، افراد کی اُن تمام غیر محدود آزادیوں سے بہتر ہیں جن کی وجہ سے غیر مساوی اور ناموافق حالات میں وہ اپنے ہاتھ سے اپنی ذات کو نقصان پہنچاتے ہیں یا اپنے ذاتی اور عارضی فائدے کی خاطر کُل جماعت اور خود اپنے مستقل فائدوں کو قربان کر دیتے ہیں۔ مثلاً آزاد معاہدہ جب ایک بڑے سرمایہ دار اور نادار مزدور یا کسان کے درمیان ہوتا ہے تو ایسے معاہدے کو آزاد کے نام سے موسوم کرنا اور اس کے لئے مزدور کو ذاتی طور پر ذمہ وار قرار دینا ستم ظریفی ہے۔ بڑا سرمایہ دار انتظار کر سکتا ہے اور مزدور کی خدمات سے مستغنی ہوتا ہے لیکن مزدور کی نگاہ کے سامنے اپنی معصوم اولاد کے فاقہ زدہ چہرے ہوتے ہیں اور جن شرائط پر بھی ممکن ہو وہ فوراً کام کر کے اُجرت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ ایسا معاہدہ آزاد معاہدہ نہیں کہلایا جا سکتا۔ اسی طرح اصولِ انجمن سازی کی اس وجہ سے مخالفت کرنا کہ اس سے افراد کی آزادی ختم ہو جاتی ہے، غلطی ہے۔ انجمن چاہتی ہے کہ آزادی کے ایک خاص معیار کے حصول کے لئے اس کے ارکانِ مشترکہ کوشش کریں۔ اب اگر اس کی وجہ سے زندگی کے خود غرضانہ اور ناعاقبت اندیشانہ معیاروں کی قربانی ہوتی ہے تو یہ اعلیٰ آزادی کی خاطر ادنیٰ آزادی کی قربانی ہے جسے جائز سمجھنا چاہیے۔ مثلاً مزدوروں کے مکانوں کا مسئلہ بیماری اور بڑھاپے کی حالت میں

اُن کی خبر گیری، اُن کے لئے مستقل طور پہ مزدوری فراہم کرنے کی ذمّہ داری، بچوں کی تعلیم اور اور انھیں کھانا کھلانا، بچوں اور عورتوں کی ملازمت کے متعلق خاص قوانین بنانا۔ ان اغراض کی حصول کے لئے جب افراد مشترکہ طور پہ انجمن بناکر کوشش کرتے ہیں اور اِس کوشش سے افراد کے انفرادی اختیار کو عارضی نقصان پہنچتا ہے تو اس کی تلافی، جماعتی اور مستقل فائدوں سے ہو جاتی ہے لیکن یہ ہو سکتا ہے کہ انجمن کے مطالبات حدود سے متجاوز ہو جائیں اور اتنی قربانی طلب کریں کہ جس کے لئے افراد طیّار نہ ہوں۔ ایسی صورت میں افراد کی آزادی کی حفاظت ضروری ہو جاتی ہے اِس قسم کی دلیل آزاد تجارت کے خلاف بھی استعمال کی جاسکتی ہے۔ آزاد تجارت ایسے دو ملکوں کے درمیان تو نہایت موزوں اور مناسب ہے، جو صنعتی حیثیت سے مساوی سطح پر ہوں۔ لیکن ایسے دو ملکوں کے درمیان جن میں سے ایک صنعتی حیثیت سے بہت ترقی یافتہ ہو اور دوسرا قدرتی وسائل کے باوجود نہایت پس ماندہ، جب آزاد مقابلہ ہوتا ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پس ماندہ ملک آزاد تجارت کی حالت میں کبھی اپنی صنعتوں کو ترقی نہیں دے سکتا۔ ایسی حالت میں جماعت کے مستقل مفاد کو پیش نظر رکھ کر آزاد تجارت سے عارضی کنارہ کشی ضروری ہو جاتی ہے لیکن یہ مسائل اِس کے بعد بھی پوری طرح صاف نہیں ہوتے اور بعض اوقات معاشی آزادی کے نام پر ایک طرف یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ پیشوں، قیمتوں، مزدوروں کی شرائط ملازمت اور آمد و برآمد کے محاصل اور باقی تمام دوسرے معاشی معاہدوں سے ہر قسم کی بیرونی پابندیاں ختم کر دی جائیں اور دوسری طرف دعوت دی جاتی ہے کہ ہر جزئی معاشی مشغلے کو حکومت کی نگرانی اور انتظام کے ماتحت لایا جائے اور دونوں نظریوں کے حامی وثوق کے ساتھ کہتے ہیں کہ صرف اُنھی کی تجویزوں سے معاشی، آزادی کے امکانات محفوظ کئے جاسکتے ہیں اِس کے متعلق مفصل بحث آئندہ کسی باب میں کی جائے گی۔

خانگی آزادی جماعت میں جتنی انجمنیں بھی پائی جاتی ہیں اُن میں سب سے زیادہ اہم، ہمہ گیر اور باثر تنظیم خاندانی ادارے کی ہے جس زمانے میں ریاستیں مطلق العنان ہوتی تھیں خاندانی زندگی میں بھی استبدادیت اور مطلق العنانی کا دَور دَورہ تھا۔ اور شوہر اپنی بیوی اور بچوں کے جان و مال کا بہت بڑی

حد تک مختار کل ہوتا تھا۔ آزادی کی تحریک نے جب خاندانی محاذ سے حملہ کیا تو اس کے پیش نظر تین مقاصد تھے (۱) بیوی کو مساوی طور پر مختار اور ذمہ دار قرار دیا جائے۔ اُسے جائداد کی ملکیت اپنے طور پر کاروبار کرنے، فریق مقدمہ بننے اور شوہر کے مقابلے میں پوری طرح محفوظ ہونے کے حقوق دیئے جائیں (۲) شادی کو جہاں تک قانون کا تعلق ہے دو ہم رتبہ فریقوں کے درمیان ایک معاہدہ سمجھا جائے (۳) اولاد کی جسمانی، دماغی اور اخلاقی تربیت کے لئے کچھ تو والدین کو پابند کیا جائے اور کچھ سرکاری طور پر تعلیم اور حفظانِ صحت کے انتظامات کر کے بندوبست کیا جائے خاندانی زندگی کے اوّل الذکر دو مقاصد سے تو مساوات کے اصول کی توسیع ہوتی ہے لیکن تیسرے مقصد کے سمجھنے میں ذرا دشواری معلوم ہوتی ہے۔ اِس مسئلے پر غور اگر اِس نقطۂ نگاہ سے کیا جائے کہ بچوں کے حقوق کی نگہداشت مستقبل کے شہری ہونے کی حیثیت سے کی جاتی ہے اور مساوی واقع کا انھیں اتنا ہی مستحق سمجھنا چاہیئے جتنا کہ موجودہ شہریوں کو اور چونکہ وہ اپنے حقوق کا مطالبہ خود کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے اِس لئے اُن کے حقوق کی نگرانی قانون اور حکومت کے ذریعہ سے ضروری ہے تو شاید یہ مسئلہ سمجھ میں آجائے اور یہاں بھی آزادی کا مفہوم مساوات قائم کرنا ہو جائے۔

مقامی نسلی اور قومی آزادی مختصر ترین جماعتی ادارے یعنی خاندان کے بعد اب ہم بزرگ ترین ادارے یعنی قوم کی طرف اپنی توجہ مبذول کرتے ہیں۔ تحریک آزادی کا ایک بڑا حصہ اُن مساعی پر مشتمل ہے جن کے ذریعے اقوام نے بصورتِ مجموعی غیروں کی حکومت سے آزاد ہونے کے لئے جد و جہد کی۔ نپولین کی شہنشاہیت کے خلاف یورپ کی تمام اقوام کی بغاوت، اٹلی کی آزادی کے لئے کوشش، ترکی کی عیسائی رعایا کی اپنے بیرونی ہم مذہبوں سے امداد طلبی، حبشی اقوام کی غلامی سے رہائی، آئرلینڈ اور ہندوستان کی قومی تحریک، یہ سب اسی جذبے کے مظاہر ہیں۔ بظاہر یہ مسئلہ بہت سہل معلوم ہوتا ہے اِن تحریکوں کا مقصد عموماً یہ ہوتا ہے کہ کمزور فریق کو طاقتور فریق کی گرفت سے نکال کر اُسے خود مختار اور ہم رتبہ بنا دیا جائے لیکن اُس کی اِس سطحی شکل کا جب ذرا گہرائی سے مطالعہ کیا جاتا ہے تو معاملہ اتنا صاف نہیں رہتا۔ قومیت کسے کہتے ہیں اور یہ ریاست سے کس حیثیت سے مختلف ہے؟ کس قسم کا خاص

اتحاد قومیت کے احساس سے پیدا ہوتا ہے اور اس کے کیا مخصوص حقوق ہیں؟ اگر آئرلینڈ ایک قوم ہے تو کیا السٹر بھی ایک قوم ہے؟ اگر السٹر کو برطانوی اور پروٹسٹنٹ کہہ کر برطانیہ کا جزو بنانے کا مطالبہ کیا جاتا تھا تو السٹر کی نصف کیتھلک آبادی کے حقوق کو پیش نظر رکھا جاتا تھا یا نہیں؟ اُن میں سے بعض مسائل کے علمی جوابات تو واقعاتِ تاریخ سے ملتے ہیں۔ مثلاً کنیڈا کی تاریخ کے مطالعے سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرانس اور برطانیہ کے رہنے والے دو مختلف عناصر کس طرح کنیڈا میں ایک ساتھ بسنے اور خود مختار طرز کی حکومت پانے کے بعد "عقاید" "زبان" معاشرتی تنظیم اور تاریخی روایات کے اختلاف کے باوجود باہم شیر و شکر ہو کر ایک قوم بن گئے ہیں۔ جرمنی کے ایک قوم ہونے کے دعوے کو بھی تاریخ نے صحیح ثابت کر دیا ہے۔ آسٹریا کے وزیر میٹرنک نے اٹلی کے متعلق طنز آمیز طریقہ پر جو یہ فقرہ کہا تھا کہ "اٹلی صرف جغرافیائی اصطلاح ہے" اس کی بھی تاریخ نے تردید کر دی ہے۔ لیکن تاریخ کے نتائج کی پیشین گوئی کس طرح کی جائے۔ اُن تمام لوگوں کے مطالبوں کو جو قومی وحدت کی بنا پر خود اختیاری حکومت کا مطالبہ کرتے ہیں کن شہادتوں کی بنا پر منظور یا مسترد کیا جائے؟ تحریک آزادی کا اوّلین مقصد اس میں شک نہیں قومی خود اختیاری کو تسلیم کرنا ہے لیکن جب تقسیم اور جزئی تقسیم پر نظر کی جاتی ہے اور فرقوں کے اندر فرقے نظر آتے ہیں تو اُس وقت خود اختیاری طرز کی حکومت کے کون سے حدود مقرر کئے جائیں؟ اِن پیچیدہ مسائل کو تاریخ کی زندہ مثالیں اور مدبّروں کی عملی بصیرت ہی حل کر سکتی لیکن ایک اصول ہے جسے تجربے کی بنا پر ہر جگہ آزمایا جا سکتا ہے۔ جب ایک کمزور قوم ایک بڑی اور طاقتور قوم کے ساتھ شامل رہ کر ایک ہی قانون کے ماتحت آزادی کے جملہ حقوق سے مستفید ہو سکتی ہو تو ایسے اتحاد کو دونوں فریقوں کے لئے مناسب سمجھنا چاہئے۔ لیکن جہاں یہ انتظام ناکام رہے، جہاں حکومت مستقل طور پر ہنگامی اور غیر معمولی قوانین بنانے یا اپنے اداروں کی آزادی ختم کرنے پر مجبور ہو تو ایسی صورت میں اِس اتحاد کو جس قدر جلد ممکن ہو ختم کر دینا چاہئے۔ ورنہ اگر یہ صورت جاری رہی تو نہایت آزاد خیال جمہوریت بھی اپنے اصولوں کی بیخ کنی پر مجبور ہو جائے گی اور اپنا اقتدار صرف اپنی آزادی قربان کر ہی کے قائم رکھ سکے گی۔

اسی قسم کے سوالات نسلی آزادی کے متعلق بھی پیدا ہوتے ہیں۔ تجربے سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ محض نسل کا اختلاف کسی شخص کو آزادی کا کم یا زیادہ مستحق نہیں بنا دیتا۔ رنگ کے کالے یا گورے ہونے سے حکومت خود اختیاری کی طبعی اہلیت یا نااہلیت میں اضافہ نہیں ہو جاتا۔ اِس بُنیاد پر جو امتیازی حقوق لوگوں کو دئے یا جو فرائض عاید کئے جاتے ہیں اُنھیں جس قدر جلد مٹایا اور تمام انسانوں کو مساوی سطح پر لاکر آزادی کے منافع میں برابر کا شریک کیا جائے اتنا ہی مناسب ہے۔

بین الاقوامی آزادی | بین الاقوامی معاملات تحریک آزادی کا مطالبہ یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے عدمِ مداخلت کے اصول پر عمل کیا جائے اور اس کے لئے تین دلیلیں پیش کی جاتی ہیں (۱) آزادی کے قیام کے لئے ضروری ہے کہ طاقت کے استعمال کی جو ظلم کا سرچشمہ ہے مخالفت کی جائے (۲) اسلحہ اندوزی کی لعنت سے نجات حاصل کی جائے۔ کیونکہ اِس سے کبھی تو براہِ راست اور کبھی بالواسطہ نہایت ہشیاری اور چالاکی کے ساتھ آزاد اداروں کو دبایا اور محاصل سرکاری کے بیشتر حصّہ کو فوجی مصارف پر صرف کیا جاتا ہے (۳) جس قدر دنیا آزاد ہو رہی ہے اُتنا ہی قوت کا استعمال سہل ہوتا جاتا ہے۔ اگر مقصد دوسری قوم کو فتح کر کے اُس کے جائز حقوق پر تصرف کرنا نہیں ہے تو حملہ کرنا سخت خام خیالی ہے۔

سیاسی آزادی اور عوام کا اقتدارِ اعلیٰ | مندرجہ بالا تمام آزادیوں کے حصول اور قیام کا طریقہ کیا ہو یہ آخری سوال ہے جس سے اب ہمیں بحث کرنی ہے۔ عام طور پر جواب یہ دیا جاتا ہے کہ اگر عاملہ اور مقننہ کو کُل جماعت کا جواب دہ بنا دیا جائے تو اِس مسئلے کا حل ہو جائے گا اور پیشِ نظر یہ انتظام ہوتا ہے کہ عوام کو اقتدارِ اعلیٰ حاصل ہو اور ہمہ گیر حق رائے دہندگی کے ذریعے سے وہ اپنے اِس اقتدار سے فائدہ اٹھائیں۔ لیکن اِس جواب سے مسئلے کی تمام دشواریوں کا حل نہیں ہوتا۔ یہ ممکن ہے کہ عوام اپنے حقوق کی طرف سے لاپروائی برتیں اور انتظام کرنے کی اہلیت نہ رکھتے ہوں یا دوسرے ممالک کی تسخیر کا نشہ اُن پر سوار ہو جائے یا اُمراء کی جائداد کی ضبطی یا اسی قسم کے کسی اور مجموعی ظلم پر آمادہ ہو جائیں۔ اِس بات کا بھی آسانی سے امکان ہو سکتا ہے کہ وسیع حق رائے دہندگی کے مقابلے میں محدود حقِ رائے دہندگی سے عام آزادی کی زیادہ ضمانت ہو اور جماعتی ترقی کے زیادہ بہتر نتائج پیدا ہو سکیں۔

اِن حالات میں عوام کے اقتدارِ اعلیٰ کے نظریے کے لئے وجہ جواز کیا ہے اور اُس کی صحت کے کیا حدود ہیں؟ کیا یہ نظریہ آزادی اور مساوات کے عام اصول پر مبنی ہے یا دوسرے کوئی خیالات اس کی تائید کے لئے موجود ہیں؟ پھر خیالات اور اداروں کے جدید ارتقا نے پارلیمنٹری حکومت کے مقابلے میں ڈکٹیٹر شپ کو لا کھڑا کیا ہے اور اب ایک نیا سوال یہ پیدا ہونے لگا ہے کہ کیا واقعی نمائندگی پر منحصر حکومت کے مقابلے میں عام طور پر مقبول اور پسندیدہ ڈکٹیٹر شپ عوام کے اقتدارِ اعلیٰ کے اظہار کا زیادہ مناسب، مؤثر اور مفید ذریعہ ہے؟ اِن سوالات کا قطعی طور پر جواب دینا تقریباً ناممکن ہے۔ یہاں اختصار کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے جمہوریت کی تائید میں چند دلیلیں پیش کرنے پر اکتفا کی جائے گی۔

آزادی کا مقصد یہ نہیں ہے کہ لوگوں کو بچوں کی طرح دوسروں کے ہاتھ سے کھانا کھلا کر خوش رکھنے کی کوشش کی جائے بلکہ یہ ہے کہ اُن میں احساس ذمہ داری پیدا کر دیا جائے۔ اُن کی سیرت کی تربیت کی جائے اور اُن کی انفرادیت کو ترقی کا موقع دیا جائے۔ اگر اُنھیں اپنی نجات خود حاصل کرنا ہے تو اُنھیں مشترکہ زندگی کے انتظام کی ذمہ داری میں شریک ہونا چاہیے۔ انتخاب کنندگان کی جہالت یا غیر ذمہ داری کے عذر پر حق رائے دہندگی کو محدود کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ مشق ہی سے آدمی کام کرنا سیکھتا ہے۔ لوگوں میں اگر احساس ذمہ داری پیدا کرنا ہے تو اُن پر بھروسا کر کے اُنھیں ذمہ داری تفویض کرنا چاہیے۔ ایسا کرنے میں خطرات ضرور ہیں لیکن خطرات اُس وقت اور بھی زیادہ ہوتے ہیں اور صورتِ حال سخت یاس انگیز ہوتی ہے جب عوام کی اکثریت کو حقوق اور ذمہ داری سے محروم رکھا جاتا ہے۔ ایک شخصِ واحد کو حاکم مطلق بنانے میں علاوہ مندرجہ بالا اعتراضات کے ایک دوسرا خطرہ اور بھی ہے۔ ایک طرف تو یہ کہ اِس کی کوئی ضمانت نہیں ہوتی کہ وہ اپنے اختیارات ناجائز فائدہ اُٹھا کر اپنے ذاتی اقتدار کے غیر ضروری استحکام میں مدد نہ لے گا۔ دوسری طرف اُس کے جانشین کا مسئلہ حل طلب رہ جاتا ہے اِس لئے جمہوری نظام اپنے تمام نقایص کے باوجود بہترین نظام ہے۔ البتہ اُس کی جو نمایاں خرابیاں ہیں اُن کے ازالے کی کوشش ضروری ہے۔ مثلاً

اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت، عوام کو بعض اہم معاملات میں نمایندے منتخب کرنے کے بعد بھی اپنی رائے کے اظہار کا موقع دینا اور بعض دوسرے معاملات میں اس کے برخلاف ماہر دل کی رائے پر زیادہ اعتماد کرنا ایسی راہیں ہیں جن کو اختیار کر کے اصلاح کی کوشش کی جا سکتی ہے۔

آزادی کو جن جن راہوں سے اور جن جن شکلوں میں مختلف زمانوں میں اور مختلف مقامات پر حاصل کرنے کی کوششیں کی گئی ہیں انھیں اب ہم دیکھ چکے ہیں۔ ہمیں معلوم ہوا کہ تحریک آزادی تمام انسانی زندگی پر حاوی ہے۔ اس کا تعلق افراد سے بھی ہے خاندانوں سے بھی اور ریاست سے بھی۔ اس کا اثر صنعت پر بھی پڑتا ہے اور قانون، مذہب اور اخلاقیات پر بھی۔ اگر گنجایش ہوتی تو اس کا جو اثر ادب اور فنونِ لطیفہ پر ہوتا ہے اس کے دکھلانے کی بھی کوشش کی جاتی کہ کس طرح تحریک آزادی کے زیر اثر قدامت پرستی، تصنع، علامِ اظلاص اور مربیوں کے ذوق کی پابندی کے خلاف جنگ اور انفرادیت، واقعیت اور صناع وادیب کی حقیقی روح کو نمایاں کرنے کی کوششیں کی گئی ہیں۔ غرض جدید دنیا کی تعمیر میں تحریک آزادی کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

دوسری بات جو اس ذیل میں خاص طور پر قابلِ لحاظ ہے وہ یہ ہے کہ تحریک آزادی کا کام ختم نہیں ہوا ہے بلکہ جاری ہے اور ترقی پر ہے۔ جیسا کہ ابتدا میں بیان کیا گیا تھا جب تک فرد اور جماعت میں وہ ہم آہنگی پیدا نہ ہو جائے جس سے جماعت کی ہر پابندی کو فرد ایک خارجی اور تہدیدی پابندی نہیں بلکہ اپنے اجتماعی نفس اور ضمیر کی پابندی سے تعبیر کرنے لگے یہ سلسلہ جاری رہے گا تاآنکہ جماعت کی اطاعت اور آزادی میں کوئی فرق باقی نہ رہے گا ؛

~ ~ ~ ~ ~ ~

ہندوستانی مسلمانوں کا مستقبل

(پروفیسر محمد مجیب صاحب کا لکچر جو انھوں نے ۱۳ اپریل کو
جامعہ کے کالج کے طلبہ کے جلسے میں دیا تھا۔)

برادرانِ جامعہ!

میں بہت دنوں سے سوچ رہا ہوں کہ آپ سے چند مسائل پر گفتگو کروں جن میں میرا جی لگا رہتا ہے اور جن پر میں سمجھتا ہوں کہ آپ سب کو بھی غور کرتے رہنا چاہیے۔ میرا مقصد لکچر دینا یا نصیحت کرنا نہیں ہے، میں صرف اپنے خیالات بیان کرکے آپ کی رائے لینا اور یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ ہم میں کہاں تک اتفاق ہے اور یہ اتفاق ہم آہنگی اور اتحادِ عمل پیدا کرسکتا ہے یا نہیں۔ ہماری چھوٹی سی جماعت کو اس کا موقع دیا گیا ہے کہ ایک انتشار زدہ ملت کے سامنے یک جہتی اور اتحاد کا نمونہ پیش کرے اور اگر ہم سچّے دل سے ایسے مسلک کی تلاش میں لگے رہے جو سب کا مسلک بن سکے تو ہم کو ایک بڑی خدمت انجام دینے کا شرف حاصل ہوگا۔ لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم آپس میں آزادی سے اپنے خیالات کا چرچا کریں۔ اور جو کچھ صحیح سمجھیں اُسے فقط زبان سے تسلیم نہ کریں بلکہ جہاں تک ممکن ہو عمل کے ذریعے اُسے آزماتے بھی رہیں، اُتنا ہی ضروری یہ بھی ہے کہ ہم دنیا کی تمام بڑی ذہنی اور معاشرتی تحریکوں کا مطالعہ کرتے رہیں اور اُن میں جو کچھ ہمیں قابلِ قدر معلوم ہو اُسے اپنے ذہنی اور اخلاقی سرمایے میں شامل کرتے رہیں۔ میں آج آپ کے سامنے اس مسئلے پر بحث کرنا چاہتا ہوں کہ دنیا کی عام روش کو دیکھتے ہوئے ہمیں کون سی روش اختیار کرنی چاہیے اور ہم اس دولت کو جو مسلمان اور ہندوستانی ہونے کے سبب سے ہمیں ملی ہے کس طرح استعمال کر سکتے ہیں کہ ہمیں فائدہ بھی ہو اور ہمارا اصل سرمایہ بھی بڑھتا رہے۔

اِس بحث کو میں اسی سوال سے شروع کروں گا جو باہر کے لوگ جامعہ والوں سے ہمیشہ پوچھتے ہیں کہ جامعہ کے طالب علم فارغ ہوکر کیا کر سکتے ہیں۔ جامعہ کے اساتذہ کے لئے اِس کا سب سے آسان جواب یہ ہے کہ تعلیم گاہ کا یہ مقصد نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو نوکریاں دلوائے لیکن اِس جواب سے ہماری ذمّہ داری بہت بڑھ جاتی ہے اور آپ کی مشکل آسان نہیں ہوتی۔ ہم نے ایک رسم کو جس کی لوگ ناعاقبت اندیشی مگر اطمینان سے پیروی کر رہے تھے غلط اور مضر ٹھہرا کر چھوڑ دیا۔ اَب ہمارا فرض ہے کہ اِس کی جگہ ایک نیا نظامِ حیات تجویز کریں جو صحیح اور مفید ہو اور کوئی ایسا طرزِ عمل اختیار کریں جسے ہم اپنے دینی، اخلاقی اور سیاسی عقائد سے ہم آہنگ ثابت کر سکیں جو ہمارے علم میں جان ڈالے اور ہماری تعلیم گاہ میں سچائی اور مردم دوستی کی رونق پیدا کرے۔ اِس سے آپ کو یہ فائدہ ہونا چاہیئے کہ تعلیم سے فارغ ہوکر آپ دنیا میں اجنبی بن کر نہ داخل ہوں بلکہ ہر لمحہ محسوس کریں کہ یہ وہی دنیا ہے جس کے لئے آپ جامعہ میں تیار کئے گئے ہیں اور اس میں وہی روش کامیاب ہوگی جس پر چلنا آپ کو جامعہ میں سکھایا گیا تھا۔

لیکن میں محض فرضی بحث نہیں کرنا چاہتا۔ میں یہ بہت ضروری سمجھتا ہوں کہ نیا راستہ تلاش کرنے سے پہلے ہم کو پورا یقین ہو جائے کہ پُرانا راستہ ہمیں منزلِ مقصود تک نہیں پہنچا سکتا۔ کیونکہ راہ رَو کے لئے ثابت قدمی شرط ہے، منزل خواہ دور ہو یا قریب، اور تھوڑی تھوڑی دور چل کر واپس آنا بھٹکنے کی سب سے زیادہ قابلِ افسوس کیفیت ہے۔ اِس لئے میں چاہتا ہوں کہ آپ جامعہ کے وجود اور یہاں اپنی موجودگی کو دم بھر کے لئے بھول جائیے اور اپنے ملک کی حالت پر غور کر کے سوچئے کہ آپ کے لئے کسبِ معاش کی کون کون سی صورتیں ہیں، اور اگر کسبِ معاش کے علاوہ آپ اور کوئی حوصلے رکھتے ہیں تو اُن کے پورے ہونے کا کس قدر امکان ہے۔

سب سے پہلی صورت تو یہ ہے کہ آپ ملازمت کے لئے کوشش کریں۔ ملازمت کا میدان بہت وسیع ہے۔ مگر کسی ایک وقت میں دیکھئے تو اس میں گنجائش بہت کم ہوتی ہے۔ اور اِس ذرا سی جگہ میں اتنے لوگ گھس جانے کو تیار کھڑے رہتے ہیں کہ آپ کی باری خدا جانے

کب آئے۔ اگر آپ کی قابلیت یا آپ کے خاندانی بزرگوں کا اثر، یعنی خوشامد اور جوڑ توڑ کام آیا تو خیر ورنہ بہتر تو یہ ہے کہ آپ اِس طرف رخ ہی نہ کریں۔

نوکری کے لئے کوشش نہ کرنا آجکل کوئی نئی بات بھی نہیں ہے۔ بہت سے نوجوان دو چار بار ٹھوکریں کھاکر یا ہوشیار ہوئے تو پہلے ہی سے ارادہ کر لیتے ہیں کہ ہم نوکری نہیں کریں گے۔ وہ تجارت، اخبار نویسی یا کبھی کبھی تصنیف و تالیف کو ذریعہ معاش بناتے ہیں۔ بعض اپنی قدرتی استعداد اور طبیعت کی مناسبت سے اِن پیشوں میں کامیاب ہوتے ہیں یا کم از کم ٹھکانے سے لگ جاتے ہیں۔ بہت سے ایسے بھی نکلتے ہیں جنھیں چند سال کے تجربے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے پیشے کے لئے موزوں نہیں ہیں۔ بہر حال نوکری سے آج کل اتنے لوگ مایوس ہو رہے ہیں اور ہماری تعلیم گاہیں اس مایوسی اور مصیبت کو بھگتنے کے لئے اتنے نوجوانوں کو تیار کر رہی ہیں کہ اور پیشوں میں بھی کامیاب ہونا خاصا دشوار ہو گیا ہے اور کسبِ معاش کی فکر اتنی بڑھ گئی ہے کہ اُس نے اور کسی فکر کے لئے جگہ نہیں چھوڑی ہے۔ ہم ایسے ناسمجھ نہیں ہیں کہ اِس قومی مصیبت کے اسباب سے واقف نہ ہوں۔ ہمیں معلوم ہے کہ ہماری موجودہ تعلیم ہم میں کوئی خاص استعداد پیدا نہیں کرتی۔ ہم ہر کام کو اناڑیوں کی طرح شروع کرتے ہیں۔ ہمارا تخیل اِس قدر کمزور اور پست ہے، ہمارا دِل اتنا چھوٹا کہ ہم صرف دوسروں کی نقل کر سکتے ہیں۔ تجربے سے فائدہ نہیں اُٹھاتے اور ضد اور حسد میں ایک دوسرے کا کام بگاڑتے رہتے ہیں۔ ہم یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ ہماری زندگی میں اصلاح نہ ہوئی تو ہم طرح طرح کی نئی بلاؤں میں گرفتار ہوتے رہیں گے لیکن افراد میں اتنی ہمت عاقبت اندیشی اور قابلیت نہیں ہے کہ وہ عام روش کے خلاف اصلاح کے خیال سے کوئی نئی وضع اختیار کریں یا کسبِ معاش کے نئے ذریعے دریافت کریں۔ حکومت کو ہماری اِن دشواریوں سے کوئی مطلب نہیں اور ہمارے رہنما اتنے روشن خیال اور دور اندیش نہیں ہیں کہ اصلاح کی ایسی کوئی مہم سر کرنے کا حوصلہ کریں۔

اِس لئے آپ جامعہ میں ہوں یا کہیں اور، اور آپ کو اپنے ذاتی اغراض کے سوا اور کسی مسئلے سے سروکار ہو یا نہ ہو آپ ذرا بھی غور کریں تو ضرور اِس نتیجے پر پہنچیں گے کہ آپ کا مستقبل کسی اعتبار سے اُمید افزا

نہیں ہے اور اس وقت کسی طرف سے اس کو بہتر بنانے کی کوشش نہیں کی جا رہی ہے۔ اگر آپ ذاتی اغراض کی حد سے گذر کر ملک کی عام حالت پر نظر ڈالیں تو آپ کو اپنی دشواریاں ایک بڑے پیمانے پر دکھائی دیں گی اور وہی حیرانی جو آپ کو اپنے متعلق سوچنے سے پیدا ہوتی ہے آپ کو قوم کے مستقبل پر غور کرتے وقت ستائے گی۔ سب سے زیادہ تکلیف آپ کو غالباً اس بات سے ہوگی کہ ہم مجبور ہیں یا مجبور بن بیٹھے ہیں۔ تنکے کی طرح ایک دھارے میں بہے چلے جاتے ہیں۔ ہماری نظر میں نہ کوئی ساحل ہے جہاں ہم اپنے لئے ٹھکانا کرنے کی اُمید رکھ سکتے ہیں، نہ کوئی بے پایاں سمندر جس میں گم ہو جانا ہم اپنی حیات کی تکمیل قرار دے سکیں۔ اس وقت ہم میں زیادہ تر لوگ ایسے ہیں جن کی سمجھ میں نہیں آیا ہے کہ ہماری زندگی میں کیسی تبدیلیاں ہو رہی ہیں اور کیسی ہونی چاہئیں۔ تعلیم یافتہ طبقے کا جو حصہ مُلکی معاملات میں پیش پیش رہتا ہے اُس کے نزدیک ترقی اس میں ہے کہ ہمیں حکومت کے اختیارات ملیں۔ ملک میں بڑے بڑے کارخانے قائم ہوں جو ہمیں اس لائق بنادیں کہ ہم جاپان، امریکہ، اور انگلستان کی صنعت کا مقابلہ کر سکیں۔ ہماری رہائش میں وہ تمام آسائیاں اور روزمرہ زندگی میں وہ تمام دلچسپیاں پیدا ہو جائیں جو مختلف آلات اور مشینوں اور فنونِ لطیفہ کی بدولت یورپ اور امریکہ میں پیدا کرلی گئی ہیں۔

لیکن یورپ اور امریکہ کی اندھی تقلید ہمیں راہِ راست پر نہیں لاسکتی۔ جب جماعت میں ربط اور اتحاد نہ ہو، افراد میں حکم دینے اور حکم بجا لانے کی استعداد اور عادت نہ ہو، وہ اجتماعی مقاصد کو ذاتی مقاصد نہ جانتے ہوں اور اُن کے لئے ایثار کرنے پر تیار نہ رہتے ہوں تو جمہوری حکومت، نعمت ہونے کی بجائے عذاب ہو جاتی ہے۔ ہم میں بے شک وہ اوصاف پیدا کئے جاسکتے ہیں جو جمہوری حکومت کو کامیاب بنانے کے لئے لازمی ہیں، لیکن ابھی ہم نے اخلاقی تربیت کی طرف بالکل توجہ نہیں کی ہے۔ صرف حقوق اور امتیازات کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ ہم میں بہت سے لوگ اپنے آپ کو قوم پرست کہتے ہیں۔ مگر ہم ابھی تک یہ طے نہیں کر سکے ہیں کہ قوم اور قوم پرستی کا مفہوم کیا ہے۔ ہماری قوم پرستی اَب تک ہماری اغراض کے مجموعے کا نام ہے جو اس وقت بالکل منتشر ہو جاتا ہے جب ہم اسے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ آپ اَب بھی دیکھ رہے ہیں کہ جوائنٹ

پارلیمنٹری کمیٹی کی تجاویز نامنظور کرنے میں تو خاصا اتفاق ہے۔ کمیونل اوارڈ پر مسلم اور مستند لیڈر بھی گفت گو کرتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ جب تک کوئی دشواری نہیں پیش آتی ہم خوشی خوشی آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں، جب کوئی رکاوٹ دیکھتے ہیں تو بغلیں جھانکنے لگتے ہیں۔

یہی رویہ ہم نے معاشی معاملات میں اختیار کیا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ملک کی تجارت اور صنعت بالکل ہمارے ہاتھ میں آ جائے، اور ہمیں آہستہ آہستہ اس میں کامیابی ہو رہی ہے۔ لیکن سرمایہ دار پیدا ہو جانے اور کاروبار کا پیمانہ بڑھ جانے سے افلاس اور بے روزگاری کا مسئلہ حل نہیں ہوتا، کیونکہ آپ اس وقت دنیا میں ہر طرف بڑے پیمانے کی صنعت اور بے روزگاری کو پہلو بہ پہلو چلتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ہم کو یاد رکھنا چاہئے کہ نظام سرمایہ داری کی بقا اور بہبود کا اپنا قانون ہوتا ہے، اور ایک مرتبہ اس کے جسم میں جان ڈال دی جائے تو پھر وہ اپنی اغراض اور اپنی سلامتی کے لئے لڑے گا اور ہم ایک اور جنجال میں پھنس جائیں گے۔

برادرانِ جامعہ!

میں یاس مشرب نہیں ہوں، اور آپ کو مایوس نہیں کرنا چاہتا۔ ہم دنیا سے نرالے نہیں ہیں۔ ہماری جیسی حماقتیں اور بے پروائی دوسری قوموں نے بھی کی ہے، اور ایسی ہی مصیبتوں میں مبتلا ہو چکی ہیں۔ جماعتوں کا نقطۂ نظر، افراد کی ذہنیت ایک وقت میں نہیں بدلتی، اصلاح کے معنی یہ نہیں ہیں کہ سب ایک ساتھ سدھر جائیں اور سب ایک ارادے اور ایک طریقے سے کسی اصول پر عمل کریں۔ لیکن جماعتیں ترقی اسی وقت کرتی ہیں جب اُن کے اندر ایسی چھوٹی جماعتیں قائم ہو جائیں جو اپنے اصول اور عمل کو باقی کے لئے ایک مثال بنائیں جن مسائل پر دوسرے غور نہیں کرتے اُن پر غور کریں، جو خطرے دوسروں کو نظر نہیں آتے اُن سے سب کو آگاہ کریں اور اصلاح اور ترقی کی نئی تدبیریں کرتے رہیں۔ میرے خیال میں ہماری چھوٹی سی جماعت ہندوستانی مسلمانوں کے لئے، اور ہندوستانی مسلمانوں کی تمام ہندوستانیوں کے لئے یہ خدمت انجام دینے کا ارادہ کرنا چاہئے۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہم برتری کا دعویٰ کریں یا اپنے آپ کو برگزیدہ ہستیاں سمجھیں۔ جامعہ کی حالت نہایت نازک رہتی ہے مسلمان

انتشار اور پستی کی انتہا کو پہنچ گئے ہیں۔ ہر میدان سے اُن کے قدم اُکھڑ رہے ہیں۔ اپنی اصل سے جس قدر دور وہ ہیں ہندوستان کی اور کوئی ملت نہیں ہے۔ ہماری سلامتی کی میرے خیال میں اب یہی ایک تدبیر ہے کہ ہم اپنے حوصلوں کو ایڑ لگائیں اور فوری نقصان اٹھا کر بھی اپنا پورا اخلاقی اور دنیاوی سرمایہ قومی زندگی کی تعمیر میں لگا دیں۔ اِس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہمیں دنیا اور دنیاوی مفاد کو ٹھکرا کر بالکل اخلاقی اور دینی مقاصد میں محو ہو جانا چاہئے۔ ہم دنیا کو سمجھے بغیر دین کو نہیں سمجھ سکتے۔ اور اِس وقت اگر ہم اپنی ملی اور قومی ضروریات اور فرائض کا صحیح اندازہ نہ کر سکے تو ہم دنیا سے بھی جائیں گے اور دین سے بھی ہم کو اِس زمانے کی تمام بڑی تحریکوں اور عالمگیر مسائل کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ کیونکہ اَب آمد و رفت کے ذریعے ایسے ہو گئے ہیں کہ دنیا کا کوئی حصّہ خارجی اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ پھر ہمیں دنیا کی عام روش اور دوسرے ملکوں کے تجربے کو سامنے رکھکر اپنے ملی مسائل پر غور کرنا چاہئے اور یہ سوچنا چاہئے کہ ہمارے اور آئندہ نسلوں کے لئے عزت اور فراغت سے زندگی بسر کرنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔ ہم کس طرح سے دنیا میں اپنا اور اپنی قوم کا اعتبار قائم کر سکتے ہیں اور اپنے آپ کو اِس دینی، اخلاقی اور تہذیبی دولت کا جو ہمیں ورثے میں ملی ہے کس طرح مستحق ثابت کر سکتے ہیں؟

برادرانِ جامعہ!

انسانی زندگی میں ہر وقت مختلف قوتیں اور تحریکیں برسرِ پیکار رہتی ہیں، اور اِس زمانے میں بھی ایک دو رخی جنگ ہے جو دنیا کے ہر گوشے میں جاری ہے اور ہندوستان میں بھی اُس کے لئے میدان تیار ہو رہا ہے۔ ایک طرف انسان اور مشین، پرانی تہذیبی حدود اور مشین پرستی کا مقابلہ ہو رہا ہے۔ دوسری طرف مذہب اور لامذہبیت ایک دوسرے سے بھڑے ہوئے ہیں۔ مشین پرستی اور لامذہبیت میں پورا اتفاق اور اتحادِ عمل ہے۔ تہذیب اور مذہب مجبور ہو کر ایک دوسرے سے ملے ہیں اور اُن کی سب سے بڑی کمزوری یہی ہے۔ اگرچہ دونوں کے علمبرداروں نے یہ اچھی طرح سمجھ لیا ہے کہ اُن میں سے کوئی ایک اکیلا سلامت نہیں رہ سکتا۔ کامیاب ہوں گے تو دونوں، تباہ ہوں گے تو دونوں۔ مشین پرستی اور لامذہبیت کے مرکز امریکہ اور روس ہیں، اور اُنھوں نے پرانی یورپی تہذیب پر قریب قریب فتح حاصل کر لی ہے۔ اَب ہم

کسی یورپی قوم کو انسانیت اور مذہب کا سچا حامی نہیں سمجھ سکتے۔ اُن کی پُشت و پناہ صرف افراد اور محدود حلقے ہیں۔ مشرقی دنیا پر مشین پرستی اور لامذہبیت کے حملے شروع ہو گئے ہیں اور بہت سی تعلیم گاہوں پر اُنھوں نے اپنا قبضہ جما لیا ہے۔ لیکن ہم وقت پر ہوشیار ہو جائیں تو اب بھی مقابلے کا بہت اچھا موقع ہے۔

سب سے پہلے تو ہمیں چاہئے کہ اپنے حریف کی خصوصیات کا بخوبی مشاہدہ اور مطالعہ کریں۔ مشین پرستی کی ابتدا اٹھارہویں صدی کے آخر میں صنعتی انقلاب کے ساتھ ہوئی۔ جب لوگوں کو یہ خیال ہوا کہ سائنس کی ترقی سے انسان، جو ہمیشہ مجبور سمجھا جاتا تمام مادّی قوتوں کو اپنے قابو میں کر لے گا اور اصلاح اور ترقی کے لئے عقیدے اور عمل کی درستی سے زیادہ ضروری نئی کلوں کی ایجاد اور کاروبار کی نئی سہولتیں ہیں۔ اِس وقت مشین پرستوں کی زندگی کا معیار کارخانے کا معمول ہے۔ اُن کے اخلاق کا معیار چالاک اور کامیاب تاجر کا طرزِ عمل ہے۔ اُن کے نزدیک حسین وہی چیز ہوتی ہے جو مشین سے بنائی جائے، اور وہی چیز قابلِ قدر ہے جس کی بدولت روپیہ کمایا جا سکے۔ اُنھیں اِس پر افسوس نہیں ہوتا کہ مشین کا رواج ہر قسم کے ہنر کے لئے مہلک ہے، کیونکہ وہ انسان کے ہاتھوں کی بنائی ہوئی چیزوں کو بدنما اور بھونڈی سمجھتے ہیں اور اُنھیں کچھ پروا نہیں ہوتی اگر دولت پیدا کرنے کا خیال کسی قوم پر بھوت کی طرح سوار ہو جائے اور اُس کے افراد کے اور تمام حوصلے مر جائیں۔ اُن کے نقطۂ نظر سے دُنیا کو خوش اور آباد رکھنے کے لئے مشین اور اشتہار کافی ہیں اور جو اُن دونوں کے رموز سے واقف ہو اُسے کوئی اور علم، کوئی اور ہنر، کوئی اور حقیقت درکار نہیں۔ لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ مشین پرستی کے مسلک میں چند خوبیاں بھی ہیں جو اُسے نہایت دلکش بنا دیتی ہیں۔ انسان، رسم و رواج کا بندہ نہیں رہتا، رہائش میں ہزاروں آسانیاں پیدا ہو جاتی ہیں، دولت اور سامانِ عیش کی افراط ہوتی ہے اور غریب اور کم ترقی یافتہ قوموں کو معلوم ہوتا ہے کہ مشین پرست ملکوں میں سب خوش، تندرست اور دولتمند ہوتے ہیں۔

مشین پرستی کا دوسرا رُخ موجودہ فلسفۂ اشتراک ہے۔ روس میں جو اشتراکی نظام ۱۹۱۷ء کے بعد

قائم ہوا اُس کے خاکے بھی صنعتی انقلاب کے زمانے میں بنائے جانے لگے تھے پہلے اُن میں مردم دوستی اور اخلاقی آئین کو زیادہ دخل تھا لیکن بعد کو اشتراکیت کا علومِ صحیحہ میں شمار ہونے لگا۔ اور کارل مارکس کی تعلیم میں جو اشتراکیت کا سب سے مکمل اور مؤثر نمونہ ہے علومِ صحیحہ کے سوا اور کوئی علم مادّے کے سوا وجود کی کوئی اور شکل، اشتراکیت کے سوا زندگی کا کوئی اور نظام تسلیم نہیں کیا جاتا۔ اشتراکی فلسفۂ حیات میں مذہب کے لئے گنجائش نہیں ہے۔ اوّل اِس وجہ سے کہ اشتراکیوں کے نزدیک مذہب، سرمایہ داروں کا سب سے زیادہ کارگر ہتھیار رہا ہے، اور اُسی کی بدولت کسان اور مزدور اپنے حق سے محروم اور اپنی غلامی سے مطمئن رکھے گئے ہیں۔ دوسرے اس لئے کہ انسان کا وجود بالکل مادّی ٹھہرایا گیا ہے اور انسان کے تمام عقائد، حوصلے، خیالات، احساسات اور خواہشیں مادّی اثرات اور خارجی تحریکوں کا نتیجہ مانی گئی ہیں۔ ایسے نظریئے یورپ میں بھی پیش کئے گئے، اور وہاں وہ مجموعی طور پر دہریت کہلاتے تھے۔ روس میں یہ نظریوں کی حد سے گذر کر عقائد بن گئے ہیں، ان کی ہر طرح سے تبلیغ کی جاتی ہے، اور وہ ایک مذہب ہے جو تمام اور مذہبوں کے مٹانے کی فکر میں ہے۔ چونکہ باقی دُنیا کے تمدّن اور تہذیب کا انحصار سرمایہ داری اور بڑے پیمانے کی صنعت پر ہے، اور کسان اور مزدور ہر جگہ اپنے حق سے کم و بیش محروم رکھے گئے ہیں، روسی اشتراکیت اپنے حریفوں کی جماعت میں بدنظمی اور فساد پیدا کرتی رہتی ہے، اور کوئی تعجب نہیں اگر اُسے آخر میں اُن پر فتح حاصل ہو۔

تہذیب، انسان کی دلچسپیوں کو اِس قدر بڑھا دیتی ہے کہ دولت جمع کرنا زندگی کا واحد مقصد نہیں بن سکتا۔ لیکن دولت کے بغیر تہذیب قائم نہیں رہ سکتی۔ یورپ کی مہذب قومیں امریکی صنعت کا مقابلہ نہیں کر سکیں، اِس لئے جنگِ عظیم کے بعد سے امریکہ کی نقل ہونے لگی۔ دصنعتی کامیابی پر اور تمام حوصلے قربان کئے جانے لگے۔ دوسری طرف روسی اشتراک کو زور پکڑتے دیکھ کر سرمایہ دار اور خوش حال طبقوں میں فاشسٹ تحریک کی ابتدا ہوئی جس کا اِس وقت جرمنی اور اطالیہ میں دَور دَورہ ہے۔ اِن دونوں تحریکوں میں وہ ذہنی اور اخلاقی اُمنگیں، نوعِ انسانی اور عقیدے کا وہ احترام جو تہذیب کی جان ہے نظر انداز کیا گیا ہے، انسانوں کو انھوں نے بھی ایک بڑی مشین کے کل پُرزے

بنا دیا ہے۔ بس مشین کا نام دوسرا رکھ دیا ہے اسی بنا پر میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ یورپی تہذیب مشین پرستی اور لا مذہبیت کا مقابلہ نہیں کر سکی ہے۔

ہندوستان میں مشین پرستی کے رواج کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ہمارے یہاں جو رہی سہی صنعتیں ہیں وہ تباہ ہو جائیں گی، ہمارے سرمایہ دار اس فکر میں پڑ جائیں گے کہ ہر کام مشین سے کریں، اور اگر وہ اس میں کامیاب ہوئے تو ہمارے مزدوروں پر ہر پانچ دس سال کے بعد فاقہ کشی کی مصیبتیں نازل ہوا کریں گی۔ اگر زمین کی کاشت مشین سے ہونے لگی، اور کسان کو مقابلے سے محفوظ رکھنے کی کوئی تدبیر نہ کی گئی تو اور بھی طوفان برپا ہو گا۔ دوسری طرف روسی اشتراکیت کے رواج کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ہم انگلستان کی جگہ روس کے غلام بن جائیں گے، اور اگر ایسا نہ بھی ہوا تو ہماری قوم ممکن ہے برسوں تک ایسے جابر سانڈوں کا تختۂ مشق بنی رہے جو نہ ہماری سیرت کا خیال کریں گے نہ ہماری روایات اور ہمارے مذہب کا پاس لحاظ کریں گے اور جو اپنی پیاس بجھانے کے لئے خون کی ندیاں بہائیں گے۔

ان آفتوں سے بچنے کے لئے ہم کچھ نہیں کر رہے ہیں، کیونکہ جمہوری حکومت اور صنعتی خودمختاری جس کا ہم مطالبہ کر رہے ہیں دونوں ہماری حفاظت کے لئے کام نہ آئیں گی۔

سیاسی آزادی دنیا کے بہت سے ملکوں کو حاصل ہے مگر جمہوری طرزِ حکومت جو کسی زمانے میں ہر مرض کا علاج سمجھا جاتا تھا، ہر جگہ بے وقعت ہو رہا ہے۔ معاشی آزادی بھی بہت سے ملکوں کو حاصل ہے مگر بڑے پیمانے کی صنعت اتنی مدت سے معاشرت اور تخیل پر چھائی ہوئی ہے اور اس نے قوموں کو ایسے الجھیڑوں میں پھنسا دیا ہے کہ اب معلوم ہوتا ہے وہ سب کو اپنے ساتھ لے ڈوبے گی۔ اشتراکیت کے پہلے مجاہد یہ دعوے کرتے تھے کہ دنیا کی معاشی اور صنعتی کشمکش اشتراکی نظام قائم ہوتے ہی غائب ہو جائے گی۔ مگر روس کی اشتراکی حکومت ہر طرح کے سرمایہ داری نظام کی نقل کر رہی ہے، اور اس میں ایک یہ شیطانی جذبہ اور ہے کہ ساری دنیا کے معاشی نظام کو درہم برہم کر کے ہر جگہ اتنا فساد برپا کرے کہ مزدور اور کسان، نظامِ حکومت پر قبضہ کر لیں اور سرمایہ داروں کو بے دخل کر دیں۔

ہمارے لئے یورپ اور امریکہ کی جمہوریت اور سرمایہ داری، روس کی اشتراکیت اور جنگ جوئی

مطالعہ کے لائق ہیں، تقلید کے لائق نہیں ہیں ہم کو اُن سے سبق لینا ہے اور اُن کی کمی پوری کرنا ہے
اپنے ملک میں ہمیں ایک ایسا نظام قائم کرنا ہے جو چست اور مضبوط ہو۔ اپنے اندر ترقی اور نشو ونما کی
صلاحیت رکھتا ہو اور اپنی بقا کے لئے کسی دوسرے کو ہلاک کرنے پر مجبور نہ ہو۔ ہمارے ملک میں
نئی تہذیب، نئی سیاسی زندگی، نئی صنعت اور نئی معاشرت کی داغ بیل ڈالی جا رہی ہے۔ ہم کسی
رستے پر اتنی دور نہیں نکل گئے ہیں کہ واپسی میں بہت زیادہ زحمت ہو۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ
ہم ایک مذہب کے پیرو ہیں جو ایک نہیں ہزار تہذیبوں کی مدح و سوال ہو سکتا ہے، اسی وجہ سے
میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہمارا یقین پختہ ہو اور حوصلہ بلند تو ہم اس مہم میں کامیاب ہوں گے اور جہاں
اس وقت دوسروں کے نقش قدم پر چلتے ہیں وہاں شاید دوسروں کی رہبری کریں گے۔

برادرانِ جامعہ!

ہمارا ایک عام عقیدہ ہے کہ مذہب، زندگی کے ہر پہلو پر حاوی ہے۔ اس لئے علم اور مذہب
کو جُدا کرنا، سیاسیات اور مذہب کو ایک دوسرے سے بے تعلق سمجھنا، معاشرت اور عادات میں
مذہبی آئین کا لحاظ نہ رکھنا بالکل غلط ہے لیکن افسوس ہے ہم اس صحیح اور مفید عقیدے سے جو نتیجے نکالتے
ہیں اُن سے منطق اور مصلحت دونوں کا خون ہوتا ہے، اور ہماری زندگی میں کوئی مذہبی اور روحانی
شان پیدا نہیں ہوتی۔ اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرنے کے شوق میں ہم علم دوستی کے آداب بھول جاتے
ہیں۔ ہم ہر چھوٹی بڑی اور اچھی بُری معاشرتی رسم کو شرعی حکم ٹھہرا کر اپنی نشو ونما کو روکتے رہتے ہیں
لیکن ان مسائل سے یہاں بحث نہیں ہے۔ میں آپ کو خاص طور پر اس نقصان کی طرف توجہ دلانا
چاہتا ہوں جو اس عقیدے کی غلط تشریح سے ہماری سیاسی حیثیت کو پہنچا ہے۔ کیونکہ ہم ہر مسئلے
پر غور کرتے وقت مسلمانوں کے فرائض کو نظر انداز کر کے صرف ان کی فوری اغراض کا خیال کرتے ہیں
اور سیاسی اختلافات کو خواہ مخواہ مذہبی رنگ دے دیتے ہیں۔ ہمیں بے شک سیاسیات اور مذہب کو
جُدا نہ کرنا چاہئے بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمیں یہ کبھی نہ کہنا چاہئے کہ فلاں کام سیاسی ہے،
اسے ہم چاہیں کریں یا نہ کریں۔ لیکن فلاں کام دینی ہے اسے ہم ضرور کریں گے۔ ہمارا فرض ہے کہ اگر

سیاسی مفاد کے نام سے اخلاقی قانون کی خلاف ورزی کی جارہی ہو تو ہم اخلاق کی حمایت کریں، لیکن یہ سمجھ بیٹھنا کہ سیاسیات سے ہمیں کوئی واسطہ نہیں، ہندوستان آزاد ہو یا نہ ہو ہندوستانی صنعت اور تجارت ترقی کرے یا نہ کرے ہمیں کوئی مطلب نہیں۔ یہ مصلحت اور میرے خیال میں ہماری مذہبی اور اخلاقی تعلیم کے خلاف ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ اگر ہم اپنے مذہب اور اپنی روایات کی صحیح ترجمانی کریں تو ہم کو قوم پرستوں اور آزادی کے مجاہدوں میں سب سے آگے ہونا چاہئے۔ ہم کو علوم وفنون، صنعت اور تجارت پر اپنا سکّہ جمانا چاہئے، اور جن حقوق کے لئے ہم اس وقت ایک نہایت مضحک اور مہمل طریقے پر لڑ رہے ہیں انھیں سیاسی زندگی کی باگ اپنے ہاتھ میں لے کر بغیر حجت اور مطالبے کے حاصل کرنا چاہئے۔ لیکن آزادی کے لئے قربانیاں کرنا، جمہوری حکومت کا ایک سلجھا ہوا نظام قائم کرنا، اور اُسے خودمختاری اور فرماں برداری، آزادی اور ضبطِ نفس، خدمت اور ایثار کی نمایاں مثالیں پیش کر کے مستحکم کرنا درحقیقت ہمارے فرائض کا صرف ایک حصّہ ہے۔ ہمیں اُن معاشرتی اصلاحوں کا ذمہ بھی اپنے سر لینا ہے جس کے بغیر ہماری جماعت روسی اشتراکیت کے حملوں سے محفوظ نہیں رہ سکتی، اور مذہبیت کی تخلیقی قوّت کے اوصاف اور کارنامے دنیا پر ظاہر کر کے لا مذہبیت کے فساد کو دور کرنا ہے۔

برادرانِ جامعہ! ہر کام کے لئے موقع درکار ہوتا ہے۔ ہر اجتماعی عمل کے لئے ایک میدان چاہئے۔ دنیا کا ہر مُلک ہمارا مُلک ہے۔ اِس لئے کہ وہ ہمارے خدا کا مُلک ہے۔ مگر کیا اِس کے معنی یہ ہیں کہ ہم کو ہر جگہ پردیسی بن کر رہنا چاہئے۔ وہاں کی نعمتوں کو اپنے اوپر حرام کر لینا وہاں کی مشکلوں کو اپنی مشکلیں نہ سمجھنا چاہئے؟ اِس وقت ہندوستان، ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں، عیسائیوں اور ہریجنوں میں تقسیم کیا جا رہا ہے، اور سب کے دلوں میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ ہندوستان کا وہی حصّہ اُن کا ہے جس میں اُن کی اکثریت ہے، اور سب جو چاہیں سمجھیں مسلمان اب تک ہندوستان کو ایک مکمل سیاسی وجود مانتے آئے ہیں اور اِس عقیدے سے اُن کی اپنی تعداد کا کوئی تعلق نہیں رہا ہے۔ ہم کو شمالی ہندوستان میں ایک متحد مرکزی حکومت قائم کئے ہوئے چند ہی سال گذرے تھے جب تاتاریوں نے

آکر عالم اسلامی کو تہ و بالا کردیا۔ ہماری کمزور نوعمر ریاست نے اُن کا بڑی جاں فشانی اور استقلال سے مقابلہ کیا، اور ہندوستان کو اُن کے مظالم سے محفوظ رکھا۔ یہ یقیناً جاں بازی اور حسنِ انتظام کا کرشمہ تھا۔ راجپوتوں کی حکومت کو چند حملوں نے ختم کردیا۔ مرہٹوں کے حوصلوں کو ایک فیصلہ کن جنگ نے خاک میں ملا دیا۔ انگریز بھی غداری اور دغابازی کا سہارا لئے بغیر میدان میں آنے کی ہمت نہ کرسکے، اور انھیں بھی اگر پچھتر برس تک مسلسل تاتاروں جیسے بے باک دشمنوں کا مقابلہ کرنا پڑتا تو خدا جانے اُن کا کیا حشر ہوتا۔ ہم ہندوستان کے لئے غیروں سے لڑے اور اپنے مذہب والوں سے لڑے، ہم نے اُسے فساد سے بچانے کے لئے اپنوں کا خون کیا، ہندوستان اگر ہمارا ملک نہیں ہے تو کس کا ہے۔ اس کا حق ہم پر نہیں ہے تو کس پر ہے۔ آپ اپنی تاریخ اور روایات پر غور کیجئے اور پھر یہ دیکھئے کہ آج کل آپ اس مُلک اور اس مُلک کے دوسرے باشندوں سے کیسی غیریت اور بے اعتنائی برت رہے ہیں۔ آپ کے اجداد نے کس ہمت اور استقلال سے اندرونی مشکلات اور بیرونی دشمنوں کا سامنا کیا۔ اور اس وقت آپ کس پست ہمتی سے اکثریت اور تحفظِ حقوق کا آسرا ڈھونڈھتے ہیں ہندوستان بے شک اِس اعتبار سے ہمارا مُلک نہیں ہوسکتا کہ ہم بغیر کسی کی شرکت کے اس پر حکومت کریں۔ لیکن اِس اعتبار سے وہ ہمیشہ ہمارا ملک رہے گا کہ اس امن و عافیت اور بہبود کے لئے ہم نے اپنا خون بہایا ہے، ہم نے اُسے مقام پرستی اور تنگ نظری کی قید سے چھڑایا، ہم نے ایسی معاشرت کا نمونہ پیش کیا جس میں ذات اور نسل کا امتیاز نہیں تھا۔ اور ہم نے اُسے ایک آزاد مذہب کا پیغام سُنایا۔ گذشتہ اور موجودہ زمانے میں میرے نزدیک ضرور اتنا فرق ہے کہ اب ہمیں اتحادِ عمل کا سبق پڑھنا اور پڑھانا ہے اور یہ ہمارے لئے ہر طرح سے مفید ہوگا۔

اِس وقت ہمارا سیاسی اور دینی فرض یہ ہے کہ ہندوستانی اتحاد کا جھنڈا کھڑا کریں۔ اور اتحاد کے ارادے کو اتنی تقویت پہنچائیں کہ وہ ہر ضروری انتظامی تفرلق پر غالب رہے۔ دوسرے اگر اس میں کمزوری بھی دکھائیں اور زبان یا نسل یا مصلحت کی آڑ لے کر اپنی اغراض اور اپنی دلچسپیوں، اپنے مقاصد اور حوصلوں کو محدود کرنا چاہئیں۔ تب بھی ہمیں اتحاد اور وحدت کے شیدائی بنے رہنا چاہئے۔

سیاسی تفریق زیادہ گہری ہوگئی تو ہمارا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ ہماری ملت میں بھی انتشار پیدا ہو جائے گا۔ ایک خطّے کے مسلمان، دوسرے خطّے کے مسلمانوں کو بیگانہ سمجھنے لگیں گے، ہم میں اُبھرنے اور ترقی کرنے کا جو مادہ ہے وہ آہستہ آہستہ زائل ہو جائے گا، اور ہم بالکل مقام کے غلام ہو جائیں گے۔ مسلمانوں میں کسی قسم کی تفریق مذہب اور روایات کے رو سے مناسب نہیں ہے، اور جب وہ مصلحت اور عاقبت اندیشی کے خلاف ہو تب تو اُسے کسی حالت میں گوارا نہ کرنا چاہیئے۔ ہندوستان کی دوسری ملتوں کو یگانگی اور اتحاد کا جذبہ بیدار کرنے میں بڑی مشکلیں پیش آ رہی ہیں، اس وجہ سے وہ وطن پرستی اور قوم پرستی پر زور دیتی ہیں اور اُسے ایک سیاسی مذہب بنانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ ہمیں اُن کی مجبوری دیکھ کر اُن پر اعتراض نہ کرنا چاہیئے۔ وہ بے شک چاہیں تو وطن پرستی کے گیت گائیں اور وطن کو دیوی بنا کر اُس کی پرستش کریں۔ ہماری خدا پرستی ہمارے لیئے کافی ہے۔

اتحاد کے بعد نظامِ حکومت کا سوال آتا ہے۔ مسلمانوں میں جمہوری حکومت بھی رہی ہے اور خلافت کے نام سے غیر ذمہ دارانہ حکومت بھی ہوئی ہے۔ ہم میں نیک بادشاہ ہوئے ہیں اور ظالم بھی ہوئے ہیں۔ لیکن جو طرزِ حکومت ہمارے دینی اور اخلاقی آئین سے سب سے زیادہ قریب ہے وہ جمہوری حکومت ہے۔ جمہوری حکومت ہزاروں طرح کی ہوتی ہے اور اُس کا نظام قوم کی ضرورت اور مصلحت کے مطابق بدلا جا سکتا ہے۔ جمہوریت کی روح یہ ہے کہ قوم کا ہر فرد اپنے آپ کو آزاد اور خود مختار سمجھے، حکومت کے ہر معاملے کو اپنا معاملہ جانے، اِس کی کامیابی میں اپنی کامیابی اِس کے عیب میں اپنا عیب دیکھے۔ آپ کے سامنے اِس دعوے کے ثبوت پیش کرنے کی ضرورت نہیں کہ اِس وقت ہماری قوم، حکومت کو غیروں کی حکومت سمجھتی ہے۔ اِس جمہوریت سے جس کے حاصل کرنے کی آج کل کوشش کی جا رہی ہے، اِس کو کوئی لگاؤ نہیں ہے، اور انگریزوں کے طعنے سُن کر بھی ہمارے سیاسی رہنما کوئی دستور اور نظامِ حکومت متفقہ تجویز کے طور پر پیش نہیں کر سکے ہیں۔ اِس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہماری سیاسی تحریک دراصل بے بُنیاد ہے۔ ہم آزادی چاہتے ہیں مگر یہ نہیں جانتے کہ ملے گی تو کیا کریں گے۔ ہماری سیاسی زندگی میں ارادے کو اتنا ہی دخل ہے جتنا کہ ہوا میں اُڑتے ہوئے تنکوں کو۔

اِس سے ہم کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ہمارا طرزِ عمل سراسر غلط ہے۔ ہم اپنی زندگی اور اپنے تخیل میں ایک خلو پیدا کرنا چاہتے ہیں جو فطرت کے بالکل خلاف ہے۔ ہم مرکزی حکومت میں اختیار چاہتے ہیں جب ہمیں گاؤں میں کوئی اختیار نہیں، ہم قوم کے ارادے اور حوصلے کی قسمیں کھاتے ہیں جب قوم کے پچانوے فی صدی افراد ہماری باتوں کو سنتے نہیں اور سنتے بھی ہیں تو سمجھتے نہیں۔ ہماری سیاسی تحریک میں جان اُس وقت پڑے گی جب وہ کسان اور مزدور کے گھر سے شروع ہو۔ جب اس کے مقاصد قوم کے مشترک مقاصد ہوں، اور فقط ایک تعلیم یافتہ طبقے کی اغراض نہ ہوں لیکن سوا چند سر پھرے نوجوانوں کے ہمارے سیاسی رہنما کسان اور مزدور بلکہ ہر طرح کے غریب آدمی سے بات کرتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ اور اُن کا یہ خوف بے جا نہیں ہے۔ اوّل تو حکومت برطانیہ اُسی وقت تک چشم پوشی کرتی ہے جب تک آزادی اور اختیاراتِ حکومت کی بحث تعلیم یافتہ طبقے کی دلچسپی ہی رہے۔ کیونکہ مزدور اور کسان تک بات پہنچ گئی تو اس کا کام بگڑ جائے گا، دوسرے یہ کہ ہمارے رہنما اور آزادی کے مجاہد مزدوروں اور کسانوں کی شرکت سے گھبراتے ہیں، اس لئے کہ پھر وہ بھی اپنا حق مانگیں گے اور انھیں اُن کا حق دینے پر کوئی تیار نہیں ہے۔

لیکن ہم بہت دنوں تک کسانوں اور مزدوروں کو اپنی سیاسی معاشرتی تحریکوں سے بے خبر اور بے تعلق رکھ نہیں سکتے۔ ہمیں اُن کے پاس جانا ہوگا اور کچھ کھنے لے کر جانا ہوگا۔ آپ جانتے ہیں چند سال ہوئے ایک اشتراکی پارٹی قائم ہوئی تھی جو اس وقت کچھ کانگریس کے ساتھ ہے۔ کچھ اس سے علیحدہ مگر تھوڑے دنوں میں وہ یقیناً ایک جداگانہ حیثیت اختیار کر لے گی اور اس کے رہبر ہمت نہ ہارے تو اس کا اثر کانگریس سے کہیں زیادہ ہو گا۔ آج کل ہماری تعلیم گاہوں کا جائزہ لیا جائے تو بیشتر نوجوان خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، اپنے آپ کو اشتراکی بتائیں گے، اور اُن میں سے اکثر مذہب، روایات اور پُرانی تہذیب کو مٹانا چاہتے ہوں گے۔ ابھی تک اشتراکی پارٹی اور اشتراکیت پسند نوجوان اپنے عقاید کو اچھی طرح سمجھ نہیں سکے ہیں۔ جب کوئی آزمائش کا موقعہ آئے گا وہ خود ٹھنڈے دل سے غور کریں گے تو اُن کی بہت بڑی تعداد اشتراکیت سے توبہ کر کے الگ ہو جائے گی، لیکن اِس کا بھی امکان ہے کہ اُن میں

تھوڑے سے جاں باز پیدا ہو جائیں اور انھیں ذرا بھی مہلت مل گئی تو وہ ایسی آگ لگا دیں گے جو پھر کسی کے بجھائے نہ بجھے گی۔ اس وقت ہمارے سیاسی رہبر اشتراکی پارٹی سے مصالحت کرنے میں ناکامیاب ہوئے ہیں، اور جب تک وہ ہندوستان کے سرمایہ داروں کا سہارا ڈھونڈھتے رہیں گے انھیں مصالحت کی اُمید نہ رکھنی چاہیے۔ اس طرح سے اشتراکی پارٹی اُن لوگوں کے اثر سے آزاد ہو گئی ہے جو کسی قدر محتاط ہیں۔ اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ہماری تعلیم گاہیں نوجوانوں کو کسی ایسے ڈھرے پر لگانے سے قاصر ہیں جو اشتراکیت کی طرح اُن کے تخیل کو گرویدہ کر سکے، یا جو اُن کے عقائد میں گہرائی پیدا کر سکے۔ معلوم ہوتا ہے جس طرح ہمارے سیاسی حوصلوں کی کشتی بغیر ناخدا اور بغیر قطب نما کے چکّر کھاتی کناروں سے ٹکراتی چلی جا رہی ہے اور کوئی یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ وہ کہاں جا کر ٹھہرے گی، ویسے ہی ہماری معاشی اور صنعتی اصلاح بدنظمی اور انتشار کا ایک عبرت انگیز نمونہ ہو گی۔

اس وقت بہت سی مسلمان نوجوان ہیں جو اشتراکیت کے بہت جوشیلے حامی ہیں، مگر اُن کے خیالات کا اثر ابھی تک ظاہر نہیں ہوا ہے اور یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ مجموعی حیثیت سے مسلمان اشتراکیت کے مسئلے سے نہ واقفیت رکھتے ہیں نہ دلچسپی۔ اس معاملے میں اُن کی غفلت اُن کے اور ہندوستان کے لئے اتنی ہی نقصان دہ ہو گی جیتنی کہ اتحاد اور جمہوریت کے مسائل میں، کیونکہ اُن کی فطرت سرشت اور عقائد میں اس کی صلاحیت ہے کہ وہ اشتراکیت کی تحریک کو لامذہبیت، مشین پرستی اور اخلاقی بے لگامی کی آلائشوں سے پاک کر کے مساوات، انصاف اور حقوق و فرائض کی صحیح تقسیم کا حامل بنائیں۔ اشتراکیت کی تحریک ابتدا میں بس اِس کی ایک کوشش تھی کہ مزدوروں کو وہ تمام حقوق دیئے جائیں جو جماعت میں انصاف اور مساوات کے رو سے ہر شخص کے ہونے چاہئیں اور کارخانوں میں اُن پر جو مظالم ہوتے تھے وہ بند ہو جائیں۔ لیکن سرمایہ داری کی اصلاح کا یہ طریقہ بے اثر ثابت ہوا، کیونکہ دوسری طرف سرمایہ داروں کو ہر قسم کے دباؤ سے محفوظ رکھنے کی فکر کی جا رہی تھی اور صنعتی کاروبار کا پیمانہ بڑھایا جا رہا تھا۔ آخر میں سرمایہ داری کا نظام اِس قدر مستحکم ہو گیا کہ وہ ریاستوں کے قابو سے بھی باہر ہو گیا، اور اسی زمانے میں ہزیمت خوردہ اشتراکیت ایک نئے اور جامع

فلسفۂ حیات کی صورت لے کر کارل مارکس کی تعلیم میں نمودار ہوئی۔ کارل مارکس کے فلسفے میں سرمایہ دار اور مزدور کی کشمکش انسانی زندگی اور تاریخ کا لب لباب ہے۔ اس میں موجودہ عہد کی سرمایہ داری صنعتی ترقی کی منزلِ مقصود قرار دی گئی ہے، اور یہ دکھایا گیا ہے کہ ساری دنیا کا صنعتی نظام آخر میں چند سرمایہ داروں کے قبضے میں آجائے گا۔ تب مزدوروں کو اس کا موقع ملے گا کہ وہ صنعتی دنیا کے ان چند بادشاہوں کو معزول کر کے اُن کی سلطنت پر قبضہ کر لیں اور حکومت جو اُن کا حق ہے اپنے ہاتھوں میں لے لیں۔ کارل مارکس کو یقین تھا کہ اگر مذہب اور مذہبی رہنما ملکیت کے حق کو دینی اور اخلاقی قانون بنا کر اہل سرمایہ کی مدد نہ کرتے اور مزدوروں اور کسانوں کو جنت اور روحانی تسلیوں کا فریب دے کر قناعت اور بردباری پر آمادہ نہ رکھتے تو وہ ہزاروں برس کی غلامی ہرگز برداشت نہ کرتے۔ اس وجہ سے کارل مارکس نے لامذہبیت کو اپنی اشتراکی تعلیم کا سنگِ بنیاد بنایا اور یہی سبب ہے روسی اشتراکی جو کارل مارکس کی تعلیم کو عینِ حقیقت مانتے ہیں مذہب کے وجود کو مٹانا چاہتے ہیں۔

کارل مارکس کے تقریباً تمام نظریے غلط ثابت کئے جا چکے ہیں، اور روس میں بھی اُن پر برائے نام عمل ہو رہا ہے لیکن اب وہ ایک مذہب بن گئے ہیں جس کی نہایت جوش اور عقیدت کے ساتھ تبلیغ کی جاتی ہے، اور دُنیا میں جہاں کہیں بھی افلاس یا بے چینی ہے وہاں یہ مذہب بہت آسانی کے ساتھ پھیل جاتا ہے، ہم اس کا مقابلہ دلیلوں سے نہیں کر سکتے، اگر ہم اِس سے نفرت ظاہر کریں گے اور اِس کے پیرووں پر کسی قسم کا جبر کریں گے تو اُن کا عقیدہ اور مضبوط ہو جائے گا۔ اِس سے ہم رواداری بھی نہیں برت سکتے، کیونکہ وہ خود رواداری کو غلط سمجھتا ہے اور جس طرح روس میں مذہب نیست و نابود کر دیا گیا ہے ویسے ہی ہندوستان میں بھی فنا کر دیا جائے گا۔ مذہب اشتراک کا توڑ صرف ایسی اصلاحیں ہو سکتی ہیں جو ہمارے مُلک کے افلاس کو دور کریں اور کسانوں اور مزدوروں کے لئے شکایت کا موقع نہ رکھیں

صحیح اشتراکیت کے معنی یہ ہیں کہ دولت کی قدر انسان کی قدر سے بڑھنے نہ پائے، اور

افراد کے حقِ ملکیت کو محفوظ رکھنے کی خاطر جماعت کے بہت بڑے حصّے کو فاقہ کرنے اور طرح طرح کی مصیبتیں جھیلنے پر مجبور نہ کیا جائے۔ اشتراکی نظام کا بنیادی اصول یہ ہے کہ زمین اور سرمایہ افراد کی جگہ جماعت کی مِلک قرار دیا جائے۔ اور جماعت کے ہر فرد کو اس سے مستفید ہونے کا موقع دیا جائے۔ سرمایے کے استعمال کی ترکیب کیا ہوگی، یہ ہر جماعت کی معاشی حالت پر منحصر ہے۔ لیکن یہ ہرگز لازمی نہیں ہے کہ اشتراکیت کے اصولوں پر اُسی وقت عمل کیا جائے جب بڑے پیمانے کی صنعت کا رواج ہو جائے۔

اگر ہم امریکہ کی مشین پرستی اور روسی اشتراک کے فریب میں نہ آئے، اگر ہم نے کسان کے سر سے مالگذاری، زمیندار اور سود خوار کا بوجھ ہلکا کر دیا اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کو فروغ دے سکے، اگر ہم نے شہروں میں وہی صنعتیں رائج کردیں جنھوں نے کسی زمانے میں ہندوستان کو تمام دُنیا میں مشہور کر دیا تھا، اگر ہم نے اپنے تعلیم یافتہ طبقے کو ذہنی غلامی سے آزاد کرلیا تو ہم ہندوستان میں بھی بہت جلد ایک اشتراکی نظام قائم کر سکتے ہیں، اور ممکن ہے ہم انتظامات کی خوبی میں روسی اشتراک سے بازی لے جائیں۔

مشکل صرف یہ ہے کہ اور مُلکوں کی طرح ہندوستان کی اصلاح میں ہم اپنے عقیدے اور ملت کے سوا اور کسی سے مدد نہیں مانگ سکتے۔

میں نے یہ بحث اِس سوال سے شروع کی تھی کہ ہم ان دشواریوں کو جو کسبِ معاش میں پیدا ہوگئی ہیں کس طرح سے دور کر سکتے ہیں۔ یہ مشکل صرف چند افراد کو نہیں پیش آرہی ہے بلکہ ہمارے ملک کے بیشتر نوجوانوں کو، اور ضرورت ایسی تدبیروں کی ہے جو کم از کم چار نسلوں کے لئے فراغت اور عافیت سے زندگی بسر کرنے کا سامان کردیں، اِسی خیال سے میں نے موجودہ زمانے کی عالمگیر تحریکوں پر جن سے ہندوستان متاثر ہوئے بغیر رہ نہیں سکتا، نظر ڈالی تھی، اور پھر یہ عرض کیا تھا کہ ہماری کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوسکتی جب تک ہم مُلک کے اندر پورا اختیار حاصل نہ کرلیں۔ اَب میں چاہتا ہوں کہ آپ دُنیا کی اور اپنے ملک کی حالت کو سامنے رکھ کر پھر اِس مسئلے پر غور کریں۔

اب تک جو غلطی زیادہ تر نوجوان کرتے آئے ہیں وہ یہ ہے کہ سوا اُن ملازمتوں کے جہاں ایک خاص ہنر سیکھے بغیر کام نہیں چلتا انھوں نے اپنی اہلیت اور شوق کا بالکل خیال نہیں کیا، اور اس لئے آپ کو سب سے پہلے یہ معلوم کرلینا چاہئے کہ آپ کو کس کام کا شوق ہے یا کس کام کو آپ بغیر اپنی طبیعت پر خاص جبر کئے کر سکتے ہیں۔ یہ معلوم کرنا بہت مشکل ہے۔ کیونکہ آدمی کا بہت کچھ کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اور اس کا تجربے کے بعد ہی پتہ چلتا ہے کہ وہ کیا کر سکتا ہے اور کیا نہیں کر سکتا۔ یہ تجربہ آپ کو بھی کرنا ہے، مگر اسے اس وقت نہ شروع کیجئے۔ جب آپ تعلیم سے فارغ ہوجائیں بلکہ طالب علمی کے زمانے کو جہاں تک ہو سکے مشق کا زمانہ بنائیے۔ اس کی سب سے اچھی صورت یہ ہے کہ آپ اپنی ذاتی اور قومی ضروریات اور فرائض کو پیش نظر رکھئے۔ طرح طرح کے کاموں میں اپنی استعداد کو آزماکر دیکھئے، ان اوصاف کو پیدا کرنے کی کوشش کیجئے جو کامیابی کے لئے ناگزیر ہیں، اور پھر جب آپ دنیا میں قدم رکھیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ آپ کی منزلِ مقصود کدھر ہے۔

اس وقت آپ کے دین، آپ کی ملت اور قوم کو جس طرح کی خدمت درکار ہے اس کی طرف میں اشارہ کرچکا ہوں۔ اس خدمت کو انجام دینے کے لئے آپ کا لیڈر بننا مفید نہیں ہے، اور یہ اور بھی مضر ہوگا کہ آپ جو کچھ کریں اُسے ایثار یا جہاد سمجھیں۔ آپ جو کام اپنے ذمے لیں وہ آپ کا ذریعہ معاش، آپ کا شوق اور آپ کے وجود کا دنیاوی مقصد ہونا چاہئے، اور ان تینوں نسبتوں سے آپ کو اس سے لگاؤ ہونا چاہئے۔ آپ کے تعلیم پانے کا ہرگز یہ نتیجہ نہ ہونا چاہئے کہ آپ پیشوں کے مدارج قائم کریں، اور چند پیشوں کے سوا اور سب کو اختیار کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھیں، بلکہ آپ کا نقطۂ نظر یہ ہونا چاہئے کہ ناکامیاب قومی لیڈر سے کامیاب گھسیارا بہت زیادہ قابلِ عزت ہوتا ہے۔ اپنا پیشہ منتخب کرتے وقت روشن خیالی، مصلحت، حوصلے سے کام لیجئے۔ جب ایک مرتبہ آپ انتخاب کرلیں تو سمجھ لیجئے کہ آپ کی عزت آبرو کامیابی میں ہے۔

پیشے کا انتخاب کرتے وقت آپ کو قومی مفاد کا ضرور لحاظ رکھنا چاہئے صرف اس نیت سے نہیں کہ آپ اپنے دل کو مطمئن رکھ سکیں، بلکہ اس نیت سے بھی کہ اس میں آپ کا اور آپ جیسے بہت سے

افراد کا فائدہ ہے۔ آپ ملازمت کریں تو ایسے اداروں کی کیجئے جو نظامِ حکومت کے کل کے پرزے نہ ہوں، مگر جن کا مقصد قوم کی بہبود ہو جیسے تعلیمی ادارے۔ آپ کو کاروباری زندگی کا شوق ہو تو کوئی ایسا کام پسند کیجئے جس سے ملک کی سچی دولت میں اضافہ ہوتا ہو۔ اس لئے کہ وہ تجارت جس میں مال ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا دیا جاتا ہے، کوئی نئی چیز پیدا نہیں کی جاتی مگر مال پہنچانے والا منافع میں حصہ دار ہو جاتا ہے، دراصل نقصان دہ ہوتی ہے اور سرمایہ داری کی سب سے مضر خصوصیتوں میں سے ہے سب سے اچھا حوصلہ آپ کے لئے یہ ہو گا کہ آپ شہری زندگی کو چھوڑ کر گاؤں میں اپنا گھر بنائیں، وہاں اپنی روشن خیالی، خود داری اور تعمیری حوصلوں کا دیا جلائیں۔ اگر آپ کوئی ہنر سیکھ چکے ہوں تو ان صنعتوں میں جان ڈالیں جن پر گاؤں کی خوش حالی کا دار و مدار ہوتا ہے۔ اگر کاشتکاری کر سکتے ہوں تو اس میں اصلاح اور جدت کر کے دوسروں کو نئی راہیں بتائیں۔ اس سلسلے میں آپ ایک طرف زمینداروں کو اس پہ آمادہ کر سکتے ہیں کہ اپنے آپ کو لگان وصول کرنے کے ٹھیکے دار نہ سمجھیں بلکہ کاشتکار بن کر زمین پر اپنا حق ثابت کریں۔ دوسری طرف آپ دیہاتی آبادی کو سود خوار کے پنجے سے چھڑانے کی کوشش کر سکتے ہیں جو غالباً اس زمانے کا سب سے اہم اصلاحی کام ہے اور جو اسی وقت انجام دیا جا سکتا ہے جب آپ گاؤں میں اپنے قدم جمائیں اور سود خواری کو جڑ سے اکھاڑنے کا تہیہ کر لیں۔ اس زمانے میں گاؤں اور شہر کا سیاسی رشتہ بالکل ٹوٹا ہوا ہے اسے دوبارہ قائم کیجئے۔ جمہوری حکومت کی راہ و رسم سے واقفیت اور لگاؤ پیدا کیجئے، اور اپنے ملک کی سیاسی زندگی کو مستحکم کیجئے۔

لیکن آپ گاؤں میں ہوں یا شہر میں آپ کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ آپ اپنی کامیابی کے ذریعے سے ان اخلاقی اوصاف کا چرچا کریں جن پر آپ کی اور آپ کی قوم اور ملت کی فلاح کا انحصار ہے۔ اس وقت ہمارا سب سے نمایاں عیب ہماری متلون مزاجی ہے۔ آپ کو چاہئے کہ صبر، محنت اور استقلال کا مادہ پیدا کریں اور اپنی ذات نہیں بلکہ اپنے کام اور اپنی کارگذاری کی بدولت بڑے بننے کا حوصلہ کریں متلون مزاجی کی طرح آرام طلبی اور فضول خرچی بھی مسلمانوں کی سرشت میں داخل ہو گئی ہے جس کے سبب سے سادہ زندگی بلکہ سلامت روی خلافِ تہذیب سمجھی جانے لگی ہے۔ بہت سے نوجوان تعلیم اسی لئے حاصل کرتے ہیں کہ

ٹھاٹھ سے رہیں، اور یہ غرض پوری نہ ہو تو ان کے لئے زندگی بے معنی اور بے لطف ہو جاتی ہے۔ آج کل کی بے روزگاری بڑی حد تک اسی ٹھاٹھ سے رہنے اور روپیہ اڑانے کی ہوس نے پیدا کی ہے۔ کیونکہ بیکاری کا آرام سب کو اچھا لگتا ہے۔ محنت کی جاں فرسا مشقتوں کے چاہنے والے بہت کم ہیں۔ ہماری یہ بری عادتیں دراصل اس طرح پڑی ہیں کہ ہمیں ایک زمانے سے ضبط کی تعلیم نہیں دی جا رہی ہے، اور ہمیں اپنے اوپر بہت کم اختیار رہ گیا ہے۔ ہمارا تخیل ہمیں ایک طرف کھینچتا ہے، تو عقیدہ دوسری طرف، ہمارا کام، محنت کا تقاضا کرتا ہے تو شوق آوارہ گردی اور گپ شپ کا۔ اسی کشمکش میں ہم کو نہ وقت کا خیال رہتا ہے نہ وعدے کا اور وہی کام جو ہم بڑے جوش اور بڑی امیدوں سے شروع کرتے ہیں ہمیں مایوس اور بیزار ہو کر چھوڑنا پڑتا ہے لیکن استقلال، اسلامت روی اور ضبط قدرتی صفتیں نہیں ہیں، وہ تعلیم و تربیت کے ذریعے سے پیدا کی جاتی ہیں اور آپ کا یہ حوصلہ ہونا چاہئے کہ طالب علمی کے زمانے میں اپنی شخصیت کو ان اوصاف سے آراستہ کریں۔

یہی اوصاف ہیں جو آپ کی اپنی زندگی کو کامیاب بنانے کے علاوہ آپ کو مذہب اور تہذیب کی خاطر مشین پرستی اور لامذہبیت سے لڑنے میں مدد دیں گے۔ وہ قومیں جن کے عقائد اور معیار میں مادّی زندگی، انصاف اور مساوات کی اتنی قدر نہیں ہے جتنی کہ موجودہ زمانے کی مشین پرست اور لامذہب قومیں کرتی ہیں وہ مقابلے میں ضرور شکست کھائیں گی اور ہماری حالت یہی رہی جو اب ہے تو ہم بھی آہستہ آہستہ مشین پرست اور لامذہب ہو جائیں گے، اسی طرح جیسے انگریزی تعلیم اور انگریزی حکومت کے اثر سے ہم یورپ پرست اور لامذہب ہو گئے ہیں۔ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو ایک نئے، اور اشتراکیت اور سرمایہ داری دونوں کے بہترین نظام معاشرت میں روح پھونک سکتا ہے، وہی ایسا مذہب ہے جس کے سائے میں ایک نئی تہذیب پرورش پا سکتی ہے، کیونکہ اس میں یہ صلاحیت ہے کہ مشین پرستی کے نظامِ حیات اور اشتراکیت کے بہترین عنصر جذب کر لے اور علم و عقل اور مادّی زندگی کا احترام جو حقیقت میں مادیت اور لامذہبیت کا جوہر ہے مسلمانوں کے لئے کوئی بری چیز نہیں ہے۔ اسلام کی سب سے قابلِ قدر صفت یہ ہے کہ وہ موجودہ زمانے کی تمام ذہنی اور معاشرتی تحریکوں میں توازن اور ہم آہنگی قائم کر سکتا ہے اور ایک معاشرتی انقلاب کو جو اب

ٹالے نہیں ٹل سکتا، اور جس کا ہنگامہ قیامت سے کم نہ ہوگا، وہ ارتقار اور نشو و نما کی صورت دے کر فساد اور خون ریزی سے پاک کر سکتا ہے۔ اسلام سے ملی اور ملکی زندگی کو یہ فیض پہنچانا مسلمانوں کا فرضِ منصبی ہے، اور آپ کا مستقبل بہت ہی قابلِ رشک ہوگا۔ اگر آپ یہ خدمت انجام دے سکیں ؛

غزلیاتِ جوشش عظیم آبادی

(مرسلۂ ہندوستانی کتب خانہ پٹنہ سٹی)

روشن علی جوشش عظیم آبادی بارھویں صدی کے آخر میں پٹنہ کے نادرۂ روزگار شاعر گذرے ہیں۔ تذکرہ نویسوں نے اُن کی بلندیِ فکر، ندرتِ تخیل اور مہارتِ عروض کی بہت تعریف کی ہے۔ میر حسن دہلوی لکھتے ہیں:-

"مردیست ساکن عظیم آباد خوش طینت و نیک اعتقاد، شاعرِ شیریں کلام صاحب دیوان، از خاصانِ آں دیار است کلامش شاعرانہ است شخصے می گفت کہ او در تالیف تذکرہ مشغول است" (تذکرہ شعرائے اُردو ۵۶)

گلشنِ بے خار میں ہے:-

"از تازہ خیالانِ عظیم آباد است شعرش صاف و بے غش۔ فکرش دلپذیر و دلکش شیوۂ گزیدہ اش گزیدہ و طرزِ پسندیدہ اش پسندیدہ درفنِ عروض بسیار مہارتِ دل خواہ داشت۔"

جوشش کے تذکرۂ شعرا کا کہیں پتہ نہیں ملتا۔ دیوان بھی بے حد نایاب ہے۔ خوش قسمتی سے جوشش کا نایاب دیوان صوبہ بہار کے مشہور شاعر اور محدث علامہ شوق نیموی کے کُتب خانے میں (علامہ موصوف کے والد مرحوم کے ہاتھ کا لکھا ہوا) موجود ہے۔ ہمارے خیال میں اِس کے سوا دیوانِ جوشش کا کوئی اور نسخہ کسی کُتب خانے میں موجود نہیں ہے۔ یہ نسخہ سنہ ۱۲۳۸ ف کا لکھا ہوا ہے۔ آخر کا زیادہ حصہ کرم خوردہ ہے۔ ۱۸۷ صفحات میں تمام ہوا ہے آخر میں چند رباعیاں بھی ہیں۔ ہندوستانی کتب خانہ پٹنہ سٹی کے زیرِ اہتمام اِس کا انتخاب عنقریب شائع ہوگا۔ چند غزلیں ناظرینِ جامعہ کے لئے ہدیۂ خدمت ہیں:-

غزلیں

تعلقاتِ جہاں سے خبر نہیں رکھتا
ہزار شکر کہ میں دردِ سر نہیں رکھتا

بتوں کے دل میں جگہ کی نہ نالۂ نَے نے
ہزار حیف یہ نالہ اثر نہیں رکھتا

خفا ہوں جان سے دل کھول کھول روتا ہوں
تری گلی میں کسی کا میں ڈر نہیں رکھتا

نہ ہے نصیب کہ دلدار سے ہم اِس دِل کو
ہزار کہتے ہیں رکھنے کو پر نہیں رکھتا

دِل و جگر کو تو پوچھے ہے کون اے جوششؔ
حضور اُس کے میں اپنی خبر نہیں رکھتا ''

اگر منظور ہو اے عشق! دل کو پاک کر دینا
تو اسبابِ تعلق کو جلا کر خاک کر دینا

جنوں! فہمیدِ معنی میں تجھے گر دستِ قدرت ہو
گریبانِ تعلق بے تامّل چاک کر دینا

تجلّی تیری یارب برقِ عقل و ہوش ہے لیکن
مجھے تو روشناسِ شعلۂ ادراک کر دینا

یہ مشتِ استخواں باقی ہے اب اے چشمِ خوں گریہ
اِسے بھی بحرِ غم کا تو خس و خاشاک کر دینا

اگر جوششؔ نہ روتا ہو ترے دردِ محبت سے
الٰہی خشک اس کا دیدۂ غمناک کر دینا

یاد کر تیرے لبِ مے گوں کا اے جاناں نمک
ڈال دیتے ہیں مے گلرنگ میں مستاں نمک

کیوں نہ گُل کو دیکھ کر گلزار میں آوے ہنسی،
مُدتوں کھایا ہے تیرا اے لبِ خنداں نمک

اے مرے کانِ ملاحت کر نہ مرہم کی تلاش
یہ تو وہ داغِ جگر ہے جس کا ہے درماں نمک

آتشِ دوری میں اُس مے خوار کے اے سوزِ عشق
بھُن چکا ہے چاہتا ہے یہ دلِ بریاں نمک

یہ تو وہ زخمِ جگر ہے آہ جس کو دیکھ کر
مرہمِ زنگار حیراں ہووے اور گریاں نمک

تیرا لب جاں بخش ہے اور وہ مددگارِ حیات
تیرے آگے کب رکھے ہے چشمۂ حیواں نمک

ہونٹھ اب تک چاٹتا ہے دیکھ جوششؔ زخمِ دِل
آہ کیا رکھتا تھا اُس کے تیر کا پیکاں نمک

دل میں بھری ہے آگ اور آنکھوں میں آب ہے
مانند شمع حال ہمارا خراب ہے

دل سے ترے جو اشک نہ آوے عجب نہیں
بریاں ہو جب کباب تو کب اس میں آب ہے

دل کس طرح چمن میں لگے آج باغباں
نے ابر نے ہوا ہے نہ جام شراب ہے

غافل کر اس کی سیر تو عبرت کی چشم سے
ہستی بے ثبات خیالات خواب ہے

خال سیہ نہ ہووے یہ رخسار یار پر
دیوان حسن کا نقطۂ انتخاب ہے

عالم خراب ہووے جو وہ بے حجاب ہو
ہے خیر کچھ اسی میں کہ منہ پر نقاب ہے

لذت ہے خاک عشق کی پیری میں ہمدماں
معشوق خوب رو ہے اور عہد شباب ہے

اس میکدے میں کون ہو ساقی سے ملتجی
خون جگر شراب ہے اور دل کباب ہے

دیکھا ہے جب سے زلف کو شانے کے ہاتھ میں
جوشش ہمارے دل کو عجب پیچ و تاب ہے

شیخ کو کعبے سے جو مقصود ہے
وہ کنشت دل ہی میں موجود ہے

میرے جلنے کی کسی کو کیا خبر
سوزش دل آتش بے دود ہے

نے حرم سے کام ہے نے دیر سے
خانۂ دل ہی مرا مسجود ہے

فرق مت کر عاشق و معشوق میں
خود ایاز اور آپ ہی محمود ہے

کیا پری کیا حور کیا جن و بشر
سب میں وہ شاہد مرا مشہود ہے

مشرب عشاق میں اے زاہدو!
اس کا جو مخلوق ہی معبود ہے

سنگ و آہن کو یہ کرتی ہے گداز
آہ ہے یا نغمۂ داؤد ہے

کس سے اے جوشش کہوں میں درد دل
میرے اس کے بولنا مفقود ہے

روشن ہوا یہ خانۂ دل اس کے نور سے
موسیٰ ہمیں غرض نہیں کچھ کوہ طور سے

آئین عاشقی میں ترقی کی آرزو
رہتی ہے میرے عجز کو اس کے غرور سے

اے غافلو یہ زندگی ناپائدار ہے — باور نہ ہو تو پوچھ لو اہلِ قبور سے

نقشِ حصیر اپنے بدن پر ہے پیرہن — سنجاب سے نہ کام نہ مطلب سمور سے

جز اشک کون دھووے مرے منہ سے گردِ غم — غربت زدہ ہوں آتا ہوں میں راہِ دور سے

آپ ہی میں جل بجھوں گا سحر تک برنگِ شمع — مجھ کو اُٹھا نہ دیجیو اپنے حضور سے

پھنس جائے گا تو دامِ تعلق میں یک بیک
جوشش نہ تھی امید یہ تیرے شعور سے

اِس ادا کا ہوں تیری دیوانہ — دیکھنا مجھ کو اور چھپ جانا

کیوں نہ صد چاک ہووے دل میرا — ہاتھ ڈالے ہے زلف پر شانہ

شعلہ رو تجھ پہ کیوں نہ ہوں صدقے — شمع پر جل مرے ہے پروانہ

ہوں وہ دیوانہ ناصحو جِس کو — ننگ ہے چاک جیب سِلوانا

یار غیروں سے اِس قدر کا ربط — اور عاشق کو دیکھ شرمانا

آج ہے جاں بلب ترا جوشش
جی میں آوے ترے تو آ جانا

افکارِ پریشاں

خدا کی سب سے بڑی طاقت سبک رَو نسیم ہے،
تیز و تند طوفان نہیں!

آفتاب کا لباس نورِ محض ہے،
بدلیاں رنگا رنگ پوشاک پہنتی ہیں۔

اگر ماہتاب کے لئے آنسو بہاتے ہو،
تو ستاروں کو بھی نہ دیکھ سکو گے!

اُس کا پیارا چہرہ میرے خواب میں اِس طرح آتا ہے
جیسے رات کی بارش!

ہم نے خواب دیکھا کہ ہم اجنبی ہیں!
ہم جاگ اُٹھے اور دیکھا کہ ایک دوسرے کے پیارے ہیں!

غم میرے دِل میں اِس طرح آرام سے سو رہا ہے،
جیسے شام خاموش درختوں میں۔

اے سمندر تیری گفتگو کیا ہے؟
دائمی سوال۔
اے آسمان تیرا جواب کیا ہے؟
دائمی خاموشی۔

زندگی کو بہار کے پھولوں کی طرح کھِلنے دو!
اور موت کو خزاں کی پتّیوں کی طرح مُرجھانے دو!

جڑیں شاخیں ہیں، زمین میں پھیلی ہوئی
شاخیں جڑیں ہیں ہَوا میں چھائی ہوئی۔

دنیا آرزو بھرے دِل کے تاروں پر دوڑتی ہے،
اور اِس سے غم کے سُر نکلتے ہیں۔

پانی میں مچھلی خاموش ہے۔
زمین پر جانور شور کرتے ہیں۔
ہوا میں چڑیاں گاتی ہیں۔
لیکن انسان میں،
سمندر کی خاموشی، زمین کا شور اور ہَوا کا نغمہ
سبھی کچھ ہے!

ننھی کلی کھِل کر پھول بن جاتی ہے اور چلّا اُٹھتی ہے :
"پیاری دُنیا! جلدی سے ختم نہ ہو جانا!"

پانی کی چڑیوں اور موجوں کی طرح
ہم کچھ دیر ساتھ رہتے ہیں
چڑیاں اُڑ جاتی ہیں، موجیں بڑھ جاتی ہیں،
ہم ایک دوسرے سے بچھڑ جاتے ہیں!

پرندے کی تمنّا ہے کہ وہ بادل ہو جائے!
بادل کو حسرت ہے کہ پرندہ نہ ہوا۔!

آج صبح میں کھڑکی میں بیٹھا دیکھ رہا ہوں
دُنیا مسافر کی طرح آتی ہے
رواروی میں سلام کرتی ہے اور چلی جاتی ہے!

خُدا بڑی سلطنتوں سے اُکتا جاتا ہے،
لیکن ننھے پھولوں سے نہیں!

ہر بچہ یہ پیغام لے کر آتا ہے کہ :
"خدا ابھی انسان سے مایوس نہیں ہوا!"

پتی، پھول ہو جاتی ہے جب محبت کرتی ہے!
پھول، پھل ہو جاتا ہے جب عبادت کرتا ہے!

دنیا عاشق کے سامنے لامحدودیت کا نقاب اُٹھا دیتی ہے
اور اتنی مختصر رہ جاتی ہے جیسے ایک گیت یا ابدیت کا ایک بوسہ۔

یہ دُنیا کے آنسو ہیں جو اُس کے تبسم کو رنگین بنائے رکھتے ہیں

میری آرزوئیں نادان ہیں میرے مالک!
وہ تیرے گیت کے بیچ میں فریاد کرنے لگتی ہیں،
تو گائے جا اور مجھے سُننے دے!

خدا ہم سے پھولوں کا شکریہ چاہتا ہے،
زمین اور سورج کا نہیں!

روشنی جو ایک ننگے بچے کی طرح خوش خوش سبز پتیوں میں کھیلتی ہے
نہیں جانتی کہ انسان جھوٹ بھی بول سکتا ہے!

حُسن! اپنی حقیقت کو محبت میں تلاش کر!
آئینے کے خوشامدانہ عکس میں مت دیکھ!

اے خدا تیرا شکر!
کہ میں طاقت کے پہیوں میں سے نہیں،
بلکہ اس مخلوق میں سے ہوں جو اس سے کچلے جاتے ہیں!

تمھارا بت ٹکڑے ٹکڑے ہو کر خاک میں مِل گیا اور ثابت کر گیا کہ خدا کی پیدا کی ہوئی خاک تمھارے بُت سے ارفع ہے!

زندگی ہمیں دی جاتی ہے —
ہم اِسی کو دے کر اِسے حاصل کرتے ہیں!

شیشے کا جھاڑ مٹی کے چراغ کو جھڑکتا ہے کہ مجھے بھائی کہہ کر نہ پکار۔ چاند نکل آتا ہے اور شیشے کا جھاڑ شرمائی ہوئی مسکراہٹ سے پکار اٹھتا ہے: میرے پیارے بھائی!

میرے دل اِن سرگوشیوں کو سُن جن کے ذریعے دنیا تجھ سے اظہارِ محبت کر رہی ہے! ...

حیدر علی

تمہید

اٹھارھویں صدی کا نصف آخر ہندوستان کی سیاسی تاریخ کا ایک تیرہ و تار ورق ہے۔ اس وقت ہندوستان میں طوائف الملوکی کا دَور دورہ تھا۔ ہمالیہ سے لے کر راس کماری تک لوٹ مار، غارت گری کا حشر برپا تھا، سیاسی بدنظمیوں، آئے دن کے انقلابات اور جنگ و جدل سے مُلک سے امن و امان اُٹھ گیا تھا۔ فضائے سیاست پر حوادث کی سیاہ گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ اسلامی ہند کی عظمت و جبروت افسانہ ہو کر رہ گئی تھی۔ ہندوستان کا عصائے جہاں بانی ایسے ہاتھوں میں آ گیا تھا جو اس کے بوجھ سے کانپ رہے تھے۔ سلطنت کی شمع عشرت پسند حکمرانوں کے محلات میں ٹمٹما رہی تھی شیر شاہ سوری اور اکبر کے پرشکوہ زمانے داستانِ پارینہ، شاہ جہاں اور عالمگیر کے قرونِ اقبال خواب و خیال ہو گئے تھے، سلطنتِ مغلیہ کی نبضیں سست پڑ گئی تھیں۔ جنگِ صد سالہ میں فرانس کی حالت ہرچند بہت سقیم ہو گئی تھی اور عوام الناس کامیابی سے بالکل مایوس ہو چکے تھے، تاہم حکمران طبقے کے دل میں حب وطن کی آتشِ مردہ کا ایک شرارہ باقی تھا، اور بادشاہ کی ذات کو آفتابِ امید خیال کیا جاتا تھا۔ برخلاف اس کے سلطنتِ مغلیہ کی تباہی تدریجی ہوئی، مگر قطعی ہوئی صرف یہی نہیں تھا کہ بیرونی حملوں کا مقابلہ کرنے والے طبقات بالکل فنا ہو گئے ہوں بلکہ یہ مصیبت تھی کہ بیرونی حملہ آوروں کے چلے جانے کے بعد جسم سیاست کے زخموں کا لہو بند کرنے والوں کا وجود بھی نہیں رہا تھا۔ سلطنت کی حالت ایک نعش کی سی تھی۔ ملکیوں اور غیر ملکیوں کی لڑائی، چیل کوّوں کی لڑائی تھی جو ایک دوسرے کی نوچ کھسوٹ سے فرصت پاتے ہی اس نعش کی

بوٹیاں نوچنے لگتے تھے۔ یہ نظارہ کیا کم عبرت انگیز اور حسرت خیز تھا کہ ایسی وسیع اور شہرہ آفاق سلطنت ایک جسمِ مُردہ کی طرح ہاتھ پاؤں پھیلائے پڑی ہو اور چیل کوّے اُس کی بوٹیاں نوچنے کے لئے لڑتے ہوں۔ گو یہ ضرور ہوتا تھا کہ کبھی کبھی امید کے کچھ آثار پیدا ہو جاتے تھے اور اتفاقاً کسی حکمران کی غیر معمولی استعداد سے کچھ توانائی بھی عود کر آتی تھی لیکن ازالۂ مرض نہ ہونے کی وجہ سے بہ ہیئتِ مجموعی مستقل حالت نہ سدھرنی تھی نہ سدھری۔ دوسری طرف انگریز سوداگر جو اَب تک چُپ چاپ اپنے بیوپار میں لگے ہوئے تھے جنھیں اہلِ ہند کے ساتھ زور آزمائی کرنے کی جسارت نہیں ہوتی تھی اپنی تجارتی کوٹھیوں سے نکل نکل کر ممالک ہند میں داخل ہونے لگے اور باہمی عداوتوں سے فائدہ اُٹھا کر ہندوستان کی رہی سہی ریاستوں کو تباہ و برباد کرنا شروع کر دیا۔ لڑائیوں میں قسمت نے ہمیشہ انگریزوں کا ساتھ دیا اور آخر کار یہی چند سوداگر جو تجارت کی اجازت کے لئے معمولی حکّام کی دربار داری کیا کرتے تھے کشورِ ہندوستان پر قبضہ جمانے کی فکر کرنے لگے۔

ایسے نازک دَور میں قدرت نے ہمیں ایک اور سنہری موقع عنایت فرمایا۔ اُس نے ایک اولوالعزم جاں باز سپاہی جس کی رگوں میں سپہگرانہ خون دَوڑ رہا تھا اور جس کے دل میں اولوالعزمی اور ناموری کے جذبات موجزن تھی میدان میں لا کھڑا کیا، جنوبی ہندوستان کے اِس نامور ہیرو نے جسے آج جنوبی ہند کا بچہ بچہ حیدر علی کے نام سے نہیں بلکہ بہادر کے لقب سے یاد کرتا ہے، اپنی بہادری، استقلال، اولوالعزمی اور عزم بالجزم سے اپنے آپ کو ایک سپاہی کے درجے سے اعلیٰ ترین عہدے تک پہنچا دیا۔ تھوڑے ہی دنوں میں اُس نے اپنی زبردست قوتِ ارادی، استقلال، جُرأت اور لاثانی حکمتِ عملی سے تاج و تخت حاصل کر لیا۔ اُس کی جنگی تدابیر اور اس کی شمشیرِ آبدار نے ایک طرف اگر مرہٹوں کے مُلک اور نظام حیدر آباد کے قصرِ شاہی میں زلزلے ڈال دیئے تو دوسری طرف نواب کرناٹک اور انگریزوں کے گھروں میں صفِ ماتم بچھا دی۔ اس نے جنوبی ہندوستان میں شاہانِ مغلیہ کی حشمت و جلال کی یاد تازہ کر دی، وہ ایسا زبردست اور عالی دماغ حکمران تھا جس کے

مدمقابل تاریخ میں بہت کم نظر آتے ہیں۔ اس کا بے پناہ عزم و استقلال، اس کے شجاعانہ کارنامے، اس کی مذہبی بے تعصبی اور رواداری ایسی صفات ہیں جن کی بدولت اس کا نام دنیا میں اس آب و تاب کے ساتھ قائم رہے گا جیسے عالمِ بالا پر نجوم روشن ہیں۔ وہ جنوبی ہندوستان کا بیدار مغز، بالغ نظر اور غیور حکمران تھا۔ اُس کی فطرت زندگی کے روشن نقوش کے ساتھ ساتھ پلتی تھی اور وہ اِس فلسفے کی عملی صورت کا قائل تھا کہ زندگی اور عزت کی زندگی صرف بہادروں کا حق ہے اور دیکھنے والوں نے دیکھا کہ جنوبی ہند کے اس نامور ہیرو نے ایسے وقت میں جب ریاست میسور کی آزادی معرضِ خطر میں تھی اپنے ہم وطنوں کو زندگی کا پیغام دیا۔ حیدر علی مرہٹوں کے خلاف نہ تھا، نظام کی سلطنت اور اقتدار پر رشک نہیں کرتا تھا، فرانسیسیوں کے لئے خطرناک نہ تھا اور اس کے فلسفۂ سیاست میں انگریزوں کے جائز مفاد کے لئے بھی گنجائش تھی۔ اس کا پیغام زندگی کا پیغام تھا اور اُس کا منشا صرف یہ تھا کہ ریاست کے باشندے اپنے گرد و پیش کے حالات کو دیکھیں، یکجہتی اور تنظیم کے ساتھ دنیا کو یہ یقین دلا دیں کہ وہ زندہ ہیں۔ اُنھیں اپنی ریاست سے محبت ہے۔

حیدر علی کے ابتدائی حالات

حیدر علی ۱۷۲۲ء میں بمقام بودی کوٹہ پیدا ہوا۔ بودی کوٹہ ایک چھوٹا سا قریہ ہے جو ضلع کولار میں واقع ہے۔ حیدر علی کے والد شیخ فتح محمد سرا کے صوبے دار تھے اس لئے اس کا عہدِ طفلی نہایت آرام و آسائش سے گذرا۔ مگر یکایک زمانے نے پلٹا کھایا اور اُس کا ستارہ گردش میں آگیا۔ اِس نامور ہیرو کی عمر قریب پانچ ہی سال کی تھی کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ اُس کی خوش قسمتی کہئے کہ عین موقع پر اُس کے چچازاد بھائی حیدر نے اس کی مدد کی اور اس خاندان کو اپنے پاس سرنگا پٹم بلا لیا۔ حیدر نے اِس زمانے کی طرزِ معاشرت کے مطابق حیدر علی کی تعلیم و تربیت شروع کر دی اور دستور کے مطابق بجائے کسی مدرسے میں بٹھانے کے اُسے فنونِ جنگ کی تعلیم دی جانے لگی اور چند ہی سال میں یہ یتیم بچہ اس وقت کے فنِ سپہ گری میں خاص ماہر ہوگیا۔ جس وقت حیدر علی

بڑا ہوا تو حیدر صاحب نے اُس کی ملاقات نندراج وزیرِ میسور سے کرائی۔ اس نے حیدر علی کو فوج کے ایک چھوٹے سے دستے پر مقرر کر کے سرنگا پٹم ہی میں رکھ لیا۔ نندراج کو اس کی کیا خبر تھی کہ یہ بچہ جو ایک معمولی گھرانے سے تعلق رکھتا تھا اپنے عزم و استقلال سے تختِ میسور پر قابض ہو کر کُل جنوبی ہندوستان پر حیدری جھنڈا لہرائے گا۔ اور اُس کی شہرت ہندوستان سے نکل کر فرانس اور انگلستان کی شئونِ قاہرہ تک پہنچے گی اور اس کی تلوار کی جھنکار ہندوستان کی ریاستوں اور سلطنتوں میں تو ایک طرف سات سمندر پار انگلستان کے سربفلک ایوانوں میں زلزلہ ڈال دے گی۔ حیدر علی نے سرنگا پٹم میں وہ سلامت روی اور خود داری اختیار کی کہ ہر شخص اس کا گرویدہ ہو گیا اور وہ اپنی نمایاں قابلیت کی وجہ سے تھوڑے ہی دنوں بعد باڈی گارڈ کا افسر مقرر ہو گیا اور اس کے بعد سے حیدر علی نے بہت جلد ترقی کی۔ ۱۷۵۵ء میں ریاست میسور کے علاقہ بائیں گھاٹ میں بغاوت ہوئی۔ وزیر نندراج حیدر علی کو ساتھ لے کر اس بغاوت کو فرو کرنے کے لیئے روانہ ہوا۔ اِن معرکوں میں حیدر علی سے ایسے ایسے کارنامے عمل میں آئے اور اُس نے اپنی بہادری، استقلال، اولوالعزمی، شجاعت اور بسالت کی دھاک کچھ اس طرح دشمنوں کے دِلوں پر بٹھا دی کہ وزیرِ میسور نے اس کو گورنر ڈنڈیگل مقرر کر دیا اور اس کے منصب کو ترقی دے کر چار ہزار سپاہی اور ڈیڑھ ہزار سواروں کا افسر مقرر کر دیا۔ نیز اس زمانے کے رواج کے مطابق حیدر علی کو اپنی خاص فوج بھرتی کرنے کا حکم بھی مِلا۔ اِس کے بعد وہ مختلف مقامات پر شورشوں کو فرو کرنے کے لئے بھیجا گیا۔ اُس نے نازک موقعوں پر اپنے راجہ اور محسن و مربی وزیر نندراج کی مدد کی اور آخر کار اُن کے دشمنوں کا صفایا کر دیا۔ حیدر علی کے اِن کارہائے نمایاں کو دیکھ کر راجہ بہت خوش ہوا۔ ۱۷۵۷ء میں اُس کو سپہ سالار افواج میسور کے عہدے پر ترقی مِل گئی اور اُس کو کامل اختیارات دے دیئے گئے کہ مرہٹوں سے جس طرح چاہے معاملہ طے کرے۔ اس نے بجائے صلح کرنے کے اُن سے مقابلہ ہی کرنا مناسب سمجھا۔ اور تھوڑے ہی دنوں میں اُس نے اپنے حریفوں پر نمایاں فتح و کامیابی حاصل کر لی۔ راجہ اِن کامیابیوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوا اور اس نے حیدر علی کو "فتح حیدر بہادر" کا خطاب دیا۔ تھوڑے ہی دنوں بعد حیدر علی نے ایک اور اہم کام انجام دیا جس سے راجہ بہت خوش ہوا

اس نے راجہ کے اشارے پر بہ نہایت آسانی اور لطایف الحیل سے نندراج سے اِستادِ وزارت لے کر راجہ کے حوالے کر دی اور اِس کارگذاری کے صلے میں راجہ نے فرزندِ ارجمند کا خطاب حیدر علی کو عطا کیا۔ اسی درمیان میں بسالت جنگ نظام حیدرآباد نے میدان پانی پت میں مرہٹوں کی شکست کا حال سن کر صوبہ سرا فتح کرنے کا ارادہ کیا۔ سرا اس وقت مرہٹوں کے قبضے میں تھا۔ چنانچہ بسالت جنگ نے قلعہ ہوسکوٹہ کا محاصرہ کیا۔ لیکن اس محاصرے نے نہایت طول کھینچا۔ بسالت جنگ نے حیدر علی سے امداد طلب کی۔ چنانچہ حیدر علی اور بسالت جنگ میں ایک معاہدہ ہوا جس میں یہ طے پایا کہ ہوسکوٹہ اور اس کے مضافات حیدر علی کو ملیں گے، بسالت جنگ دربار دہلی میں صوبہ داری سرا کے لئے حیدر علی کی سفارش کرے گا۔ قلعہ گرم کنڈہ جو اب تک حیدرآباد کے ماتحت رہا تھا آئندہ سے حیدر علی کی ملکیت ہوگی۔ چنانچہ حیدر علی کی جرار فوجوں نے چند ہی دنوں میں ہوسکوٹہ فتح کر لیا اور بموجب معاہدہ ہوسکوٹہ، اس کے مضافات اور قلعہ گرم کنڈہ حیدر علی کو ملا، شہنشاہ ہند کا سفیر حیدر علی کے نام فرمان صوبہ داری سرا لے کر آیا اور اس کے ساتھ شہنشاہ کی جانب سے شمشیر مرصع کار، پالکی جواہر نگار اور نقارہ و نشان مع خطاب نواب عنایت ہوئے۔ اس کے بعد حیدر علی نے مڑگ سرا، مدگیری، البس نگر اور سرا پر قبضہ کر لیا۔ اور اِس طرح تقریباً تمام صوبۂ سرا کا مالک ہو گیا۔

۱۷۶۰ء میں جب فرانسیسیوں کی مدد کے لئے افواج حیدری پانڈیچری گئی ہوئی تھی کھانڈے راؤ راجہ اور رانیوں نے سازش کی کہ نندراج کی طرح حیدر علی کو معزول کر دینا چاہئے۔ چنانچہ دربار پونا کو ایک خط لکھ کر مدد طلب کی گئی۔ میدان خالی پاکر وہاں سے ایک فوج روانہ ہو گئی۔ حیدر علی کو اس کی مطلق خبر نہ تھی۔ اسے اس وقت معلوم ہوا جب فوج سرنگاپٹن کے قریب آپہنچی۔ حیدر علی نے اپنے دوستوں سے مشورہ کرنے کے بعد رات کو فرار ہونے کا ارادہ کر لیا۔ جس وقت رات زیادہ ہوئی وہ اپنے گھر سے نکلا اور سیدھا دریائے کاویری پر پہنچا۔ ہمت کر کے دریا میں کود پڑا اور پار نکل گیا اور صرف بیس گھنٹے کے عرصے میں بنگلور پہنچ گیا۔ جہاں اس کی فوج کا ایک حصہ موجود تھا۔ اِدھر راجہ میسور وزیر کھانڈے راؤ اور مرہٹہ سرداروں نے بنگلور کی طرف کوچ کیا۔ ان کا ارادہ تھا کہ یہاں اس کا محاصرہ کر کے ہم اُس کو

گرفتار کرلیں گے۔ حیدر علی بھی تیار ہو چکا تھا۔ اس نے قلعہ سے نکل کر ایسا زبردست حملہ کیا کہ راجہ کی فوج سخت نقصان اُٹھانے کے بعد منتشر ہوگئی اور جب اِس شکستِ فاش کی خبر سرنگا پٹن پہنچی تو محل میں کہرام مچ گیا حملاتِ حیدری میں میدانِ جنگ کی جو تصویر مصنف حملات حیدری نے کھینچی ہے اُس کا ایک حصّہ مصنف سلطنت خداداد نے اپنی کتاب میں درج کیا ہے جو بجنسہ نقل کیا جاتا ہے :-

دونوں مہابھارت دلیں، جیسے ساون بھادوں کے گھنگھور بادل چاروں طرف سے اُٹھتے ہیں، ایک دوسرے کے مقابل ہوئیں۔ پہلے تو دور سے گولیاں اور گولے اولے کی طرح دونوں طرف سے برسنے لگے۔ جب دونوں فوجیں لڑتے لڑتے نزدیک آئیں تب تو تیغ و تبر، خنجر، جمدھر، پستول، طمنچے، بھالے، برچھی بوچھاریں چلتی تھیں اور لہو کی پھوہاریں اُڑتی تھیں۔ ایک لمحہ میں خون کی ندیاں اور نالے بہنے لگے اور ہاتھی گھوڑے، اونٹ، گاؤ، بچھڑے کی مانند نظر آتے۔ فیلوں کے سر حباب کی مانند تیرتے پھرتے تھے۔ آخر کار نواب رستم شوکت اسفندیار صولت نے راجہ میسور کے لشکر کو ہزیمت دی،

اِس واقعے کی اطلاع جب نند راج کو ہوئی تو اس نے الیاجی سپہ سالار مرہٹہ فوج کو جو اس وقت سرنگ پٹن میں تھا ایک خط لکھا جس میں راجہ اور کھانڈے راؤ کی سازشوں کا پورا حال درج تھا جو اُن دونوں نے نند راج کے ساتھ روا رکھی تھیں اِس خط کو دیکھتے ہی الیاجی نے حیدر علی کو خط لکھا کہ اگر وہ اخراجاتِ جنگ ادا کرے تو مرہٹہ فوج واپس چلی جائے گی۔ حیدر علی نے روپیہ کے عوض بارہ محل کا علاقہ اُنھیں دے دیا اور مرہٹہ فوج واپس چلی گئی۔ اس اثنا میں حیدر علی کی وہ فوج بھی واپس آگئی تھی جو پانڈی چیری گئی ہوئی تھی۔ اس نے اس وقت یہی مناسب سمجھا کہ جس طرح ہو سکے سرنگ پٹن پر قبضہ کرلے چنانچہ اس نے نند راج سے مشورہ کرنے کے بعد سرنگ پٹن پر حملہ کر دیا اور اسے نہایت آسانی سی فتح کرلیا۔ دوسرے دن حیدر علی نے راجہ کی نذر کے لئے چند تحائف بھیجے اور باریابی کی اجازت چاہی۔ بعد اجازت چند منتخب سردار محل کے اندر گئے اور راجہ سے مطالبہ کیا گیا کہ انتظامِ ریاست حیدر علی کو تفویض کردے۔

چنانچہ حیدر علی نے راجہ کے مصارف کا انتظام کر کے حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی اور اپنی حکومت کا اعلان کر دیا۔ وہ آج سے حکمرانِ میسور ہے۔

حیدر علی نے ۱۷۶۳ء میں صوبہ سرا کے انتظام سے فارغ ہو کر بالاپور حوند اور نندی گڑھ کی طرف توجہ کی۔ یہاں کے راجہ سے ایک سخت مقابلہ ہوا اور آخر کار راجہ نے اپنے آپ کو حیدر علی کے سپرد کر دیا اور نندی پر بدرالزماں خان کو بطور قلعہ دار مقرر کر دیا گیا۔ بالاپور اور نندی گڑھ کی فتح سے فارغ ہو کر نواب حیدر علی سرا میں مقیم تھا کہ بدنور کا ایک جائز وارث آکر طالب داد ہوا اور اس نے نواب سے التجا کی کہ وہ غاصبوں سے اس کی سلطنت چھین کر جائز وارث کے سپرد کر دے۔ نواب نے اس کی درخواست کو قبول کر لیا اور بدنور فتح کر کے اس کے جائز وارث کے حوالے کر دیا۔ یہاں سے منگلور فتح کرنے کی غرض سے آگے بڑھا اور کچھ عرصے میں اس نے منگلور فتح کر لیا۔ وہاں سے واپس ہو رہا تھا کہ اس کے مارنے کے لئے بدنور میں ایک سازش کی گئی مگر نواب کو عین وقت پر اس کی اطلاع ہوگئی اور اس نے رانی اور اس برہمن کو جو اس سازش میں شریک تھے گرفتار کر کے قتل کرا دیا اور ملک پر نواب کا قبضہ ہو گیا۔ نواب حیدر علی کو یہاں اس قدر خزانہ ملا کہ جس کا اندازہ بارہ کروڑ روپیہ کیا جاتا ہے۔ یہاں سے فارغ ہو کر وہ راجہ علی امیر البحر کی درخواست پر ملیبار کی طرف روانہ ہوا، ملیبار ہندوستان کے جنوب مغربی ساحل پر ایک زرخیز خطہ تھا یہاں مسلمان عرب تاجر کثرت سے آباد تھے مگر وہ اپنے ہمسایوں کی روز روز کی لڑائی سے تنگ آگئے تھے چنانچہ حیدر علی جب ایک جرار لشکر کے ساتھ ملیبار پہنچا ہے تو نائروں نے اس کے مقابلے کے لئے ایک فوج جمع کی۔ کنانور کے قریب ایک ندی کے کنارے جنگ ہوئی جس میں حیدر علی کو فتح حاصل ہوئی۔ یہاں سے حیدر علی کالی کٹ روانہ ہوا اور نہایت آسانی سے اس پر قبضہ کر لیا اور وہاں کے زامرن نے اپنے محل میں آگ لگا دی اور جل کر مر گیا۔ اس خبر کو سنتے ہی نائروں نے کالی کٹ پر حملہ کیا مگر یہاں بھی انھیں شکست ہوئی۔ اسی اثنا میں بارش کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ نواب حیدر نے یہ سوچا کہ اگر ملیبار میں مقیم رہیں گے تو فوج کو سخت نقصان پہنچے گا اس لئے وہ کوئمبٹور کی طرف روانہ ہو گیا، نائروں نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور پھر ایک لشکر جمع کر کے پونانی کے مقام پر حیدر علی کا مقابلہ کیا۔ یہاں مقابلہ سخت ہوا مگر

ایک شدید جنگ کے بعد نائروں کو فاش شکست نصیب ہوئی۔ اسی اثنا میں مرہٹوں نے بدنور پر قبضہ کر لیا تھا۔ جب حیدر علی کو اس کی خبر ہوئی تو اس نے ایک فوج اُدھر روانہ کی مگر اس فوج کے پہنچنے سے قبل ہی مرہٹے بارش کی کثرت کی وجہ سے واپس جا چکے تھے۔ جس وقت مرہٹوں نے بدنور پر حملہ کیا تھا تو نواب شاہ نور نے اُن کی مدد کی تھی۔ لہٰذا حیدر علی نے اُن کا صفایا کر دینا ہی مناسب سمجھا۔ چنانچہ اُس نے شاہ نور پر حملہ کیا اور اس کی افغان فوجوں کو کاٹ کر رکھ دیا۔ وہاں کے نواب نے مجبور ہو کر صلح کی درخواست کی جسے نواب حیدر علی نے منظور کر لیا۔

مرہٹوں کا میسور پر حملہ

ہم پہلے اس کا ذکر کر چکے ہیں کہ نواب حیدر علی نے الیاجی کو بارہ محل کا علاقہ تفویض کر دیا تھا مگر جب الیاجی بارہ محل پہنچا تو وہاں کے حیدری قلعہ داروں نے قلعہ جات حوالہ کرنے سے انکار کر دیا۔ اس وقت تو الیاجی واپس چلا آیا مگر جب مادھو راؤ پیشوا ہوا اور اس نے حیدر علی کے روز افزوں اقتدار کا حال سُنا تو اُس نے بارہ محل لینے کا ارادہ کر لیا۔ چنانچہ وہ ایک لاکھ سوار، ۶۰ ہزار پیادے، پچاس ہزار تیر انداز اور ایک بڑا توپ خانہ لے کر روانہ ہوا۔ راستے میں اُس نے شاہ نور، چتلدرگ، سرا اور مدگیری کو نہایت آسانی سے فتح کر لیا۔ حیدر علی نے جب یہ خبر سُنی تو اُسے فکر ہوئی کہ کس طرح اس کا مقابلہ کیا جائے۔ اس نے سواروں کے ایک دستہ کو حکم دیا کہ وہ صحرائے ماگڑی میں چھپ کر مرہٹی فوج پر شبخون مارا کریں۔ گری فتح کرنے کے بعد مادھو راؤ قلعہ ماگڑی کی طرف بڑھا یہاں کے حاکم سردار خاں نے نہایت شجاعت کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا۔ مگر آخرکار اُس کے تمام سپاہی لڑتے لڑتے مر گئے۔ اور وہ خود زخمی ہو کر گرفتار ہو گیا۔ اِس عرصے میں حیدری فوج نے جو جنگل میں چھپی ہوئی تھی کئی مرتبہ شبخون مارا مگر اس سے کیا ہو سکتا تھا۔ آخرکار اس کا ماگڑی پر قبضہ ہو گیا۔ یہاں سے بالاپور، کراپہ، کولار، گرم کنڈہ پر قبضہ کرتا ہوا مادھو سرنگاپٹم کی طرف بڑھا اس نے اپنا صدر مقام چنتامنی کو مقرر کر کے ایک بھاری توپ خانہ اور پچاس ہزار فوج سرنگاپٹم کی طرف

روانہ کی۔ اِدھر حیدر علی پریشان تھا۔ ایسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سلطنت حیدری کوئی دَم کی مہمان ہے۔ مگر اس نے اپنی خداداد دلیری سے کام لے کر ماگڑی کے جنگل میں اس فوج کا انتظار کیا جس وقت نصف شب گذری تو اس نے اس فوج پر شبخون مارا اور یہ حملہ کچھ اِس غضب کا تھا کہ قریب قریب کُل مرہٹے کٹ گئے اور جو بچے بھاگ نکلے۔ دوسری طرف مرہٹی فوج کا ایک چھوٹا دستہ باراحل پر چڑھ رہا تھا۔ اس پر بھی حیدری فوج نے شبخون مار کر اُس کو واپسی پر مجبور کر دیا۔ مادھوراؤ کو جب ان دونوں شکستوں کی خبر پہنچی تو وہ حیران تھا کہ کیا کرے۔ ایک جانب اس کی غیرت قبول نہیں کرتی تھی کہ شکست کھا کر واپس جائے، دوسری طرف فوج کی کمی آگے بڑھنے سے مانع تھی۔ اِس موقع سے حیدر علی نے فائدہ اُٹھا کر سات لاکھ روپیہ مادھوراؤ کے پاس بھیجے اور پچاس لاکھ دینے کا وعدہ کیا۔ مادھوراؤ نے اسے ایک خداداد فتح خیال کرتے ہوئے پونا کی طرف کوچ کر دیا۔

(باقی آئندہ)

انوکھا ظلم

(یہ زمانۂ حال کے مشہور ترکی انشا پرداز عمر سیف الدین کا افسانہ ہے۔ جس کا ترجمہ انگریزی میں خالدہ خانم صاحبہ کی ایک عزیزہ بلقیس خانم صاحبہ نے کیا ہے۔ ہم ان دونوں خواتین کے شکرگذار ہیں کہ اُن کی عنایت سے یہ رسالہ جامعہ کو اشاعت کے لئے حاصل ہوا)

نہیں معلوم کیوں شاید یہ سبب ہو کہ میرے باپ دادا پُرانے زمانے میں جاگیر دار تھے، جب کبھی میں بلغاریہ میں گھومتا ہوں تو میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ میں اپنے آبا و اجداد کے کھیتوں میں گشت لگا رہا ہوں۔ سبزہ سل سے ڈھکی ہوئی چھوٹی نہریں، بے شمار گلاب کے تختے کھیتوں کے گرد کانٹے دار جھاڑیاں، اداس مکان اور اُن کی کُشادہ برساتیاں، بد وضع گرجا گھر جو بالکل جَو کے کھلیان معلوم ہوتے ہیں، خوگیر کسے ہوئے کرایہ کے ٹٹو، غور و فکر میں ڈوبے ہوئے خچر، موٹی سفید لٹھنیں، غرضکہ ہر چیز حتیٰ کہ میلے کیچڑ میں سنے ہوئے سور۔ سب سے میں خوب مانوس معلوم ہوتا ہوں۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا میں ہمیشہ سے ان موٹی ٹانگوں والی عورتوں سے واقف ہوں جو ندیوں میں کپڑے دھوتی رہتی ہیں، اُن بد مزاج لڑکیوں کو جانتا ہوں جو ہر وقت اپنے گھروں کے سامنے موزے بُنتی رہتی ہیں، اور اُن دیہاتیوں سے بھی خوب شناسائی رکھتا ہوں جو غروب آفتاب کے وقت جب میدان کی جھاڑیوں کا رنگ گہرا سبز ہو جاتا ہے دفعتہً نمودار ہو کر مجھے سلام کرتے ہیں۔

بلغاریہ میں لیجنا وہ مقام ہے جسے میں سب سے زیادہ پسند کرتا ہوں۔ گذشتہ سال میں وہاں کے چشموں میں غسل کرنے کے لئے گیا ہوا تھا اور میرا دوست کوستانوف میرے ہمراہ تھا شام کے وقت ہم دونوں شہر سے باہر نکل کر اِدھر اُدھر چہل قدمی کیا کرتے تھے اور اُن بادلوں کو دیکھتے تھے جو کوہ "کور ادوا" پر راکشن نظر آیا کرتے تھے اور رات کو ہم ڈینکو کی سرائے میں شراب

پی کر اور تاش کھیل کر گذارتے تھے۔ اِس پرانی سرائے کے زیریں حصے میں ایک قدیم طرز کا بڑا کمرہ تھا ہر اتوار کو مشہور شرابی جو سات سات بوتلیں ایک وقت میں چڑھا جاتے تھے اِس کمرے میں جمع ہو جاتے تھے اور اپنے حقوں اور ناچ کی آواز سے تمام رات ہم کو سونے نہ دیتے تھے۔ ایک روز اتوار کی شام کو رات کا کھانا کھانے کے بعد میں نے کوشتانوف سے کہا:-

"آج رات کو یہ لوگ ہمیں سونے نہ دیں گے۔ پھر ہم کہیں اور ہی کیوں نہ چلیں"

"کہیں اور کہاں؟"

"مثلاً ڈاکٹر کے ہاں۔ وہ کئی دن سے ہمیں دعوت دے رہے ہیں۔"

"کسی اور رات کو وہاں چلیں گے"

لیکن آج رات کو کیوں نہ چلو؟"

اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا "آج رات کو میں تمہارا تعارف ایک پرانے سیاست داں سے کراؤں گا جو ترکی زبان خوب اچھی بول سکتے ہیں اور جنھوں نے اپنی نوجوانی کے زمانے میں استنبول میں تعلیم پائی ہے"

"وہ کہاں ہیں؟"

"وہ یہاں آئے ہوئے ہیں۔ وہ بھی غسل کے لئے آئے ہیں۔ لیکن جس قسم کے وہ آدمی ہیں اس کا تمھیں پتہ چل جائے گا۔ بالکل "بائی گوئیو" ہیں (ناول نویس کانسٹنٹین الیکو کا مشہور ہیرو)

شام کے کھانے کے بعد کوشتانوف نے سرائے والے سے دوات قلم منگوایا۔ ایک پرچہ لکھا اور اُسے یہ کہہ کر دیا کہ اسے گوسپوڈن کیپازنی کے پاس لے جاؤ۔

پھر وہ مجھ سے اس شخص کی زندگی کے حالات بیان کرتا رہا۔ ابتدا میں کیپازین ایک انقلابی تھا بلغاریہ کی آزادی کے بعد وہ وزارت داخلہ میں ایک عہدہ دار کی حیثیت سے مامور ہو گیا۔ پھر نائب وزیر ہوا اور اخیر میں چند مہینوں کے لئے وزیر عدالت ہو گیا۔ اس کی استمبلاف سے بڑی گہری دوستی تھی۔

اُس نے کہا "یہ عجیب حضرت ہیں۔ خیر تمھیں خود معلوم ہو جائے گا۔ وہ کسی اور کو بات کرنے تھوڑا ہی دیتا ہے۔ تمام وقت خود ہی بولتا رہتا ہے۔ یورپ کے جتنے سیاست داں ہیں سب کو ذلیل سمجھتا ہے۔ بسمارک کا دماغ اس کے نزدیک مغز سے بالکل خالی تھا اور اس بات کی تو وہ قسم کھاتا ہے کہ روس میں ایک بھی معقول آدمی نہیں ہے"

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ سرائے والا آگیا اور کہنے لگا

" گاسپوڈن آپ کو اور آپ کے دوست کو اپنے کمرے پر بلاتے ہیں۔ اُنھیں گٹھیا کی شکایت ہے اور خود نیچے اُتر کر نہیں آسکتے "

" اُن کے کمرے کا کیا نمبر ہے۔ "

" ایک "

" کیا وہ اکیلے ہی ہیں "

" جی ہاں "

کوستنانوف جلدی سے اُٹھ کھڑا ہوا اور میرا ہاتھ پکڑ کر یہ کہہ کر مجھے ایک پتلے زینے سے کھینچتا ہوا اوپر لے گیا کہ

" چلو ایک پرانے زمانے کے آدمی کو بھی دیکھ لو۔ "

سرائے کے کمروں میں نمبر ایک کا کمرہ شاید سب کمروں میں بہترین تھا۔ یہ کمرہ سڑک کے رُخ تھا اور اس کے دروازے کے دو پہلو تھے۔ کوستنانوف نے دروازے پر اس طرح دستک دی جیسے فوجی مارچ میں 'تکی تک'، 'تکی تک تک'، 'تک تک'، 'تکی تک'، 'تکی تک تک' کی آواز پیدا ہوتی ہے۔

پھر اُس نے دھکا دے کر کواڑ کھولا۔ یہ کمرہ حقیقتاً دوسرے کمروں کے مقابلے میں بہت زیادہ آراستہ تھا۔ کھڑکیوں پر سبز پردے اور شیڈز لگے ہوئے تھے۔ دیواروں پر بادشاہ فرڈنینڈ اور بادشاہ بورس کی روغنی تصویریں ٹنگی ہوئی تھیں۔ آیوڈین کی تیز بو ہماری ناک میں گھسی۔

گرمی کے باوجود کھڑکیاں بند تھیں۔ گاسپوڈن ایک کونے میں صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کی ٹانگیں ایک سُرخ کمبل سے ڈھکی ہوئی اور اُس کے سامنے بچھی ہوئی ایک آرام کرسی پر رکھی ہوئی تھیں اُس کے بال اور داڑھی سپید تھی اور اُس کا چہرہ سُرخ تھا۔ جب ہم داخل ہوئے تو وہ ہنسا اور چلا کر کہنے لگا۔

"تم ہو کوستانوف۔ تمہارا یہاں کیا کام ہے۔ کِسانوں کو دھوکا دینے آئے ہو۔"

"نہیں۔ میں غسل کرنے کے لئے آیا ہوں۔"

"یہ فریب دوسروں کو دینا۔ اگر میں برسر اقتدار ہوتا تو میں تمھیں اور تم جیسوں کو سانس تک نہ لینے دیتا۔ جنیسر بیٹھو......"

ہم نے ایک ایک کرسی لے لی اور اُس کے سامنے بیٹھ گئے۔ پھر کوستانوف سے مخاطب ہو کر اُس نے کہا :-

"کیا خبریں ہیں۔ کہو ؟"

"خبر کیا ہے کچھ بھی نہیں گاسپوڈن !"

"خبر کیسے نہیں۔ تم جیسے نوآموز کسی بات کو کچھ اہمیت ہی نہیں دیتے۔ کیوں ٹھیک ہے نا ؟"

پھر اُس نے مجھے سَر سے پاؤں تک دیکھا۔ اُس کی نیلی آنکھیں بھورے شعلوں کی طرح چمک رہی تھیں

"آپ کون ہیں ؟ کیا یہ بھی تمھارے شاگرد ہیں ؟"

"نہیں گوسپاڈن یہ بلغاری نہیں ہیں۔"

"پھر یہ کون ہیں"

"ترک"

"ترک ؟"

"ہاں"

میرے سر پر کلپاک تھی۔ بس سے اس نے سمجھا کہ کوستانوف مذاق کر رہا ہے اور ہنسنے لگا۔ لیکن پھر بھی اُسے کچھ تامل ہوا اور جب کوستانوف نے اُسے یقین دلایا تو اس نے مان لیا۔ میں بھی اس عرصے میں مسکرا رہا تھا۔

"یہ یہاں کیا کر رہے ہیں" اس نے پوچھا

"یہ غسل کے لئے آئے ہیں اور میرے دوست ہیں۔"

"کیا آپ بھی سوشلسٹ ہیں" یہ کہہ کر اس نے مجھے گھورنا شروع کیا۔

"میں نے کہا نہیں" اور کوستانوف نے بھی میری تائید کی۔

"یہ قوم پرست ہیں گوسپاڈن" کوستانوف نے کہا

"مجھے زیادہ بے وقوف نہ بناؤ۔ ایک ترک نہ سوشلسٹ ہو سکتا ہے نہ قوم پرست۔"

اب وہ برابر ہنس رہا تھا۔ انسان بھی عجیب ہوتا ہے۔ اگر کسی ترک نے یہ بات کہی ہوتی تو مجھے اس کی شاید پروا نہ ہوتی۔ لیکن جب ایک بلغاری نے یہ بات کہی تو مجھے بُری معلوم ہوئی اور اس وجہ سے اور بھی کہ اس میں استہزار کی جھلک تھی۔ میرا چہرہ یقیناً بہت زیادہ سرخ ہو گیا ہوگا۔

"کیوں نہیں ہو سکتے" میں نے کہا "میری طرف دیکھئے میں قوم پرست ہوں۔"

"کیا تم ترک نہیں ہو؟"

"ہاں میں ترک ہوں"

"تو پھر عزیزِ من تم کچھ بھی نہیں ہو سکتے"

"کیوں نہیں ہو سکتا"

کیونکہ عزیزِ من تم ترک ہو۔"

"یہ کیسی عجیب بات ہے"

اب مجھے غصہ آنے لگا تھا۔ کوستانوف نے یہ دیکھ کر کہ مجھے بُرا معلوم ہوا ہے بات کو ٹالنا چاہا۔

"لیکن گاسپوڈن نوجوان ترکوں کے متعلق تم ایسا نہیں کہہ سکتے۔"

مگر بڈھا سیاست داں سر ہلاتا رہا اور اس بات کو اصرار کے ساتھ کہتا رہا۔

"بوڑھے ہوں یا جوان ترک ترک ہیں۔ میں انھیں خوب جانتا ہوں۔ روئے زمین پر کوئی شخص ترکوں کو مجھ سے بہتر نہیں سمجھ سکتا۔"

کوشتانوف نے کئی مرتبہ احتجاج کرنا چاہا بعض وقت معقولیت کے ساتھ اور بعض وقت ایسے الفاظ میں جن سے کوئی مفہوم پیدا نہ ہوتا تھا۔ اخیر میں کیپازلیف نے کہا

"ترکوں کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ نہ خیال ہے نہ نصب العین۔ اُن کے پاس صرف ایک چیز ہے"

ہم دونوں نے پوچھا

"وہ کیا ہے؟"

"مذہبی دیوانگی"

"........."

ہاں مذہبی دیوانگی۔ بلغاریہ میں مَیں نے اُن کی مذہبی دیوانگی سے بہت فائدہ اٹھایا۔ اگر میں آج برسرِ اقتدار ہوتا تو آج بھی فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ استامبلوف کو اس بات کا یقین تھا کہ میں ایک غیر معمولی ذکاوت اور ذہانت کا شخص ہوں۔ جب ہماری ریاست کی نئی نئی تنظیم ہو رہی تھی اگر میں نہ ہوتا تو بلغاریہ کی یہ حالت نہ ہوتی جو آج ہے۔ ترک اس قدر زیادہ تھے .... ہماری تعداد سوبرانیا میں یقیناً نصفا نصف ہوتی اور ایک دن جماعتِ عاملہ میں آدھی تعداد ترکوں کی ہوتی۔ لیکن میں نے...... لیکن میں نے........"

اس نے اپنی ٹانگوں کو سمیٹا اور اپنے سینے کو اپنے بال دار ہاتھوں سے ٹھوک کر اور کوشتانوف کی طرف اشارہ کر کے کہا

"یہ جاہل ہماری قدر نہیں کرتے۔ لیکن تاریخ سے حقیقت کا اظہار ہو گا۔"

مجھے یہ معلوم کرنے کی جستجو تھی کہ اس نے ترکوں کی مذہبی دیوانگی سے کس طرح فائدہ اُٹھایا۔ اِس لئے میں نے پوچھا:۔

"جناب گوسپاڈن صاحب کیا آپ ہمیں یہ نہ بتلائیے گا کہ آپ نے ترکوں کی مذہبی دیوانگی سے کس طرح فائدہ اٹھایا"

"کیوں نہیں بڑی خوشی سے"

"شکریہ" میں نے کہا۔ کوشتانوف کو بھی اشتیاق تھا۔

بڈھے آدمی نے کمبل کے نیچے ایک پاؤں پر دوسرا پاؤں رکھا۔ منہ بنایا۔ جیب سے ایک سگریٹ کیس نکالا۔ ایک ایک موٹا سگریٹ ہم دونوں کو دیا، اور ایک خود سلگایا۔ قصہ بیان کرتے وقت وہ سر، بازو اور اپنے تمام جسم کو ہلاتا رہا اور تھوڑی دیر کے بعد اپنے گھٹنوں پر ہاتھ مارتا تھا۔

"بچپنے میں میری اور استمبلوف کی دوستی تھی۔ استنبول میں ہم دونوں ساتھ ہی مدرسے میں داخل ہوئے تھے۔ جب بلغاریہ کو آزادی ملی تو ہم نے کانگریس کو اور تمام کمیٹیوں کو جمع کیا۔ اس وقت بلغاریہ محض برائے نام ایک ریاست تھی۔ کیونکہ آدھی سے زیادہ آبادی ترک تھی اور یہ ایک بڑا پیچیدہ مسئلہ تھا۔ بے وقوف آدمی قتل عام کی تجویزوں کو سوچتے تھے اور ان پر گفتگو کر رہے تھے۔ ایک دن استمبولاف نے مجھ سے پوچھا

"ترکوں کے ساتھ ہمیں کیا کرنا چاہئیے"

"میں نے کہا" یہ تو بہت سہل ہے۔ ہم انھیں ترکی واپس بھیج دیں گے"

"کس طرح؟" استمبولاف نے کہا "کیا یہ لوگ اپنا گھر بار اور مکان اپنی خوشی سے آپ ہی چھوڑ دیں گے"

میں نے جواب دیا "ہاں ضرور" لیکن اسے یقین نہیں آیا۔ اس کا بھی یہی خیال تھا کہ قتل عام ہونا چاہئیے۔ دراصل قتل عام کی جن لوگوں کے لئے ضرورت تھی وہ یونانی تھے کیونکہ بلغاریہ سے انھیں نکالنے کی کوئی صورت ہی نہیں تھی۔ چنانچہ اخیر میں یہی کرنا پڑا۔ لیکن ترکوں کو قتل کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی میں جانتا تھا کہ ان کا سب سے زیادہ مقدس جذبہ ان کی مذہبی دیوانگی ہے۔ میری پرورش انھیں کے درمیان ہوئی تھی

میرے پڑوسی سب ترک تھے۔ انھیں کسی سے نفرت نہ تھی۔ وہ کسی کو نقصان نہ پہنچاتے تھے حتیٰ کہ روسیوں کو بھی نہیں جو اُن کے دشمن تھے۔ اُن کی تمام زندگی ' مذہبی دیوانگی کے سیاہ پردے میں لپٹی ہوئی تھی۔ مثلاً انھیں سوروں سے نفرت تھی۔ سور آپ جانتے ہیں بے ضرر جانور ہے۔ لیکن ترک اُس کے جانی دشمن تھے۔ جب کبھی انھیں سور نظر آجاتا تو وہ آپے سے باہر ہوجاتے اور اُس سے ایسے بھاگتے گویا کہ شیطان سے بھاگ رہے ہیں۔ جب حکومت اس وقت کے حاکموں کا یعنی ہمارا تقرر کر رہی تھی تو میں نے استمبولاف سے کہا

" میں ایسے حصے میں جاؤں گا جہاں بلغاری بالکل ہی نہیں ہیں اور چند دنوں میں میں سب ترکوں کو بلغاریہ سے باہر نکال دوں گا۔"

" لیکن یورپ والوں کا بھی تو خیال کرو" اُس نے کہا اور سر ہلایا۔ اُس کا اب بھی یہی خیال تھا کہ میں ترکوں کا قتل عام کرنا چاہتا ہوں۔

میں نے اُسے یقین دلایا کہ "کسی کی نکسیر بھی تو نہ پھوٹے گی۔"

" تو پھر تم کیا کروگے "

میں ایک انوکھا ظلم کروں گا "

" کس طرح "

میں نے اُسے نہیں بتلایا۔ میرا ڈیلی ارمن میں تقرر ہوگیا جہاں اگر دوا کے لئے بھی ضرورت ہوتی تو ایک بھی بلغاری دستیاب نہ ہوسکتا۔ میں نے مقدونیہ کے ایک امان دیئے ہوئے خاندان کو شہر میں بسایا۔ میں نے سرکاری بجٹ میں سے خفیہ خدمت کی مد میں اُسے چار لیرا کی رقم دی اور اُن سے پانچ سور خریدوا دیئے۔ میں نے اُن سے یہ بھی کہہ دیا کہ اِن جانوروں کو سڑکوں' باغوں اور کھیتوں میں غذا کی تلاش میں آزاد گھومنے دیں۔

سور تمام شہر میں پھیل گئے۔ اُس وقت ترکوں کی حالت دیکھنے کے لائق تھی۔ اُن کے بڑے بزرگ میرے پاس آئے اور مجھ سے احتجاج کیا۔

"بلغاریوں کے سور آزادی سے سڑکوں پر گھوم رہے ہیں۔ وہ پانی کے حوضوں کو خراب کر رہے ہیں اور کھیتوں کو سونگھتے پھرتے ہیں، ہم سے یہ برداشت نہیں ہو سکتا۔"

میں نے آزادی پر ایک لمبی چوڑی تقریر کی اور میں نے کہا کہ جیسے بکریوں، گایوں، بیلوں اور مرغیوں کو آزاد رہنے کا حق حاصل ہے ویسے ہی سوروں کو بھی ہے اور میں نے اس سوال پر معاملے کو ختم کر دیا کہ

"کیا ہمیں تمھاری بھیڑوں پر کوئی اعتراض ہے؟"

وہ اس سوال کا جواب نہ دے سکے۔ لیکن اس کے بعد سے انھوں نے ان حوضوں سے پانی لینا بند کر دیا جہاں سور پانی پیتے تھے۔ وہ چراگاہوں میں لنگوٹ باندھ کر پہلے کی طرح نہ ننگے ہو سکتے تھے نہ کشتی لڑ سکتے تھے کیونکہ وہاں بھی سور گھومتے پھرتے تھے۔ چھ سات مہینوں میں سوروں کا قلیل التعداد گلہ بڑھا اور ہر جگہ پھیل گیا۔ جب ترکوں کو یہ معلوم ہوا کہ ان سے نجات کی کوئی صورت نہیں ہے تو ایک ایک کر کے ہجرت کرنے لگے۔ حتیٰ کہ جو بہت امیر تھے انھوں نے بھی اپنے گھر کا سامان باندھنا شروع کیا اور اپنی جائداد اور زمین کو کوڑیوں کے بھاؤ فروخت کر ڈالا۔ میں حکومت کے لئے تمام زمین خرید رہا تھا۔ وہ لوگ جو گئے تھے اور جا کر استنبول میں بس گئے تھے وہ واپس آئے اور اپنے عزیز واقربا کو اپنے ہمراہ لے گئے۔ کسان بھی ہجرت کرنے لگے اور میں مقدونیہ کے بلغاریوں کو امداد دے کر بلا رہا تھا اور ویران شہروں کو ان سے بسا رہا تھا۔

مختصر یہ کہ دو سال کے اختتام پر تمام شہر میں ایک ترک بھی باقی نہیں رہا۔ ہاں تمام ترکوں نے اپنے صدیوں کے گھر بار کو اس طرح خیرباد کہا گویا آگ ان کا پیچھا کر رہی تھی۔ حکومت نے میرا طریقہ ان تمام شہروں میں جاری کیا جہاں بلغاری آبادی نہ تھی۔ یعنی بلغاریہ والوں کا ایک خاندان اور سوروں کا ایک گلہ۔ سال کے اندر اندر اس سے ترکوں کی آبادی اپنی اصل تعداد کے مقابلے میں نصف ہو جاتی تھی۔ میری حکمتِ عملی سے اسٹمبولاف بہت خوش ہوا اور جب کبھی میری اس سے ملاقات ہوتی وہ کہا کرتا کہ تم غیر معمولی ذکاوت اور ذہانت کے آدمی ہو۔ تم بسمارک سے بھی بڑھ کر ہو۔

استمبولاف مجھ سے بیچ بیچ بغلگیر ہوتا تھا اور میرا منہ چومتا تھا۔ ہاں بسمارک السِاس لورین کے مسئلے کا ایسا تیر بہدف علاج نہ سوچ سکا۔ زبان کی تعلیم کو روکنا، مدرسوں کو بند کرنا ظالمانہ طریقے ہیں میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ کیا کرنا چاہئے تھا۔ لیکن مجھے اِس کا یقین ہے کہ کوئی ایسی بات کی جاسکتی تھی جس سے فرانسیسیوں کو غصہ آتا اور اُن کی مذہبی دیوانگی برانگیختہ کی جاسکتی۔ اگر بسمارک نے اس چیز کو ڈھونڈھ لیا ہوتا تو سال کے اندر اندر اُس نے اِن صوبوں کو جرمن بنا دیا ہوتا۔

دس سال ہوئے میں سینٹ پیٹرس برگ گیا تھا۔ میں نے سازانوف سے گفتگو کی تمھیں معلوم ہے کہ اِس بے وقوف کو لوگ یورپ میں سیاست داں کہتے ہیں۔ میں نے اُس سے کہا کہ تم استنبول پر قبضہ کرنا چاہتے ہو۔ کیوں۔ اُس نے بلا کسی تامل کے جواب دیا

"ہاں"

"یہ کام بہت آسان ہے۔"

"کس طرح" سازانوف نے پوچھا

"دنیاوی جنگوں کی ضرورت نہیں ہے۔ جیسا تمھارا خیال ہے۔ ایک بہت ہی سہل طریقہ ہے۔"

اُس نے دوبارہ پوچھا "کس طرح"

"تم ترکوں کو استنبول چھوڑنے پر مجبور کر سکتے ہو اور اُن کی جگہ روسی بسا سکتے ہو۔ پچیس سال میں ایک بھی ترک باقی نہ رہے گا اور استنبول روسی شہر ہو جائے گا۔"

"اُس نے تیسری دفعہ پوچھا" لیکن یہ کس طرح ممکن ہے۔"

"بہت سہل ہے" میں نے کہا۔ اور پھر میں نے اُسے بتلایا کہ ترکوں میں کوئی سیاسی خیال نہیں ہے۔ انھیں وطن اور ملک سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ وہ مذہبی دیوانگی کے ماتحت تمام چیزوں کو سوچتے ہیں۔ میں نے اُسے سمجھایا کہ اگر ترکوں کے محلہ میں ایک روسی یا بلغاری خاندان کو سوروں کے گلے کے ساتھ بسا دیا جائے گا تو ترک آوارہ گرد چڑیوں کی طرح گھبرا کر اُڑ جائیں گے۔ گدھے کو میری بات کا یقین نہ آیا۔ بے شک وہ گدھا تھا۔ کیونکہ وہ اُن لوگوں کی

ذہنیت سے واقف نہ تھا جن کے دارالسلطنت پر وہ قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ میرے طریقے پر ہنسا۔ اور اس نے خیال کیا میں مذاق کر رہا ہوں لیکن جب اسے بعد کو معلوم ہوا کہ میں سنجیدگی کے ساتھ اس بات پر اعتقاد رکھتا ہوں تو اس نے ہمارے ایلچی سے کہا

"گوسپوڈن کیپازلیف بھی کیسا عجیب آدمی ہے۔ پہلی ہی ملاقات میں مجھے بنانے لگا۔"

"ہاں یہ شخص ضرور گدھا تھا۔ یورپ میں خصوصاً روس میں ایک متنفس بھی ایسا نہیں ہے جو سیاست سے صحیح طور پر واقفیت رکھتا ہو۔ ہاں سب کے سب گدھے ہیں۔"

عمر رسیدہ سیاست داں ایک کے بعد دوسرا سگریٹ جلاتا رہا اور ہم سے بھی یہی کراتا رہا۔ وہ اپنی پرانی کامیابیوں کی داستان کو ختم نہ کر سکا۔ نصف شب گذر چکی تھی۔ میرے لئے یہی بہت تھا اور کشتانوف یہ محسوس کر رہا تھا۔ اس لئے اس نے رخصت چاہی اور ہم نے کمرے کو جو سگریٹ کے دھوئیں سے لبریز تھا خیرباد کہا۔ باہر آکر اس نے مجھ سے کہا

"جو کچھ یہ کہتا ہے اس میں سے ہر بات کا تمھیں یقین نہ کرنا چاہئے۔"

"کیوں کیا وہ جھوٹ بول رہا تھا"

"نہیں"

"تو پھر"

"یہ مبالغے سے کام لیتا ہے۔ اس میں سے پانچ فیصدی نکال دو اور باقی پر یقین کر لو۔"

میں اپنے کمرے میں گیا کپڑے اتارے اور بستر پر لیٹ گیا لیکن نیند غائب تھی۔ مجھے بخار تھا لیکن میرا بدن گرم نہ تھا۔ میرے تمام جسم پر سرد پسینے کی تہ جمی ہوئی تھی۔ رفتہ رفتہ بڑے کمرے میں گانے اور ناچنے کا شور بلند ہو گیا۔ مرغوں نے اذانیں دیں۔ دن نکلنے لگا۔ میں نے اپنی آنکھیں مضبوطی سے بند کر لیں۔ منہ بستر میں دے لیا اور اونگھنے کی کوشش کی۔ میں نے محسوس کیا کہ میں اپنے بہادر آباؤاجداد کو، اپنے جانباز بھائیوں کو، اپنے پاک باطن اور سادہ لوح ہم قوموں کو گندے سوروں کے گلوں کے

آگے آگے پاگلوں کے ایک مجمع کی طرح بھاگتا ہوا دیکھ رہی ہوں۔ اُن کے عمامے ہوا میں اُچھل رہے ہیں۔ اُن کے گھوڑے اور گاڑیاں دلدل میں پھنسی ہوئی ہیں۔ اُن کی توپیں اور بندوقیں، اُن کی بیویاں اور بچے ایک ایک کر کے راستے میں گرتے جا رہے ہیں۔

ہاں اُس رات مجھے بالکل نیند نہیں آئی ؟

تنقید و تبصرہ

امہات الامہ مصنفہ شمس العلما۔ مولانا حافظ نذیر احمد مرحوم قیمت فی نسخہ عاؔر ملنے کا پتہ ساقی بک ڈپو دہلی

یہ وہ ہنگامہ خیز کتاب ہے جس کے شائع ہونے پر دہلی کے بعض مولویوں نے شورش برپا کرکے دور دور تک پھیلایا اور اس کے مصنف پر کفر و الحاد کے فتوے لگائے چنانچہ اُن کی زندگی ہی میں جب دہلی میں ندوۃ العلما کا اجلاس ہوا تو مولوی صاحبان نے جمع ہو کر اس کتاب کی تمام جلدوں کو جو ایک صاحب کے پاس امانتاً رکھوا دی گئی تھیں لیکر ڈھیر لگایا اور اس پر مٹی کا تیل ڈالکر آگ سے جلا دیا۔ اتفاق سے اس کا ایک نسخہ بچا ہوا رہ گیا تھا جسے امسال دوبارہ مسٹر شاہد احمد نے جو مصنف کے پوتے ہیں شائع کیا ہے اس میں جو باتیں علمار کے نزدیک قابل اعتراض ہیں ان کو ایک مولوی صاحب نے جن کا نام عبد الغنی تھا کشف الغمہ کے نام سے شائع کیا تھا اس کا جواب علامہ احمد حسن محدث دہلوی صاحب احسن التفاسیر نے لکھا تھا یہ دونوں رسالے بھی اس کتاب کے ساتھ شامل کردئے گئے ہیں تاکہ لوگ ان وجوہات کو دیکھیں جن کی بنیاد پر کتاب نذر آتش کی گئی تھی۔

یہ کتاب پادری احمد شاہ شائق کی کتاب امہات المومنین کے جواب میں لکھی گئی ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خانگی زندگی پر اعتراضات کئے گئے تھے مولانا نذیر احمد نے ان تمام اعتراضات کے نہایت مستند اور دنداں شکن جوابات دئے ہیں میں نے ساری کتاب غور سے پڑھی میرا خیال یہ ہے کہ جس غرض و غایت کیلئے یہ لکھی گئی ہے نہایت مشرح اور مکمل ہے۔ بیشک بعض امور میں علمی حیثیت سے اختلاف کی گنجائش ہے لیکن ان اختلافات سے مصنف کا دین و ایمان قطعاً زیر بحث نہیں لایا جاسکتا انھوں نے جو کچھ لکھا ہے۔ رسول پاک کی مدافعت میں لکھا ہے خلوص نیت سے لکھا ہے۔ علم اور ایمان کی روشنی میں لکھا ہے کہیں ان کی عقیدت سے فتور کا شائبہ نہیں ملتا۔ بیشک چند الفاظ زبان قلم سے ناولانہ رنگ کے نکل گئے ہیں جن سے ان کی طبیعت مالوف تھی مگر ان کی بنار پر یہ کتاب سوختنی نہیں

ہو سکتی اگرچہ ہماری خواہش یہ ضرور ہوتی ہے کہ کاش ان الفاظ سے بھی جو عوام میں ہیجان پیدا کر سکتے ہیں یہ پاک ہوتی۔

جن حضرات نے اس کو جلایا یا جلوایا میرا خیال یہ ہے کہ معاصرانہ عداوت یا کچھ اور جذبات اس کے محرک رہے ہوں گے ورنہ اس کتاب سے تو قطعاً مصنف کا کفر و الحاد ثابت نہیں کیا جا سکتا زیادہ سے زیادہ بعض الفاظ سے سوء ادب کا الزام لگایا جا سکتا ہے وہ بھی بزعم خود کیونکہ مصنف کا رتبہ ادب اردو میں نہایت بلند مسلم ہو چکا ہے وہ اگر ان الفاظ یا فقرات کو ادب کے خلاف سمجھتے تو میرا یقین ہے کہ ہرگز نہ استعمال کرتے

محمدیہ پاکٹ بک | مؤلفہ منشی محمد عبداللہ صاحب معمار امرتسری تقطیع خورد لکھائی چھپائی اور کاغذ نہایت عمدہ ضخامت ۱۰۳۶ صفحے مجلد قیمت فی جلد ہے ملنے کا پتہ شعبہ تالیف و طبع انجمن اہلحدیث برانڈرتھ روڈ لاہور۔

یہ کتاب مرزائیت کی تردید میں نہایت جامع اور مبسوط لکھی گئی ہے جس میں اس کے تمام اصولی اور فروعی امور زیر بحث لائے گئے ہیں انداز بیان اس قدر معقول اور مدلل ہے کہ سوائے تسلیم کے کوئی چارہ کار باقی نہیں رہتا مرزائیوں نے احمدیہ پاکٹ بک شائع کر کے مرزا صاحب کی چند پیشین گوئیوں کا وقوع ثابت کیا تھا لیکن چند پیشین گوئیوں کے صحیح ہو جانے سے کوئی شخص نبی نہیں ثابت ہو سکتا تاوقتیکہ یہ نہ دکھایا جائے کہ اس کی کوئی پیشین گوئی غلط نہیں نکلی اس کتاب میں مؤلف نے مرزا صاحب کی اکثر پیشینگوئیوں کو جو بڑے ادعا کے ساتھ کی گئی تھیں جھوٹا ثابت کر دیا ہے اور ان کے عدم وقوع کو خود مرزا اور مرزائیوں کی تحریروں سے دکھلا دیا ہے۔ ہندوستان کے اس مدعی نبوت کی پیشینگوئیوں کی حقیقت اگر کوئی دیکھنا چاہے تو اس کو یہ کتاب ضرور پڑھنی چاہیئے واقعی اس کا مؤلف فاضل مرزائیت ہے اگر کوئی یونیورسٹی اس لٹریچر کی مہارت پر ڈگری دیتی تو منشی عبداللہ کو اس کتاب پر ضرور پی ایچ ڈی کی ڈگری مل جاتی۔

ضروری کہانیاں | مصنفہ قاضی عبدالصمد صاحب۔ قیمت ۲ ملنے کا پتہ مولوی محمد ادریس صاحب میرٹھی۔ مکتبہ شرقیہ۔ دہلی

قاضی صاحب نے اس کتاب میں ہندوستان کے راجاؤں، بادشاہوں اور نوابوں کے ایسے واقعات اور قصص فراہم کیے ہیں جن سے ہندوستانی قوموں میں باہم اتحاد بڑھے، مخالفوں نے ہندوستان کی تاریخ کو جو یہاں کی اقوام میں باہمی منافرت پیدا کرنے کا ذریعہ بنا رکھا ہے اس قسم کی کتابوں سے اُن کے زہر کا ازالہ ہو سکتا ہے قاضی صاحب کی یہ کوشش بہر حال ہندوستانی نگاہ میں نہایت مفید ہے۔

سودیشی اردو | مصنفہ قاضی عبدالصمد صاحب فی نسخہ ۸ ملنے کا پتہ مولوی محمد ادریس صاحب میرٹھی مکتبہ شریفیہ دہلی

اس رسالہ میں قاضی صاحب نے بچوں کے لیے چھوٹی چھوٹی دلچسپ کہانیاں اور باتیں خالص اردو میں لکھی ہیں اس میں عربی و فارسی کے الفاظ نہیں آئے ہیں عبارت رواں اور صاف ہے جو لوگ خالص اردو کو پسند کرتے ہیں ان کے لیے یہ ایک عمدہ تحفہ ہے۔

روزنامچہ یا مجنوں کی ڈائری | از جناب قاضی عبدالغفار صاحب تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۶۰ صفحات کتابت وطباعت اچھی، یہ کتاب "لیلیٰ کے خطوط" کے ساتھ ہے میں ملتی ہے ملنے کا پتہ دارالادب پنجاب بارود خانہ امرتسر لاہور

دارالادب پنجاب نے ایک خاص نوع کا ادب لطیف پیش کرنا شروع کیا ہے جس میں اخلاقی، مذہبی رسمی اور روایتی قیود سے بے نیاز ہو کر کتاب کے موضوع کا انتخاب کیا جاتا ہے اور دوران تصنیف میں خیال آفرینی پر کسی قسم کی حد بندی یا رکاوٹ عاید کرنا آزادی تحریر کے منافی سمجھا جاتا ہے اس نوع کا ادب عموماً سماج کے اس دور میں پیدا ہوتا اور قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے جب امرا اور تعلیم یافتہ جماعت میں تشکیک کا غلبہ ہوتا ہے اور ان کے قوائے عمل مفلوج ہو جاتے ہیں۔ زندگی کی تمام پرانی قدریں اپنا اثر زائل کر دیتی ہیں اور نئی قدریں ذوق ونشاط عمل پیدا کرنے سے قاصر رہتی ہیں مذہب، اخلاق، قانون معاشرت، رسم ورواج، سیاسی تحریکیں سب لغو و مہمل نظر آنے لگتی ہیں حتیٰ کہ خود زندگی کا کوئی مفہوم باقی نہیں رہتا، شراب ہوس پرستی اور موسیقی وجہ تخلیق کائنات اور مدار زندگی بنجاتے ہیں خیال کی پختگی اور گہرائی کے اعتبار سے یہ دور چاہے کتنا ہی بے مغز کیوں

نہ ہو لیکن اس کے بعض ادبی شاہکاروں کی لطافت اور دلچسپی خراج تحسین وصول کیے بغیر نہیں رہتی۔

زیر تنقید کتاب اسی قسم کی تصنیف ہے اخلاقی اور معاشرتی حیثیت سے یہ چاہے جس قدر بھی قابل اعتراض ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ ادبی حیثیت سے یہ اسی قدر کامیاب ہے

"شرح حال" کے عنوان سے کتاب کی ابتدا میں قاضی عبدالغفار صاحب نے ایک طویل مقالہ بزرگانہ شان کے انداز میں سپرد قلم فرمایا ہے جس میں انھوں نے اپنی تصنیف کی "معنوی کیفیات" کو بے نقاب کرنے کی کوشش فرمائی ہے اور ان لوگوں کی تعریف کو جو اپنی توجہ اس تصنیف کی محض ادبی خوبیوں تک محدود رکھنا چاہتے ہیں "تحسین ناشناس" سے تعبیر کیا ہے لیکن ان کی اس پیش بندی کے باوجود ہم اُن کی کتاب کو اس سے زیادہ اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

"مجنوں کی ڈائری" سے اگر "شرح حال" کو نظر انداز کر دیا جائے تو ہمارا خیال ہے اس سے کسی قسم کی اصلاحی یا تعلیمی خدمت نہیں ہوتی بلکہ اس سے غیر پختہ ذہنوں میں جہاں ابھی تک خدا کا ڈر، شریعت کا احترام اور سماج کے قانون کی عزت باقی ہے، ایک طرح کی غیر ذمہ دارانہ آزادی، مزاجی انتشار اور مایوس کن کیفیت بے عملی اور بے زاری پیدا ہونے کا احتمال ہے۔ قاضی صاحب کو اس چیز کا مطالبہ نہ کرنا چاہیے جس کے وہ مستحق نہیں ہیں، ادبی حیثیت سے ہمیں اعتراف ہے، ان کا کارنامہ بڑی حد تک کامیاب ہے لیکن اس دور ابتلا اور آزمائش میں جب کہ ہر نوجوان کے سامنے ایک واضح اور متعین معیار اور مقصد ہونا چاہیے ان کی کتاب کی تخریبی مساعی کسی نہج سے لائق ستائش نہیں ہو سکتیں ان کے وسیع تجربہ اور بالغ نظری سے بجا طور پر توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ نوجوانوں کے مسائل کو زیادہ پیچیدہ بنانے کی بجائے اُن کی زندگی کے خطرناک راستہ کو سہل اور ہموار کرنے کی کوشش فرمائیں گے۔

"شرح کلام" کے اختتام پر قاضی صاحب نے امید دلائی ہے کہ "داستان ابھی باقی ہے جو اس سلسلہ کی آئندہ اقساط میں پیش کی جائے گی" ہماری تمنا ہے کہ آئندہ جو "داستان" پیش کی جائے وہ ایسی ہو کہ اس سے زندگی کا ایک صحیح اور تندرست فلسفہ پیدا ہو سکے تاکہ موجودہ دور شک و الحاد اور بے عملی کا خاتمہ ہو اگر قاضی صاحب اس خدمت کے کرنے میں کامیاب ہوئے تو ان کی تحریر کے ادبی نقوش کی تعریف

کے ساتھ ساتھ ان کی تصنیف کی "معنوی اہمیت" کی بھی ہر طرف سے خاطر خواہ داد ملے گی آخر میں، ہم قاضی صاحب موصوف سے درخواست کریں گے کہ وہ نوجوانوں کی اُن ذہنی کیفیات کا جن کا تعلق محض شہوانی جذبات سے نہیں ہے ذرا زیادہ گہرا مطالعہ کرنے کی زحمت گوارا فرمائیں اور اُن "غریب نوجوانوں کو جنھیں کالجوں میں پیا گھولا اور چھانا جاتا ہے" اپنی دل سوزی ہمدردی اور تعمیری مساعی کا زیادہ مستحق سمجھیں اور ان پر سستی قسم کی پھبتیاں چست کرنے سے جہاں تک ہو سکے اجتناب فرمائیں کیونکہ ان "آبگینوں" کو "ٹھیس" لگانا سماج کے لیے سخت مہلک ثابت ہو سکتا ہے۔

لیلیٰ کے خطوط | از قاضی عبدالغفار صاحب، تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۲۴ صفحات۔ کتابت و طباعت اچھی "مجنوں کی ڈائری" کے ساتھ ہے، ملنے کا پتہ دارالادب پنجاب بارود خانہ اسٹریٹ لاہور

یہ کتاب ایک ذہین تعلیم یافتہ اور شاید فطرتاً نیک بازاری عورت کے فرضی خطوط ہیں جن کے وسیلے سے اس کے فلسفۂ زندگی اور نفسیاتی کیفیات کے تجزیہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے موضوع کتاب یعنی ابتدا میں جوانی کی لغزش، تربیت کرنے والوں کی عدم توجہی اور بعد میں معاشی ضرورت سے مجبور ہو کر طبعی تنفر اور بیزاری کے باوجود پیشہ کو جاری رکھنا اور مناسب موقع ملنے پر اس سے کنارہ کش ہو جانا ہر چند پامال ہو چکا ہے لیکن جس جدت خیال اور ندرت بیان کے ساتھ قاضی عبدالغفار صاحب نے کتاب میں اپنی انفرادیت کو چمکانے کی کامیاب کوشش کی ہے وہ یقیناً مستحق ستائش ہے ادب لطیف کے اس دلکش خزانے میں چند جواہر پارے تو واقعی بہت بیش قیمت ہیں مثلاً ایک خط کی ابتدا ایک ایسے بلیغ استعارے سے ہوتی ہے کہ کل کتاب کا ماحصل چند مختصر الفاظ میں محدود ہو جاتا ہے۔ وہ لکھتی ہے:-

"قدرت کے دو بچوں نے کہا آؤ ایک کشتی بنائیں انھوں نے ایک چھوٹی سی کشتی بنائی محبت سے اس کے تختے جوڑے اس کو اپنے ایک باغ کے خوبصورت تالاب میں ڈال دیا جہاں موسم بہار کی معطر ہوائیں اس ننھے سفینے کو پانی کی ہلکی لہروں پر جھولا جھلایا کرتی تھیں وہ کشتی کاغذ کی نہ تھی، نہ لکڑی کی تھی نہ لوہے کی لیکن کاغذ سے بھی زیادہ نازک تھی مگر اس کے بنانے والے نہ جانتے تھے کہ ایسی کشتیاں

کس قدر نازک ہوتی ہیں شاید انھوں نے یہ سمجھا کہ ایک چھوٹے سے باغ کے چھوٹے سے تالاب کے بے موج اور بے طوفان پانی کے لیے کشتی کو مضبوط بنانے کی ضرورت نہیں وہ بھول گئے کہ تالاب کی کشتی کو بھی کسی دن طوفان خیز سمندروں اور تیز دریاؤں میں جانا پڑتا ہے۔ تالاب بھی دریا اور سمندر بن سکتا ہے۔ وہ خطرات کو بھول گئے، مگر بھول جانے سے خطرات کم نہیں ہو سکتے یہ خدا کا نہ بدلنے والا قانون ہے۔"

برسات آئی۔ ایسی برسات آئی کہ چاروں طرف سے نالے چشمے اور دریا اُمنڈ آئے پھولوں کی کیاریوں کو پانی کی چادر نے ڈھانک لیا ...... جب تک اس ننھے سفینہ میں دم تھا اور دم ہی کتنا تھا۔ اس نے سنبھلنے کی کوشش کی لیکن کوئی سہارا نہ تھا کشتی والے بیخبر تھے انھوں نے کس محنت سے سفینہ بنایا تھا اور کس بے پروائی سے اس کو بھول گئے تالاب کے پانی اور برسات کی ہواؤں نے یوں گویا کہ دونوں کی سازش تھی، ایک دو دن اس شکستہ لنگر کشتی کو ادھر ادھر گھسیٹا اور پھر آخری جھٹکا دیکر چھوڑ دیا۔ ایک طرف کیچڑ میں جہاں مینڈکیں بول رہی ہیں اور جھینگر شور مچا رہے ہیں، درختوں کے گرے ہوئے پتے سڑ رہے ہیں چند گلے ہوئے تختوں کا انبار پڑا ہوا ہے کچھ کیچڑ میں کچھ کیچڑ کے باہر ......

"کوئی ان بے خبر کشتی والوں کو بلائے اگر چاہیں تو ان تختوں میں اب بھی اتنی سکت باقی ہے پھر اپنی کشتی بنالیں وہ ایسی مضبوط تو نہ ہوگی جیسی پہلے تھی مگر کسی چھوٹے سے باغیچہ کی نہر میں اب بھی پڑی رہ سکتی ہے کہیں کوئی ملاح ہے جو اس ٹوٹی ہوئی کشتی کے تختوں کو جوڑ دے جو اس کشتی کے لیے ایک بادبان اور لنگر کہیں سے لادے؟

"میرے مہربان! یہ پہیلی جو بیان کی گئی آپ بیتی ہے ......"

اسی قسم کے اور بہت سے لطیف ادبی شہ پارے ہیں، کتاب مستحق مطالعہ ہے اور بازاری عورت کے شرمناک عہد زندگی کے اختتام اور نئے عہد پاکبازی کے آغاز پر ختم ہوتی ہے آخری خط میں وہ لکھتی ہے "چند روز اس نئی دنیا میں مجھے دم لینے دو جس کے دروازے میرے لیے کھلتے جاتے ہیں۔ اس ویرانے کو آباد ہونے دو مجرموں سے میرے انتقام کا وقت وہ آئے گا جب میں بیوی اور ماں بنکر بغاوت کا علم بلند کروں گی۔ ابھی تو میں ایک بازاری عورت ہوں، ذلیل، حقیر، گردن زدنی!"

دلچسپ افسانے | از جناب کوثر چاند پوری تقطیع چھوٹی ضخامت چار سو صفحات کتابت و طباعت روشن کاغذ متوسط قیمت عہ ملنے کا پتہ شمیم اختر بیگم۔ بیگم گنج بھوپال یا مکتبہ جامعہ قرول باغ دہلی

یہ جناب کوثر چاند پوری کے پچیس مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے جو ملک کے مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں ان میں سے بیشتر سماج کی اصلاح کے مقصد سے لکھے گئے ہیں اور اپنے مقصد میں بڑی حد تک کامیاب ہیں کچھ حسن و عشق کے افسانے بھی ہیں جن میں رومان پیدا کرنے کی کوشش کیگئی ہے جناب مصنف کی طبیعت مبالغہ کی جانب بھی مائل معلوم ہوتی ہے" انتقام قدرت" میں سورج سنگھ کا کیرکٹر مبالغہ آمیز ہے سورج سنگھ کو اس کے مظالم کی سزا قدرت کی طرف سے یہ ملی ہے کہ اس کا گھر سیلاب میں بہ گیا اور وہ خود بیوی بچوں سمیت سیلاب کی نذر ہو گیا مگر یہ صورت تو کم و بیش گاؤں کے دوسرے رہنے والوں کے ساتھ بھی پیش آئی انھیں کس جرم میں یہ سزا ملی۔ کتاب کے شروع میں جناب مصنف اور جناب قاضی امیرالدین صاحب نائب دیوان ریاست دتیا کی تصویریں بھی ہیں۔

رموز کلام غالب | مرتبہ محمد اسحاق صاحب، حجم ۸۲ صفحات تقطیع چھوٹی۔ کتابت و طباعت متوسط کاغذ معمولی قیمت ۸ ملنے کا پتہ مینجر صاحب رسالہ ماہ تمام نمبر ۸۲ کولوٹولہ اسٹریٹ کلکتہ

جناب اسحاق صاحب امرتسری، غالب کے سات اشعار مختلف عنوانات: مایوسی، قسمت، طاعت، آئینہ، شراب، دین و دنیا۔ انسان کی دنیا کے تحت میں تقسیم کر کے اُن کی تشریح کی ہے

ہوش کے ناخن | از جناب میر حسن و مخدوم محی الدین صاحبان تقطیع چھوٹی حجم ۴۰ صفحات، کتابت و طباعت متوسط کاغذ اچھا قیمت دس آنے ملنے کا پتہ کتاب پر درج نہیں۔ یہ ایک انگریزی ڈرامے کا ترجمہ ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ انسان طمع زر میں کیسا سخت دل اور خود غرض ہو جاتا ہے اور اپنا مطلب نکالنے کے لیے کیسی کیسی عیاریوں سے کام لیتا ہے اور اگر کوئی ان خرابیوں کی اصلاح کرنا بھی چاہے تو ماحول اور سوسائٹی اسے بالکل بے بس اور مجبور کر دیتی ہے۔ ترجمہ بہت صاف اور شگفتہ ہے اور قابل مترجمین نے اسے بڑی خوبی سے اپنایا ہے

زبان حیدر آباد کی مقامی ہی جس سے ڈراما کا لطف اہل حیدر آباد کے لیے اور بڑھ گیا ہوگا۔ حیدر آبا
دوبارہ کامیابی کے ساتھ اسٹیج بھی ہو چکا ہی۔

چالیس حدیثیں | مرتبہ خواجہ عبدالحی صاحب فاروقی استاد تفسیر جامعہ ضخامت ۴۴ صفحے تقطیع چھوٹی۔ کتابت وطباعت اور کاغذ عمدہ قیمت ۲؍ ملنے کا پتہ۔ مکتبہ جامعہ قرول باغ دہلی

جناب خواجہ صاحب نے اس کتاب میں بچوں کے لیے مختلف عنوانات مثلاً جسم اور کپڑوں کی صفائی، وقت کی پابندی، استقلال، ماں باپ رشتہ دار وغیرہ عنوانات کے ماتحت قرآن کی آیات اور احادیث جمع کر دی ہیں۔ ساتھ ہی نہایت آسان زبان اور موثر انداز میں ان کی تشریح بھی کی ہی یہ کتاب بچوں اور بوڑھوں سب کے لیے مفید ہی۔

بچوں کے اسماعیل | از جناب سعید انصاری صاحب بی۔ اے (جامعہ) ضخامت ۸۰ صفحات کتابت وطباعت اور کاغذ عمدہ قیمت ۶؍ ملنے کا پتہ مکتبہ جامعہ قرول باغ دہلی

جناب سعید انصاری صاحب نے اس چھوٹی سی کتاب میں ہندوستان کے مشہور شاعر اسمٰعیل میرٹھی کی اُن نظموں کا انتخاب شائع کیا ہی جو انھوں نے بچوں کے لیے لکھی ہیں اور ان کی ریڈروں میں چھپ چکی ہیں مولانا اسمٰعیل میرٹھی کو بچوں کی نظمیں لکھنے میں جو کامیابی ہوئی ہی وہ اب تک بہت کم شاعروں کو نصیب ہوئی۔ سعید صاحب نے یہ بہت اچھا کام کیا ہی کہ ان نظموں کو ایک جگہ جمع کر دیا ہی انھوں نے اس امر کا التزام کیا ہی کہ سہل اور آسان نظمیں پہلے آئیں اور بعد میں مشکل ہوتی جائیں آخر میں مشکل الفاظ کی فرہنگ بھی ہی۔

شذرات

خدا کا شکر ہو کہ جامعہ کا وفد جو شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کی سرکردگی میں صوبہ متحدہ کے مغربی اضلاع کا دورہ کر رہا ہو اب تک ہر طرح کامیاب رہا ہو مظفر نگر، سہارنپور، بجنور کا کام ختم ہو چکا ہو اور ان تینوں ضلعوں کے باہمت لوگوں نے جس گرمجوشی، خلوص اور فیاضی سے ہمارے وفد کی امداد کی ہو اُس سے ایک طرف تو یہ اندازہ ہوتا ہو کہ ان مالی مشکلات کے زمانے میں مسلمانوں کا ہاتھ تنگ ہو، مگر دل تنگ نہیں ہو اور دوسری طرف یہ کہ جامعہ تعلیم نے ہر طبقے اور ہر خیال کے لوگوں کو اپنی تعلیمی تحریک کی طرف متوجہ کر لیا ہو اور اب انشاء اللہ اس کی راہ میں وہ دشواریاں جو اب تک تھیں باقی نہیں رہیں گی آئندہ ہفتے میں وفد بریلی شاہجہاں پور بدایوں وغیرہ جائے گا ہمیں یقین ہو کہ روہیلکھنڈ کے حامیانِ تعلیم اور محبّانِ ملت اپنے قومی ادارے کی مدد میں قسمت میرٹھ کے باشندوں سے پیچھے نہیں رہیں گے تخمینہ یہ ہو کہ مظفر نگر، سہارنپور، بجنور کے چندے کی مجموعی رقم اُس نصاب سے ڈیوڑھی ہو جو ان اضلاع کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔ دیکھنا ہو کہ اور اضلاع صرف اس تناسب کو قائم رکھتے ہیں یا آگے بڑھ جاتے ہیں۔

تجویز ہو کہ آئندہ سال سے جامعہ میں ابتدائی مدارس کے معلموں کی ٹریننگ کا انتظام کیا جائے بعض اسلامی انجمنوں نے جو ابتدائی مدرسوں کو چلاتی ہیں اور دو ایک میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں نے یہ خواہش ظاہر کی ہو کہ جامعہ اپنے یہاں معلموں کی تعلیم کا مدرسہ کھولے، خود جامعہ کے ابتدائی مدرسہ سے ہر سال مدرس ٹریننگ کے لیے باہر بھیجے جاتے ہیں اور اُن کی تعلیم کا خرچ جامعہ کو برداشت کرنا پڑتا ہو اگر وہ اپنے یہاں ٹریننگ کا معقول انتظام کرے تو اس کے مدرسوں اور دوسرے اسلامی مدرسوں کو بڑی سہولت ہو جائے گی اسی خیال سے فی الحال ایک سال کیلئے ٹریننگ کا شعبہ امتحاناً قائم کیا جا رہا ہو اور اس میں بہت تھوڑے سے طلبا داخل کئے جائیں گے، داخلہ کی مفصل شرائط بہت جلد شائع کر دی جائیں گی۔ غالباً اسلامیات، اردو، انگریزی، ریاضی، تاریخ، جغرافیہ کم سے کم

ثانوی دوم (مڈل) تک جاننے کی قید ہوگی۔ ممکن ہے داخلہ کا کوئی امتحان بھی رکھا جائے۔ طلبا کو اصول تعلیم، نفسیات اطفال، طریق درس، نظم مدرسہ، حفظان صحت وغیرہ کے علاوہ ان مضامین کی مزید تعلیم بھی دیجائے گی جو انھیں ابتدائی مدرسوں میں پڑھانے ہوں گے۔

کالج کے نصاب تعلیم پر بھی دوبارہ غور کیا جا رہا ہے۔ خیال ہے کہ ثانوی چہارم کے بعد کالج کی چار سال کی تعلیم کا ایک ہی نصاب بنایا جائے اور ایک ہی سند بی۔ اے رکھی جائے۔ ہر سال کے ختم پر امتحان ہو مگر صرف اس لیے کہ سال بھر کی تعلیم کا نتیجہ معلوم ہو سکے۔ نصاب میں اختیاری مضامین نہ رکھے جائیں بلکہ ہر طالب علم کے لیے ایک ہی نصاب ہو، جو انگریزی، اردو کے علاوہ اسلامیات اور اجتماعیات پر حاوی ہو، اور جس کے ختم کرنے کے بعد طلبہ صحافت، معلمی اور دوسری معاشرتی، قومی خدمات انجام دے سکیں۔

بی اے کی سند حاصل کرنے کے بعد ہر طالب علم سے یہ توقع کیجائے گی کہ ان میں سے کسی کام کی عملی تربیت بھی حاصل کرے اور جب تک جامعہ میں اس کا انتظام نہیں ہے اس وقت تک کسی دوسرے ادارے میں جا کر اس کی تکمیل کرے۔

امیر جامعہ ڈاکٹر انصاری صاحب مدظلہٗ کے برادر بزرگ نواب ضیا نواز جنگ بہادر نے یکایک بنگلور میں انتقال فرمایا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ ہم جامعہ ملیہ کے طلبا اور اساتذہ اور رسالہ جامعہ کے قارئین کرام کیطرف سے ڈاکٹر صاحب قبلہ اور مرحوم کے کل عزیزوں سے اس صدمۂ جانکاہ میں قلبی ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں، مرحوم اعلیٰ درجہ کے منتظم اور مدبر، اعلیحضرت خسرو دکن کے معتمد خاص، نہایت دیندار، خوش خلق اور مہمان نواز بزرگ تھے، جامعہ ملیہ سے دلی ہمدردی رکھتے تھے اور اس کی مدد میں ہر طرح کی سعی فرماتے تھے۔

خداوند تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور انھیں اپنے سایۂ رحمت میں جگہ دے (آمین)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جامعہ

قایم مقام ایڈیٹر:- محمد عاقل - ایم - اے

جلد ۲۴	اگست ۱۹۳۵ء	نمبر ۸

فہرست مضامین

محمد مجیب بی اے (آکسن) پرنٹر و پبلشر نے جامعہ برقی پریس میں چھپوا کر شائع کیا

فیڈریشن یا وفاق

اگر دو یا دو سے زیادہ ریاستیں اس طرح مل کر ایک نئی ریاست بنائیں کہ اُن کا وجود بھی قائم رہے اور اُن سے مل کر جو ریاست بنی ہے اُس میں ریاست کے تمام اوصاف موجود ہوں تو اُسے وفاق[۵۱] کہیں گے۔ اس تعریف کو سمجھنے کے لئے سیاسی اتحاد کی بعض اور صورتوں کو سمجھنا ضروری ہے۔

ایک صورت تو دو ریاستوں کے متحد ہونے کی یہ ہے کہ ریاستیں علیحدہ علیحدہ ہوں، لیکن اُن کا بادشاہ ایک ہی ہو۔ ۱۶۰۳ء میں اسکاٹلینڈ کا بادشاہ جیمس ششم انگلستان کا بادشاہ بھی ہو گیا، دونوں ریاستوں کا وجود علیحدہ علیحدہ قائم رہا۔ دونوں کے داخلی قانون میں فرق تھا، صرف بادشاہ کے ایک ہونے کے باعث خارجی حکمت عملی ایک تھی۔ یہ صورت ۱۷۰۶ء تک قائم رہی اُس کے بعد قانون[۵۲] اتحاد کی رو سے دونوں ریاستوں نے اپنی انفرادیت کو چھوڑ دیا اور ایک ریاست متحد ہو گئی۔ ۱۶۰۳ء اور ۱۷۰۶ء کے درمیان انگلستان و اسکاٹلینڈ کے اتحاد کو شخصی[۵۳] اتحاد کہا جائے گا۔ اسی قسم کا اتحاد ملکہ وکٹوریہ سے قبل موجودہ خاندان کی حکومت میں انگلستان و ہنوور کا تھا۔ ۱۷۰۶ء کے بعد انگلستان و اسکاٹلینڈ کے اتحاد کو حقیقی[۵۴] اتحاد کہتے ہیں، اور اس کی متعدد صورتیں ہو سکتی ہیں، مثلاً جنگ میں شکست کے بعد کوئی ملک کسی دوسری سلطنت سے ملحق ہو جائے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ دو یا دو سے زیادہ ریاستیں کسی خاص مقصد کے لئے متحد ہو جائیں۔ اُن کی جداگانہ حیثیت قائم رہے۔ لیکن اُس مشترک مقصد کے لئے وہ مشترک ادارے قائم کرلیں۔ ان اداروں کی تعداد کم ہوتی ہے۔ ریاستوں کی سیادت قائم رہتی ہے، اور اگر وہ چاہیں تو ان مشترک اداروں کو توڑ سکتی ہیں۔ اس اتحاد کو اتحاد جنسی[۵۵] کہیں گے اور یہ وفاق کی ادنیٰ صورت ہے۔ امریکہ میں ۱۷۸۱ء سے ۱۷۸۹ء تک، سوئٹزرلینڈ میں ۱۸۴۸ء تک اور جرمنی کی ریاستوں میں ۱۸۶۶ء تک

---

[۵۱] FEDERATION [۵۲] ACT OF UNION [۵۳] PERSONAL

[۵۴] UNION [۵۵] REAL UNION [۵۶] CONFEDERATION

اسی قسم کا اتحاد تھا۔

وفاق اتحاد کی ان تمام صورتوں سے مختلف ہے، وفاق میں شریک ہونے والی ریاستیں اپنی خود مختاری کا ایک بڑا جزو قربان کرتی ہیں۔ داخلی امور میں کسی قدر اختیارات کو محفوظ رکھ کر، باقی تمام اختیارات اُس جدید ادارہ[1] کو سپرد کر دیتی ہیں جو ان کے اتحاد سے پیدا ہوتا ہے اور جسے ان سب پر بلحاظ اختیارات و وسعت فوقیت حاصل ہوتی ہے اور جو ایک ریاست کی حیثیت رکھتا ہے۔ یعنی وفاق میں ریاستوں کی انفرادیت کا کچھ حصہ محفوظ رہتا ہے اور کچھ حصہ آپس میں مدغم ہو کر ایک اعلیٰ ریاست کو تشکیل دیتا ہے۔

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ وفاق کی تشکیل بالکل متضاد طریقہ پر ہو، یعنی ایک مملکت پہلے مختلف حصوں میں منقسم ہو جائے اور پھر وفاق مرتب ہو، مثلاً برطانوی ہندوستان ایک وحدانی ریاست تھا، لیکن اس کے صوبوں کو خاص اختیارات دے کر ماتحت ریاستوں کی صورت دی گئی اور پھر وفاق قائم کیا جا رہا[2] ہے، یہی صورت کناڈا[3] اور جنوبی افریقہ[4] میں پیش آئی۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو یہ فرق کچھ اہم نہیں ہے، نہ اس سے وفاق کی نوعیت پر کوئی اثر پڑتا ہے۔ اس لئے کہ وفاق کی تشکیل کے بعد ایسے اجزا کا موجود ہونا ضروری ہے جو بعض امور میں ایسے اختیارات رکھتے ہوں جن میں مرکزی حکومت باختیار خود مداخلت نہ کر سکے، اور اس طرح ان کی انفرادی حیثیت قائم ہو، اور اُن سے مل کر ایک ایسی ریاست بنے جس کے اختیارات چند دیگر امور میں ان تمام اجزا کی تمام وسعت میں تسلیم کئے جائیں اور جن سے قانوناً سرتابی ممکن نہ ہو۔ اتحاد جزوی میں شریک ہونے والی ریاستیں مشترک ادارو کے احکام سے قانوناً منحرف ہو سکتی ہیں، اُن کی حیثیت شخصی حلیف کی ہوتی ہے اور وہ معاہدہ کو منقطع کر سکتی ہیں، اس کے علاوہ اتحاد جزوی میں مشترک مقاصد بہت محدود ہوتے ہیں، مثلاً کسٹمس[5] میں یگانگت یا فوجی اور دفاعی اتحاد، وفاق میں اس مشترک ادارہ کے اختیارات زیادہ وسیع ہوتے ہیں، عام طور پر کسٹمس،

[1] میرا عقیدہ ہے کہ ریاست ایک ادارہ ہے، لیکن یہاں اس کے فلسفہ پر بحث فضول ہے۔ [2] مسودہ قانون حکومت ہند جو برطانوی پارلیمنٹ کے سامنے پیش ہے۔ [3] قانون برطانوی شمالی امریکہ ۱۸۶۷ء۔ [4] تجویز مورخہ ۹ جون ۱۹۱۰ء منظور کردہ کیپ ہاوس آف اسمبلی۔ [5] CUSTOMS درآمد و برآمد پر محصول۔

امورِ خارجہ، دفاع، تجارتی معاہدے، وسائل آمد و رفت، ڈاک، تار، اور اکثر ایسے امور جو تمام وفاق سے متعلق ہوں مرکز کی سپرد ہوتے ہیں، اتحاد جزوی میں مرکزی ادارہ کو سیادت حاصل نہیں ہوتی، اور حلیفوں کو کامل سیادت حاصل ہوتی ہے، وفاق میں سیادت[1] اعلیٰ کا مسئلہ پیچیدہ ہے، لیکن یہ کہا جاسکتا ہے کہ مرکزی ادارہ کو، نیز مقامی اجزا کو ایسے حقوق حاصل ہوتے ہیں جنھیں سیادت کا جز وسمجھا جاسکتا ہو۔ یہاں یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ وحدانی[2] ریاستوں میں بھی صوبوں اور مقامی اداروں کو بعض اختیارات حاصل ہوتے ہیں، لیکن ان اختیارات کی وسعت خواہ کسی وفاق کے اجزا سے زیادہ ہو، تاہم ان کی نوعیت میں فرق نمایاں ہے، وفاق کے اجزا کو جو اختیارات حاصل ہوئے ہیں وہ اُن کا حق ہیں اور اُن میں تبدیلی اُن کی یا اُس اعلیٰ قوت کی مرضی کے بغیر نہیں ہوسکتی جو وفاق کی ضامن ہے، خواہ یہ اعلیٰ قوت قوم ہو، یا کوئی بیرونی طاقت، اس کے مقابلہ میں وحدانی حکومت کو اقتدار کلی حاصل ہوتا ہے، وہ اپنی مرضی کے مطابق ماتحت اجزاء کے اختیارات میں کمی اور اضافہ کرسکتی ہے، اور اسے یہ حق حاصل ہے کہ کسی اختیار کو کلیتہً سلب کرلے۔ حقیقت یہ ہے کہ وحدانی و وفاقی حکومتوں کا فرق قانونی ہے، اور اُسی حد تک راسخ ہے جہاں تک قانون کی دسترس ہے، اگر سیادت اعلیٰ وحقیقی کے نقطۂ نظر سے بحث کی جائے تو امتیازات مٹ جاتے ہیں، لیکن یہ دلیل درمیان میں لانی مفید نہیں ہے، اس لئے کہ اگرچہ سیادت حقیقی[3] تمام اداروں کی روح ورواں ہے اور انھیں بناتی یا بگاڑتی رہتی ہے، تاہم اُس کا اظہار چند محسوس اداروں کے ذریعہ سے ہوتا ہے، جن میں سب سے زیادہ اہم قانون ہے، اور اس لئے وفاقی و وحدانی حکومتوں میں امتیاز بہت اہم ہے، اس لئے کہ قانونِ اساسی کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، خواہ اس کی حقیقت کچھ ہی کیوں نہ ہو۔

سیادت حقیقی ناقابل تقسیم ہے، غیر محسوس ہے اور اس کا تعین دشوار ہے، لیکن سیادت قانونی[4]

---

[1] (SOVEREIGNTY)

[2] (UNITARY)

[3] REAL SOVEREIGNTY

[4] LEGAL SOVEREIGNTY

یعنی قانون بنانے کی قوت محسوس بھی ہے، متعین بھی ہے اور قابل تقسیم بھی ہے۔ لہذا وحدانی اور وفاقی حکومتوں کا فرق اس طرح واضح کرنا آسان ہوگا کہ وحدانی حکومتوں میں سیادت قانونی صرف مرکز کو حاصل ہوتی ہے اور وفاق میں مرکز اور اجزائے وفاق پر منقسم ہوتی ہے، خواہ دونوں کے حصوں میں کتنا ہی تفاوت ہو۔

اگرچہ وفاق اور وحدانی حکومت کا اساسی فرق وہی ہے جو مندرجہ بالا سطور میں مذکور ہے، تاہم دنیا کی تمام وفاقی حکومتوں میں چند خصوصیات ہوتی ہیں جن کا تذکرہ ضروری ہے۔

پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وفاق میں آئین اساسی[۱] کو بہت اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ بعض ممالک اب بھی ایسے ہیں جن میں آئین اساسی تحریر کیا ہوا نہیں ہے، بلکہ اُس کی بنیاد بعض روایات پر قائم ہے، ان میں چند روایات ایسی ہیں جو تمام قانون کی بنیاد بن گئیں ہیں، مثلاً انگلستان میں آئین اساسی کسی جگہ لکھا ہوا نہیں ہے، تمام کام روایات سے چلتا ہے، صرف قانونی روایت یہ بن گئی ہے کہ پارلیمنٹ کو تمام اختیارات حاصل ہیں، چنانچہ مشہور مقولہ ہے کہ "پارلیمنٹ[۲] عورت کو مرد اور مرد کو عورت بنانے کے علاوہ تمام کام کرسکتی ہے" پارلیمنٹ کو خود اپنے حقوق بڑھانے اور گھٹانے کا حق حاصل ہے، اپنی ترکیب میں تبدیلیاں کرسکتی ہے، اور وہ جو قانون بھی منظور کرلے، قانوناً اس میں چون وچرا کی گنجائش نہیں ہوسکتی۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ پارلیمنٹ میں بادشاہ بھی شامل ہے، اس لئے کہ بادشاہ کی منظوری تمام قوانین کو رائج کرنے کے لئے ضروری ہے۔ اس قسم کے آئین کے مقابلہ میں تحریری آئین ہوتے ہیں، تاکہ وہ تمام امور جو آئین اساسی کا جزو ہیں قلمبند ہوجائیں اور پھر اُن کے متعلق چون وچرا کی گنجائش نہ رہے۔ دنیا کے اکثر ممالک میں اب تحریری آئین کا رواج ہے۔

آئین اساسی کی صرف اسی نہج پر تقسیم نہیں ہوتی، بلکہ ایک اور صورت بھی ہے وہ یہ کہ آئین اساسی میں تبدیلی کیونکر ہوسکتی ہے۔ اگر آئین اساسی میں تبدیلی کا وہی طریقہ ہو جو کسی معمولی قانون بنانے کا ہوتا ہو تو ایسے آئین اساسی کو ترمیم[۳] پذیر کہیں گے اور اگر اس میں تبدیلی کسی خاص طریقہ سے ہی ہوسکتی ہے جو

---

[۱] CONSTITUTION [۲] DE LLOME [۳] FLEXIBLE

معمولی قانون بنانے کے لئے استعمال نہیں ہوتا تو اسے استوار[1] کہیں گے ظاہر ہے کہ استوار سے استوار آئین بھی ایسا نہیں ہو سکتا جس میں ترمیم نہ ہو سکتی ہو، لیکن فرق صرف طریقہ کا ہے۔ اگرچہ استوار آئین کو بھی بدلنے کا طریقہ آسان ہو سکتا ہے، لیکن بالعموم طریقہ اس طرح وضع کیا جاتا ہے کہ آئین اساسی کی تبدیلی کسی فوری جذبہ کے ماتحت عجلت میں نہ ہو سکے۔

وفاق کا آئین مختلف ریاستوں میں سمجھوتہ کا نتیجہ ہوتا ہے، وہ اپنی سیادت قربان کرتی ہیں اُن کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ اُن امور کے علاوہ جن کا مرکزی حکومت کے اختیار میں ہونا ناگزیر ہے اُن کے اختیارات قائم رہیں اور ان اختیارات کو اُن کی مرضی کے خلاف کسی عام جوش کے ماتحت نہ چھینا جائے، لہٰذا وفاقی حکومتوں کا آئین بالعموم تحریری بھی ہوتا ہے اور اُستوار بھی، ممکن ہے کہ آیندہ چل کر اختیارات کے متعلق جھگڑا ہو، ایسے موقع پر تحریری دستاویز میں شک وشبہ کو کم دخل ہوتا ہے ان ہی وجوہ کی بنا پر وفاقی حکومتوں میں آئین اساسی کو ایک مقدس میثاق کا درجہ حاصل ہوتا ہے، جس میں ترمیم عجلت کے ساتھ نہیں ہو سکتی اور جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اگر وفاق ایک وحدانی ریاست کو تقسیم کرنے کے بعد وجود میں آیا ہے تو بھی تحریری و استوار آئین کی ضرورت باقی رہتی ہے اس لئے کہ وحدانی حکومت کو توڑ کر وفاق اُسی حالت میں قائم کیا جاتا ہے جب ملک میں ایسے اجزا موجود ہوں جو جداگانہ اختیارات چاہتے ہوں اور اُنھیں قائم رکھنا مقصود ہو۔

اس کے علاوہ وفاق میں عدالت[2] کو ایک خاص درجہ حاصل ہوتا ہے حقیقت یہ ہے کہ وفاقی حکومت کے لئے آزاد عدالت کا وجود ناگزیر ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اگر ملک میں بیک وقت دو حکومتیں قائم ہیں اور ہر شہری دونوں کا ماتحت ہے تو بعض اوقات مشکلات کا پیش آنا ممکن ہے۔ ممکن ہے کہ کسی معاملہ کے متعلق مقامی و قومی حکومتوں میں اس امر پر نزاع ہو جائے کہ وہ کس کے ماتحت ہے؟ ممکن ہے کہ مرکزی یا مقامی مجلس آئین ساز ایسا قانون مرتب کرے جو دوسرے کے حقوق میں دست اندازی کرتا ہو۔

---

[1] (RIGID)　　[2] (JUDICIARY)

ان حالات میں ایک ایسے آزاد ادارہ کی ضرورت ہے جو متنازعہ فیہ امور کا قانونی فیصلہ کرسکے۔ یہی سبب ہے کہ وفاقی حکومتوں میں عدالت کو ایک سیاسی اہمیت حاصل ہوتی ہے، عدالت وفاقی حکومتوں میں آئین کی پاسبان ہے، اُس کی دیانت اور آزادی پر حقوق و فرائض کی تفویض کا دارومدار ہے۔ لہذا اُسے تمام سیاسی اثرات سے آزاد رکھا جاتا ہے اور اُس پر کسی قسم کی پابندی عائد نہیں ہوتی۔ جب تک ایک طاقتور عدالت قائم نہ ہو، وفاق کا وجود خطرہ میں رہتا ہے۔

تیسری خصوصیت مرکزی حکومت کی تشکیل سے متعلق ہے۔ عام طور پر مجالس آئین ساز کے دو ایوان ہوتے ہیں، ایک میں براہ راست[1] نمایندگی سے قوم کے نمایندے منتخب ہوتے ہیں جو آبادی کے لحاظ سے منتخب کئے جاتے ہیں، دوسرے ایوان میں ریاستوں یا صوبوں کے نمایندے ہوتے ہیں۔

وفاق میں سب سے زیادہ اہم مسئلہ تقسیم اختیارات کا ہے۔ اس لئے کہ ہر وفاق میں شہریوں کو دو حکومتوں کے ماتحت رہنا پڑتا ہے، ایک تو مقامی حکومت اور دوسری مرکزی حکومت، اس لئے ضروری ہوتا ہے کہ دونوں حکومتوں کے اختیارات کو قانوناً بالکل واضح کردیا جائے۔ عام طور پر ان کا تذکرہ آئین اساسی میں ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ بعض اختیارات کی ایسی نوعیت ہے کہ وہ صرف مرکزی حکومت ہی کی سپرد ہوسکتے ہیں ورنہ وفاق بیکار رہے، ان میں سے بعض کا ذکر غیر مناسب نہ ہوگا۔

(۱) امور خارجہ تمام بین الاقوامی معاملات میں وفاق کی حیثیت ایک ریاست کی ہوتی ہے، لہذا یہ ممکن نہیں ہے کہ ہر جزوی[2] ریاست اپنے خارجی امور کو علیحدہ علیحدہ طے کرے۔ تاریخ میں کوئی ایسی

---

[1] یہاں براہ راست نمایندگی سے یہ مراد ہے کہ قوم نمایندوں کو بلا واسطہ منتخب کرتی ہے۔ اس میں ایوان انتخاب ELECTORAL COLLEGE کے طریقہ کو بھی شامل سمجھنا چاہیئے اس لئے کہ عملاً اس طریقہ سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ وہ قوم کے نمایندے ہوتے ہیں اداروں کے نہیں [2] جزوی ریاست کی اصطلاح اس مضمون میں اُن ریاستوں کے لئے استعمال ہوئی ہے جن سے وفاق مرتب ہوا ہے۔

شامل نہیں ہے کہ وفاق کی ریاستیں خارجی امور میں آزاد ہوں۔ اگر وفاق کلی نہ ہو، بلکہ جزوی ہو، تو بھی متحدہ طریق کار کے لئے ضروری ہے کہ اُس کی خارجی حکمت عملی میں اختلاف و انتشار پیدا نہ ہو۔ اس لئے امور خارجہ ہمیشہ مرکزی حکومت کی سپرد ہوتے ہیں۔

(۲) امور خارجہ سے ملحق مسئلہ دفاع کا ہے۔ لہٰذا بحری بری اور ہوائی افواج پر وفاق کو اختیار حاصل ہوتا ہے۔ اس کے بغیر نہ یہ ممکن ہے کہ مرکزی حکومت بین الاقوامی امور میں اختیار و اقتدار کے ساتھ نمائندگی کرے، نہ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ جزوی ریاستوں پر اپنا اقتدار قائم رکھے۔ حقیقت یہ ہے کہ وفاق کی ہستی ہی اس طرح قائم رہ سکتی ہے کہ مرکزی حکومت افواج پر قادر ہو اور جزوی ریاستوں کو بغاوت سے روکتی ہو اور غیر ممالک سے اگر جنگ کا موقع ہو تو پوری قوت کے ساتھ اُس میں شریک ہو سکے۔

(۳) ایسی خدمات جن کا تمام ملک سے تعلق ہے، مثلاً ڈاک، تار، ٹیلفون وغیرہ۔ ان کو اگر جزوی ریاستوں یا صوبوں کے سپرد کر دیا جائے تو نظم و نسق میں دشواریاں پیدا ہوں گی اور کوئی فائدہ نہ ہو گا۔ اس کے علاوہ ان کے ذریعہ سے مرکزی حکومت کو آمدنی ہوتی ہے جو ضروری کاموں پر خرچ کی جا سکتی ہے۔

(۴) امور تجارت جو تمام ملک سے متعلق ہوں، تجارتی قوانین، سکّہ، اوزان کی یکسانیت سے اتحاد میں قوت پیدا ہوتی ہے اور تجارت میں آسانی، مفاد میں یگانگت قوم کے تمام اجزا کو ایک دوسرے سے قریب تر کر دیتی ہے۔ ایک بڑی ریاست منڈیوں کی تلاش، تجارتی مراعات کے حصول، تجارتی حقوق کے تحفظ، صنعت و حرفت کو ترقی دینے اور جدید وسائل پیدا کرنے میں ہمیشہ زیادہ کامیاب ہوتی ہے۔ اگر ان امور کو صوبوں یا جزوی ریاستوں پر چھوڑ دیا جائے تو یہ کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔

(۵) امور تجارت کے ضمن میں بنک، وسائل آمد و رفت، سڑکیں، ریلیں، بحری، بری اور ہوائی راستوں کی نگرانی۔ اجارے، وغیرہ بھی آتے ہیں۔ اس میں حقوق تصنیف، ایجاد وغیرہ کی حفاظت شامل ہے۔

(۶) غیر ملکیوں کے حقوق کا تعین، شہری بننے کے قواعد۔ اقلیتوں کی حفاظت، آبادی سے متعلق دوسرے امور بھی عام طور پر مرکزی حکومت کے سپرد ہوتے ہیں۔ اس میں مذہبی رواداری بھی

شامل ہے۔ یہ وہ امور ہیں جو عام طور پر مرکزی حکومت کی ماتحتی میں ہوتے ہیں، لیکن یہ فہرست مکمل نہیں ہے۔ نہ ہوسکتی ہے۔ اس لئے کہ ہر وفاق میں تقسیم کی تفصیلات میں فرق ہوتا ہے۔ یہاں پر چند ایسے امور کا ذکر کیا گیا ہے جو تمام وفاقوں میں مشترک ہیں۔ ادنیٰ تامل سے ظاہر ہو جائے گا کہ یہ امور ایسے ہیں جن کا وفاق کے تمام رقبہ سے تعلق ہے۔ جزوی ریاستوں اور صوبوں کے اختیارات کی فہرست بنانی بہت دشوار ہے، اس لئے کہ ان میں بہت تنوع ہوتا ہے۔ عام طور پر ایسے امور ان کی سپرد ہوتے ہیں جو مقامی طور پر ہی بہتر انجام پا سکتے ہیں۔ ان میں تنوع کا سبب مقامی حالات میں اختلاف اور تاریخی اثرات ہیں۔ اگر وفاق ایسی صورت میں مرتب ہوا کہ جزوی ریاستوں کو اپنے حقوق سے دستبرداری گراں گزرتی تھی تو انھوں نے زیادہ سے زیادہ حقوق جو حفاظت کے ساتھ اپنے پاس رکھے جا سکتے تھے اپنے لئے محفوظ کر لئے۔ اگر وفاق کسی اعلیٰ قوت نے مرتب کیا تو صوبوں اور جزوی ریاستوں کے حقوق کو کم کر دیا۔

حقوق کے تعین کے باوجود ایک حلقہ ایسا رہ جاتا ہے جو اس تعین کی دسترس سے باہر ہوتا ہے۔ انسان ہمیشہ ترقی کرتا رہتا ہے جس وقت وفاق مرتب ہوتا ہے اس وقت زندگی کے بہت سے شعبے ظہور پذیر نہیں ہوتے اور بعد میں نمایاں ہوتے ہیں، بہت سی صورتیں ایسی پیش آتی ہیں جو قانون وضع کرنے والوں کے ذہن میں نہیں تھیں، ان کو اختیارات باقیہ[1] کہتے ہیں۔ اکثر وفاق ان اختیارات کو جزوی ریاستوں یا صوبوں کے سپرد کر دیتے ہیں۔ بعض وفاق ایسے بھی ہیں جو انہیں مرکزی حکومت کی نگرانی میں رکھتے ہیں لیکن ان کی تعداد کم ہے۔ اگرچہ یہ ماننا پڑے گا کہ یہ دونوں صورتیں ایسی ہیں کہ ان سے مسئلہ کا خاطر خواہ تصفیہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ کون بتا سکتا ہے کہ آیندہ جو صورت پیش آئے گی اس کی کیا نوعیت ہوگی؟ لیکن اس کا علاج یہ ہے کہ اختیارات کی فہرست میں وقتاً فوقتاً ترمیم ہوتی رہے۔ بعض ممالک میں یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ مرکزی اور مقامی حکومتوں کو بعض متعین اور بعض غیر متعین امور میں یکساں اختیار دے دئے گئے ہیں، وہ اس امید پر کہ جب مناسب ہوگا آیندہ ظہور میں آتا رہے گا۔ اگر کوئی مسئلہ محض مقامی نوعیت رکھتا ہو

---

[1] (RESIDUARY POWERS)

تو مرکز اُس میں دست اندازی نہیں کرے گا اور اگر اُس کی مرکزی حیثیت ہوئی جس کا ملک سے تعلق ہے تو مرکز اُس کے متعلق قانون وضع کرے گا۔ اس صورت میں دستور اساسی میں مذکور ہوتا ہے کہ اگر کسی مسئلہ پر کوئی جزوی ریاست یا صوبہ کوئی قانون بنائے اور اُسی مسئلہ پر مرکز بھی کوئی قانون وضع کرے تو مرکزی قانون کو تفوق حاصل ہوگا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ صورت درپردہ تمام اختیاراتِ باقیہ مرکز کی سپرد کردیتی ہے۔

ایک زمانہ میں یہ تصور کیا جاتا تھا کہ وفاق کے لئے ناگزیر ہے کہ حکومت کے عاملہ[1] مقننہ[2] اور عدالت کے فرائض میں ایسی راسخ اور سخت تقسیم ہو کہ ایک دوسرے کے کام میں مخل نہ ہو سکیں، بظاہر یہ طریقہ ناگزیر اور مناسب معلوم ہوتا ہے، لیکن فی الحقیقت یہ صورت ممکن نہیں ہے، عاملہ کو ایسے احکام نافذ کرنے پڑتے ہیں جن کی حیثیت اس وقت قانون سے کم نہیں ہوتی۔ بسا اوقات بعض امور کا فیصلہ بھی کرنا پڑتا ہے جو عدالت کی خصوصیت ہے۔ پھر اگرچہ عاملہ خود قانون بنانے کا اختیار نہ رکھتا ہو لیکن مقننہ اس کی ہدایت اور مشورہ سے قانون سازی کا کام انجام دیتا ہے۔ مقننہ کے بعض قوانین وقتی امور کے لئے ہوتے ہیں اور عاملہ کے احکام سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے اور بعض اوقات عدالت کی حدود میں داخل ہو جاتے ہیں، عدالت تو ظاہر ہے کہ ہر وقت قانون بناتی رہتی ہے اور اس کی نظیریں اور قانون کی تفسیر ہر ملک کے قانون میں ایک بہت اہم مرتبہ رکھتی ہیں[3]۔ حقیقت یہ ہے کہ حکومت کے فرائض میں کلی تقسیم ممکن ہی نہیں ہے۔ مانٹسکو[4] کے اثر کے ماتحت ریاستہائے متحدہ امریکہ میں یہ تجربہ کیا گیا تھا۔ اگرچہ قانونی اعتبار سے یہ طریقہ اب تک قائم ہے لیکن عملی طور پر ٹوٹ چکا ہے، سیاسی جماعتوں کی قوت نے عاملہ اور مقننہ کی جدائی کو زائل کر دیا ہے۔ عدالت کی آزادی قائم ہے۔ لیکن یہ کہنا غلط ہوگا

---

[1] EXECUTIVE یعنی عمال حکومت جو قانون کو عملی جامہ پہناتے ہیں [2] LEGISLATURE (مجالس آئین ساز [3] JUDGE MADE LAW [4] MONTESQUIEU فرانسیسی فلسفی اور ماہر سیاسیات +

کہ اُس کی قوتِ مقننہ دوسرے ممالک سے ذرہ برابر بھی کم ہے۔

وفاق کی نوعیت کو سمجھنے کے لئے مفید ہوگا کہ اُن امور پر قدرے غور کیا جائے جو اس کے قیام میں معین ہوتے ہیں، اس لئے کہ ان سے اس کی ضرورت اور فائدہ کا بہتر اندازہ ہوسکے گا۔ وفاق کے قیام کو مندرجہ ذیل اسباب سے تقویت پہونچتی ہے۔

(۱) جزوی ریاستوں کا ایک دوسرے سے ملحق ہونا، اگر ریاستیں دور ہوں تو ان میں اتحاد پیدا ہونا دشوار ہوتا ہے۔ اگر سب کی اراضی ایک ہی سلسلہ میں ہو تو اتحاد و یگانگت کے جذبات اور مفاد کی یگانگت بہت جلد پیدا ہوجاتی ہے۔ نظم و نسق میں آسانی ہوتی ہے۔ جغرافیائی قربت سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ کسٹمس وسائل آمد و رفت و خبر رسانی، دفاع ہر چیز میں آسانی پیدا ہوتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ بعض اوقات جغرافیائی بُعد وفاق کے رستہ میں شدید مشکلات پیدا کردیتا ہے، مثلاً مسلمانوں کی ابتدائی سلطنت کے مختلف آزاد ریاستوں پر تقسیم ہوجانے کا سب سے بڑا سبب جغرافیائی بُعد تھا۔ سلطنت برطانیہ کی مختلف مستعمرات کا ایک وفاق میں شامل ہونا اسی وجہ سے دشوار معلوم ہوتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں اب تک جتنے وفاق قائم ہوئے ہیں ان میں یہ جغرافیائی قربت موجود رہی ہے۔

(۲) محض جغرافیائی قربت دو ریاستوں کو اس پر مشکل سے آمادہ کرسکتی ہے کہ وہ اپنی آزادی سے دستبردار ہوجائیں، جب تک کہ وفاق کی اور وجوہ بھی موجود نہ ہوں۔ ان میں سے سب سے زیادہ اہم دفاع کی ضرورت ہے۔ مثلاً ریاستہائے متحدہ امریکہ کو متحد ہونے پر جس چیز نے زیادہ راغب کیا وہ دفاع کا مسئلہ تھا۔ جزوی ریاستوں میں اتنی طاقت کہاں ہوتی ہے کہ وہ بڑی سلطنتوں کا مقابلہ کرسکیں۔ لیکن جب وہ مل کر وفاق بنالیتی ہیں تو ایک عظیم الشان سلطنت معرض ظہور میں آجاتی ہے جیسا کہ امریکہ میں ہوا یا کم از کم اُن کی طاقت میں بہت اضافہ ہوجاتا ہے جیسا کہ سوئٹزرلینڈ میں ہوا۔ ہندوستان میں دفاع کی بہتر صلاحیت ہوگی اگر وہ متحد رہے، اگر ہر صوبہ خود مختار ہوجائے تو ظاہر ہے کہ یہ صلاحیت باقی نہ رہے گی۔

(۳) دفاع کے برابر ہی اہم اقتصادی و معاشی فوائد ہیں، تجارت کے ذیل میں بعض فوائد بیان

ہو چکے ہیں، اگر جزوی ریاستیں علیحدہ علیحدہ رہیں تو سب کو محصول لینا پڑتا ہے لیکن اگر وہ متحد ہو جائیں تو ایک ہی جگہ محصول لیا جاتا ہے اور تجارت کو اس سے ترقی ہوتی ہے، اور بہت سے فوائد جو پہلے مذکور ہو چکے ہیں رونما ہوتے ہیں۔ بعض اوقات ایسا ہوا ہے کہ محض اقتصادی مفاد جزوی ریاستوں کو ملانے میں کامیاب ہوئے ہیں، جرمنی کی ریاستوں میں پہلے محاصل کے متعلق ہی اتحاد قایم ہوا تھا، یہ محسوس کیا جاتا ہے کہ مشرقی یورپ میں بہت سی ریاستوں کے قیام نے اقتصادی و معاشی زندگی کو نقصان پہونچایا ہے،

(۴) سیاسی مقاصد جس طرح ریاستوں کے متحد ہونے سے دفاع میں آسانی ہوتی ہے اسی طرح آبادی، رقبہ، آمدنی اور ذرائع کے جمع ہونے سے وفاق کے وقار میں اضافہ ہوتا ہے، بین الاقوامی امور میں اُس کی آواز کو وقعت حاصل ہوتی ہے، اور دوسری اقوام میں اُس کی عزت بڑھتی ہے۔ یہ صورت جزوی ریاستوں کو حاصل نہیں ہو سکتی۔

(۵) نسلی امتیازات کو وفاق کے قایم کرنے میں کافی اہمیت حاصل ہوتی ہے، مثلاً امریکہ کو اس وجہ سے آسانی ہوئی کہ اُس کی حکمراں قوم بیشتر ایک ہی نسل سے تعلق رکھتی تھی، ایک نسل کی آبادی کی روایات، مطمع نظر، طریق زندگی، جذبات اور خصوصیات میں یگانگت ہوتی ہے، لہٰذا اگرچہ جزوی ریاستوں میں ایک ہی نسل کی آبادی ہو تو وہ اتحاد و وفاق کی طرف زیادہ مائل ہوتی ہے۔

نسلی امتیاز بعض اوقات وحدانی مملکتوں کو وفاقی صورت اختیار کرنے پر مجبور کرتا ہے مثلاً کناڈا کی حکومت وحدانی تھی، وہاں کی آبادی میں اینگلو سیکسن نارڈک[۱] اور فرانسیسی لاطینی[۲] شامل تھے، ان میں بغض و عداوت کے جذبات موجود تھے، جن میں ہر روز ترقی ہوتی جاتی تھی، لہٰذا کناڈا کو فرانسیسی اور انگریزی صوبوں پر تقسیم کر کے وفاق قایم کر دینے سے یہ عداوت کم ہو گئی اور اب ان میں اتحاد کے جذبات ترقی پذیر ہیں۔ اسی طرح جنوبی افریقہ میں ولندیزی اور انگریز بیگانگی محسوس کرتے تھے، جسے وفاق

---

[۱] ANGLO SAXON NORDICS [۲] FRENCH LATINS

نے بہت کم کر دیا ہے اور نفاق کی جگہ اتحاد پیدا کر دیا ہے۔

(۶) زبان، ادب اور تمدن[1] نسل کا امتیاز اس قدر نمایاں چیز نہیں ہے، لیکن زبان کا فرق بہت اہم ہے۔ اگر دو آدمیوں کی زبان مختلف ہو تو اُن میں بیگانگی قائم رہتی ہے اور یگانگت کا پیدا ہونا مشکل ہے، اس لئے کہ یگانگت تو تبادلۂ خیالات و یکسانئ جذبات سے پیدا ہوتی ہے اور زبان کے امتیاز سے ان کا پیدا ہونا دشوار ہے۔ اس کے علاوہ ہر شخص کو اپنی زبان سے ایسی الفت ہوتی ہے کہ وہ اُسے چھوڑنے پر کبھی راضی نہیں ہوتا، اور زبان ہی پر کیا موقوف ہے؟ وہ لطیف چیز جسے تمدن کہتے ہیں ہر انسان کو عزیز ہوتی ہے اور ہر قوم کا تمدن دوسری قوم سے مختلف ہوتا ہے، ادب، فنون لطیفہ، علوم اور رجحانات سے تمدن پیدا ہوتا ہے۔ یہ تمدن ہر قوم کی عمر بھر کی کمائی ہے اور اُسے چھوڑنے پر کوئی قوم تیار نہیں ہو سکتی، اگر وہ تیار ہو جائے تو وہ خودکشی پر آمادہ ہے، لہذا زبان و تمدن کا اختلاف بھی وہی حکم رکھتا ہے جو نسلی اختلاف رکھتا ہے۔ یہی سبب ہو کہ جہاں کہیں بھی ایسی اقوام میں وفاق قائم ہوا جہاں مختلف قوموں کی مختلف زبانیں تھیں اور ان کے تمدن میں فرق تھا، وہاں تمام زبانوں کو تسلیم کیا گیا ہے اور انھیں یکساں درجہ دیا گیا ہے مثلاً سوئٹزرلینڈ میں جرمن، فرانسیسی اور اطالوی، کناڈا میں انگریزی و فرانسیسی، جنوبی افریقہ میں ولندیزی اور انگریزی سرکاری زبانیں ہیں۔

(۷) مذہب کی یگانگت سے وفاق کی تعمیر میں بہت مدد ملتی ہے۔ اور مذہب کا اختلاف جزوی ریاستوں کو متحد ہونے سے روکتا ہے۔ اگرچہ مذہب کو موجودہ سیاست میں وہ اہمیت حاصل نہیں ہے جو پہلے تھی، لیکن یہ تصور کرنا غلط ہو گا کہ مذہب کا اثر سیاست سے بالکل زائل ہو چکا ہے، مذہبی اختلاف اب بھی سیاسی اتحاد کے راستے میں حائل ہوتے ہیں، بالخصوص اگر مذہب کے ساتھ ساتھ نسلی، یا زبان و تمدن کی پیچیدگیاں پیدا ہو جائیں تو مشکلات میں اضافہ ہو جاتا ہے، وحدانی سلطنت میں یہ زیادہ نمایاں ہوتی ہیں، لیکن وفاق میں بھی اکثر جغرافیائی بُعد بھی شامل نہ ہو تو وقتوں میں کمی نہیں

---

[1] اس مضمون میں تمدن کو CULTURE کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔

واقع ہوتی ۔ مگر یہ ظاہر ہے کہ جہاں اس قسم کی دشواریاں ہوں وہاں وفاق سے ہی مسئلہ کسی حد تک حل ہوسکتا ہے ، بالخصوص اگر ان اختلافات کو جغرافیائی حدود میں مقید رکھنا ممکن ہو تو کامیابی کی زیادہ امید ہوسکتی ہے۔

(۸) بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کوئی سلطنت ایسی نوآبادیاں قائم کرے جو ایک دوسرے سے متحد نہ ہوں اور یکساں طور پر اُس سلطنت کی ماتحت ہوں ۔ اگر ان میں یہ احساس پیدا ہو جائے کہ سلطنت کا تفوق کم کرنا ضروری ہے تو اس کی مخالفت ان کو متحد کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے ، جیسا کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ میں ہوا۔

اختلافات و یگانگت کی مندرجہ بالا بحث سے معلوم ہوا ہوگا کہ جہاں کامل اتحاد دشوار ہو اور وحدانی سلطنت کا قیام یا وجود مشکل ہو ، وہاں وفاق سے دشواریاں دور ہونے کا امکان ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وفاق کی بنیاد اکثر اختلاف پر ہوتی ہے ، جہاں اتحاد میں فائدہ نظر آتا ہے لیکن اپنے وجود کو قربان کرنا ممکن نہیں ہوتا وہاں وفاق کا طریقہ کارگر ہوتا ہے ۔ لیکن تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ وفاق کے قیام کے بعد یگانگت کی طرف قدم تیزی سے بڑھتا ہے اور ساتھ رہنے اور مشترک مفاد کی حفاظت اور مشترک دشواریوں کو حل کرنے کی ساعی مختلف اجزا میں اعتماد و محبت پیدا کرتی ہے ، باہمی شبہات کا ازالہ ہوتا ہے اور رشتہ مؤدت مضبوط ہوتے ہوتے قوم کی ہستی و یگانگت کو ایک حقیقت بنا دیتا ہے ۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ کو ایک مرکز پر لانا آسان نہ تھا ، لیکن آج امریکن قوم کسی طرح بھی وفاق کو توڑنے پر راضی نہ ہوگی اور جزوی ریاستوں کے وجود سے امریکن قوم کے تصور میں کسی قسم کا فرق نہیں آتا۔ اس طرح سوئٹزرلینڈ میں مذہب ، زبان ، اور نسل کے امتیازات موجود ہیں لیکن وفاق نے تمام اجزا کو قومیت کے مضبوط رشتہ میں منسلک کر دیا ہے اور اب یہ رشتہ ٹوٹ نہیں سکتا۔ فرانسیسی بولنے والے سوئس فرانس کے تابع ہو کر رہنا پسند نہیں کریں گے ، نہ جرمن اور اطالوی اجزا جرمنی یا اطالیہ کے ماتحت رہنا پسند کریں گے ۔ اس وقت تک تو ایسا ہی ہوا ہے کہ وفاق نے بتدریج قومیت کے احساس کو ترقی دی ہے اور اُسے زیادہ مضبوط بنایا ہے ۔

وفاق پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ یہ طریق حکومت کمزور ہے۔ اختیارات کی تقسیم سے حکومت کو وہ مرکزیت وبرتری حاصل نہیں رہ سکتی۔ جو وحدانی مملکتوں میں حاصل ہوتی ہے۔ اور اس وجہ سے حکومت کمزور پڑجاتی ہے۔ اور موثر طریقہ پر کام نہیں کرسکتی۔ یہ الزام درست نہیں معلوم ہوتا۔ اس لئے کہ اگر اس الزام کا منشا یہ ہے کہ قومی وجود خطرہ میں ہوتا ہے اور وفاق کے ٹوٹنے اور جزوی ریاستوں کے آزاد ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے تو ظاہر ہے کہ ایسا اب تک نہیں ہوا ہے اور نہ وفاق میں ایسا ہونے کا وحدانی حکومت سے زیادہ امکان ہے، اس لئے کہ وہ طاقت جو مملکت کو تخریب سے بچاتی ہے وفاق میں بھی مرکزی حکومت کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ تخریب کا امکان وحدانی حکومت میں زیادہ ہے۔ اس لئے کہ وہاں اگر کسی فریق کو بے اطمینانی ہو تو اُسے رفع کرنا زیادہ دشوار ہے۔ وفاق میں اتنا دشوار نہیں ہے۔ اس کے مقابلہ میں اگر کمزوری کے یہ معنی ہیں کہ حکومت اپنے فرائض انجام دینے میں قاصر رہتی ہے تو یہ بھی غلط ہے اس لئے کہ ایسا تو کہیں نہیں ہوتا کہ تمام امور مرکزی حکومت ہی انجام دے۔ وحدانی حکومتیں بھی مقامی اداروں کو اختیارات تفویض کرتی ہیں۔ لہذا اختیارات کے تعین سے کمزوری کا پیدا ہونا قرین قیاس نہیں ہے+

پند نامہ شغلی دکھنی

اردو ادب کے بہت کچھ جواہر پارے انجمن ترقی اردو کی بدولت تباہی سے بچ گئے اور اکثر انمول موتی اب بھی ہماری توجہ کے محتاج ہیں، اسی سلسلہ کی ایک کڑی یہ پند نامہ ہے جس کے مصنف نے خود کو شغلی کہا ہے۔ شغلی کے متعلق اردو شعراء کے تمام تذکرے خاموش ہیں، دکھنی ادبیات کے ذخیرہ کے مطالعہ سے صرف چند اشعار ایسے ملتے ہیں جو شغلی کے بتائے جاتے ہیں، اس پند نامہ میں ۱۰۵ اشعار ہیں لہذا یہ شغلی کے کلام کا مستقل نمونہ کہا جاسکتا ہے، ان ۱۰۵ اشعار میں سے صرف ۱۰۳ ملتے ہیں۔ شاید دو شعر ضائع ہوگئے،

شغلی کے متعلق میں صرف اتنا عرض کرسکتا ہوں کہ وہ نصرتی کا ہمعصر تھا یا فوراً اس کے بعد پیدا ہوا، کیونکہ یہ پند نامہ نصرتی کی مشہور مثنوی گلشن عشق کے ساتھ ہی شامل ہے، گلشن عشق کا یہ قلمی نسخہ (جس کے لئے میں نواب حبیب الرحمٰن صاحب شروانی (صدر یار جنگ بہادر) کا مشکور ہوں) ۱۰۶۹ھ میں تصنیف ہوا اور ۱۱۶۹ھ میں اس کی کتابت ہوئی اس سے یہ امر یقینی ہے کہ یہ ۱۱۶۹ھ سے قبل کی تصنیف ہے لیکن صحیح تاریخ کا تعین یقین کے ساتھ نہیں کیا جاسکتا۔

یہ کسی فارسی پند نامہ کا ترجمہ معلوم ہوتا ہے جیسا کہ ان اشعار سے ظاہر ہے۔

سو اس وجہ تھی فارسی میں کتاب　　　سو شغلی دکھن سال؟ کیتا شتاب

سبب کیا جو کوئی معنی فارسی　　　نپاتا سو پاوے کیا آرسی

لیکن اس کے متعلق باوجود کوشش کے زیادہ معلومات نہ مل سکیں، اس سلسلہ میں پنجاب کے اکثر کتب خانے دیکھے، رامپور کے کتب خانہ میں بھی معلوم کیا، کتب خانہ آصفیہ، کتب خانہ جامعہ عثمانیہ، کتب خانہ دفتر دیوانی سرکار نظام میں بھی جستجو کی۔ ان مقامات میں آصفیہ سے تین غیر مطبوعہ قلمی تذکرے ملے ایک تذکرہ دفتر دیوانی سے ملا کسی فرصت میں انشاء اللہ ان پر بھی کچھ روشنی ڈالی جائے گی شغلی کے

متعلق میری کوششیں جاری ہیں، اگر میں نہ کر سکا تو ممکن ہے کہ یہ سعادت کسی دوسرے کے حصہ میں ہو۔

اس سلسلہ میں ایک "ذات" کا شکر یہ ضروری سمجھتا ہوں جس سے مجھے اپنے کام میں بہت کچھ مدد مل جاتی ہے، یہ غائبانہ شکریہ میرا فرض تھا، اس سے زیادہ کی اجازت نہیں مل سکی، بہر حال۔

ع حساب دوستاں در دل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پند نامہ

کہ یک دن محمد علیہ السلام — لیے اصحاب بیٹھے مدینہ تمام

تہاں یک شخص آ نبی کوں سلام — کیا ہور کہن لاگیا یوں کلام — ۱اس جگہ ۲کو ۳اور ۴کہنے لگا

جو میں آیا ہوں تمن قدم کن — کہ شہ مین تے نصیحت سکن — ۱آیا ۲تمھارے ۳پاس ۴سے ۵سیکھنے

تمیں منبع نصیحت کے دیو عقل — تو تس پر حکم میں کروں کا عمل — ۱تم ۲مجھے ۳یعنی ۴تس حکم پر میں عمل کروں گا

سو یو بات سن کر نبی یوں کہے — تیرا بول مقصود جہاں لگ اٹھے — ۱جس قدر ۲ہے

تو تب ویں اوا اصحاب کیتا سلام — نبی شوں ہوا پھر کے یوں ہم کلام — ۱کیا ۲سے

جو میرا ارادہ ہے یوں دل منے — جو طاعت کروں رب کی تل تلمنے — ۱میں ۲دل تل منے، گھڑی گھڑی، ہمیشہ

جو کرتا اچھوں بندگی میں سدا — کدھی بھی نہ طاعت سوں ہوؤں جدا — ۱رہوں ۲کسی وقت۔

کیا بات واصحاب اسدہات جب ۔ سوسنکر نبی یوں کہے بات تب ۔ ۱ اس طرح

جو اوّل ہو کے پاک وضو توں ساز ۔ جماعت سوں پنج وقت کرتوں نماز ۔ ۲ تو

اگر تیوا مر رب کا سر پر لیا ۔ گویا کے شب و روز طاعت کیا ۔ ۳ یہ

او اصحاب نے یو سنیا بات جب ۔ بھے دوسرا کیا سوال اسدھات جب ۔ ۴ ۔ ۵ دوسرا

جو میں ہو بھلا اس خلق میں رہوں ۔ کریں سب قبول بات جو میں کہوں

سو یو بات سن کر نبی یوں کہے ۔ اگرچہ خدا ترس ہو توں رہے

تو ہوے گا خلق دوست تیرا تمام ۔ انوں میں پھرے گا تو ہو کر امام ۔ ۶ سب

سو یو بات سنی تا چہ سیوم سوال ۔ کیا پھر واصحاب یوں عال حال

کشادہ ہووے دل جو منجہ تنگ ہے ۔ ہووے یوم سائل جو منجہ سنگ ہے ۔ ۷ ۸ ۹ میرا

سو اسو چہ او شخص کیتا بیان ۔ سو اس کے نبی نے کئے یوں نشان

جو کچھ بات بنج دل میں آوے اگر ۔ تونا بھول رب نوں سدا یاد کر

تو تب جا تیرا دل ہوئے گا کشاد ۔ ہے تس پر بہوت ہوئے گا شاد شاد

سو یو بات سن دیں واصحاب نے ۔ کیا سوال پھر دیں محمد کنے ۔ ۱۰ کے پاس

صدق یا محمد علیہ السلام ۔ بڑا ہے جو مقصود میرا تمام

جو میرا ارادہ اہے یو وصل ۔ رہوں ہو حضوری خدا کی اگل ۔ آگے

سو یو بات سنکر نبی نے شتاب ۔ دئے سوال کا اسکوں یوں کر جواب

ہے منگتا حضوری توں ہونی اگر ۔ تو قرآں تلاوت شب و روز کر

ہے یو سوال کیتا نبی کے سنگات ۔ کہ اے یا خدا کے رسول پاک ذات ۔ ۱۱ ساتھ

میں ڈرتا ہوں رب سوں بہوت کل آج ۔ سو یو بات کا ہے کہو کیا علاج ۔ ۱۲ بہت

نبی یوں کہے تب اسے بندہ خدا ۔ شب و روز کر یاد رب کوں سدا

ظاہر ہو۔ باطن خدا یاد کر ۔ تو ہووے گا تپ دوست مقبول تر

بہتے یو سوال نبی کے کیتا اگل ⸺ جو ہوؤں میں عاقل خلق سوں سگل ۱۔ آگے، سامنے ۲۔ سب ۳۔ بیر

نبی یوں کہے یاد کر موت کوں ⸺ تو عاقل ہووے گا ہمہ خلق سوں

کیا سوال پھر یوں نبی کے اگل ⸺ جو پاؤں میں ایمان بیسر اگل

سو یو بات سن کر نبی یوں کہن ⸺ لگے اس شخص کے نشاں یوں کرن

جو ہنس مکھ ہووے گا خلق سات جب ⸺ کرے گا سگل سوں میٹھی بات تب

تو تب تجکو ایمان ہووے گا تمام ⸺ کہ رحمت عطا ہووے گی صبح و شام

بہے یو سوال کیتا ہیں آگناہ ⸺ ہووے دن بدن کم لگوں نیک راہ ۱۔ کیا ۲۔ گناہ

نبی تب دئے اسکوں یوں کر جواب ⸺ جو تو بہ کیا کر سدا بے حساب

کیا سوال پھر یوں سوں اصحاب ⸺ جو مجکوں نہ ہووے قبر کا عذاب

سو اسکوں نبی جواب یوں کر دیتے ⸺ جو مسکیں غریباں فقیراں جتے ۱۔ جتنے، جس قدر۔

اہے سو اُنن پر تو ہو مہربان ⸺ نہ آزار دے اُن اُپر کر آسان ۱۔ اُن

تو تجکوں اُنن کی دعاسوں ثواب ⸺ ہووے گا نہو سے؟ قبر کا عذاب

کہیا او شخص پھر کے اے یا رسول ⸺ جو میری دعا ہوئے ہر دم قبول

دئے جواب یوں خاتم الانبیاء ⸺ جو تجکوں اہے جیو جننے دیا ۱۔ جان ۲۔ جس نے

سو اس پاس منگ توں دعا مستجاب ⸺ ہووے گا ہر کام تیرا شتاب ۱۔ مانگ

کیا سوال پھر کر او درحال دیں ⸺ جو ننگا رہوں تا قیامت کہ نئیں؟

جو سُن کر اُٹھے یوں محمد نے بول ⸺ جو توں مومناں کا نکو عیب کھول ۱۔ نہیں

کسی کا یہاں میل نا دھوے گا ⸺ قیامت کوں نا پھر ننگا ہوے گا

کیا سوال پھر یوں نبی کے اگل ⸺ قیامت نہ ہو جائے مجپر سگل ۱۔ دشوار

سبب کیا جو ہووے گا برا او وقت ⸺ سو او وقت سب پہ کہلے گا سخت ۱۔ بیتے گا۔ گذرے گا

تو اس وقت پر میں عرش کے تلار ⸺ رہوں چھاؤں تل کچھ نہ دیکھوں ازار ۱۔ تلے، نیچے ۲۔ تلے ۳۔ آزار

سو یو نقل جب او شخص نے کیا — سو تسکوں دئے جواب یوں نبیاد
اگر کوئی دو آپ میں کریں جنگ جدل — لڑے تو صلح کر خدا اسکے بدل
یوں کرتا رہے گا صلح تو سدا — تو تج عرش تل چھاؤں دیگا خدا
نبی کی زبانی سنیا بات یوں — بہے پھر سوال کیتا نبی سات یوں
جو اعمال نامہ سفید دھائے کر — رہے داہنی[1] ہات مج آئے کر   [1] داہنا سیدھا
نبی نے دئے جواب اسد ہات سوں — جو مادر پدر کوں خوشی راکھ توں
تو تب جا او اعمال نامہ تجھ سکل — سیدھی ہات پر آ رہے گا سگل
کیا سوال پھر یوں وا اصحاب نے — نبی کے آن کے روبرو سامنے
جو دنیا سے ہووے میرا دل سرد — بہے تسپر ہمیشہ اچھوں[1] پر درد   [1] رہوں
نبی نے دئے جواب اسد ہات سوں — سدا دیکھتا اچھ گورستاں توں
تو تب دل دنیا سوں سرد ہویگا — بہوت موم دل پر درد ہوے گا
کیا سوال پھر کر جو مجکوں[1] اتال — جو ہونا شفاعت تمارا[2] کمال   [1] حاصل [2] تمہارا
دئے جواب یوں کر نبی پاک ذات — کہے یوں وا اصحاب کے سات بات
جو رانڈاں یتیماں، اسیراں، گدا — اہے سو انن پر رحم کر سوا
تو تب جا شفاعت تجھے ہوے گا — انن کا درد دکھ اگر کھوے گا
یو سنکر وا اصحاب نے سوال یوں — کیا پھر نبی سات در حال دوں
جو آئے روز محشر کوں دیدار میں؟ — خدا دیکھے کا امید وار میں
سو سن کر نبی جواب یوں کر دئے — نصیحت وا اصحاب کوں یو کئے
جو ہمسائیگاں پر کرم کی نظر — کیا کر توں احسان انن کے اپر
تو تب کیں قیامت کوں دیدار توں — دیکھے گا اگر ہے بڑا پکار تو
کیا سوال پھر یوں کہ اے پاک تن — کہ دونوں جہاں میں رہوں میرا من

دئے جواب یوں کر نبی نے بیاں
جو مت بول، قید کر توں زباں

اگر بد زبان تلوں۔ کیسے نا کہے
تو ہر دو جہاں میں امن تے رہے

کیا سوال پھر یوں کہ اے یا رسول
جو توبہ پڑے رب کینے منجھ قبول

۱۔ میری (مجھ)

نبی نے دئے جواب سدھات سات
کئے یوں وا صحاب کے سات بات

جو توں اپنے نفس پر قہر کر
ہمیشہ خدائے تعالیٰ سوں ڈر

نین میں انجو لیا کے روز ار زار
تو توبہ قبول تج کرے گا غفار

۱۔ آنکھ ۲۔ آنسو ۳۔ لاکر

کیا سوال پھر یوں کہ اے پاک تن
جو ہوئے نہ مرنے میں منجھ جاں کندن

نبی یوں کہے پھر وا صحاب سوں
جو جا پوچھ ہر ایک بیمار کوں

شریک ہووے گا درد میں توں آن کر
تو نا ہوے گی جان کندن تج اپر

نبی سوں ہوا پھر کے یوں ہم کلام
جو میرا ہوئے دوست عالم تمام

دئے جواب پھر یوں نبی تاجدار
جو بد کام سوں توں ہو پرہیز گار

کبھی نا بول توں جھوٹ نقصان ہے
عمل نیک کر کچھ کہ انسان ہے

تو تب کئیں خلق دوست ہوئیگا تمام
جو ان میں رہے گا تو ہو نیک نام

سو یو بات سن کر نبی کے اگل
کہن لاگیا یوں بیان کر سگل

جو مجکوں دیکھے غضب سوں خدا
رکھے اپنے رحم میں سب سدا

سو یو بات سن کر نبی یوں کہے
اگر غضب سوں رب کے ڈرتا ہے

تو طاعت عبادت کیا کر سدا
تجھے غضب نا کچھ کرے گا خدا

سو یو بات سن کر کیا دیں سلام
نبی سوں ہوا پھر کے یوں ہم کلام

جو میں آب کوثر کا پیتا رہوں
عمر ہوا بد لگ ہیں جیتا رہوں

۱۔ تلک۔ تک

کہے یوں محمد علیہ السلام
دے پیاسے کوں پانی بھوکے کوں طعام

تو تب آب کوثر کا ہووے گا عطا
عمر ہو بجئے گا سدا بے خطا

بہے بعد از نبی نے دئیے یوں جواب — کہ واللہ اعلم بالصواب

امت کوں محمد علیہ السلام — نصیحت کئے پند نامہ تمام

سو یو پند نامہ سنے تو ثواب — ہے اتنا جو ہوئے نکوئی[1] عذاب

اگر کوئی دیکھے اسے بھر نظر — تو گویا نبی کوں[2] او دیکھا بشر

اگر کوئی اسکوں پڑے گا تمام — کہ دوزخ کی ہے آنچ اسکوں حرام

اگر کوئی اس پر کرے گا عمل — سو او ہوئے گا خاص بندہ اجل

سو اس وجہ تھی فارسی ہیں کتاب — سو شغلی دکھن سال کیتا شتاب

سبب کیا جو کوئی معنی فارسی — نپاتا سو پا دے کیا آرسی[1]

ہوئے ایک سو پانچ بیتاں تمام — زصدق محمد علیہ السلام

[1] نہ کوئی
[2] وہ
[1] صاف۔ ظاہر

محکومیتِ نسواں

عورتوں کے ساتھ مساوات کے سوال میں ایک بات اور مضمر ہے جس کا میں آسانی کے ساتھ دوسروں کو قائل کرسکتا ہوں۔ میرا قول یہ ہے کہ چونکہ دنیا میں لوگ عورت کو خانگی فضا میں قید رکھنا چاہتے ہیں اسی لئے اُن کو زندگی کے کسی شعبہ میں قدم رکھنے نہیں دیتے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو اس زمانہ میں جبکہ سیاسی خیالات اس قدر اشاعت پا رہے ہیں اور معاشیات کا چرچا جزو سیاست ہو رہا ہے، شاید ہی کوئی ایسا ہوتا جو دنیا کی نصف آبادی کو اکثر اقسام کی پیشہ وری اور تقریباً تمامی اعلیٰ معاشرتی فائدوں سے محروم رکھنا گوارا کرتا، اور یہ جائز رکھتا کہ جو کاروبار احمق سے احمق یا ادنیٰ سے ادنیٰ مرد کے لئے ہنر ہو سکتا ہے وہ لایق سے لائق عورت کے لئے عیب قرار دیا جائے، اور مرد کے لئے صرف اس لئے مخصوص کر دیا جائے تاکہ وہ عورت کا حاکم بنا رہے۔ دو صدی پیشتر تو عورت کی نا اہلیت ثابت کرنے کے لئے صرف یہ کہہ دینا کافی سمجھا جاتا تھا کہ وہ ہمیشہ سے نا اہل مانی جاتی رہی ہے، کیونکہ اُس وقت تک یہ بات بھی پیش نہیں کی گئی تھی کہ عورت کا ذہن مرد کے ذہن کے برابر نہیں ہے۔ اب بالآخر یہ حیلہ پیدا کیا گیا ہے کہ عورت کو مرد کے برابر درجہ دینا سوسائٹی کے مفاد کے خلاف ہے۔ (یا یوں کہئے کہ مرد کے مفاد کے خلاف ہے!) اور یہ بالکل وہی صورت ہے جیسے حکومت کے بے پایاں اختیارات کے خلاف جب کوئی آواز بلند کی جاتی ہے تو اقتدار پسند اور حکومت پرست لوگ کہہ دیتے ہیں کہ ایسی تحریک مفاد سلطنت اور سیاسی مصلحت کے خلاف ہے اور اس طرح حکومت والوں کے لئے شدید سے شدید افعال و اعمال بھی جائز ہو جاتے ہیں۔ یہ زمانہ تو وہ ہے کہ قوت جہاں کہیں کام کرتی ہے میٹھی چھری بن کر کام کرتی ہے۔ اور جب کبھی انداز ظلم اختیار کرتی ہے تو یہی پکارتی جاتی ہے کہ میں انصاف اور بہبودی کی دیوی ہوں۔ عورت کے لئے جب کوئی چیز حرام قرار دی جاتی ہے تو کہا بھی جاتا ہے کہ اس چیز کو اُس کے لئے جائز کرنا خود اُس کی زندگی تباہ کرنا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جو لوگ اس طرز تقریر کے عادی ہیں وہ تجربہ کی روشنی

میں کوئی استدلال پیش کریں۔ اگر یہی بات ہے کہ عورتیں فی الجملہ مردوں کے مقابلہ میں ہر کام کے لئے نااہل ثابت ہوئی ہیں تو آیندہ بھی جب مرد کے بالمقابل آئیں گی ناکام رہیں گی۔ اور جس شعبہ زندگی میں ناکام رہیں گی اُس میں قدرتاً اُن کی تعداد از خود کم ہو جائے گی۔ اس میں سوسائٹی کا کچھ نقصان نہیں ہے۔ اور تجربہ کی رو سے یہ ماننا ہوگا کہ احمق سے احمق اور کمزور سے کمزور مرد ذی فہم اور توانا عورت کے مقابلہ میں سوسائٹی کے مفاد کے لحاظ سے فی الجملہ قابل ترجیح نہیں مانا جاسکتا۔ مقابلہ ہی وہ چیز ہے جس میں اہل اور نااہل کی تمیز بر نقطۂ نظر سے ہو سکتی ہے۔ جو لوگ عورتوں کی مخالفت کرنے پر تلے ہوئے ہیں اُن کو بھی اس زمانہ میں ماننا پڑے گا کہ خاص کر آج کل عورتوں نے جو بھی کام انجام دئے ہیں اُن میں واقعی وہ مردوں سے کسی طرح کم نہیں رہیں۔ گو یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ بعض کاموں میں وہ ماہرین کا مقابلہ نہیں کرسکتیں لیکن ان کی یہ کمی بالعموم کسی ذہنی کمزوری کی وجہ سے نہ تھی۔ یہ بات دوسری ہے کہ اُنھیں وہ آسانیاں نہ حاصل ہوئی ہوں جو مردوں کے لئے عام طور پر موجود ہیں۔ کیا یہ ظلم نہیں؟ اور کیا خود یہی امر سوسائٹی کے مفاد کے خلاف نہیں کہ عورتوں کو مردوں کے مدمقابل بن کر میدان عمل میں آنے سے طرح طرح سے روکا جاتا ہے؟ کیا یہ واقعہ نہیں کہ بہت سے ناکارہ مرد دنیا میں اس وجہ سے منتخب ہو گئے ہیں کہ اُن سے بہتر عورتیں اُن کے مقابلہ میں نہیں آنے دی گئیں؟ سوسائٹی کا کیا اسی میں فائدہ ہے کہ لائق اور نالائق میں تمیز نہ کی جائے؟ کیا منصفانہ مقابلہ اسی کا نام ہے؟ کیا اعلیٰ ذمہ داریوں کو اپنے سر پر لینے کے لئے دنیا میں اتنے مرد نکل آئے ہیں کہ لیاقت اور نالائقی کا سوال ہی دنیا سے ناپید ہو رہا ہے؟ کیا مردوں کی صلاحیت پر ہم کو اس قدر عقیدہ رکھنا زیبا ہے کہ ہم اپنی نصف آبادی کو کار دنیا انجام دینے میں بالکل فراموش کر دیں اگرچہ اُس نصف آبادی سے ہم کو لایق سے لائق افراد کے ملنے کی توقع ہو سکتی ہے؟ مقتضائے انصاف کیا ہے اور منفعت خلق کا امکان کس صورت میں زیادہ ہے؟ میں تو کہتا ہوں کہ کسی گروہ پر یہ پابندیاں عاید کرنا کہ اُس کے افراد مثلاً طبیب نہ بن سکیں یا وکالت نہ کرسکیں یا قانون سازوں میں شامل نہ کئے جائیں یہ فقط اُن ہی کے ساتھ ناانصافی نہیں بلکہ اُن لوگوں کی بھی حق تلفی ہے جنھیں اطبا یا وکیلوں کی ضرورت ہے اور قانون ساز جماعتوں کے لئے اپنے نائب منتخب کرنا ہیں۔ مقابلہ کو کسی خاص گروہ کے لئے مخصوص

کرنا مقابلہ کے فوائد سے دنیا کو ایک حد تک محروم کرنے کے مرادف ہے۔

عورتوں کا حق انتخاب ورائے دھندگی

اپنے استدلال کے ضمن میں میں جزئیات کو صرف اس حد تک شامل کرنا چاہتا ہوں کہ عورت کے سیاسی حقوق کے تعین میں مدد ملے۔ کیونکہ جب ان حقوق پر روشنی ڈالی جائے گی تو زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی عورتوں کی صلاحیت اور استعداد کا کچھ نہ کچھ اندازہ پہلی ہی نظر میں آسانی سے ہو سکے گا۔ ان حقوق سے میری مراد عورتوں کے حقوق رائے دہندگی سے ہے جو میونسپلٹی یا پارلیمنٹ کے امیدواروں کو منتخب کرنے میں اب تک عورتوں کو حاصل نہیں ہوئے ہیں۔ عورتیں دو طرح سے ان انتخابات میں حصہ لے سکتی ہیں۔ ایک تو خود اس انتخاب میں بطور امیدوار کے مقابلہ کے لئے کھڑی ہو کر اور دوسرے مقابلہ کرنے والوں میں سے کسی امیدوار کے حق میں رائے دے کر ان دونوں صورتوں میں بڑا فرق ہے۔ اپنے لئے اپنے حکمرانوں کے منتخب کرنے کا حق سیاسی دنیا میں ابھی تک صرف مردوں کو حاصل ہے۔ لیکن اصولاً قانون نے اس حق کو عورت کے لئے یوں تسلیم کر رکھا ہے کہ اُسے اپنے دنیاوی آقا یعنے شوہر کے انتخاب کی کامل آزادی دے دی ہے۔ اور قانونی زبان میں کم از کم کہا یونہی جاتا ہے کہ عورت اپنا بر ڈھونڈھنے کے لئے بالکل آزاد ہے۔ یہ انتخاب درحقیقت اُس شریک زندگی کا انتخاب ہے جو زندگی بھر اُس کا حکمراں بنا رہے گا۔ اب جن شرایط اور قیود کے ساتھ مردوں کو حق رائے دہندگی قانون نے عطا کیا ہے اُن شرائط اور قیود کے ماسوا کوئی پابندی اس حق کے بارے میں عورتوں کے لئے کسی طرح جائز نہ ہونا چاہئے جس طبقہ اور جس حیثیت کے مرد اس حق کے استعمال کے اہل ہیں اُسی طبقہ اور حیثیت کی عورتیں کیوں اس حق سے محروم قرار دی جاتی ہیں۔ اُن کو یہ حق اس لئے چاہئے کہ وہ اپنی سیاسی مساوات کی طرف سے مطمئن ہو جائیں۔ اس سے بہتر کوئی ضمانت اُن کے حقوق کی نہیں ہو سکتی۔ جو لوگ عورتوں کی آزادی کے باب میں مجھ سے اتفاق نہیں رکھتے اُنھیں کم از کم اس سیاسی مسئلہ میں میری تائید کرنا چاہئے۔ کیونکہ اگر عورت کو دائمی غلامی میں رکھنا ہے تب تو اور بھی ضرورت ہے کہ اُن کی حفاظت کی جائے تاکہ جس قدر اُن کو پسینا منظور ہے اُس سے زیادہ وہ نہ پسی جائیں۔ غلاموں کے لئے ان کے آقاؤں نے جو حفاظت کے طریقے قانون

ہیں مقرر کئے ہیں وہ ہمیں معلوم ہیں۔

اہلیت اور ذمہ داری اس مسئلہ پر کہ عورتیں کس قسم کے پیشہ کی اہلیت رکھتی ہیں، میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ یہ ایک عملی سوال ہے۔ جب کوئی عورت کسی کام یا منصب کے لئے اپنے کو پیش کرے گی تو میدان عمل میں اپنا امتحان خود دے گی۔ اگر وہ کامیاب ہوئی تو یہی اُس کی اہلیت کی دلیل ہے۔ خواہ وہ کسی پیشہ میں سر برآوردہ بننا چاہے یا کسی انتخاب میں کامیاب ہو لیکن نظام قانون بہر کیف وہ ہونا چاہئے جو نااہل کو ذمہ داری سے دور رکھے۔ جو قوانین عورتوں کے لئے ترقی کی راہ مسدود کرنے کے لئے بنائے گئے ہیں اگر اس اصول پر مبنی ہیں کہ قابل عورتیں صرف مستثنیات کے طور پر شمار میں آتی ہیں تو ان مستثنیات کے ساتھ ناانصافی کیونکر جائز ہوگی؟ میں تو کہتا ہوں کہ انہی مستثنیات سے یہ کلیہ باطل ہوتا ہے کہ عورتیں کسی لایق نہیں۔

عورتوں کی ذہنی کمزوری اب میں چاہتا ہوں کہ عورت اور مرد میں دماغی قوت اور ذہنی قابلیت کا جو فرق بتایا جاتا ہے اُس کی وجہ بتانے کی کوشش کروں۔ اس ضمن میں عورت کی جو کمزوری دکھائی جاتی ہے اُس سے مجھے فی الجملہ انکار نہیں۔ لیکن جن حالات میں عورتیں اب تک پرورش پاتی رہی ہیں اور اُن کی تعلیم سے جو بے توجہی برتی گئی ہے یہ اُس کا نتیجہ ہے کہ اکثر عورتیں ذہانت اور عالی دماغی میں اکثر مردوں سے کم ہیں۔ دونوں جنسوں کا یہ فرق کوئی فطری فرق نہیں نہ اُن کی ذہنیت اور سرشت کے متفرق ہونے کا نتیجہ ہے۔ عورت کو جس حال میں ہم پاتے ہیں اُس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ وہ اُس سے آگے ترقی نہیں کرسکتی محض غلط ہے۔ جو کچھ اب تک دنیا میں عورتوں نے کر دکھایا اُس سے تو یہ ضرور ثابت ہوا کہ وہ کس حد تک کس بات کی اہل تھیں۔ لیکن اب تک جو کام اُن سے لئے ہی نہیں گئے اور جن باتوں سے وہ برابر روکی جاتی رہی ہیں اگر ان میں وہ پوری نہیں اترتیں تو اُس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ وہ نااہل ہیں درست نہیں۔ یہ سمجھ لینا کہ چونکہ عورتوں میں کوئی بڑی شاعرہ یا فلسفہ داں وغیرہ کبھی نہیں ہوئی اس لئے آیندہ بھی پیدا نہیں ہوسکتی ایک لغو بات ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ مسئلہ ہنوز غور طلب ہے اور بحث کا محتاج ہے۔ لیکن اس میں کسی کو کیا کلام ہوسکتا ہے کہ ملکہ

الزبتھہ اورجون آف آرک صنف اناث سے تھیں جو ملک کے انتظام میں یا حریت پرستی میں اپنا اپنا نام کر گئیں۔ یہ تو تاریخی بات ہے جس میں خیال اور رائے کو دخل نہیں جس سیاست میں عورتوں نے اپنی قابلیت کا ثبوت دیا ہے اُسی سیاست میں وہ تمامتر نااہل اور حقوق سے محروم قرار دی جاتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ عورتوں کو شیکسپیر کے ایسے شاعرانہ مضامین قلمبند کرنے میں کوئی قانون حائل نہ تھا اور پھر بھی وہ شیکسپیر کے برابر شاعر اپنی صنف میں نہ پیدا کرسکیں۔ لیکن لایق غور تو یہ ہے کہ ملکہ الزبتھہ یا ملکہ وکٹوریہ کو تاج وتخت اگر ورثہ میں نہ ملا ہوتا تو ادنیٰ سے ادنیٰ سیاسی خدمت یا ذمہ داری کا اُن کے سپرد ہونا ہرگز نہ گوارا کیا گیا ہوتا۔ اور نہ اُن دونوں میں سے کسی کو اپنی بے مثل قابلیت کے ثابت کرنے کا موقعہ ملا ہوتا۔ بلکہ اُن کا شمار بھی دنیا کی دو نااہل، عورتوں میں کیا جاتا۔

عورت کی انتظامی قابلیت محض تجربہ ہی پر دارومدار ہو تو میں یہ کہوں گا کہ دنیا نے عورتوں کو اُسی چیز کی ذمہ داری سے محروم کر رکھا ہے جس کی صلاحیت اُن میں خاص کر موجود ہے۔ زندگی کے وہ شعبے جن میں کامیابی حاصل کرنے سے قانون نے بظاہر اُن کو کبھی نہیں روکا اُن کی جانب توجہ کرنے کے بجائے اُنھوں نے کسی نہ کسی وجہ سے ہمیشہ انتظامی معاملات میں زیادہ کامیابی حاصل کی۔ تاریخ کے صفحات شاہد ہیں کہ دنیا کے فرمان رواؤں میں مردوں کی تعداد عورتوں سے زیادہ ہے لیکن قابلیت سے حکمرانی کرنے والوں میں عورتوں کی تعداد نسبتاً بہت زیادہ ہے۔ ان میں سے بہت سی ایسی گذری ہیں جنھوں نے نہایت نازک وقت میں اپنے تاج وتخت کو سنبھالا۔ اور ایسے ایسے کارنمایاں کئے جو بالعموم عورتوں کی رواج پسندی اور توہم پرستی کے دیکھتے ہوئے اُن سے بہت بعید تھے۔ اُنھوں نے قابلیت کے ایسے جوہر دکھائے کہ اُن کی حکومت نہایت ضابطہ اور استحکام کے ساتھ قایم رہی اور اُن کے احکام ذہانت کا بہترین نتیجہ ثابت ہوئے۔ عورت نہ صرف ملکہ یا حکمراں کی حیثیت سے کامیاب ہوئی بلکہ جب کبھی اُس کو ولیہ یا متولیہ کا درجہ دیا گیا تو بھی اُس نے اپنی انتظامی قابلیت کے بے مثل جوہر دکھائے[1]۔ یہ امور اس قدر ناقابل انکار ہیں کہ عرصہ ہوا ایک مرتبہ ایک

---

[1] یہ صرف مغربی دنیا ہی میں نہیں بلکہ مشرق کو لیجئے مثلاً ہندوستان کی جن ہندو ریاستوں میں عمدہ نظام (بقیہ برصفحہ آیندہ)

صاحب جو اس حقیقت کی تردید کرنا چاہتے تھے بے ساختہ کہہ گئے کہ بادشاہ سے تو ملکہ ہی اچھی کیونکہ بادشاہ کی آڑ میں عورتیں حکومت کرتی ہیں لیکن ملکہ کی آڑ میں مرد"! میں جانتا ہوں کہ ایسے بے تکے مزاجیہ فقروں پر بحث کرنا ایک بیکار سی بات ہے۔ لیکن ایسی باتوں کا اثر لوگوں کی طبیعت پر ضرور پڑتا ہے۔ میرا دعویٰ یہ ہے کہ یہ غلط ہے کہ بادشاہوں کی آڑ میں عورتیں حکومت کرتی ہیں مستثنیات کی بات اور ہے لیکن کمزور فرمانرواؤں کی کمزوریاں فقط زن مریدی ہی کے باعث نہیں ہوتیں بلکہ خوشامد خورے مردوں کی خوشامد کا نتیجہ ہوا کرتی ہیں۔ زن مرید بادشاہوں سے اگرچہ زیادہ امیدیں وابستہ نہیں ہو سکتیں۔ لیکن اس کے خلاف مثالیں بھی موجود ہیں۔ اور اُن صورتوں پر خاص کر نظر کرنا چاہیئے جن میں بادشاہوں نے اپنے اختیارات کسی عورت کو تفویض کر دیئے ہوں۔ مثلاً چارلس ہشتم جو اپنے نامور باپ لوئی یازدہم کی وفات کے وقت نوعمر تھا مگر اُس نے باپ کی دور اندیشانہ وصیت کے

(بقیہ صفحہ سابقہ) حکومت جاری ہے ظلم وتعدی کے بغیر امن وامان قائم ہے زراعت ترقی پر ہے اور لوگ خوش حال ہیں اُن میں ۵۰ فی صدی آپ یہی پائیں گے کہ وہاں کوئی عورت برسر اقتدار ہے۔ یہ بات میرے لئے کچھ توقع کے خلاف تھی لیکن ہندو ریاستوں کی بابت میں نے یہ دفتری معلومات بہت وضاحت کے ساتھ حاصل کی ہے۔ ہندو عورت کو اصولاً بادشاہت نہیں دیتے لیکن ہوتا یہ ہے کہ بعض رؤسا اپنے جمود اور عیش پسندی کی وجہ سے عمر طبعی کو پہنچنے سے پہلے ہی اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُن کی گدی کسی نابالغ بچہ کو ملتی ہے اور نابالغ کی ماں عموماً اُس یتیم کی ولیہ کے طور پر عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لے لیتی ہے۔ چنانچہ جب اس صورت حال پر نظر کیجئے کہ ان عالی خاندان خواتین کو کبھی محل کے باہر کی ہوا بھی نہیں لگی ہے نہ اُنھیں بجز اپنے خاص عزیزوں کے دنیا کے کسی مرد سے دو بدو گفتگو کا موقع ملا ہے بلکہ وہ ان پڑھ ہوتی ہیں اور اگر لکھ پڑھ بھی سکتی ہیں تو اُن کی زبان میں وہ کتابیں نہیں ہوتیں جن کے ذریعہ سے وہ سیاسیات کو بطور علم کے حاصل کر سکیں تب حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی کہ ان دشواریوں کے باوجود ان کی قدرتی صلاحیت اُن کو انتظامی معاملات میں کس قدر جلد ماہر بنا دیتی ہے۔

(مصنف)

بموجب ایک مدت تک اپنی ماں کو سلطنت کا مختار بنائے رکھا ۔ فرانس کا ایک اور بادشاہ سنٹ لوئی تھا جو شارلِ میگنی کے بعد سب سے زبردست اور بہترین فرمانروا گذرا ہے۔ ایک عرصہ کے لئے اُس نے اپنی بہن کو تمامی اختیارات سلطنت دے رکھے تھے۔ یہ وہ فرمانروا ہیں جو اپنے اپنے زمانہ میں اپنے معاصرین میں سب سے بہتر حکمران خیال کئے جاتے تھے اور ان کے زمانہ کا ساز مانہ مشکل سے کسی ملک کو ملتا ہے۔ اسی طرح شہنشاہ چارلس پنجم کو لیجئے جو اپنے وقت کا سب سے بڑا مدبر مانا جاتا ہے۔ اُس کے دربار میں جتنے لائق و فائق لوگ تھے شاید ہی کسی فرماں روا نے جمع کئے ہوں۔ یہ وہ حکمراں تھا جس نے شاید کبھی ذاتی نفع کے آگے جذبات کی پروا نہیں کی۔ لیکن اسی شخص نے اپنے خاندان کی دو شہزادیوں کو یکے بعد دیگرے ولایت ندرلینڈ (ہالینڈ) کی گورنری پر مامور رکھا۔ یہانتک کہ اُس کے انتقال کے بعد ایک تیسری شہزادی وہاں پھر اسی عہدہ پر ممتاز ہوئی اور ان سے ایک (شہزادی مارگریٹ آف آسٹریا) تو اپنے زمانہ کی سب سے بڑی سیاست دان سمجھی جاتی تھی۔ یہاں پر ایک بات تو ختم ہوگئی۔ اب یہ قول لیجئے کہ عورتوں کے پردہ میں مرد حکمرانی کرتے ہیں تو فی الجملہ اس پر بھی وہی حجت صادق آتی ہے جو پہلی بات کے ضمن میں بیان کی گئی۔ اس قول کا بھی منشا گویا یہی ہے کہ عورتیں جب حکمراں بنتی ہیں تو اُن ہی لوگوں کے ذریعہ سے حکومت کرتی ہیں جو ان کی ذات کے لئے راحت رساں ہوتے ہیں۔ لیکن عورتوں کے بارہ میں ایسی مثالیں بہت شاذ ملیں گی۔ اس بارے میں سب سے زیادہ بے اصول ملکہ کیتھرین ثانیہ کہی جاسکتی ہے لیکن اُس کے زمانہ میں بھی شاذ ہی یہ صورت دیکھی گئی۔ اور اس عورت کی مثال میں بھی یہ بات نہیں پائی گئی کہ اس کی حکومت کی جو خوبیاں تھیں وہ کچھ مردوں کی کارگذاری کا نتیجہ کہی جاسکیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ کسی عورت کے راج میں انتظام حکومت اگر اچھا ہوتا ہے تو اس لئے کہ سارا انتظام لائق اور منتخب مردوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے تو میں یہ پوچھتا ہوں کہ اس حسن انتخاب کی داد کس کو دیجئے گا؟ پس عورت اگر بحیثیت حکمراں کے اپنی قابلیت کی بنا پر کامیاب ہوسکتی ہے تو میرے نزدیک وزارت کا عہدہ بھی اُس کے لئے نہایت موزوں ہوسکتا ہے، کیونکہ نہ صرف انتظامِ حکومت بلکہ حکّام کو منتخب کرنے کا

کام عموماً وزرا، بلکہ وزیر اعظم کے سپرد ہوا کرتا ہے۔ اور سلطنت کے مختلف صیغوں میں اچھے حکام کا تقرر ہی امورِ عامہ کی بہتری کی ضمانت ہوا کرتا ہے۔ یہ تو ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ آدمی کی سیرت جس قدر جلد عورت پہچان لیتی ہے مرد نہیں پہچانتا۔ مرد پر عورت کو یہ ایک ایسی فوقیت حاصل ہے کہ اُس کے حسنِ انتخاب کا یقین دلا سکتی ہے اور یہ وہ بات ہے کہ ملکی انتظام میں اس کا لحاظ سب باتوں سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ تاریخ اس قضیہ کو ثابت کر چکی ہے۔ لیکن یہ بھی تاریخ ہی سے ثابت ہے کہ جن عورتوں نے اپنے طرزِ حکومت کی خوبی میں نام پیدا کیا اور جن کا شمار با اقتدار فرمانرواؤں میں ہوا وہ وہی تھیں جو عنانِ حکومت واقعی اپنے ہی ہاتھ میں رکھتی تھیں اور اپنے عمائدین کے حُسنِ انتظام کی داد خود لیتی تھیں۔ اور اگر اُنہوں نے کسی کی اچھی صلاح پر کان دھرے اور عمل کیا تو یہ ثبوت اس بات کا ہو کہ خود ان کی رائے صائب تھی اور اچھی صلاح اور مشورہ کے مطابق قائم ہوا کرتی تھیں۔

اب یہ بالکل قرین عقل ہے کہ جو اہم ترین سیاسی امور کو انجام دینے کے لائق ہو سکتا ہو وہ بدرجہ اولیٰ چھوٹے چھوٹے سیاسی مسئلوں میں بھی دخل دینے کے لائق ہو سکتا ہے۔ کیا اس کی بھی کوئی وجہ سمجھ میں آ سکتی ہے کہ دنیا کے بادشاہوں کی مائیں اور بہنیں جب اپنے بیٹوں اور بھائیوں کے فرایض انجام دینے میں کامیاب ہوئی ہیں تو دنیا کے بڑے بڑے سیاسی لوگوں، باسلیقہ حاکموں، کمپنیوں کے کارکنوں وغیرہ کے گھرانوں کی عورتیں اپنے مردوں کا کام کرنے سے یکسر قاصر رہیں گی؟ اگر ایسا ہو بھی تو اُس کا اصلی سبب ظاہر ہے۔ وہ یہ کہ شاہی خاندانوں کو جو برتری عوام پر حاصل ہوتی ہے اُس کا مقتضا یہ بھی ہوا کرتا ہے کہ اُن میں مردوں اور عورتوں کی تعلیم و تربیت میں نسبتاً زیادہ فرق نہیں ہونے پاتا۔ بلکہ اُن میں عورتوں کو اکثر ان فرایض کے انجام دینے کا موقع ملا کرتا ہے۔ ان کو سیاست سے چنداں دور نہیں رکھا جاتا۔ کیونکہ نہ معلوم کونسا وقت آ جائے کہ اُنھیں اپنے خاندان کی کوئی سیاسی خدمت انجام دینا پڑے یا تختِ سلطنت پر متمکن ہونے کی دعوت دے دی جائے۔ اور غالباً یہی وہ طبقہ ہے جس میں زن و مرد میں کوئی تمیز نہیں کی جاتی اور یہی وجہ ہے کہ امورِ سلطنت میں کسی خاندان کی شہزادیاں شہزادوں سے کم نہیں ثابت ہوتیں

عورتوں میں کارپردازی کی صلاحیت

دنیا میں جو کچھ تجربہ بتاتا ہے وہ تو یہی ہے، اور یہی صورت اُن کی قایم رہے گی یا نہیں، یہ میں کچھ نہیں کہتا۔ البتہ یہ ضرور کہتا ہوں اور بار بار کہہ چکا ہوں کہ عورتیں جو کچھ اب ہیں یا ہوسکتی ہیں وہ محض اس لئے نہیں کہ ان کی فطرت میں کوئی خاص کمزوری ہے۔ اب تک تو فی الجملہ اُن کا وجود ایک غیر فطری فضا میں رہا ہے جس سے اُن کی ہر قسم کی باڑھ مرتی رہی۔ اور میرا خیال یہی ہے کہ اگر اُن پر (سوائے اُن پابندیوں کے جو معاشرت انسانی کے حالات کے لحاظ سے بالکل ناگزیر ہیں۔) پابندیاں عاید نہ ہوں تو جہاں تک عمل کا تعلق ہے فی الجملہ ان میں اور مردوں میں کوئی اہم فرق بالآخر نہ پایا جائے گا۔ میں آگے چل کر اس کا کچھ اور ثبوت بھی دوں گا، مگر میرے نزدیک یہ بھی کافی تیقن کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ ان کی افتاد طبع بہ نسبت مردوں کے زیادہ عاملانہ اور اُن میں کارپردازی زیادہ ہوتی ہے۔ یہ بات صرف روز مرہ کے تجربہ سے نہیں بلکہ تواریخ سے بھی ثابت ہوتی ہے۔ کسی ہوشیار عورت کی خصوصیات اور اُس کی دماغی قابلیت پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ ایسی سب عورتیں بہت کام کی اور بڑی کارپرداز ہوتی ہیں۔ عام لوگ جس چیز کو "عورتوں کا علم غیب" کہتے ہیں (یعنے کسی بات کا پہلے سے از خود معلوم کرلینا یا اندازہ سے پتہ لگا لینا) یہ اصل میں عورت کی حاضر دماغی اور قوت فیصلہ کی صحت کا نتیجہ ہوا کرتا ہے کیونکہ عورت کی نظر ہمیشہ سامنے کی باتوں پر نسبتاً زیادہ رہا کرتی ہے۔ دنیا میں کسی شخص نے سائنس کا کوئی کلیہ اس طریقہ پر تو کبھی نہ معلوم کرلیا۔ نہ کبھی کسی نے فرض شناسی اور دوراندیشی کا کوئی قضیہ اس طرح سے دریافت کیا۔ یہ تو وہ چیزیں ہیں جو آہستہ آہستہ عام تجربہ اور احتیاط کی بدولت انسان پر منکشف ہوتی ہیں۔ برخلاف اس کے عورتوں کا "علم غیب" صرف اُن تجربات کا نتیجہ ہوا کرتا ہے جو انھیں اپنی ذاتی نظر اور مطالعہ سے حاصل ہوتا ہے۔ اگر عورتوں کو دوسروں کے تجربوں سے اسی طرح بغیر روک ٹوک کے نفع پہنچنے لگے جیسے مردوں کو پہنچتا ہے تو اُن کی حاضر دماغی اور سامنے کی باتوں پر نظر رکھنے کی طینت اُن کو وہ فائدہ پہنچائے جو عموماً مردوں کو بھی میسر نہیں، اور یہ چیز اُن کو دنیائے عمل میں واقعی ممتاز کردے۔ مرد جن کی اس قدر تعلیم و تربیت ہورہی ہے امور حاضرہ پر نظر

رکھنے کے عادی نہیں ہیں ۔اُن کو ہمیشہ دور ہی کی سوجھا کرتی ہے اور سامنے کی چیزیں گویا دکھائی ہی نہیں دیتیں۔ ان کو ہر چیز اُس توقع کے رنگ میں رنگی ہوئی نظر آتی ہے جو اُنہیں اُن کے علم وتجربہ کی رو سے قایم ہوئی ہو۔ لیکن عورتیں اس کے بالکل برعکس ہیں۔ اگر وہ علم وتجربہ میں مردوں کے برابر ہوں تو پیش بینی میں وہ عموماً مردوں سے بازی لے جاتی ہیں۔ اور ان کی یہی صلاحیت ہے جو اُن سے بجائے دور و دراز کے نظریئے قائم کرانے کے اُنھیں عملی معاملات میں زیادہ کامیاب بنانی ہے۔ کلیات وضع کرنے میں (یعنے عام باتیں سوچنے میں) فکر کی قوت سے کام لینا پڑتا ہے۔ اور جزئیات پر کلیات کو منطبق کرنا (یعنے عام باتوں کو خاص خاص چیزوں کے مطابق کرکے دیکھنا) اور خاص موقعوں کو پہچاننا (یعنے موقع محل ہر بات کا دیکھنا) عمل کی صلاحیت پر دلالت کرتا ہے۔ یہ بات بحالات موجودہ عورتوں میں فی الجملہ زیادہ پائی جاتی ہے۔ چنانچہ مجھے یہ بھی تسلیم ہے کہ عمل اُسی وقت ٹھیک ہوتا ہے جب اصول (یعنے عام باتوں اور قاعدوں) پر صحیح رائے قائم ہو اور عورتوں کو نظر کی تیزی میں جو خصوصیت حاصل ہے اُسی کی وجہ سے وہ اکثر صرف ذاتی مشاہدہ پر جلد بازی کے ساتھ کوئی سرسری رائے قائم کرکے ایک کلیہ تراش لیا کرتی ہیں۔ اور اُسی جلد بازی کے ساتھ اُس پر عمل بھی کر بیٹھتی ہیں۔ گو اُن کا ذاتی مشاہدہ نسبتاً وسیع ہوا کرتا ہے مگر اُن کو اُس پر اکثر ضرورت سے زیادہ بھروسہ ہو جاتا ہے۔ اس کا صرف ایک ہی علاج ہے یعنے عام معلومات کا بڑھانا۔ عورتوں کی غلطیاں اُسی قسم کی ہوتی ہیں جیسے کسی عالم بے پیر سے سرزد ہوں۔ جس شخص کو اپنی تربیت تمامتر خود ہی کرنا پڑتی ہے اُسے اکثر وہ چیزیں نظر آجاتی ہیں جو ہوتی تو ہیں بالکل معمولی مگر بڑے بڑے فاضلوں کی نظر اُن پر نہیں پڑتی۔

عورت کی حقیقت پسندی عورت کا فطرتاً حاضر دماغ ہونا اور اصلیت اور واقعیت کی طرف عجلت کے ساتھ رجوع کرنے کی عادت یہ ایسی باتیں ہیں کہ بجائے خود ان سے غلطی میں پڑنے کا کافی اندیشہ ہو سکتا ہے۔ تاہم یہی وہ باتیں ہیں جن میں لوگ مدت سے مبتلا ہیں۔ جن لوگوں کو ہمیشہ دور کی سوجھا کرتی ہے اور جو منصوبے باندھنے کے عادی ہوتے ہیں وہ اکثر ایسی غلطیاں کرجاتے ہیں کہ گویا اُنھیں سامنے کی بات بھی نہیں سوجھتی۔ یہاں تک کہ کبھی تو وہ ایسی باتیں بگھارنے لگتے ہیں

کہ جن کی تردید روزمرہ کے واقعات سے کوئی بچہ بھی کردے۔ اور بعض اوقات ایسی پر کٹی اُڑاتے ہیں
کہ آدمی اُن کا منہ تکتا رہ جائے۔ یہ کوئی مبالغہ نہیں۔ نہ یہ فقط ادنیٰ دماغ کے لوگوں کا ذکر ہے۔ بلکہ
دنیا کے اُن بڑے بڑے فلسفیوں کی تصانیف میں اس قسم کی عجوبہ اور بے تکی باتیں مل سکتی ہیں جن کے
نظریئے فلسفیانہ تخیلات کا اعلیٰ ترین نمونہ سمجھے جاتے ہیں۔ غرض کہ بڑے بڑے وسیع النظر لوگوں کی
قوت متخیلہ سے کام لینے کے ساتھ ساتھ دنیا میں اگر اُن خواص انسانی سے بھی کام لیا جانے لگے
جو عورتوں میں اس طرح نمایاں طور پر پائے جاتے ہیں تو یہ علمی دنیا کے لئے کس قدر مفید ہو، اور
فلسفہ اور سائنس میں یگانگت کے آثار کتنی خوبی سے پیدا ہونے لگیں؟ اس نقطہ نظر سے تو فلسفی
لوگوں کو چاہیئے کہ اپنے تخیلات فطرت نسوانی کے واقعیت نگار قلم اصلاح کے آگے پیش کریں اور
اُس کی تنقیدی قوت سے فائدہ اُٹھائیں تاکہ اُن کی پرواز خیال حقیقت اور واقعیت کے دائرہ کے
باہر نہ ہونے پائے۔ عورت زیادہ تر باتوں کی طرف نہیں دوڑتی نہ زیادہ اصول اور قاعدوں کی پروا
کرتی ہے۔ اُس کا دماغ بہت سی چیزوں کو ایک ساتھ نہیں بلکہ ہر چیز کو الگ الگ مگر تیزی کے ساتھ
قبول کرتا ہے۔ پھر یہ کہ اُسے اس بات کا بڑا دھیان رہتا ہے کہ فلاں بات کا اثر کسی شخص پر فوراً کیا ہوگا
اُسے دوسروں کے فوری احساسات کی بڑی جستجو رہتی ہے جس سے وہ اپنے ہر فعل میں مدد
لینے کی کوشش کرتی ہے۔ یہی دو باتیں ہیں جن سے وہ ایسے اصول اور عام باتوں پر توجہ نہیں کرنا
چاہتی جن میں جزئیات کا لحاظ نہ رکھا گیا ہو۔ نہ ایسی باتوں سے اسے رغبت ہوتی ہے جن کا اثر بلا واسطہ
لوگوں کے جذبات اور احساسات پر نہ ہو اور جو محض تخیل یا فرضی امور پر مبنی ہوں، یعنے جن سے کسی
کو نہ نفع پہنچتا ہو نہ نقصان۔ چنانچہ عورتوں کی رائے متخیل مردوں کے خیالات کو واقعیت سے
متعلق کرنے میں اُسی حد تک مدد دے سکتی ہے جیسے مردوں کے خیالات عورت کی رائے کو وسعت
نظر پر مبنی کرتے ہیں۔ اور یہ بھی پیش نظر رہے کہ عورتوں کی باتیں جتنی گہری ہوتی ہیں اکثر مرد اُس گہرائی
کو پہنچ بھی نہیں سکتے۔

عورت کی صلاحیت عمل اور زود فہمی | دوسری بات جو عورتوں کو مردوں پر فوقیت دیتی ہے وہ عورتوں

کی عام زود فہمی ہے۔ جہاں تک عمل کا تعلق ہے یہ انسان کے لئے بہت بڑی خوبی ہے۔ جب کوئی کام آن پڑتا ہے تو یہی چیز کام آتی ہے کہ انسان اُسے انجام دینے کے لئے فوراً آمادہ ہو جائے اور جلد از جلد کام کا طریقہ طے کرے۔ جو شخص خیال آرائیوں کا عادی ہے اُسے تو سوچنے کا کافی موقع ملتا ہے اور اُس کو عجلت کا سوال پریشان نہیں کرتا۔ خواہ وقت نکل ہی کیوں نہ جائے لیکن وہ بغیر "اگر مگر" کے نہیں مانتا۔ علمی دنیا میں بھی ناکافی مواد کی بنا پر کسی نظریہ کا قایم کرلینا علمی ضروریات کے لئے جائز قرار دیا گیا ہے کیونکہ اکثر اس میں وقت بچ جاتا ہے اور نظریہ کی تصدیق بعد کو ہوتی رہتی ہے۔ چنانچہ جلد کسی نتیجہ پر پہنچنا یا عجلت میں رائے قائم کرلینا یہ لامحالہ کوئی عیب نہیں بلکہ یہ ایک کارآمد طریقہ کار بھی شمار ہو سکتا ہے کیا فلسفہ اور کیا سائنس، سب کہیں یہ طریقہ کسی نہ کسی حد تک رائج ہے۔ اور ارباب فلسفہ کے لئے اگر نہ ہو تو سائنس والوں کے لئے اکثر یہی طریقہ کارآمد ثابت ہوا ہے۔ کیونکہ اُن کا مطلب منفرد اشیاء اور جزئی واقعات عالم کا حل کرنا ہوتا ہے اور اُن کو زیادہ ضرورت رہتی ہے کہ ہر موقع پر عمل کا طریقہ جلد طے کریں اور اپنے خیال کو تیزی کے ساتھ دوڑائیں۔ ان کے یہاں "اگر مگر" کی اُتنی گنجائش نہیں جتنی فلسفہ والوں کے لئے ہوتی ہے۔ خیال کی تیزی میں ہی ان کی قوت متخیلہ صرف ہوا کرتی ہے۔ فلسفی خواہ جیسی بھی تنقید کرے لیکن عمل میں اُس کا قدم اُتنا تیز نہیں پڑتا۔ اور فی الجملہ یہی فرق مرد اور عورت کی سرشت میں ہے جو فلسفی اور سائنس والوں میں نظر آتا ہے۔ مرد تو سست روی کا اس قدر عادی ہو گیا ہے کہ جن کاموں میں مہارت رکھتا ہے انمیں بھی وہ کچھوے کی چال چلنا چاہتا ہے اور اسے خواہ مخواہ کوئی خوبی نہ سمجھنا چاہیئے۔

عورت کی تنگ مزاجی اور اُس کا اثر عمل پر

شاید یہ کہا جائے کہ عورت جیسی ذکی الحس ہے ویسی ہی تندخو بھی ہے۔ یہ بات اُس کی عام صلاحیت کارگزاری میں حائل خیال کی جائے گی۔ کیونکہ خانگی معاملات کے علاوہ اُس کی تنگ مزاجی نباہی نہیں جاسکتی۔ اور اس عیب کی وجہ سے نہ تو وہ کسی بات پر قائم رہتی ہے نہ موقع محل دیکھتی ہے۔ بلکہ اپنی برافروختگی میں عقل کے استعمال سے بھی معذور ہوتی ہے۔ اور بدیں وجہ اُس کو کسی سنجیدہ کاروبار کے لائق نہ سمجھنا چاہیئے۔ میرے خیال میں محرورالمزاجی کے یہ دورے جو عورتوں

ہیں دیکھے گئے ہیں وہ زیادہ تر اعصاب کی بے مصرف قوت کے سیلان کا نتیجہ ہوا کرتے ہیں۔ اگر ان کی قوت کسی معین مقصد کی جانب مرکوز ہوا کرے تو یہ کیفیت نہ پیدا ہو آپ نے غور کیا ہوگا کہ پرانے زمانہ میں جو بات بات پر عورتوں کو غش آجایا کرتے تھے اُس کا گویا اب رواج ہی اُٹھ گیا۔ کچھ بات یہ بھی ہے کہ اچھے گھرانوں میں عورتوں کی پرورش اس طرح ہوا کرتی ہے جیسے کسی شیشہ خانہ میں کوئی پودا پرورش کیا جائے۔ اُنھیں نہ تو صاف ہوا میسر آتی ہے نہ قدرتی حرارت جس سے ان کے قویٰ فطری طور پر نشو ونما پائیں نہ انھیں کسی جسمانی مشقت یا کاروبار کا موقع حاصل ہوتا ہے کہ ان کے اعصاب میں قدرتی حرکت پیدا ہو اور ان کا دل و دماغ قوی ہو اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اُن کے جذبات بس اشتعال کے منتظر رہا کرتے ہیں۔ پھر کیا تعجب ہے اگر انھیں دق نہیں ہو جاتی؟ اندرونی اور بیرونی اثرات سے اُن کے حواس اتنے برافروختہ رہتے ہیں کہ وہ مسلسل نہ کوئی کام کر سکتی ہیں نہ کسی خیال میں مستقل رہ سکتی ہیں۔ اُن عورتوں کو دیکھئے جنھیں اپنی روزی آپ کمانا ہوتی ہے۔ ان کی سرشت پر اس قسم کے اعتراضات عاید کرنا آسان نہیں۔ کیونکہ اُس طبقہ کی عورتیں اپنے بھائیوں کی سی تربیت پاتی ہیں اور تقریبًا یکساں آزاد فضا میں اُن کی پرورش ہوتی ہے۔ چنانچہ فی الجملہ نہ وہ محرور المزاج ہوتی ہیں نہ ان میں کاروبار کی صلاحیت مفقود ہوتی ہے۔ یہ بات اور ہے کہ کسی مرد کی طرح کسی عورت کو اعصاب کی کمزوری کی شکایت پیدائشی ہو جو اکثر موروثی اثرات سے بھی ہوا کرتی ہے لیکن اگر یوں بھی مان لیا جائے کہ لڑکیاں بہ نسبت لڑکوں کے ایسے امراض ورثتًا زیادہ قبول کرتی ہیں تو میں پوچھتا ہوں کہ جو لڑکا کوئی پیدائشی مرض لے کر جوان ہوا ہو کیا وہ بھی کسی کاروبار کے لائق نہیں سمجھا جاتا؟ دنیا میں ایسے لوگ ہمیشہ گنائے جا سکتے ہیں جو باوجود اس قسم کے خلقی نقائص کے جن کا اثر اعصاب اور مزاجی کیفیت پر ہو اپنے زمانہ میں از حد کامیاب ثابت ہوتے ہیں۔ اعصابی ہیجان بھی ایک ایسی چیز ہے جو اکثر لوگوں میں محض وقتی ہوتا ہے جس کا اثر بعد کو مزاج پر بالکل نہیں رہتا۔ نہ کسی طرح کسی تفحص یا تجسس میں مخل ہوتا ہے۔ بلکہ یہ ہیجان بعض اوقات کام کے جوش و خروش سے تعبیر ہوتا ہے اور یہ وہی جوش ہی جو گھوڑ دوڑ کے گھوڑے کو اتنا تیز دوڑا دیتا ہے کہ منزل مقصود پر پہنچتے ہی بعض اوقات اُس کا دم ٹوٹ جاتا ہے اور وہ مر جاتا ہے یہی وہ چیز ہے جس نے بہت سی نازک ہستیوں کو استقلال کے مقدس ترین مدارج

طے کرادئے اور جس کی بدولت ان کو سخت سے سخت جسمانی اور روحانی تکالیف کی پروا نہ ہوئی۔ یہ خصوصیت
اکثر اُن لوگوں میں بھی پائی جاتی ہے جو اپنی عملی خدمات کے ذریعہ سے نوع انسان کے رہنما بنتے ہیں۔ اور
یہی بات ہے جو بڑے بڑے مقرروں اور واعظوں کو اور عملی درس اخلاق دینے والوں کو کامیاب کرتی ہے
اگرچہ ان میں وہ خواص نہ بھی ہوں جو کسی رکن وزارت یا کسی حاکم عدالت کے لئے اچھے سمجھے جاتے ہیں۔
یہ ہرگز نہ سمجھنا چاہئے کہ جن لوگوں کا مزاج زیادہ اشتعال پذیر ہوتا ہے وہ ہر وقت حالت اشتعال میں اپنی
جان گھلایا کرتے ہیں۔ پھر یہ بات تو بہت کچھ تربیت پر منحصر ہے۔ نفس پر قابو پیدا کرنا بغیر کسی زبردست جذبہ
کسی لاگ اور کسی خاص احساس کے ممکن نہیں، البتہ یہ بات تربیت اور مشق سے حاصل ہوتی ہے۔ پہلوان
کبھی تو جذبات سے مغلوب ہوکر پہلوان بن جاتا ہے اور کبھی جذبات کو مغلوب کرنے سے۔ تاریخ اور تجربہ
دونوں ثابت کرتے ہیں کہ زبردست جذبات کے لوگوں کو فرض کا احساس سب سے زیادہ ہوتا ہے بشرطیکہ
اُن کے جذبات کسی ڈھرے پر لگا دئے گئے ہوں۔ حاکم عدالت اپنا منصفانہ فیصلہ صادر کرتے وقت جب
اپنے جذبات ہمدردی پر فتح حاصل کرتا ہے تو اُسی احساس فرض کی بدولت جو بجائے خود ایک جذبہ
ہے جس کی تقویت تربیت سے ہوتی ہے۔ یہی وہ صلاحیت ہے جو انسان کو روزمرہ کی زندگی کے ادنیٰ
اثرات سے بالاتر بنا کر پھر اُسی روزمرہ کی زندگی دیکھئے انسان کی سیرت اکو متاثر کرتی ہے۔ یہی وہ جوش
ہے جس کے کیف میں انسان اُس مرتبہ کو پہنچ جاتا ہے کہ وہ اپنے اعمال اور محسوسات کو تول سکے اور جانچ
کر دیکھے کہ وہ اُس کے نصب العین اور معیار خلق سے گرے ہوئے تو نہیں ہیں۔ اگرچہ انسان کی جسمانی
کیفیات ہمیشہ بدلا کرتی ہیں لیکن اُس کی عادتوں میں جو مقاصد سرایت کئے ہوئے ہیں وہ مستقل ہوتے
ہیں اور وہ نتیجہ ہیں اُسی جوشیلی کیفیت کا جو اُس کے لئے معیار عمل قایم کرتی ہے۔ دوسری قوموں کے
حالات مطالعہ کرنے سے بھی پتہ چلتا ہے کہ طبیعت کا زیادہ اشتعال پذیر ہونا انسان کو ناکارہ نہیں
کر دیتا۔ اور جن لوگوں کو دیر میں اشتعال ہوتا ہے وہ دوسرے لوگوں سے کچھ زیادہ کارپرداز نہیں ثابت
ہوتے۔ یوروپ کی بعض دیگر اقوام کے مقابلہ میں فرانسیسی اور اطالوی لوگ یقیناً بہت زیادہ محرور المزاج
واقع ہوئے ہیں۔ اور روزمرہ کی زندگی میں وہ انگریزوں کے مقابلہ میں تو بہرکیف نہایت مشتعل مزاج

ہیں. لیکن کیا وہ سائنس میں یا عام کاروبار میں قانونی اور عدالتی معاملات میں یا سپہ گری میں کسی قوم سے پیچھے ہیں ؟ ضرورت سے زیادہ شہادت اس امر کی موجود ہے کہ قدیم یونان والے حال کے یونانیوں کی طرح از حد مشتعل مزاج لوگ تھے. لیکن اُن کی حکمت مشہور ہے اور دنیا کا کوئی فن نہ تھا جس میں اُنھوں نے کمال نہ حاصل کیا ہو. اہل رومہ بھی اُسی نواح جنوب کے لوگ تھے جو ابتداءً ویسا ہی مزاج رکھتے تھے لیکن اُن کے زبردست قومی نظام نے اُن کو اُن کی ابتدائی حالت کے بالکل برعکس بنا دیا اور وہی چیز جو ابتدا میں اُن کے جوش کی ایک صورت تھی اُس سے اُن کی تربیت نے ان کے طبایع کو ایک برعکس حالت پر کر دیا. آئرستان کی سیلٹ قوم بھی اسی تربیت کی ایک مثال پیش کرتی ہے. غرضکہ جس طرح فرانسیسی انگریزوں کے مقابلہ میں آئرلینڈ والے سوئیزرلینڈ والوں کے مقابلہ میں یونانی اور اطالوی لوگ جرمن قوم کے مقابلہ میں رکھے جا سکتے تھے اُسی طرح عورتیں مردوں کے مقابلہ میں. اور دونوں کی صلاحیت عمل میں بالآخر مزاجی کیفیت کی بنا پر کوئی فرق نہ پایا جائے گا بشرطیکہ ان کی تربیت کا کافی لحاظ رکھا جائے.

عورت کے ذہن کی جزورسی اور دوسری صفتیں

اگر کہا جائے کہ عورتوں میں کسی ایک کوشش کو برابر جاری رکھنے کے لئے کافی استقلال نہیں ہوتا تو میں کہہ چکا ہوں کہ یہ اُن کی تربیت کی خامی ہو نہ کہ اُن کی فطرت کی. تاہم اگر یہ مان بھی لیا جائے تو اس سے ممکن ہے کہ اُن کے کام کی خوبی اُس پایہ کی نہ ہو لیکن یہ کہ وہ کوئی خوبی اپنے کام میں نہ پیدا کر سکیں یہ لائق یقین نہیں ہے. دماغ کا کسی کام پر جمنا گو ایک قابل تعریف بات ہے مگر عملی ضروریات کے لئے یہ عادت بعض اوقات مضر بھی ثابت ہوتی ہے. کیونکہ میری قطعی رائے یہ ہے کہ کسی اہم مسئلہ میں مسلسل انہماک اُتنا مفید نہیں جس قدر بار بار اُس کی طرف دماغ کو رجوع کرنا. اور جب آدمی ایک چیز کی طرف خوب متوجہ ہو تو اُس چیز کو دفعتاً چھوڑ کر دوسری چیز کی طرف اُسی قدر متوجہ ہو سکے تو یہ بڑی بات ہے. یہ عادت مردوں کو بہت کم ہوتی ہے لیکن عورتوں کے لئے یہ کچھ دشوار بات نہیں. ممکن ہے کہ یہ اُن کے لئے کوئی فطری بات ہو لیکن اُن کو اس کی مشق تو بہر کیف زیادہ ہوتی ہے. کیونکہ عورتیں جن کاموں میں مصروف رہا کرتی ہیں اُن میں ہر آن جزئیات پر نظر رکھنا ہوتی ہے

جرمنی کا سفرنامہ

برلن | بداپسٹ سے روانہ ہوکر ہم برلن پہنچے جو جرمنی کا دارالخلافہ ہے ۔اور رات کو ایک ہوٹل میں ٹھہر گئے اگلے دن صبح کو دس بجے ہمیں سرکاری افسر سے ملنا تھا جنہوں نے مہربانی فرما کر ہمارے اِدھر اُدھر جانے کا انتظام کیا تھا۔ ناظرین کو تعجب ہوگا کہ جرمنی کی حکومت نے اس قسم کی مدد ہم کو دینا کیوں منظور کی؟ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے جو ممالک یہ جانتے ہیں کہ دوسرے ممالک سے روپیہ اُسی وقت کمایا جاسکتا ہے جبکہ دوسرے ممالک کے باشندوں کو خوش رکھا جائے اور جہاں تک ہوسکے ان کو سہولتیں دی جائیں وہ ہی تجارت کی دوڑ میں آگے نکلتے ہیں۔ دوکانداری کی دوکانداری ہی یہ ہے کہ وہ اپنی اشیا کے خریدار کی خاطر تواضع کرے۔ ان حکومتوں کے اندر رعونت۔ غرور اور تکبر نہیں ہے۔ یہ لوگ اپنے آپ کو انسان سے بالاتر نہیں سمجھتے اور نہ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم اعلیٰ افسر ہیں معمولی آدمی کی کیوں فکر کریں۔ ہم نے آتے ہی فرانس۔ جرمنی۔ اور زیکوسلوواکیہ کی حکومت کو اپنا منشا لکھدیا تھا اور خواہش کی تھی کہ وہ ہماری مدد کریں۔ کیونکہ ہم نہ ملک سے واقف ہیں اور نہ ان کے ملک کی زبان جانتے ہیں۔ اسی طرح ہم نے اپنی سرکار کو بھی ولایت میں لکھدیا تھا کہ وہ ہماری مدد کرے۔ مگر ہماری سرکار کے جواب پہونچنے سے پہلے ہی جرمنی کی سرکار نے ہم کو لکھا کہ ہم کس قدر عرصہ وہاں گذارنا چاہتے ہیں اور کیا کیا دیکھنا چاہتے ہیں تاکہ وہ پروگرام بنا کر بھیج سکیں۔ اُنہوں نے یہ بھی لکھا کہ وہ اپنا ایک آدمی مفت دیں گے جو ہمیں تمام چیزیں دکھاوے گا۔ ہم نے اپنا منشا لکھ بھیجا اور سرکار نے دس روز کا جرمنی کا پروگرام بنا کر بھیجدیا اور ہم کو لکھا کہ آیا ہم اس میں کوئی ترمیم تو نہیں چاہتے؟ ہماری سرکار کا جواب صرف اس قدر تھا کہ ہم کو چاہیئے کہ ہم سرکاری افسر سے جو ہر ملک میں رہتا ہے جاکر ملیں اور اس کی نصیحت پر عمل کریں وہ ہماری مدد کرے گا۔ ہم نے جب یہ دیکھا کہ جرمنی سرکار نے اس قدر تکلیف ہمارے لئے برداشت کی ہے اور پورا پورا پروگرام ہمارے سفر کا دیدیا ہے تو ہمیں اپنے مشغول افسر کو تکلیف دینا مناسب نہ معلوم ہوا کیونکہ ممکن ہے ان کی ہدایات اور نصیحتوں پر ہم عمل نہ کرسکیں ممکن ہے وہ ویسی ہی ہدایات اور نصائح

ہوں جیسی کہ ہمارے یہ مہربان ہندوستان میں دیا کرتے ہیں۔ ہمارے پروگرام میں یہ درج تھا کہ ہم ۱۰ بجے صبح
سرکاری دفتر میں جاکر اس محکمہ کے بڑے افسر سے مل کر زبانی گفتگو کریں تاکہ اگر کسی اور ترمیم کی ضرورت ہو تو پروگرام
میں کی جاسکے چنانچہ ہم ۱۰ بجے پہونچ گئے اور ہم نے دیکھا کہ یہ اعلیٰ افسر جو زراعتی محکمہ کے سب سے بڑے افسر
تھے مع اپنے چند ماتحتوں کے ہمارا انتظار کر رہے ہیں ہم پہونچے اور انہوں نے بڑی آؤ بھگت سے ہمارا خیر
مقدم کیا۔ ہم نے ان سب عنایتوں کے لئے ان کا شکریہ ادا کیا انہوں نے کہا کہ ہم اب دوسرے ملک میں ہیں
جہاں کے لوگ شکریہ کے لئے نہیں بلکہ ہر انسان کی اپنا بھائی سمجھ کر مدد کرنا فرض سمجھتے ہیں اور وہ ہر طرح کی مدد
ہم کو دینے کو تیار ہیں۔ اگر ہم کو کسی قسم کی اور ضرورت ہو یا تکلیف ہو تو ہم فوراً اُن کو آیندہ اطلاع دے سکتے ہیں
اور ضروری مدد حاصل کر سکتے ہیں۔ سب سے پہلی بات جو ہم کو اس جگہ دکھائی دی یہ تھی کہ چپراسی سے لے کر اعلیٰ
افسر تک ہر شخص کے اندر بھائی بندی کا برتاؤ تھا۔ یعنی وہ حکومت وہ رعب و داب غائب تھا۔ ہمارے ملک
میں اگر ایک اعلیٰ افسر کے سامنے اس کا ماتحت جو خود بھی ایک بڑا افسر ہو پہونچتا ہے تو نہایت عاجزی اور انکساری
کا برتاؤ کرتا ہے اور ہر شخص یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ یہ شخص ماتحت ہوگا مگر یہاں خواہ چپراسی ہی کیوں نہ ہو افسران
اپنے ماتحتوں کے ساتھ نہایت خوش خلقی کے ساتھ اس طرح پیش آتے ہیں گویا وہ ان کے سگے بھائی ہیں چھوٹے
اور بڑے افسر آپس میں خوب گرم جوشی کے ساتھ باتیں کرتے ہیں وقتاً فوقتاً مذاق کرتے ہیں خوب ہنستے ہیں۔ ہم کو
افسوس ہے کہ ہم کو جرمن زبان نہیں آتی جو ہم ان کی گفتگو کا پورا پورا لطف لے سکتے۔ مگر ہم نے بعد کو بھی جس جگہ
جاکر دیکھا یہی بات نظر آئی۔ ایک افسر جب ایک ماتحت کے کمرے میں یا محض مزدور کے کمرے میں جاتا ہے
تو سب کو سلام کرتا ہے۔ مزدوروں کو بار بار اٹھنے اور جُھک جُھک کر سلام کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ بیشتر کی
طرح اپنے کام میں لگے رہ سکتے ہیں جو ضرورت اس افسر کو ہوگی وہ بیان کر دے گا اور جس شخص کا وہ کام ہوگا
وہ افسر کے حکم کی تعمیل کرے گا۔ یہاں تک کہ ایک جگہ ہم نے دیکھا کہ ایک فیکٹری کے مزدور تاش کھیل رہے تھے
کچھ گانا بجانا کر رہے تھے افسر اس جگہ گیا تو یہ لوگ اپنا کام بدستور کرتے رہے۔ افسر نے ان کو سلام کیا اور
مزدوروں نے خندہ پیشانی سے اس کا جواب دیا جس شخص کا یہ فرض تھا کہ وہ افسر کے حکم کی تعمیل کرے
اس نے اس حکم کی تعمیل کی۔ اس طرح ہم نے ایک اور مقام پر دیکھا افسر کے آنے پر مزدور برابر اپنے

کام پر لگے ہیں اور آپس میں باتیں کرتے اور ہنستے کھیلتے ہیں گویا کوئی بڑا افسران کے پاس ہے ہی نہیں۔ یہ بھائی بندی کا سبق واقعی ایک بڑا دلکش منظر ہے۔ ہم آگے چل کر بتائیں گے واقعی جرمنی کہاں تک ایک تعجب خیز ملک ہے اور اُس نے کیوں اور کس طرح اس قدر جلد اپنی بگڑی ہوئی اور تباہ شدہ حالت کو اس قدر قلیل عرصہ میں درست کر لیا ہے۔

جرمنی کے علاقہ میں داخل ہوتے ہی آپ کو ہر طرف چمنیوں کی بھرمار ملے گی اور ہر طرف کوئی نہ کوئی چیز بنتی ہوئی دکھائی دے گی۔ یہ مشکل کیا بلکہ ناممکن ہے کہ آپ مختلف قسم کے کارخانوں کو آسانی سے دیکھ سکیں کیونکہ ان کی تعداد بے شمار ہے۔ اس لئے ہم نے صرف چند قسم کے کارخانے اور زراعتی ادارے دیکھنے پر اکتفا کی اور ہم صرف انہیں کا حال ناظرین کے روبرو پیش کریں گے۔ ناظرین کے لئے غالباً یہ بات دلچسپی کی ہوگی کہ جرمنی ان عجیب ممالک میں سے ہے جہاں ہر چیز سے کچھ نہ کچھ بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جو اشیاء ہمارے ملک میں آتی ہیں وہ اکثر ایسی چیزوں سے بنی ہوتی ہیں کہ ان کا خواب و خیال بھی ہم کو نہیں ہو سکتا۔ ایک سرکاری اعلیٰ افسر سے ایک روز گفتگو ہو رہی تھی تو میں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ میں کوئی ایسی فیکٹری دیکھنا چاہتا ہوں جہاں پر آلو وغیرہ ترکاریوں سے بٹن بنائے جاتے ہیں انہوں نے کہا کہ جرمنی میں ایسی مختلف چیزوں سے اشیاء بنائی جا سکتی ہیں کہ ان کا پتہ لگنا مشکل ہوتا ہے اور باوجود اس کے کہ وہ خود جرمن ہیں ان کو بھی بہت سی اشیاء کے متعلق یہ معلوم نہیں ہے کہ وہ کس چیز سے بنائی گئی ہیں۔ مثال کے طور پر خون سے بٹن بنائے جاتے ہیں اور دیگر مختلف اشیاء بنائی جاتی ہیں۔ ہڈیوں سے سینکڑوں قسم کی اشیاء بنتی ہیں۔ ہم چاہتے تھے کہ کسی ایسی فیکٹری کو دیکھیں جہاں پر ہڈیوں سے کھاد بنایا جاتا ہو۔ مگر ہم کو بتایا گیا کہ جرمنی میں ہڈی ایسی بیش قیمت چیز ہے کہ اس کو کھاد کے کام میں بہت کم لایا جاتا ہے - ہم نے ایک فیکٹری کو دور سے دیکھا جو مصنوعی کارک بناتی ہے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ کارک عموماً لکڑیوں کی چھال سے بنائے جاتے ہیں۔ دودھ کے اندر سے ایک چیز نکلتی ہے جس کو انگریزی میں CASEIN کیسین کہتے ہیں اس سے ہزاروں نہایت رنگین اور خوشنما اشیاء بنائی جاتی ہیں۔ جرمنی میں یہ کوشش کافی ہے کہ جو چیز قدرت نے پیدا کی ہے اس سے کوئی نہ کوئی کارآمد شے ضرور بالضرور بنائی جا سکے۔ اور جرمنی کے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ وہ اپنے ملک کی ضروریات کو مصیبت آنے پر

ہزاروں قسم کی چیزوں کے بنانے میں ضرور بدل سکیں گے لڑائی کے زمانہ کا اگر ہم حال لکھیں کہ جرمنی میں کون کون اشیاء ایسی تھیں جن سے کھانے اور مویشیوں کے چارہ کا کام لیا گیا تھا تو لوگوں کو تعجب ہوگا مگر ہم ان پر تفصیلی بحث کرنا غیر ضروری سمجھتے ہیں۔

برلن ایک بہت بڑا شہر ہے اور میلوں کے اندر آباد ہے اس میں ہزاروں قسم کی اشیا بنتی ہیں اور قریب قریب ہر حصہ ملک کے اندر جو اشیاء بنتی ہیں ان سب کارخانوں کے دفتر اس شہر میں پائے جاتے ہیں۔ ہمارے لئے سرکار کی طرف سے دو افسر تعینات تھے دونوں ڈاکٹر کی ڈگری لے چکے تھے اور نوجوان تھے ان میں سے ایک زراعتی واقفیت رکھتا تھا مگر انگریزی نہ بول سکتا تھا اور دوسرا افسر انگریزی بہت عمدہ بولتا تھا مگر اس کی زراعتی واقفیت اس قدر زیادہ نہ تھی۔ اسی وجہ سے دو افسروں کے لینے کی ضرورت ہوئی۔ سب سے پہلے ہم نے ایک زراعتی فارم کو دیکھا جہاں پر پوٹاش کی کانیں ہیں اور کافی تعداد میں سلفیٹ آف پوٹاس اور کلورائڈ آف پوٹاش جرمنی سے باہر دیگر ممالک کو جاتی ہے۔ جرمنی کی طرف سے قریب قریب سب ممالک کے اندر اس کی ضرورت بتانے کے لئے آدمی رہتے ہیں اور اس جگہ پر مختلف قسم کے پودوں پر پوٹاش اور دیگر کھادوں کے تجربات کئے جاتے ہیں کہ کس کھاد کا کس پودہ پر ڈالنے سے کیا اثر ہوگا۔ دنیا بھر کے اندر جس قدر فصل پیدا ہوتی ہے وہ سب کی سب یہاں موجود ہے اور اس پر تجربات کئے جاتے ہیں۔ ہم کو تعجب تھا کہ کس طرح جرمنی کے لوگ ہمارے ملک کے پودوں پر جن کو بہت گرمی کی ضرورت ہو تجربات کرتے ہوں گے افسر زراعت ہم کو یہ دکھانے کے لئے ایک مکان کے اندر لے گئے اور وہاں اُنہوں نے ایک مشین دکھائی جس سے ہر ملک کے پودے کو اس ملک کی آب وہوا اور ٹمپریچر کے مطابق سردی گرمی اور رطوبت پہنچائی جا سکتی تھی۔ عموماً ہندوستان اور دوسرے ممالک کے اندر اس کام کے لئے جو انتظام کیا جاتا ہے وہ یا تو نیچے آگ جلا کر پودوں کو مصنوعی گرمی پہونچائی جاتی ہے یا ان کو کسی طرح گرم پانی پہنچا کر گرم رکھا جاتا ہے یا سورج کی گرمی زیادہ کر کے مصنوعی گرمی دیتے ہیں مگر اس ذریعہ سے کوئی خاص کامیابی نہیں ہوتی۔ اس جگہ اس مشین کے ذریعہ اب سرد سے سرد اور گرم سے گرم اور خشک سے خشک اور مرطوب سے مرطوب آب وہوا پیدا کر سکتے ہیں اور اس وجہ سے جو پودے اس جگہ اُگائے جاتے اور

جو تجربات ان پر کئے جاتے ہیں وہ زیادہ اعتبار کے قابل کہے جا سکتے ہیں۔ بہت سے عالم اس جگہ مختلف پودوں کے متعلق تحقیقات کر رہے تھے جن کے ایک ایک اوزار کو دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ صرف یہ بات معلوم کرنے کے لئے کہ بارِیک پودوں مثلاً گیہوں کی نالی کے حصہ کے اندر کی کوٹھڑیاں کس قسم کا کھاد دئے جانے پر یا کس کھاد کے کم ہو جانے پہنچتی ہیں ایک نہایت نازک مشین بنائی گئی ہے۔ جو نالی کو نہایت باریک کاٹ دیتی ہے اور اس کو خوردبین میں تین سو گنا بڑھا کر دیکھا جا سکتا ہے اور اس کی صحیح تصویر بن سکتی ہے۔ اب تک بہت ملکوں میں یہ طریقہ ہے کہ خوردبین میں پودہ کو دیکھتے جاتے ہیں اور اس کی تصویر ہاتھ سے بناتے جاتے ہیں جس سے نہ تو اسکیل ٹھیک رہ سکتی ہے اور نہ تفصیل آسکتی ہے مگر اس جگہ ایک آلہ ہے جو کہ اس کی بالکل ہو بہو تصویر تین سو گنی بڑھا کر لے سکتا ہے۔ جو لوگ کام کرتے ہیں اگر ان سے آپ بات کریں تو وہ یہ فرض نہیں سمجھتے کہ ہر وقت جا اور بیجا طور پر پوٹاش کے کھاد کی تعریف کریں۔ بلکہ جو چیز ان کے نزدیک جیسی ثابت ہوتی ہے وہ اُس کو ویسا ہی بیان کریں گے۔ جس پودے کے اندر ان کے خیال میں پوٹاش سے کوئی خاص فائدہ نہیں دیکھا گیا ہے وہ کہدیں گے کہ ان کے تجربہ میں ابھی تک کوئی فائدہ نہیں ہوا ہے۔ پھل دار پودوں کے لئے یہاں خاص تحقیقات جاری تھی کہ کس طرح بونے سے زیادہ فائدہ ہو سکتا ہے۔ ان لوگوں کے خیال میں کسی درخت کو بہت زیادہ بڑھتے رہنے دیا جائے تو پودہ بہت زیادہ خوراک زمین سے حاصل کرتا ہے اور اس پر پھل کم آتے ہیں۔ ان کے خیال میں پودہ کو قلم کر دینا چاہیئے کیونکہ صرف پودوں کے اس حصہ پر پھل آتے ہیں جس کی کونپلیں نئی پھوٹی ہوں۔ ایسا کرنے سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ پودے کے نیچے کوئی چیز پیدا کی جا سکتی ہے اور اس کو سایہ سے نقصان نہیں پہونچتا۔ چنانچہ ہم نے سیب کے درخت پھلوں سے لدے ہوئے دیکھے اور ان کے نیچے مختلف قسم کی ترکاریاں نہایت عمدہ حالت میں اُگی ہوئی تھیں۔ اس انسٹی ٹیوشن کا یہ بھی کام ہے کہ وہ نئی نئی فصلوں کے متعلق تجربات کرے کہ ملک کے اندر کونسی فصل رائج کی جا سکتی ہے۔ غرض ہر طرح سے یہ کوشش کی جاتی ہے کہ اس سے زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کی جا سکے۔

ایک جگہ ہم نے اس فارم کو دیکھا جہاں پر کہ شہر کا تمام گندہ پانی جمع ہوتا ہے اور اُس سے آبپاشی کا کام لیا جاتا ہے۔ برلن بمبئی سے دوگنا شہر ہے شاید اس سے بھی زاید ہو۔ اس شہر کا تمام غلیظ پانی ناظرین اندازہ لگا سکتے ہیں

کس قدر زیادہ ہو گا۔ مگر اس کو فضول دریا میں نہیں بہایا جاتا۔ کیونکہ جرمن جانتے ہیں کہ اس سے دریا کے پانی کو گندہ کرنے کے علاوہ جب ہزاروں من اجناس اس سے پیدا کی جاسکتی ہیں تو کیوں اس سے یہ مفید کام نہ لیا جائے ہمارے ملک کے شہری ممبران کی طرح وہ اس پانی کو فضول پھینکنے کے قایل نہیں ہیں۔ چنانچہ تمام شہر کے پانی کو ایک جگہ لاکر بڑے بڑے تالابوں میں جمع کر دیا جاتا ہے ۔ تاکہ تمام مٹی وغیرہ نیچے بیٹھ جائے اور صرف پانی رہ جائے ۔ایک بہت بڑے رقبہ اراضی کے لئے جس میں پہلے کچھ بھی پیدا نہ ہوتا تھا ۔ اس پانی کو بطور آب پاشی استعمال کیا جاتا ہے۔ اور اس سے چارہ وغیرہ دیگر اجناس پیدا کی جاتی ہیں اس رقبہ زمین کو مختلف کاشتکاران کو دے دیا گیا ہے جو کھیتی کرتے ہیں اور میونسپلٹی کو لگان ادا کرتے ہیں۔ زیادہ تر اس جگہ چارہ۔ آلو۔ اور چقندر بویا جاتا ہے۔ کبھی کبھی مکئی کی کاشت بھی کی جاتی ہے۔ ہم نے دریافت کیا کہ ترکاریاں آلو چقندر اس سے پیدا کرنا صحت کے لئے مضر کیوں نہیں سمجھا جاتا تو ہم کو بتایا گیا کہ یہاں کی اراضی میں جو سبزی پیدا ہوتی ہے اس میں کوئی مضر صحت بات نہیں پائی گئی ہے۔ ممکن ہے کہ دوسری جگہ پائی جاتی ہو۔

اس کے بعد ہم ایک کسان کا فارم دیکھنے کے لئے گئے اس کے پاس پچاس بیگہ اراضی ہو گی۔ اور یہ خاندان اسی جگہ دو سو سال سے کھیتی کرتا ہے۔ سارے گاؤں کا یہ ہی مکھیا تھا۔ اس کا مکان ہم نے دیکھا تو ہمارے ہوش باختہ ہو گئے۔ نہایت آراستہ و پیراستہ مکان۔ سامان جو مکان کے اندر تھا وہ بہت قیمتی تھا۔ نہایت صاف ستھرا۔ مکان میں کھانا پکانے کے دو کمرے تھے ایک میں گرمی کے موسم کے لیے اور دوسرا جاڑے کے لیے۔ اس وقت کھانا پک رہا تھا۔ ہم اندر گئے تو دیکھا دھوئیں کا نام نہیں ہم کو خیال ہوا کہ بجلی یا گیس سے کھانا بن رہا ہو گا مگر دیکھا کہ کوئلہ اور لکڑی جلائی جا رہی ہے۔ مکان میں ۴۰۰ گائیں تین گھوڑے ۵ سور اور مرغیاں تھیں۔ اور ایک بہت بڑا گودام سامان رکھنے کا تھا۔ ٹریکٹر چلانے کے لئے موجود تھا جو اس کی اراضی اور دیگر کاشتکاران کی بھی اراضی جوتتا تھا۔ کٹی کاٹنے کے لئے مشین علیحدہ تھی ۔ غرض ہر طرح سے یہ جگہ ایک رئیس آدمی کی معلوم ہوتی تھی۔ ہم نے مذاقاً دریافت کیا کہ کیا وہ خود ہی ہل چلاتا اور کھیتی باڑی کے دوسرے کام کرتا ہے تو اس نے بتایا کہ وہ سب کام خود کرتا ہے مگر وہ چونکہ اکیلا ہے اور بچے چھوٹے ہیں اس وجہ سے چند

ملازم بھی رہتے ہیں جن کو فی کس تیس روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی ہے اور کھانا اور کپڑا دیا جاتا ہے۔ اس کے مکان میں ایک خاص تعداد میں کتابوں کا مجموعہ تھا۔ مہمانوں کے خیر مقدم کے لئے بہت عمدہ ڈرائنگ روم تھا۔ مکان کے پیچھے ایک چھوٹا سا باغیچہ تھا جس میں پھلدار درخت تھے اور سبزیاں گھر کے خرچ کے لئے پیدا ہوتی تھیں

اگلے روز ہم نے ڈیری دیکھی جو شہر کو دودھ مہیا کرتی تھی۔ شہر میں صرف ۲ ڈیریاں تھیں جن سے سارے شہر کو دودھ مہیا ہوتا تھا۔ یہ بہت بڑا مکان تھا جس میں ہزاروں آدمی ملازم ہونگے۔ تمام دودھ ٹین میں بھر بھر کر یہاں لایا جاتا تھا اور ایک سٹیرلائزنگ مشین سے چھان کر صاف کیا جاتا تھا۔ اس کے بعد دودھ کو ایک جگہ جمع کر دیا جاتا تھا۔ اور وہاں اس کو گرم کر کے تمام جراثیم مار دئے جاتے تھے اور پھر اس کو ٹھنڈا کر کے فروخت کرنے کے لئے بوتلوں میں بھر کر باہر بھیجدیا جاتا تھا۔ جو باقی بچتا تھا اس کا مکھن اور مکھن کے دودھ کا پنیر بنا یا جاتا تھا۔ یہ جگہ نہایت صاف رکھی جاتی ہے۔ اگرچہ یہ سب کام ایک کمیٹی کرتی ہے مگر اس کمپنی کے اندر کافی حصہ داروں کی تعداد دودھ بہم پہونچانے والوں کی تھی۔ نرخ دودھ کا سرکار کی طرف سے مقرر تھا تا کہ کوئی شخص زیادہ روپیہ وصول نہ کرلے۔ تمام جرمنی کے اندر ہر بوتل دودھ کے اوپر یہ تحریر کرنا پڑتا ہے کہ وہ بوتل کس کارخانہ کی ہے اس میں کتنا دودھ ہے اور کس روز وہ بوتل بھری گئی ہے اور یہ بھی لکھنا ہوتا ہے کہ اس میں کوئی پانی وغیرہ کی ملاوٹ نہیں ہے اور اس کے جراثیم ہلاک کئے گئے مگر اس پر بھی اکتفا نہ کر کے سرکار کی جانب سے کافی نگرانی ہوتی ہے اور اگر کسی شخص کے متعلق کوئی بات معلوم ہوتی ہے تو اس کو کڑی سزا دی جاتی ہے اور اس کا لائسنس ضبط کر لیا جاتا ہے۔ ایک بات ہم ناظرین کی دلچسپی کے لئے بتا دینی ضروری سمجھتے ہیں کہ جرمنی کی حکومت اس بات میں یقین نہیں رکھتی کہ قانون کو وضع کرنے کے بعد اس کی تعمیل وعدم تعمیل کی پرواہ نہ کی جا ے بلکہ اس کی پابندی اس طرح کی جاتی ہے کہ کوئی شخص اس کی خلاف ورزی کر ہی نہیں سکتا۔ جرمنی میں لوگوں کے اخلاق کی بلندی ایک سرکاری فرض ہے اس لئے ہمیشہ اس بات کا خاص طور سے خیال رکھا جاتا ہے جس سے لوگ کوئی ایسا کام نہ کریں جس سے بھائی بندوں کو نقصان پہونچے یا دھوکہ ہو اور اگر کوئی شخص ایسا کرتا ہے تو اس کو کڑی سزا دی جاتی ہے تا کہ دیگر لوگوں کو عبرت ہو۔ ہم نے ایک شخص سے چند سوالات ایسے کئے جس سے اس کو یہ معلوم ہوا کہ ہم کو یہ شبہ ہے کہ جرمنی میں لوگ آمیزش کرنے کی کوشش کرتے ہونگے

اور ضرور کچھ نہ کچھ ملاوٹ دودھ وغیرہ میں کرتے ہوں گے اس نے نہایت پرجوش لہجے میں جواب دیا کہ جرمنی کے اندر حکومت ہوتی ہے اور کوئی شخص ایسی حکومت میں قانون کی خلاف ورزی کرنے کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتا ہمارے ملک میں بھی حکومت ہوتی ہے اور آئے دن ہزاروں نوجوان جیل کے اندر بلا مقدمات چلائے مہینوں اور برسوں کے لئے بند کر دیئے جاتے ہیں مگر کیا مجال کہ اس قسم کے جرایم کے انسداد کے لئے سرکار کے کانوں پر جوں بھی چل جائے۔ البتہ اگر کوئی میونسپل بورڈ اس کام میں زیادہ دلچسپی لے تو اس کے راستہ میں روڑ ا اٹکانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اس کے بعد ہم نے ایک اور سرکاری زراعتی تجربہ کے فارم کو دیکھا جس کے اندر بہت سی باتیں قابل ذکر ہیں مگر ناظرین کی دلچسپی کے لئے صرف ایک بات کا ذکر کر دینا کافی ہے۔ اس فارم میں چند سال سے کامیاب تجربات کئے جا رہے ہیں کہ گیہوں۔ جو چنے کی فصل کو بونے کے بعد ایک ماہ کے جب فصل اُگ آئے تو ان کھیتوں میں گاجر۔ رزقہ۔ کلوور وغیرہ کوئی فصل بو دی جائے اور جب فصل گیہوں کی کٹ جائے تو کلٹی ویٹر سے اس کو اچھی طرح ملا کر ٹھیک کر دیا جائے تو اس طرح ایک فصل کی بجائے دو فصلیں آسانی سے مل جاتی ہیں۔ یہ طریقہ نہایت کامیاب ثابت ہوا ہے اور اب چند کاشتکار بھی اس پر عمل کر رہے ہیں ناظرین کو یاد رکھنا چاہئے کہ تمام جرمنی میں تمام اجناس ہمیشہ قطاروں کے اندر بوئی جاتی ہیں اور اس وجہ سے اس قسم کے تجربات میں آسانی ہوتی ہے۔

پھر ہم نے مذبح خانہ کو دیکھا۔ جہاں سے تمام شہر کو گوشت بہم پہونچایا جاتا ہے۔ اس جگہ پر ہزارہا گائے۔ بچھڑے۔ سور۔ بھیڑ۔ وغیرہ ذبح ہونے کے لئے کاشتکاران لاتے ہیں اور اس خیال سے کہ کاشتکاروں کے ساتھ بے ایمانی نہ ہو سرکاری ملازمین پہلے مویشیوں کی جانچ کر کے کم سے کم قیمت مقرر کر دیتے ہیں۔ اس سے زاید قیمت پر ہی مویشی قصابوں کو خرید کرنے ہوں گے۔ بہت سے قصاب وہاں جمع رہتے ہیں اور اگر یہ لوگ آپس میں مل کر خرید کرنا شروع کر دیں تو ان کو کڑی سزا دی جاتی ہے یعنی اس بات کی پوری کوشش کی جاتی ہے کہ انھیں کوئی نقصان نہ پہنچے۔ ہر روز کسانوں کی طرف سے ایک ہوشیار مکھیا یا زائد آدمی سرکار کی طرف سے اس بات کی دیکھ بھال کے لئے رکھے جاتے ہیں کہ کوئی شخص بے ایمانی کر کے یا آپس میں

مل کر کسان کو نقصان نہ پہونچا سکے۔ ہر مویشی کی قیمت کے ساتھ ساتھ اُس کے بیمہ کی فیس ادا کرنی ہوتی ہے۔ جب جانور فروخت ہو چکتا ہے تو اس کا ڈاکٹری معائنہ کیا جاتا ہے اور اگر کوئی جانور ذبح کرنے کے قابل نہ ہو تو اس کی قیمت بیمہ کمپنی ادا کر دیتی ہے اور اس جانور کو دوسرے کام کے لئے ذبح کیا جاتا ہے۔ ذبح کرنے کا کام مشینری سے کیا جاتا ہے جس سے کھال گوشت وغیرہ تمام اجزاء ایک دم الگ ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد ہر ایک قصاب کا گوشت، گوشت کے بازار میں بھیجد یا جاتا ہے جہاں اس کو برف کے اندر ٹھنڈا رکھا جاتا ہے اور وہاں سے یہ بازاروں میں جاکر فروخت ہوتا ہے۔

اس جگہ ایک بہت بڑا انسٹی ٹیوٹ کھانڈ کے متعلق ہے جہاں شیرہ۔ کھویہ۔ کھانڈ وغیرہ کی تحقیقات ہوتی ہے اس کو بھی ہم نے دیکھا اس کے کارکنان سے بات چیت کی اُنھوں نے نہایت خوش اسلوبی سے ہماری باتوں کے جوابات دئے اور فرمایا کہ اگر ہم اپنا شیرہ وغیرہ وہاں روانہ کریں گے تو وہ لوگ نہایت خوشی کے ساتھ اس کے متعلق واقفیت بہم پہونچانے کا کام کریں گے۔ جرمنی کے اندر جس قدر شیرہ پیدا ہوتا ہے وہ سب کا سب مختلف اشیاء کے بنانے میں کام آجاتا ہے۔

شام کو ہم دوبارہ سرکاری افسر سے ملے کیونکہ اگلے دن ہمارے وہاں سے چلے جانے کا پروگرام تھا۔ انہوں نے نہایت خندہ پیشانی سے ہمارے سفر کا حال دریافت کیا اور پھر ہر طرح کی سہولت بہم پہونچانے کے لئے کہا۔ ہم نے خواہش ظاہر کی کہ اگر ممکن ہو تو ہم دو روز اور جرمن کے اندر رہ کر اپنا دورہ شروع کریں مگر اُنہوں نے جواب دیا کہ یہ ناممکن ہوگا کیونکہ تمام افسران کو اطلاع دے دی گئی ہے اس لئے وہاں سے ہم اگلے دن لیپزگ اسٹیشن کے لئے روانہ ہو گئے۔

لیپزگ | لیپزگ کے اسٹیشن پر ہم ٹھیک وقت پر پہونچ گئے مگر بدقسمتی سے جن لوگوں سے ہم کو ملنا تھا ان سے ملاقات نہ ہوئی۔ وہ اتفاق سے ہماری تلاش میں رہے اور ہم ان کی تلاش میں۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کریں آخر ہم نے سوچا کہ ہم نمائش کے دفتر میں جن لوگوں سے پہلے سے خط وکتابت کر رہے تھے۔ اور جن سے ملنا ضروری تھا مل لیں۔ چنانچہ ہم ایک موٹر لیکر اس مقام پر گئے۔ لیپزگ ایک بہت بڑا شہر جرمنی میں ہے اور یہاں تمام قسم کی مشنری کی سال میں دوبار نمائش ہوا کرتی ہے۔ نمائش کے لئے پختہ مکانات اور تمام سامان کی

دوکانیں وغیرہ مستقل طور سے بنی رہتی ہے۔ سب سے بڑی نمائش تو مارچ میں ہوتی ہے۔ دوسری اگست میں۔ ۔ ان لوگوں سے جاکر ملے تو دیکھا ایک عالیشان عمارت میں سینکڑوں آدمی یہ ہی کام کر رہے ہیں کہ کس طرح اس نمائش کی زیادہ سے زیادہ شہرت کی جائے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ دوسرے ممالک سے یہاں آکر جرمنی مشین کو دیکھیں اور ان کی فروخت میں سہولت ہو۔ اس نمائش کے نظام کو اشیار کی فروختگی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہم ان لوگوں کے پاس پہونچے اور ہم نے سب سے پہلے اپنی مصیبت بیان کی۔ انہوں نے فوراً ریل کو فون کیا کہ ان لوگوں کو تلاش کرکے ہمارے پاس بھیج دیا جاوے۔ ریل والوں نے فوراً تلاش شروع کردی اور چند منٹ کے اندر اندر ہی ہم کو جواب ملا کہ وہ تشریف لا رہے ہیں اور ہم کو کسی تشویش کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ بات معلوم کرکے جان میں جان آئی اور ان لوگوں سے بات چیت شروع ہوئی۔ انہوں نے اس بات پہ بڑا زور دیا کہ ہم کو یہ موقعہ ہاتھ سے نہ کھونا چاہئے کیونکہ اس موقعہ پر تمام جرمنی کے بڑے بڑے مشین بنانے والے اپنی مشینیں اس جگہ لاتے ہیں اور ان کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ہماری مطلب براری کا اس سے زیادہ اچھا طریقہ اور کوئی نہیں ہے۔ چنانچہ ہم نے طے کیا کہ واپسی بھی اسی راستے سے ہو۔

اس عرصہ میں یہ لوگ آگئے اور ہم سیدھے اس جگہ کی سب سے بڑی زراعتی ہل بنانے والی فیکٹری میں جس کا نام رووسیک ہے گئے۔ یہ قریب ساٹھ سال کی پرانی فیکٹری ہے اور تمام قسم کے ہل، ہیرو، کلٹی ویٹر اور ٹریکٹر جو مٹی کے تیل سے چلتے ہیں بناتی ہے۔ کارخانہ کافی لمبا چوڑا ہے اور سینکڑوں قسم کے ہل اس جگہ بنائے جاتے ہیں۔ کارخانہ کو دیکھ کر واقعی آدمی کی عقل چکرا جاتی ہے۔

اس شہر میں یوں تو سینکڑوں اشیار بنائی جاتی ہیں مگر اس وقت جرمن لوگ اس کوشش میں ہیں۔ کہ انگریزی کی کتابیں سستی سے سستی قیمت میں نہایت خوبصورت شائع کی جائیں اور ان کو بہت سستی قیمت پر دوسرے ممالک میں فروخت کیا جائے۔ دوپہر بعد ہم اس جگہ سے اسٹٹ گارٹ کے لئے روانہ ہوئے۔ ہم کو بتایا گیا تھا کہ صبح کی گاڑی سے روانہ ہوکر ہم اس جگہ رات کے ۹ بجے پہونچ جائیں گے۔ مگر ہم کو راستہ میں معلوم ہوا کہ ہم کو ایک جگہ گاڑی بدلنی ہوگی۔ راستہ میں کوئی آدمی انگریزی جاننے والا نہ ملا مگر کسی نہ کسی طرح سے گاڑی بدل کر جان میں جان آئی اب امید ہوئی کہ ہم ضرور اپنی منزل مقصود پر پہونچ جائیں گے۔ مگر

تھوڑی دور چل کر معلوم ہوا کہ یہ گاڑی بھی آگے ایک اور مقام پر بدلنی ہوگی۔ اب بڑی چہ میگنم میں پڑ گئے۔ اتفاق سے ہماری مشکل حل ہونے کے لئے ایک صاحب ہمارے کمرہ میں سوار ہو گئے جو سوئٹزرلینڈ کے رہنے والے تھے اور بڑی اچھی انگریزی جانتے تھے جس غلطی میں ہم مبتلا تھے انہوں نے بھی ٹھیک وہی غلطی کی تھی۔ اور وہ بھی اس جگہ جانے کے لئے اس گاڑی سے سوار ہوئے تھے مگر چونکہ وہ جرمنی جانتے تھے اس لئے انہوں نے گارڈ سے دریافت کیا تو اس نے جواب دیا کہ ہم اس گاڑی سے نورن برگ جا سکیں گے اور اس کے بعد ہم کو دوسرے روز صبح گاڑی ملے گی۔ اور وہ گاڑی اگلے دن دس بجے ہم کو پہونچائے گی۔ اس جگہ ہم کو ۷ بجے دوسرے مقامات دیکھنے کے لئے چلا جانا تھا اس لئے بڑی مصیبت کا سامنا معلوم ہوتا تھا۔ اس شریف آدمی نے ہم کو صلاح دی کہ ہم رات کو ایک مقام نواں برگ پر جو اسٹیشن کے بہت قریب ہے ٹھیر جائیں اور وہاں سے اسٹٹ گارٹ کے ہوٹل کو فون کر دیویں تاکہ ہوٹل والا سرکاری افسروں کو ہمارے وقت کی اطلاع دے دیوے۔ اور وہ بخوشی اس سب کام کو انجام دیویں گے کیونکہ ان کی گاڑی ایک گھنٹہ بعد جائے گی۔ وہ بخوشی ہمارے ساتھ آئے اور انہوں نے اسٹٹ گارٹ کے ہوٹل کو فون کیا تو معلوم ہوا کہ وہ لوگ ہمیں لینے کے لئے آئے تھے اور اگلے دن پھر ۷ بجے صبح آئیں گے ہم نے سب قصہ ان کو بتا دیا اور اس طرح رات بھر پریشانی میں کٹی۔ اگلے دن صبح کو دس بجے اسٹٹ گارٹ پہونچے اور خوش قسمتی سے ہم کو یہ لوگ ریل پر مل گئے اور ہم کو مختلف فارموں کے دکھانے کے لئے لے گئے۔ جہاں مختلف فصلوں پر نہایت دلچسپ تجربات کئے جا رہے تھے۔ اور سرکاری دلچسپی زراعت کے کاموں میں بخوبی دکھائی دیتی تھی۔

اس کے بعد ہم ڈیری دیکھنے کے لئے گئے۔ اس شہر کی آبادی تین لاکھ سے زائد ہے مگر دودھ کا انتظام صرف ایک کارخانہ کے سپرد ہے جس میں کچھ میونسپلٹی کے حصص ہیں اور کچھ حصص کسانوں کے۔ اور کچھ دوسرے لوگوں کے ہیں۔ برلن کی طرح دودھ کا نرخ سرکار مقرر کرتی ہے۔ اس جگہ تمام دودھ مختلف مواضعات سے آتا ہے جن کا فاصلہ ۷۰ میل تک پہونچتا ہے۔ کچھ دودھ بذریعہ موٹر لاری کے ٹین کے کنستروں میں آتا ہے اور کچھ بذریعہ ریل آتا ہے۔ اس تمام علاقہ کے دودھ میں مکھن کی تعداد زیادہ ہوتی ہے

اور معمولی دودھ کے اندر، ۳۶ فیصدی گھی کی مقدار ہوتی ہے ۲۰۰۰۰ میٹر دودھ روزانہ اس جگہ پر آ کر اکھٹا ہوتا ہے۔ انتظام کی خوبی اس بات سے ظاہر ہوگی کہ باوجود اس کے کہ چالیس میل تک سے دودھ لایا جاتا ہے مگر زیادہ سے زیادہ گرمیوں کے دنوں میں صرف دو ہزار میٹر یعنی ایک فیصدی سے بھی کم کھٹا ہونے پاتا ہے اور جاڑے کے دنوں میں صرف دو سو میٹر کھٹا ہوتا ہے۔ کھٹے دودھ کو الگ مکھن بنانے کے کام کے لئے رکھدیا جاتا ہے اور صرف عمدہ دودھ فروخت ہوتا ہے۔ دودھ کے انتظام کے لئے ہر گاؤں کے اندر ایک پنچایت ہے جو ہر شخص کا دودھ دیکھتی ہے اور اس بات پر نظر رکھتی ہے کہ کوئی شخص خراب دودھ فروخت نہ کرے کسی قسم کی ملاوٹ نہ کرے اور نہایت صفائی کے ساتھ دودھ کو دوہے۔ عمدہ دودھ کی قیمت یہ پنچایت کچھ زائد ادا کرتی ہے۔ دودھ کا تمام انتظام نہایت اعلی درجہ کا ہے کسی جگہ مٹی گرد کا نام نہیں۔ ہر ایک جگہ اور ہر ایک برتن مشین وغیرہ نہایت صاف رکھی جاتی ہے۔ میونسپلٹی کی طرف سے اس جگہ ملازمین کے رہنے کے لئے مکانات بنے ہوئے ہیں جو نہایت خوب صورت ہیں اور بہت سستے کرایہ پر ملازمین کو دیدئے جاتے ہیں ان کے کپڑوں کے دھونے کے لئے علیحدہ مشین ہے۔ کھانا پکانے۔ کھانا کھانے کے کمرے علیحدہ ہیں اور طرح طرح کا سامان جدا گانہ ہے غرضکہ ہر طرح سے مزدوروں کی رہائش کا نہایت عمدہ انتظام کیا گیا ہے۔ مزدوروں کے مکانات۔ ان کے کپڑے۔ رہنے کی جگہ بھی نہایت صاف ستھری رکھی جاتی ہے

تمام دودھ صاف ہو کر چھانا جاتا ہے اور اس طرح گرم ٹھنڈا کرکے بوتلوں کے اندر بھر دیا جاتا ہے ہم کو بتایا گیا کہ جو مشین اس جگہ کام کرتی ہے وہ جرمنی میں سب سے نئی قسم کی ہے۔ اور نہایت عمدہ کام کرتی ہے اس کارخانہ میں زیادہ تر کام مشین سے کیا جاتا ہے۔ دودھ اسٹور میں پہنچ جانے کے بعد بوتلوں میں بند ہوجانے تک ہاتھ لگانے کی ضرورت نہیں ہوتی اور نہ اس کا مکھن بنانے میں ہاتھ لگانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ البتہ مکھن کو بنا کر ایک روز رکھ دیا جاتا ہے اور اس کی ٹکیاں چونکہ دوسرے روز بنتی ہیں اس وجہ سے مکھن اسٹور میں لیجانے اور لانے کے لئے مزدوروں کی ضرورت پڑتی ہے۔ مکھن کی ٹکیہ بنانے۔ اس کے صحیح وزن کاٹنے اور اس پر کاغذ چپکانے وغیرہ میں بھی ہاتھ نہیں لگتا صرف انسان کی ضرورت یہ ہے کہ ٹکیوں کو بکس میں بند کردے اور ان کو جہاں لکھا ہو بھیجدے۔ مکھن بننے کے بعد جو دودھ بچتا ہے اس کی

دہی جماکر اسے بوریوں میں دبا دیا جاتا ہے اور اس سے جو ملائم پنیر حاصل ہوتا ہے اس کو پنیر بنانے کی فیکٹریوں میں روانہ کر دیا جاتا ہے اس کو کبھی خشک کر کے فیکٹریوں کے ہاتھ فروخت کر دیا جاتا ہے اور اس سے ہزاروں قسم کی چیزیں کھلونے۔ لکھنے کے قلم۔ چاقو کے دستے۔ کنگھے وغیرہ بنائے جاتے ہیں۔ اس جگہ دودھ کو سفوف بنانے کا کام بھی ہم نے دیکھا جو نہایت دلچسپ طریقہ پر کیا جاتا ہے۔ دودھ کو خواہ تازہ ہو یا مکھن نکلا ہوا ایک جگہ پہلے ویکویم پین کے اندر ابالا جاتا ہے تاکہ اُس کا دو تہائی پانی خشک ہو جائے اور اس کے بعد ایک رولر جس کے اندر گرمی پہونچائی جاتی ہے اس کو نہایت باریک کاغذ کی شکل میں تبدیل کر دیتا ہے اور پھر اس کو مشین سے پیس کر فروخت کر دیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے یہ مشین جرمنی میں اول قسم کی ہے۔

اس کے بعد ہم نے ایک کھانڈ بنانے کی مشین دیکھی۔ جو چقندر کا موسم نہ ہونے کی وجہ سے چقندر سے کھانڈ نہ بنا رہی تھی۔ - اس کارخانہ کے ماتحت بہت سے کارخانے قرب و جوار میں ہیں جو صرف لال کھانڈ بنا کر اس کارخانہ کو بھیجدیتے ہیں اور یہاں اس سے سفید کھانڈ اور چائے میں ڈالنے کی ٹکیاں بنائی جاتی ہیں .... یہ بہت زبردست کارخانہ ہے اور کئی سو من کھانڈ کی ٹکیاں ایک دن میں اس جگہ تیار ہوتی ہیں - زیادہ تر کام مشین سے ہوتا ہے۔ کھانڈ کی کٹائی اور ڈبوں کے بنانے کی مشین وغیرہ پر تمام عورتیں کام کرتی ہیں جن کی تعداد سینکڑوں کی ہوگی۔

اس کے بعد ہم نے یہاں کا زراعتی ہائی اسکول دیکھا۔ اس جگہ سب سے عجیب رواج یہ ہے کہ صرف وہ طلباء لئے جاتے ہیں جو بارہ سال معمولی مدرسوں میں تعلیم پا چکے ہوں اور اس کے بعد کم سے کم دو سال کھیت پر کھیتی اپنے ہاتھ سے کر چکے ہوں۔ اعلیٰ افسران سے گفتگو کرنے پر معلوم ہوا کہ ان کا یہ خیال ہے کہ جب تک لڑکے کھیتی کرنے کے بعد اسکول یا کالج میں نہیں آتے ان کو کھیتی کرنے کی طرف رغبت نہیں ہوتی اور ان کا کام صرف کتابی ہوتا ہے جس سے قوم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا اور نہ ہی وہ کسان بننا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ اس خیال کو پسند نہیں کرتے کہ تعلیم ختم کر دینے کے بعد کسان کا کام کرنے کے لئے لڑکوں کو مجبور کیا جائے۔ انھوں نے اپنی یہ رائے تجربہ کی بنا پر قائم کی ہے۔

کہ زراعت کی اعلیٰ تعلیم سے پہلے کھیت پر کام کر لینا ضروری ہے ۔ ان لوگوں نے بتایا کہ جب سے یہ طریقہ رائج کیا گیا ہے کافی تعداد ان کے طلبا ، کی کسان کا کام کرتی ہے ۔ اور کسان کے کام میں کافی ترقی ہوئی ہے ۔ہم سمجھتے ہیں ہندوستان کی سرکار کو بھی اس تجربہ سے فائدہ اٹھانا چاہیئے :تاکہ صرف نوکری کی تلاش کرنے والے طلبا ، زراعتی کالجوں سے نہ پیدا کئے جائیں ۔ فصل اس جگہ نہایت عمدہ تھی ۔اور سینکڑوں قسم کے نئے نئے بیج پیدا کر کے ان پر تجربات کئے جا رہے ہیں ۔

اسٹٹ گارٹ عجیب قسم کا شہر ہے ۔ چاروں طرف پہاڑیاں ہیں اور بالکل وادی میں واقع ہے ۔شہر نہایت دلکش ہے اور اس کے چاروں طرف گھومنے سے سارا شہر جگہ بہ جگہ نظر آتا ہے اور نہایت دلکش نظارہ دکھائی دیتا ہے ۔اس شہر میں ایک بہت پرانا قلعہ ہے جو بہت عمدہ جگہ اونچائی پر واقع ہے ۔ اس کے سامنے سے ایک پرانی سڑک دوسرے قلعہ کو جاتی ہے جو اب بطور جیل خانہ کے استعمال ہوتا ہے ۔اس قلعہ میں بہت پرانی کرسیاں اور ایک پلنگ موجود ہے ۔ جو ڈیڑھ سو سال سے زائد بنا ہوا بتایا جاتا ہے اس پر بچھانے کا سامان ریشمی کپڑے کا ہے اور اس پر نہایت خوب صورت زر دوزی کا کام کیا گیا ہے یہ سامان ابھی تک بالکل نیا معلوم ہوتا ہے ۔عمارت میں کئی جگہ نہایت خوبصورت پچے کاری کی تصاویر بنی ہوئی ہیں ۔ اور بحیثیت مجموعی عمارت میں ایک خاص شان پائی جاتی ہے آج کل اس جگہ شام کے وقت لوگ کافی تعداد میں تفریح کے لئے آتے ہیں ۔

اسٹٹ گارٹ میں ایک نہایت عالیشان عمارت تیراکی سکھانے کے لئے بنائی گئی ہے ۔جس میں عجیب طرح کی مشین لگائی ہے ۔جو پانی کو مختلف درجہ حرارت پر رکھتی ہے ۔اگر پانی میں گندگی ہو تو اس کو صاف کرتی ہے ۔ایک طرف بیسیوں مکانات ایک ایک آدمی کے نہانے کے لئے بنے ہوئے ہیں جہاں پر اگر کوئی صاحب چاہیں تو گرم یا ٹھنڈے پانی سے نہا سکتے ہیں یا فوارہ سے پانی لے سکتے ہیں ۔ایک بہت بڑے مکان میں دو تالاب بنائے گئے ہیں جن کے بیچ میں صرف اوپر کی طرف ایک پل نما پگ ڈنڈی بنا دی گئی ہے ۔ ایک طرف پگ ڈنڈی کے عورتیں تیرتی ہیں اور دوسری طرف مرد تیرنے کا کام سکھانے کے لئے ہر وقت آدمی رہتا ہے اور سینکڑوں آدمیوں کا جمگھٹا ہر وقت رہتا ہے ۔اس تالاب کا پانی ہر وقت

ایک طرف سے آتا اور دوسری طرف سے خارج ہوتا رہتا ہے تاکہ پانی خراب نہ ہونے پائے۔ کہا جاتا ہے کہ جرمنی میں یہ چیز صرف اس جگہ ہے۔ یوں تو تیرنے کے تالاب اور بھی بہت سی جگہوں پر ہیں۔ مگر خوبصورتی کے ساتھ ایسی عمارت اور عمدہ انتظام کسی جگہ نہیں ہے۔ انتظام کے لئے افسر رہتے ہیں۔ چھوٹا سا مکان کھانے پینے کی اشیا بہم پہونچانے کے لئے موجود ہے۔ غرضکہ نہایت تفریح کی اور کارآمد جگہ ہے۔

اس کے بعد ہم کارلزرہ کے لئے روانہ ہوئے۔ زراعتی محکمہ کے افسر جو انگریزی بخوبی جانتے تھے۔ ہم کو اسٹیشن پر مل گئے اور ہوٹل میں ہمراہ لے گئے۔ ایک صاحب جرمنی کے رہنے والے ہیں۔ کینیڈا میں کھیتی کرتے تھے وہاں چونکہ نقصان ہونا شروع ہوا۔ اس لئے سب اراضی فروخت کرکے واپس چلے آئے۔ اور اب سرکاری ملازمت کرلی۔ انہوں نے زراعتی ڈپلوما پہلے ہی حاصل کرلیا تھا جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ زراعتی اسکولوں کے طلبا اکثر کھیتی کرتے ہوں گے۔ کارلزرہ اگرچہ چھوٹا مگر پرانا شہر ہے۔ رات کو ہم ہوٹل میں ٹھیر گئے اور صبح کو تمباکو کے فارم میں پہونچ گئے۔ وہاں کے افسر نے ہم کو تمام قسم کے تمباکو دکھائے۔ شاید ہی دنیا کے اندر کوئی خطہ ایسا ہوگا جہاں کا تمباکو یہاں موجود نہ ہو۔ پانچ سو سے زائد اقسام تو باہر کے تمباکو کی اس جگہ تھیں اور ہزاروں قسم کے تمباکو انہوں نے خود پیدا کئے تھے جس پر یہ لوگ اپنے تجربات کررہے تھے۔ اس اسٹیشن کے ذمہ دار افسر جرمن ہیں جو سن رسیدہ ہیں اور عرصہ تک مصر میں کپاس کی تحقیقات پر کام کرتے رہے ہیں۔ اور اب اس جگہ کام کرتے ہیں۔ انگریزی نہایت عمدہ بولتے ہیں اور نہایت خوش خلق آدمی ہیں۔ انہوں نے بہت سی کتابیں بھی تمباکو۔ کپاس وغیرہ اجناس پر لکھی ہیں۔ مگر بدقسمتی سے یہ سب جرمنی زبان میں ہیں۔ اس لئے ہم ان سے کوئی خاص فائدہ نہیں اُٹھا سکتے تھے۔ تمباکو کے متعلق جس قدر طریقے ترقی کے ہم سوچ سکتے تھے وہ سب یہاں کئے جارہے ہیں اور ان کا اثر دیکھا جارہا ہے۔ تمباکو کے پودوں کے درمیان کتنا فاصلہ ہونا چاہئے۔ کس قسم کی اراضی پر کون سا تمباکو اچھا ہوگا۔ پانی دینے اور نہ دینے کا کیا کیا اثر تمباکو کی مقدار اور خاصیت پر پڑتا ہے۔ کون سا کھاد ڈالنا مفید ہوگا کس موسم میں تمباکو بونا کس علاقہ جرمنی میں ٹھیک ہے۔ تمباکو کے سکھانے اور اس کو رچانے کا عمدہ طریقہ کیا ہے۔ وغیرہ وغیرہ

غرضکہ یہ ایک بہت بڑا فارم ہے اور ہر طریقے پر تمباکو کی تحقیقات جاری ہے۔ یہ لوگ اس تحقیقات کے پیچھے پاگل سے معلوم ہوتے ہیں۔ ہم نے کئی بار چاہا کہ زیادہ دیر تک وہاں نہ ٹھیریں کیونکہ دوسری جگہ جانے کا پہلے سے پروگرام تھا اور ان لوگوں کا انتظار کرنا برا معلوم ہوتا تھا مگر ان لوگوں کی دلچسپ کہانی اور نئے نئے طریقوں کا بیان ہم کو جانے نہ دیتے تھے۔ ناظرین کو تعجب ہوگا کہ ان لوگوں نے ایسا تمباکو پیدا کیا ہے جس میں وہ چیز جس سے نشہ ہوتا ہے یعنی نکوٹین بالکل نہیں ہے اور اس تمباکو کی کاشت چند کاشتکاروں سے ان کو بلا بتلائے ہوئے کرائی گئی ہے جس میں بڑی کامیابی ہوئی یعنی پیداوار میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ اب اس کے مزید تجربات کرنے کے بعد امید ہے جرمنی یہ تمباکو بہت جلد بازار میں بھیج سکے گا۔ اس کی طبی تحقیقات باقی ہے۔ اس کا بیج ہم حاصل کرنا چاہتے تھے مگر انہوں نے کہا کہ چونکہ ابھی تجربہ ختم نہیں ہوا ہے اس لئے اس کا بیج نہیں مل سکتا۔ اور بہت سی اقسام کے بیج ان لوگوں نے ہم کو دئے جن کے لئے ان کے مشکور ہیں۔ دوسری عجیب چیز جو ہم نے دیکھی وہ یہ تھی کہ ایک کھیت میں برابر سال بہ سال تمباکو اگایا جارہا ہے۔ سات سال ہو چکے ہیں مگر تمباکو کی خاصیت اور پیداوار پر کوئی خاص اثر نہیں پڑا ہے۔ بلکہ پیداوار بڑھ رہی ہے اور قسم عمدہ ہو رہی ہے۔ ہندوستان کے مبصر اگر اس ملک کے اندر ہوتے تو ایسے سب لوگوں کو جو اس قسم کے تجربات کرکے ارضی کا ستیاناس کر رہے ہیں اور نئی نئی بیماریاں ان کے خیال کے بموجب پیدا کر رہے ہیں جیل خانہ کے اندر ٹھونس دیتے ان کو ایکھ کی کاشت دو سال تک بھی کھیتوں میں کرنا ناگوار گزرتی ہے یہ ہماری بدقسمتی نہیں تو کیا ہو کہ ہمارے ہندوستانی مبصر نہ تو خود کچھ کرنا چاہتے ہیں اور نہ دوسرے لوگوں کو کچھ کرنے دیتے ہیں۔ جس ملک کے اندر بچہ سے لے کر بوڑھے تک میں اپنے ملک کی ترقی کی لگن ہو وہ ملک اگر ترقی نہ کرے گا تو کون کرے گا۔

اس وقت ایک بہت بڑی عمارت نہایت عجلت کے ساتھ تعمیر کی جارہی ہے جس میں اس سال کی فصل جو ۵ اروز کے بعد ٹوٹنی شروع ہو جائے گی سکھائی جاسے گی اس کے اندر جو مشین لگائی جارہی ہے وہ نہایت عجیب قسم کی ہے۔ ہم نے اس کو دیکھا ہے کیونکہ وہ لگائی جا چکی ہے۔ اگر کسی درجہ حرارت یا درجہ

رطوبت کو کچھ دنوں تک قایم رکھنا ہو تو یہ طریقہ کام میں لایا جائے گا۔ اس مشین کے ذریعہ ایک بار سب چیزیں ٹھیک کر دینے پر از خود گرمی سردی۔ رطوبت اور خشکی ایک درجہ پر رکھی جا سکتی ہیں۔ نہ صرف سارے مکان میں بلکہ ہر ایک کمرہ میں مختلف درجہ حرارت و درجہ رطوبت قائم رکھے جا سکتے ہیں۔ جب کبھی گرمی بڑھ گھٹ جائے گی یا رطوبت میں کمی بیشی ہوگی تو ایک دم ایک پرزہ اپنی جگہ تبدیل کر کے اس سب کو ٹھیک کر دے گا۔ یہ مشین یہاں کے مبصرین کی نئی ایجاد ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس قسم کی مشین آج تک کسی جگہ نہیں لگائی گئی ہے ہمارے ملک کے مبصر تو مشین منگا کر اس کا استعمال کرنا بھی نہیں جانتے مگر یہ لوگ ہیں کہ نئی مشینیں اختراع کرتے اور اس سے کام لیتے ہیں صرف اتنا ہی نہیں۔ بلکہ سب سے زیادہ معرکہ کی بات یہ ہے کہ آپ کوئی قسم تمباکو کی ان لوگوں کو دے دیں اور دریافت کریں کہ وہ کس قسم کا تمباکو ہے تو یہ اس کو بلا سونگھے اور چھوئے یعنی انسانی حواس سے بلا کسی قسم کا کام لئے بتا دیں گے کہ وہ پینے میں کیسا ہے سونگھنے میں کیسا ہے اور اس کی دیگر خاصتیں کیا ہیں۔ عموماً تین چار قسم کے تمباکو زیادہ تر بوئے جاتے ہیں۔ اول وہ تمباکو جس سے عمدہ سگرٹ بنائے جا سکیں۔ دویم وہ جو پائپ کے اندر پینے کے لائق ہو۔ سویم ایسے تمباکو جو سگار کے کام آسکیں۔ چہارم وہ جو تینوں یا دونوں باتوں کے لئے کارآمد ہو سکیں۔ اس وقت اس بات پر خاص توجہ دی جا رہی ہے کہ تمباکو میں پتوں کی تعداد بڑھائی جائے تاکہ پیداوار میں خاطر خواہ اضافہ ہو۔ اس بات میں بڑی کامیابی ہوئی ہے اور ناظرین یہ جان کر تعجب کریں گے کہ ہم نے خود ایسے پیڑ دیکھے ہیں جن پر ساٹھ ساٹھ پتے پائے گئے ہیں ڈنٹھل پر پتوں کے درمیان جگہ کم کر دی گئی ہے۔ اگرچہ ایسا کرنے سے پتہ کچھ چھوٹا ضرور ہو گیا ہے مگر ان لوگوں کی رائے میں یہ تمباکو سگرٹ اور پائپ کے لئے خصوصیت کے ساتھ عمدہ ہے۔ چونکہ یہ تجربہ بھی ابھی مکمل نہیں ہوا ہے اس لئے ہم کو اس کا بیج نہ مل سکا۔ ہم یقین کرتے ہیں جس وقت یہ تجربات مکمل ہوں گے۔ دنیا میں چکا چوندہ پیدا کر دیں گے۔ اور لوگوں کی سمجھ میں آجائے گا کہ جو شخص لگن کے ساتھ کام کرتا ہے وہ کیا نہیں کر سکتا؟

مختلف طریقہ پر پتوں کو سکھانے کے تجربات اس جگہ کئے جا رہے ہیں مگر کسانوں کے لئے صرف دو طریقہ یہ لوگ بتاتے ہیں اول طریقہ یہ ہے کہ پتوں کو توڑ کر ان کی اقسام کرنے کے بعد ایک ڈورے

میں پرو دیا جاوے اور ان کو چھت کی کڑیوں میں کیل لگا کر لٹکا دیا جائے تاکہ وہ دھیرے دھیرے سوکھتا رہے اور جب تباکو کے پتے اس طرح سوکھ جائیں تو ان کو سرکاری کیورر کے ہاتھ فروخت کر دیا جاوے جہاں اس کے انتخاب اور بار بار الٹ پلٹ سے اس کو بہتر بنایا جاسکتا ہے۔ سرکار کی طرف سے تباکو کی قیمت مقرر ہے اور سوسائٹی کے اس نظام کے کاشتکار بھی ممبران ہیں۔

اس کے بعد ہم نے مشہور و معروف فیکٹری دیکھی مارنہائم کے اندر ہے جہاں بُل ڈوگ یا لیتر قسم کے نفیے من کے تیل سے چلنے والے ٹریکٹر بنائے جاتے ہیں۔ یہ فیکٹری میلوں کے اندر واقع ہے اور ساٹھ ستر سال پرانی ہے۔ اس وقت یہ لوگ ....

صرف ٹریکٹر اور بھوسہ اڑانے اور گہانے کی مشینیں زیادہ تر بناتے ہیں۔ ابھی ایک قسم کا ٹریکٹر ان لوگوں نے بنایا ہے جس میں چھ قسم کی چال ہوگی اور اس کو نہ صرف کھیتوں کے اندر استعمال کیا جائے گا بلکہ سڑکوں پر بھی عام لاریوں کی طرح ۲۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دس ٹن سامان لے کر چل سکے گا۔ جرمنی ان ممالک میں نہیں ہے۔ جہاں پی۔ ڈبلیو۔ ڈی کے حکام یا دیگر ضلع کے حاکم یہ کہ سکیں کہ ۱½ و ۲ ٹن سے زیادہ وزن کی لاریاں سڑک خراب کر دیں گی یہاں ایک انجن سے تین تین لاریاں ایک ساتھ ہانکی جاتی ہیں اور دو کا تو عام رواج ہے اور یہ سب لاریاں تین تین اور چار چار ربڑ سے بڑے شہروں کے اندر سے جہاں موٹر وغیرہ کی بکثرت آمد و رفت ہے مال سے ٹھسا ٹھس بھری ہوئی برابر دوڑتی رہتی ہیں۔ نہ یہاں کے پل خراب ہوتے ہیں اور نہ سڑکیں گھستی ہیں دراصل کسی کی تجارت و زراعت کی ترقی کا دارومدار زیادہ تر اس ملک کی باربرداری کے نظام پر ہے۔ ہمارے یہاں باربرداری کا ذریعہ ریل ہے اور یہ تجارتی سامان سستے داموں پر ڈھونے اور جلد ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے سے قاصر ہے پھر ستم ظریفی یہ ہے کہ کسی اور قسم کی باربرداری کو بھی ہندوستان میں پنپنے نہیں دیتی ہمارے خیال میں زمانہ آگیا ہے کہ ہمارے بھائیوں کو اسمبلی و کاونسلوں میں اس بات کی زبردست کوشش کرنی چاہئے کہ بڑی بڑی لاریاں اور دوسری قسم کی باربرداری کی مشینیں ریل کے مقابلہ میں چلائی جاسکیں۔ اگر ریل کا محکمہ اپنی آمدنی کا انتظام کرنا یا خرچ کی پرتال کرنا نہیں جانتا تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ کسی اور قسم کے باربرداری کو ہندوستان کے اندر نہ پنپنے دے۔ غالباً ہمارے تجارت پیشہ لوگ اس بات کی طرف کم توجہ کرتے ہیں اور ہمارے

ممبران اسمبلی و کاونسل تو اس سے واقفیت حاصل ہی نہیں کر سکتے جب تک وہ اس طرف خاص طور پر متوجہ نہ ہوں زراعت پیشہ لوگ تو بیچارے جاہل ہی ٹھہرے۔ پھر اس میں تبدیلی ہو تو کیسے ہو؟ ہم کو سب سے زیادہ زور اس بات پر دینا واجب ہے کہ معمولی بہانہ سازی سے سرکاری حکام ہم کو سستی قسم کی باربرداری سے باز نہ رکھ سکیں اگر واقعی پل اچھے نہیں ہیں اس کی صحت میں ہم کو شبہ ہے۔ تو ان کو توڑ کر ٹھیک بنایا جائے بجائے اس کے کہ باربرداری کی سستی قسم کو کام کرنے سے روکا جاوے۔ اس طرح لاکھوں آدمیوں کو روزگار مل سکے گا۔ اور سامان و مسافر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہونچنے کی وجہ سے بازاروں کی حالت عمدہ ہو سکے گی اور تجارت و زراعت کو فروغ ہوگا جس قدر زور اس بات پر دیا جاوے اسی قدر تھوڑا ہی۔ ہم امید کرتے ہیں ہمارے بھائی اس ضرورت کو محسوس کریں گے۔

اس کارخانہ نے ایک ایسا ٹریکٹر بنایا ہے جس سے بھوسہ اس قسم کا باریک ہوجاتا ہے جیسا کہ ہم لوگ بیلوں کے لئے استعمال کرتے ہیں اور اناج صاف ہوجاتا ہے۔ بدقسمتی سے اس قسم کا ٹریکٹر اس وقت موجود نہ تھا کیونکہ جرمنی میں یہ فصل کٹنے کے دن ہیں اور ان لوگوں کی تمام توجہ جرمنی کی ضرورت کی مشینیں بنانے کی طرف تھی۔ مگر اس قسم کے ٹریکٹر کافی تعداد میں اس وقت اسی کارخانہ کے بنائے مصر میں کام کر رہے ہیں جہاں کے لوگ بھوسہ کو مویشیوں کے چارہ کے لئے کام میں لاتے ہیں۔

ہم نے اپنے ٹریکٹروں کے متعلق چند شکایات کیں کیونکہ ہم بھی اس کارخانہ کے ٹریکٹر استعمال کر رہے ہیں انہوں نے نہایت خندہ پیشانی سے ہم سے تفصیل دریافت کی اور اس کی خرابی کی وجوہات بتائیں اور کہا کہ ہم چاہے جس وقت ان کو مفصل حالات لکھ کر ان کی رائے دریافت کر سکتے ہیں۔ اور وہ ہمیشہ خوشی سے ہم کو اس کا جواب دیں گے۔

جرمنی میں انگریزی سکہ کی دو قیمتیں ہیں ایک وہ جو معمولی بازار کی قیمت ہے اور اس وقت ۱۲ مارک کے قریب ہے۔ دوسری ان لوگوں کے لئے جو دوسرے ممالک سے جرمنی میں آتے ہیں اگر وہ چھ روز سے زائد کے لئے آنا چاہیں تو ان کو پونڈ کے بدلہ میں قریب ۱۸ مارک دے دئے جاتے ہیں اور مسافر ان مارکوں کو بھنا کر اپنا خرچ چلا سکتے ہیں۔ مگر قاعدہ یہ ہے کہ ایک دن میں صرف پچاس مارک خرچ کئے جا سکتے

ہیں اور یہ مارک بھی صرف دو روز کے لئے مل سکتے ہیں اور صرف بنک سے بھنائے جا سکتے ہیں۔ یعنی اگر کوئی شخص ساٹھ مارک روزانہ خرچ کرے گا تو اس کو پونڈ کے بدلے میں صرف ۱۲ مارک ملیں گے لیکن اگر روزانہ خرچ کے لئے پچاس مارک چاہے گا تو ۱۰ مارک ملیں گے۔ یعنی مسافروں کے لئے مارک کی قیمت دو تہائی کر دی گئی ہے۔ ہم نے بھی بیس دن کے مارک خرید کر لئے تھے جب ہم کاسرو پہونچے تو ہمارے پاس بہت کم مارک رہ گئے تھے اور ہم چاہتے تھے کہ اس دن کے پچاس مارک اور اگلے دن کے پچاس مارک بنک سے لے لیں مگر جب بنک میں پہونچے تو معلوم ہوا کہ اس علاقہ میں مسافروں کو صرف پچیس مارک مل سکتے ہیں پچاس نہیں۔ اب ہم بڑی چہ میگنم میں پڑ گئے کیونکہ ہم کو ہوٹل کے دام ادا کرنے تھے۔ جو افسر زراعت کے ہمارے ساتھ تھے انہوں نے کہا کہ یہ معمولی بات ہے ہم ہوٹل کا بل ادا کر دیں گے اور ہیلڈل برگ جہاں ہم کو دوسرے روز جانا تھا اور جہاں پچاس مارک مسافر کو مل سکتے ہیں وہاں ہم مارک بھنا سکتے ہیں۔ مگر معلوم ہوا کہ اس دن جمعہ ہے اور اگلے روز صرف دوپہر تک بنک کے دفتر کھلے رہیں گے اور اس سے اگلے دن اتوار ہونے کی وجہ سے دفتر بالکل بند رہیں گے۔ موجودہ نظام کے بموجب ہم صرف رات کو ہیڈلبرگ پہونچتے تھے۔ اس لئے پروگرام کو تبدیل کرنا پڑا اور میں نے یہ طے کیا کہ ہیلڈلبرگ جا کر پہلے روپیہ لے لیا جاوے اور اس کے بعد اور کسی جگہ کو دیکھا جاوے۔ چنانچہ ہم ہیلڈلبرگ گئے اور ہم نے ڈیڑھ سو مارک تین دن کے لئے لے لئے کیونکہ ایک دن ہمارا پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔ اب ہم کو تسلی ہوئی اور روپیہ کی فکر دور ہوئی۔

جرمنی کی مشہور و معروف کمپنی بے ڈی شن انیلین سوڈا فیکٹری کا نام ہر تاجر نے سنا ہو گا یہ کمپنی سب قسم کے رنگ لڑائی سے پہلے بنایا کرتی تھی۔ اب بھی یہ رنگ بناتی ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اس نے مختلف قسم کے مصنوعی کھاو بنانے شروع کر دئے ہیں۔ ہر دو کارخانہ اب ایک ٹرسٹ کے ماتحت ہیں جو جرمنی کی تمام کارخانوں کی کیمیاوی پیداوار کو فروخت کرنے کا ذمہ دار ہے اور اب اس کا نام بھی بدل دیا گیا ہے۔ رائن ندی کے کنارے پر یہ کارخانہ قریب ۵ میل لمبا ہے۔ اور اس میں بیسیوں چمنیاں آسمان سے باتیں کرتی ہیں۔ سارے کارخانے میں محض چکر لگانے کے لئے ہم کو کئی دن چاہییں تھے۔ اس لئے ہم نے صرف کھاو بنانے کے حصہ کو دیکھنا چاہا۔ یہ کارخانہ بھی بہت دور تک چلا گیا تھا اور اس کی

کھاد کے بنے ہوئے ڈھیر کارخانہ میں چھوٹے چھوٹے پہاڑ معلوم ہوتے تھے نمونا کارخانے میں یہ طریقہ ہے کہ ریل کی ویگن آکر اُس کے باہر کھڑی ہو جاتی ہے، اور تمام تیار سامان اُس ویگن کے اندر بھرتا رہتا ہے جب یہ بھر جاتی ہے تو دوسری اُس کی جگہ آجاتی ہے۔ اس وقت میں بھی اسٹور میں کافی مقدار کھاد کی موجود تھی۔ اتنے لمبے کارخانہ کے کاموں کی تفصیل جہاں سینکڑوں قسم کے کھاد اور دوسری چیزیں بنائی جاتی ہوں ناممکن ہے۔ اس لئے ہم صرف چند باتیں بتانے پر اکتفا کریں گے۔ یہ کارخانہ بجلی سے کھادیں بناتا ہے۔ ہندوستانی مبصرین سے گفتگو ہوتی ہے تو وہ بتاتے ہیں کہ ہندوستان میں سستی بجلی نہیں ملتی۔ اس وجہ سے ہوا کی نائٹروجن سے مصنوعی کھاد نہیں بنایا جاسکتا۔

یہ بات بالکل غلط ہے۔ کیونکہ بجلی جرمنی میں بھی سستی نہیں ہے۔ اور ہر کارخانہ ہوا کی نائٹروجن کو کام میں لانے کے لئے بجلی کا استعمال نہیں کرتا۔ یہ اور بات ہے کہ ہمارے مبصرین کسی کام کو کرنا نہ چاہیں۔ یا اُن کو واقفیت نہ ہو مگر اُن کو کوئی حق نہیں ہے کہ وہ ہمیں گمراہ کریں۔ ناظرین کی واقفیت کے لئے ہم اس طریقہ کو بھی بتادینا چاہتے ہیں۔ اگرچہ اس کی تفصیل وار کیمسٹری سے متعلق ہماری واقفیت بھی قطعی محدود ہے اور اس قلیل عرصہ میں ہم پوری واقفیت پیدا بھی نہیں کر سکتے۔

پانی کی بھاپ کو جس میں ہائیڈروجن اور آکسیجن آمیز ہوتی ہے کوئلہ پر سے گزارا جاتا ہے تاکہ پانی پھٹ کر اُس کی ہائیڈروجن الگ ہوجائے اور اسی طرح ہوا کو جس میں نائیٹروجن زیادہ مقدار میں ہے گزارا جاتا ہے اور خالص نائٹروجن الگ کرلی جاتی ہے۔ جو بقیہ اجزا اور پانی سے بچ رہتی ہے وہ دوسری چیزوں کے کام آتی ہے۔ اس طرح ہائیڈروجن اور نائٹروجن دو گیسیں الگ الگ بن کر ایک انجن کے پائپ میں آنی شروع ہوتی ہیں۔ ان ملی ہوئی گیسوں پر بہت زیادہ ہوا کا دباؤ ڈالا جاتا ہے۔ تاکہ ان کے آئندہ ملنے میں سہولت ہو۔ ان "دبی ہوئی" گیسوں کی مخلوط چیز کو ایک بہت بڑے اور مضبوط چولھے کے اندر سے گزارا جاتا ہے جس میں ایک قسم کی کیمکل چیز موجود رہتی ہے جو اس کارخانہ کا بھید ہے۔ جب اُس میں سے گزارتے ہیں تو یہ دونوں گیسیں مل کر امونیا بنادیتی ہیں۔ جس سے اور دوسری

کھادیں جن میں نائیٹروجن ہوتی ہے بنتی ہیں۔ کئی قسم کی کھادجن میں۔ نائٹروجن ہوتی ہے اس کارخانہ میں تیار ہوتی ہیں مگر صرف دو مشہور کھادوں کا ہم ذکر کریں گے۔ کیونکہ بقیہ قسم کے کھاد ہندوستان کے اندر انگریزی کارخانے اس وقت فروخت کر رہے ہیں۔ اول کھاد کی قسم نائیٹروفوس ہے

جس میں نائیٹروجن بارہ فیصدی فاسفورس بارہ فیصدی پوٹاش ۱۲ فیصدی اور چونا ۸ سے ۱۰ فیصدی تک ہوتا ہے۔ یعنی نصف سے زائد اشیاء پودہ کے کام آنے والی ہوتی ہیں۔ یہ کھاد سب سے زیادہ کارآمد سمجھا جاتا ہے۔ دوسرا کھاد یوریو کہلاتا ہے جس میں ۴۶ فیصدی نائیٹروجن ہوتی ہے۔ یہ دونوں کھاد ہندوستان میں بہت مفید ہوں گے مگر معلوم ہوا ہے کہ تمام دنیا کے کھاد بنانے والوں نے یہ طے کر دیا ہے کہ کس ملک کے ہاتھ کون ملک کھاد فروخت کرے اس لئے یہ کارخانہ ہم کو نہ بتا سکا کہ آیا ان کا فروخت کرنا ہندوستان میں ممکن ہے یا نہیں برلن سے اس بات کا پتہ لگ سکے گا۔ جو مصنوعی کھاد اس وقت ہندوستان کے اندر آتے ہیں اُن میں کوئی کھاد بھی ایسا نہیں ہے جس میں چاروں جز ایک جگہ پائے جاتے ہوں اور نہ کوئی کھاد ایسا ہے جس میں نائیٹروجن کی مقدار اس قدر زیادہ ہو۔ ہندوستان میں یہ دونوں کھاد استعمال کئے جائیں تو یقین ہے کہ بہت مفید ثابت ہوں گے۔ اس کارخانہ کی ایک بہت بڑی فارم بھی ہے جس میں پودوں پر ان کھادوں کا تجربہ کیا جاتا ہے ہم بھی اسے دیکھنے گئے۔ ہزاروں قسم کے پودے اور فصلیں اس جگہ موجود ہیں بلکہ دنیا بھر کی سب مشہور مشہور فصلوں پر تجربہ کیا جاتا ہے اول پودوں کو معمولی ریت کے اندر گملوں میں اُگا کر تجربات کئے جاتے ہیں۔ پھر جو بات گملوں میں صحیح ثابت ہوتی ہے اُس کے تجربات مختلف کھیتوں میں کئے جاتے ہیں۔ بعض بعض جگہوں کی مٹی منگا کر اُس میں بھی پودوں کو بویا گیا ہے۔ چاول۔ گنا۔ جو یہاں بالکل نہیں ہوتے وہ بھی نہایت عمدگی کے ساتھ اس جگہ اُگے ہوتے تھے۔ البتہ اس مکان کی آب و ہوا کو مصنوعی طور پر بنایا گیا تھا۔

جیسا کہ ہم پیشتر لکھ چکے ہیں جرمنی میں ہر شخص کو جس کی عمر ۲۵ سال سے زائد نہ ہو چھ ماہ کے لئے ایک مرتبہ ضرور مزدوری کا کام کرنا پڑتا ہے۔ اور یہ کام عموماً مٹی کھودنے سڑک بنانے اور نہریں نکال کر زمینوں کو ٹھیک کرنے کا ہوتا ہے۔ ہر وقت اس طرح سینکڑوں کی تعداد میں نوجوان آدمی یہ کار خیر کرتے

رہتے ہیں انہیں معمولی مزدوری ملتی ہے۔ قیام کا انتظام حکومت کی طرف سے کیا جاتا ہے۔ ہمیں بڑی خواہش تھی کہ ان لوگوں کے کیمپ کو کسی نہ کسی جگہ کام کرتا ہوا دیکھیں۔ چنانچہ راستہ میں ایک جگہ اس قسم کا ایک کیمپ دیکھنے کا موقع ملا۔ لکڑی کا بنا ہوا ایک نہایت خوش نما کیمپ دو سو پچاس مزدور نما طالب علموں کے لیے بنایا گیا ہے۔ چاروں طرف سے گھرا ہوا ہے صرف دو دو دروازے رکھے گئے ہیں۔ بیچ میں ایک لگا ہے۔ دونوں دروازوں پر ان ہی مزدوروں میں سے دو لڑکے چوکیدار کی حیثیت سے پہرا دیتے ہیں۔ ان کے پاس ایک شوول مٹی کھودنے کا اور ایک لمبا اوزار پہرا دینے کے لئے ہے جو اس بات کی نشانی ہے کہ یہ مزدوروں کا کیمپ ہے۔ اور مزدوری کرنا جرمنی میں شان کی بات ہے۔ اس چوکیدار سے اجازت لے کر اندر گئے تو ایک طالب علم جو اس جگہ سارجنٹ کا عہدہ رکھتا تھا ملا۔ اس نے بڑی خندہ پیشانی سے سب چیزیں ہم کو دکھائیں۔ یہ کالج تک پڑھا ہوا تھا۔ قریب ۱۵ سال کے اسکول میں تعلیم پا چکا تھا۔ عمر لگ بھگ ۲۰ سال کے ہوگی۔ نہایت تندرست و توانا اور نہایت ذہین اور ہوشیار معلوم ہوتا تھا۔ اس وقت صرف دس بارہ لڑکے اندر موجود تھے جو کھانا پکا رہے تھے اور اسی قسم کے دوسرے کام کر رہے تھے۔ ایک طرف نہایت عمدہ باورچی خانہ تھا جہاں اگرچہ لکڑی اور کوئلہ جلایا جا رہا تھا لیکن دھوئیں کا پتہ نہ تھا۔ سب سامان نہایت صاف مگر بہت سادہ تھا۔ اس کے آگے ایک نہانے اور حجامت وغیرہ بنانے کی جگہ تھی۔ اس کے بعد رہنے کے کرے تھے ہر کمرے میں سولہ سولہ لڑکے رہتے ہیں۔ چار پلنگ نیچے تھے اور چار ان کے اوپر تھے۔ کمرے نہایت صاف اور بستر قرینہ سے لگے ہوئے۔ پلنگ سب لکڑی کے بنے ہوئے تھے کیمپ نہایت صاف ستھرا تھا اور اس طرح بنایا گیا تھا کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ آسانی سے منتقل ہو سکتا تھا۔ راستے میں ہم نے اُن لڑکوں کو ایک جھیل کے اندر گہری نالی کھودتے دیکھا تاکہ جھیل کا پانی نکل جائے اور کھیت قابل کاشت ہو جائیں۔ واقعی دیکھنے کے لائق نظارہ تھا، تعلیم یافتہ نوجوان جن میں کئی ڈگری حاصل کئے ہوئے تھے، کدال، پھاوڑا لئے مٹی کھود رہے تھے۔ اور اپنے ملک کی حالت درست کرنے میں لگے ہوئے تھے، ہماری آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے اور ہم نے سوچا کہ کیا ہندوستان میں بھی وہ زمانہ کبھی آئے گا جب اُن میں یہ شریفانہ جذبات بیدار

ہوں گے جب مزدوری کا یہی سبق انہیں سکھایا جا سکے گا ۔جس ملک کے نوجوان اس طرح سے مزدوری کا سبق اسکولوں میں نہیں بلکہ مٹی کے ساتھ کشتی کرکے اور پسینے پسینے ہوکر پڑھتے ہوں اس ملک کے نوجوانوں میں وطن کی دوستی کا جذبہ ،خدمت کا جذبہ ،اور مزدوروں کی محبت کا جذبہ پیدا نہ ہوگا تو کیا ہمارے نوجوانوں میں ہوگا جن کو زمین سے نیچے پیر رکھنے میں عار ہے آج اگر ہندوستانی نوجوانوں میں یہ احساس پیدا ہو جائے تو ہزاروں نوجوان جو آج جوتیاں چٹخاتے اور ایک طرف سے دوسری طرف دھکے کھاتے پھرتے ہیں افسروں کی خدمت میں گڑگڑا کر نوکریاں مانگتے ہیں اور ذلیل ہوتے ہیں آن کی آن میں ملک کی حالت تبدیل کرسکتے ہیں، کیا حکومت کی طرف سے زبردستی لوگوں کو مزدوری کرنے کی تعلیم دینے کا سبق سکھایا جائے گا ،
آہ ہم کیا کہ رہے ہیں ہندوستان آخر ہندوستان اور جرمنی جرمنی رسی جل گئی مگر بل نہ گئے ،ہماری شان وشوکت کا بیچارا جرمنی کیا مقابلہ کرے گا ، ہم لنگوٹی میں پھاگ کھیلنے والے ٹھیرے اور جرمنی کے باشندے محنت پر یقین رکھنے والے ہمارا اُن سے کیا مقابلہ ،ایک طرف ملکیش اور پون، دوسری طرف مہاتما اور سادھو ،ایک طرف دنیا کے پیچھے پڑنے والے ، دنیاوی سکھوں کے لئے جان دینے والے دوسری طرف زندگی سے ہاتھ دھوکر عقبیٰ کی فکر کرنے والے !آہ! ہندوستانیو تم ہمیشہ قلاش ہی بنے رہو گے .ہندو اور مسلمان کی تفریق قائم رکھ کر زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہنا .اور ہمیشہ بھوکے مرنا تمہیں گوارا ہے اگر تم مین غیرت و احساس کا شائبہ بھی باقی ہے تو برہمن ،چمار، عیسائی، مسلمان ، ہندو، نوجوان، بوڑھے کمزور کندھے سے کندھا ملا کر ضعیف اور کمزور بھارت ورش کے سر کو اونچا کرنے کی کوشش کرو. جرمنی جیسے ناہموار ملک کو دیکھو آج سونا اُگل رہا ہے اور اپنے زرخیز ملک کو دیکھو دھول اڑتی ہے، انگلستان کے باشندے آکر تمہارے ملک کو خوبصورت نہ بنائیں گے یہ سب کچھ تم ہی کو کرنا ہوگا. ملک کی خوشحالی اور بدحالی تمھارے ہاتھ میں ہے نوجوانو! کیا تم ہندو مسلمان کی بیہودہ .بے معنی اور مصنوعی تفریق کو چھوڑ کر مزدوری کا سبق پڑھو گے کاش کہ تم خود ہی یہ سبق پڑھنے پر راضی ہوجاؤ ، ورنہ زمانہ کی ٹھوکریں ذلتیں اور رسوائیاں تمہاری کجی اور گمراہی کو دور کریں گی .آہ! کیا ہماری نحوست کے دن ختم نہیں ہوئے ہیں .اور کیا ابھی ہمارے نصیب میں اور بھی ذلتیں دیکھنی ہیں .

ذرا خیال تو کرو یہ وہی جرمنی ہے جسے تباہ کرنے کے لئے دنیا کی تمام طاقتوں نے مل کر کوشش کی اور ہر طرح سے اس کی تباہی پر کمر باندھی، صلح کی شرائط کیا تھیں، صرف تباہی کے آثار تھے، مگر جس طرح ایک دبی ہوئی لکڑی بوجھ اترتے ہی اچھل کر پانی پر سوار ہو جاتی ہے۔ جرمنی آج پھر اپنی تباہی کے اوپر سوار ہو چکی ہے اس میں وہی پرانی چہل پہل جاری ہے اس کے لوگ ویسے ہی خوش حال آج نظر آتے ہیں اس کی چمنیاں آج پھر چاروں طرف دھواں اُگل رہی ہیں۔ جو لوگ اپنے دلوں میں یقین کی نعمت رکھتے ہیں جنھیں اپنے اوپر بھروسہ ہو اپنے ملک کے لئے قربانی کر سکتے ہیں وہ سب کچھ حاصل کر سکتے ہیں دنیا کی کوئی طاقت ان کو نیست و نابود نہیں کر سکتی مگر جو لوگ اپنی تمام امیدوں، حوصلوں اور ارادوں سے منھ موڑ کر نوکری کی مالا جپ رہے ہوں جو دن پھر دوسروں کی غلامی ہی اپنی آزادی سمجھتے ہوں ان کی زندگی ایک غلام کی زندگی کے سوا اور ہو ہی کیا سکتی ہے۔ ہندوستانی نوجوانو! آؤ اپنی عقل، اپنی طاقت اپنے علم کو، اپنے ملک کو بہتر بنانے اور اپنے ملک کو اونچا اُٹھانے میں صرف کریں خدا ہماری مدد کرے گا۔ اور ضرور کرے گا۔

گھومتے گھومتے ہم ہینڈنبرگ پہونچے، اور ہم کو ایک پہاڑ کی اونچی چوٹی پر جو ہینڈنبرگ سے قریب آٹھ دس میل کے فاصلے پر ہوگی لے جایا گیا، یہاں ایک بڑا زبردست میدان تھا، اور پتھر کی سیڑھیاں تھیٹر کی شکل میں اوپر نیچے بنی ہوئی تھیں جن پر کم سے کم پندرہ ہزار آدمی بیٹھ سکتے تھے۔ چاروں طرف لاؤڈ سپیکر لگے تھے اور جھنڈے لگائے جا رہے تھے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ تمام سڑک جنگل کو کاٹ کر زمین ہموار کر کے پتھر چُن کر قرینے سے کوٹ کر ان ہی نوجوان مزدوروں نے بنائی ہے جن کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں پتھر کی سیڑھیاں بھی ان ہی نوجوانوں کا کارنامہ ہے۔ مقصد یہ ہے کہ جرمنی کے لوگوں کو تفریح کا سامان بہم پہونچ سکے اور پہاڑ کے ٹکڑے آسانی کے ساتھ شہر میں پہونچ سکیں اور اس کی قیمت میں اضافہ ہو سکے، کل اس جگہ رات کو ایک جلسہ ہوگا اس میں تمام طلبا جمع ہوں گے، اور سب لوگ، رؤسا، امیر و غریب ان کے کام کی داد دینے کے لئے بلا کسی فرق کے زمین پر بلا کسی امتیاز کے ایک ساتھ بیٹھیں گے آہ! کیا دلکش نظارہ ہوگا، ہم چاہتے ہیں کہ ان جوانوں کے درشن کریں جنھوں نے یہ نیک کام کر کے اپنے ملک کی سچی خدمت کی ہو گر بدقسمتی سے ہمارا پروگرام طے ہو چکا تھا۔ اور ہم اگلی رات کو نہ ٹھیر سکتے تھے۔ مجبوراً اس جلسے کی زیارت سے محروم رہے۔

کلام جگر

عشق ہے نصف الحقیقت کیوں پریشاں کیجئے
یعنی ہم پہ رحم کرکے، خود پہ احساں کیجئے

کب تک آخر مشکلات شوق آساں کیجئے
اب محبت کو محبت ہی پہ قرباں کیجئے

ایک اک ذرے سے حاصل درس عرفاں کیجئے
یعنی خود کھو جایئے، ان کو نمایاں کیجئے

پھر جنون بیخودی میں کچھ کمی سی آچلی
آج پھر برہم مزاج حسن جاناں کیجئے

اللہ اللہ سنتے ہیں، تم ہو رگ جاں سے قریب
اب تو ہر نشتر کو پیوست رگ جاں کیجئے

حسن کی رسوائیاں بھی حسن سے کچھ کم نہیں
ہو سکے۔ تو مثل بوئے گل پریشاں کیجئے

ہم نے تو دکھلا دیا خود بن کے محروم وصال
آپ سے ممکن جو ہو ناکام ہجراں کیجئے

سر سے پا تک اک نگاہ بے محابا ڈال کر
عمر بھر کے واسطے ممنونِ احساں کیجئے

آپ کو شرمایئے کیا؟ آپ کا دامن ہے پاک
ہم گنہگارِ محبت ہیں پشیماں کیجئے

آپ کے دشمن رہیں وقف خلش، صرف تپش
آپ کیوں غمخواری بیمار ہجراں کیجئے

دل یہ جو گذرے سو گذرے عشق کی ضد ہے یہی
آج اتنا چھیڑئے اُن کو کہ گریاں کیجئے

شانِ رحمت کو نہیں درکار کوئی پیشکش
احتیاطاً اکتساب کفر و ایماں کیجئے

نیرنگ حیات

مضطرب ہے ذرہ ذرہ عالم تعمیر کا
خواب ہی میں منتظر ہے خواب کی تعبیر کا

اک حجاب اٹھا تو حائل ہو گئے صد ہا حجاب
راز افشا ہو سکا کب حسن عالمگیر کا

جتنے آئینے بنے تھے وہ تو پردے ہو گئے
دیکھئے اب اور کیا عنوان ہو تشہیر کا

کھل نہیں سکتا کبھی راز نقوشِ کائنات
ہے بہت دھندلا سا منظر ہر اک تصویر کا

ہر نفس اک عقدۂ لاحل ہے اے ذوقِ خلش
بس نہیں چلتا یہاں کچھ ناخن تدبیر کا

صفحۂ ہستی پہ آتے ہیں نظر کتنے حروف
ہے مگر معدوم اب تک مدعا تحریر کا

زندگی کی ابتدا کیوں کر ہوئی کیسے ہوئی
سانس کا یہ سلسلہ ٹکڑا ہے کس زنجیر کا

ہر نفس پہ لغزشیں ہیں ہر قدم پہ ٹھوکریں
روئیے رونا کہاں تک عقل کی تقصیر کا

دور باش اے حسِ محرومی کہ ذوقِ بیخودی
ماحصل ہے عمر بھر کی کاوشِ تفسیر کا

غزل

کوئی باتوں باتوں میں "باوفا" جو کہہ گیا
مرا زخم خوردہ دل دھک سے ہو کے رہ گیا

ضبط اس لئے کیا تھا کہ راز ہو نہ فاش
اب میں اس کو کیا کروں دل میں درد رہ گیا

میری بے زبانیاں کام آگئیں کہ میں
غم کی ساری داستان اک نظر میں کہہ گیا

میرے دل کے ولولے آہ بن کے اڑ گئے
میرا جذبۂ جنوں آنسوؤں میں بہہ گیا

خون کے بدلے آنکھوں میں ایک لالی رہ گئی
دل میں درد کی جگہ ایک داغ رہ گیا

"نغمۂ روح"

میں نے شعر و سخن کے سانچے میں
اپنی آہ و فغاں کو ڈھالا ہے

دوستو! میرے پاس نغمہ کہاں
"نغمۂ روح" ایک نالہ ہے

دنیا کی رفتار

(۱) ممالک غیر

حبشہ | قوت کا طلسم بھی نظر بندی کے کیا کیا کھیل دکھاتا ہے۔ اس کی تاثیر سے عیب ہنر معلوم ہونے لگتا ہے اور ظلم انصاف۔ اور یہی نہیں کہ دوسرے ایسا سمجھنے لگتے ہوں، خود صاحب قوت اس آسیب کے اثر سے اپنی خود غرضیوں کو مقصد کائنات سے ہم آہنگ جاننے لگتا ہے۔ اگر کوئی مسحور ہونے سے بچ رہتا ہے تو وہ غصہ یا حیرت کے ساتھ یہ تماشہ دیکھتا ہے، مگر اس مجنون کے پاس جانے اور اس کے سر سے اس بھوت کو اتارنے کی ہمت کون کرتا ہے؟

اٹلی اپنے نئے قائد مسولینی کے عہد میں اسی حالت سے گذر رہا ہے۔ اس میں کیا کلام ہے کہ اٹلی میں سیاسی سازشوں کی جگہ ایک متحدہ قومی عزم کی تخلیق اسی کا کارنامہ ہے، اس نے یورپ کی سیاست میں اپنی قوم کے درجہ کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے، اور ایک کاہل قوم کے دل میں سرداری کا ولولہ پیدا کر دیا ہے۔ مگر یہ پرستش کرتا ہے صرف قوت کی۔ توپ اس کا خدا ہے! اور اقبال کا "فلاطونِ نسادیِ باطل پرست" میکاولی اس کا پیغمبر۔ یہ جب اپنے ملک کے غیر آباد علاقوں کو قابل کاشت بنا کر اس میں پہلی مرتبہ اپنے ہاتھ سے گیہوں بوتا ہے تو بھی اس امن کے کام میں اپنی ہر حرکت کا اعلان توپوں کی باڑھ سے کراتا ہے تاکہ معاملات انسانی میں قوت کے تصرفات کو اپنی قوم کے ذہن نشین کرا دے۔

اسی قوت کے بھروسہ پر اور دوسری دول کی باہمی رقابتوں کے سہارے مسولینی چاہتا ہے کہ حبش کے قدیم ملک کو سلطنت اطالوی میں شامل کرے۔ وجہ کیا ہے؟ یہ کہ حبش کے سپاہیوں نے ہماری فوج کے ساتھ زیادتی کی، ایک غیر متمدن قوم کی یہ گستاخی ایک ایسی قوم کے ساتھ جس نے "تاریخ بنائی ہے" ناقابل معافی ہے نتیجہ صاف ہے حبش پر اٹلی کا تسلط ہونا چاہیئے۔ قوت کی منطق کا یہی انداز ہوتا ہے۔

اب گستاخی کی حقیقت سنئے۔ حبش اور برطانیہ کے نمائندوں پر مشتمل ایک کمیشن سرحدی علاقہ میں حد بندی

کاکام کررہا ہے۔ اس کمیشن کے ساتھ کچھ حبشی سپاہی ہیں۔ ۵ر دسمبر ۳۴ء کو ولول کے کنوؤں کے قریب جو مصدقہ معاہدوں کی رو سے کوئی سو میل حبش کی سرحد کے اندر ہیں، اطالوی فوج کا سردار کپتان سمارتا ان حبشی سپاہیوں پر بلاکسی اطلاع کے حملہ بول دیتا ہے۔ حملہ کی کمک کے لئے ٹینک اور ہوائی جہاز بھی آتے ہیں۔ حملہ کے وقت حبشی سپاہی اپنے خیموں میں بے خبر بیٹھے ہیں۔ گھبرا کر نکلتے ہیں تو فوراً ہی ان کا سردار مارا جاتا ہے، کوئی ۱۰۷ سپاہی کام آتے ہیں، ۴۵ زخمی ہوتے ہیں۔

یہ بیان حکومت حبش کا نہیں ہے۔ واقعہ کے پانچ برطانوی شاہد بھی موجود ہیں۔ خود برطانوی کمشنر کرنل کلفورڈ کی تصدیق موجود ہے۔ جس اطالوی فوج کے ساتھ گستاخی کی یاداش میں قریب قریب سارے ملک حبش کو سلطنت روما کا جزو بنانے کی تجویزیں ہیں اگر اس فوج کے مزاج کا اندازہ لگانا ہو تو مذکورہ صدر کپتان سمارتا کی تقریر کا ایک

اقتباس ملاحظہ فرمائیے جو اس "گستاخی" کے ارتکاب سے پہلے انھوں نے ۲۳ نومبر کو اپنے کرایہ کے افریقی سپاہیوں کے سامنے فرمائی تھی:۔" اس وقت تو وَلوَل پر حبشیوں کے ساتھ انگریز بھی ہیں۔ مگر تم سومالی لوگ شیر نر ہو۔ شیر جب شکار کو دیکھتا ہے تو بس اس کی گردن دبا تا ہے اور اُسے ختم کر دیتا ہے۔ تم بھی یہی کروگے .... ابھی تو میرے ہوائی جہاز ہی آئے ہیں۔ مگر مسلح کاریں بھی پہنچنے والی ہیں۔ ہر ایک میں تین تین توپیں ہوں گی۔ یہ آجائیں تو پھر تمھیں ان حبشیوں سے جنگ کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑے گی۔ یہ مشینیں جو زمین پر چلتی ہیں اور ہوا میں اڑتی ہیں، کافی ہوں گی۔ اس وقت تم دیکھوگے کہ میں کیا کرتا ہوں۔ میں ان حبشیوں کو قہوہ کی طرح پیس ڈالوں گا۔"

ادیس ابابا میں ولول کے واقعہ سے ارباب حکومت کو جس قدر تکلیف ہوئی ہوگی وہ ظاہر ہے۔ مگر یہ بیچارے ایک غیر متمدن افریقی حکومت کے ارکان تھے، کیا کرتے؟ طرفہ یہ کہ تین چار روز بعد ان کے متمدن حریف کے سفیر نے سخت احتجاج کیا اور الٹا انھیں موردِ الزام بنایا۔ "مسلح حبشیوں نے ہم پر بلا اطلاع حملہ کیا۔ ہمارے مقتولین و مجروحین کی تعداد ابھی معلوم نہیں ہے، مگر میں اس واقعہ پر شدید احتجاج کرنا چاہتا ہوں اور مطلع کرتا ہوں کہ ہماری شاہی حکومت معافی اور تاوان کا مطالبہ کرے گی۔" حبش کے وزیر خارجہ نے اس کے جواب میں ۱۹۲۸ء کے معاہدۂ ثالثی کا ذکر کیا تو جواب ملا کہ "یہ بات شبہ سے بالکل خالی ہے کہ وَلوَل اور وردیر اطالوی سومالی لینڈ میں شامل ہیں .... اور حالات اس درجہ واضح ہیں کہ ۱۹۲۸ء کے معاہدہ کا اطلاق اس واقعہ پر نہیں ہو سکتا۔ تاوان اور معافی کا مطالبہ فوراً پورا ہونا چاہیے۔" مطالبہ یہ تھا کہ حبشی گورنر، ہرآر آکر، جو حبش علاقہ میں ہے لیکن جس پر اطالوی غاصبانہ قابض ہیں، معافی چاہے، اور اس کی فوج اطالوی جھنڈے کو سلامی دے، دو لاکھ پونڈ بطور تاوان ادا کیے جائیں، تمام اشخاص جن کا اس واقعہ سے تعلق تھا گرفتار اور اپنی خدمات سے سبکدوش کیے جائیں۔ یہ سب جھنڈے کی سلامی میں شریک ہوں اور اس کے بعد سب کو مناسب سزائیں دی جائیں۔

کمزور حکومت حبش سوائے اس کے اور کیا کر سکتی تھی کہ جمعیۃ اقوام سے، جس میں یہ شریک ہے، اپیل کرے۔ چوروں کے سامنے چوری کا مقدمہ پیش، مہینے گذر گئے اور وہ کچھ طے نہ کر سکے کہ کیا کرنا چاہیے۔ باہمی رقابتوں کی وجہ سے اگر کوئی رکن اٹلی کو اس دراز دستی سے روکنا چاہتا ہے تو اٹلی، جاپان اور جرمنی کی طرح، جمعیۃ سے علیحدہ ہونے کی دھمکی دیتا ہے جس سے ڈر ہے کہ جمعیۃ کا سارا ڈھونگ ہی ختم ہو جائے گا۔ دوسرے لوگ جن کے اغراض

خود حبش سے وابستہ ہیں، کبھی اٹلی کو دبانا چاہتے ہیں، کبھی حبش کی مصیبت سے فائدہ اٹھانے کی سوچتے ہیں اور اصل یہ ہے کہ اپنے معاملہ میں اٹلی سے سودا کرنے کی فکر میں ہیں۔ چنانچہ جمعیۃ اقوام کی آخری قرارداد یہی ہے کہ ۱۹۰۶ء کے معاہدہ کے مطابق فرانس، برطانیہ اور اٹلی معاملہ کو سلجھائیں۔ اس معاہدہ کی تمہید میں اس کی غرض یوں ظاہر کی گئی ہے:۔ "فرانس، برطانیہ اور اٹلی تینوں کے مشترک اغراض کا تقاضا ہے کہ حبش کی ملکی خودمختاری کو قائم رکھا جائے .... بہرحال تینوں حکومتوں میں سے کوئی بھی اس ملک میں اس وقت تک مداخلت نہ کرے گی جب تک بقیہ دو سے اس باب میں سمجھوتہ نہ ہو جائے"۔ اس سے اہل بصیرت اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جمعیۃ کے یہ تینوں ممتاز رکن باہمی مشورہ کے بعد ملک حبش کے ساتھ کیا انصاف کریں گے!

یہ تینوں اپنی اپنی غرض رکھتے ہیں۔ اس کی وجہ سے ان میں باہمی رقابت بھی ہے لیکن مشترک چیز یہ ہے کہ ملک حبش کا کوئی نہ کوئی علاقہ یا کوئی نہ کوئی حق غصب کرلیں۔ انگلستان اس فکر میں ہے کہ نیل ازرق ان کے قبضہ میں آجائے تاکہ سوڈان اور مصر کی آبپاشی میں کسی طرح کا رخنہ کبھی نہ پڑنے پائے۔ انگریز چاہتے ہیں کہ اس پانی کو بند باندھ کر قابو میں رکھیں۔ ۱۹۰۲ء سے برابر اس کی کوشش ہو رہی ہے لیکن ہنوز معاملہ جہاں کا تہاں ہے۔ فرانس کو اپنی ریلوے بڑھانے اور اس پر نقل و حمل کے کاروبار کو ترقی دینے کی فکر ہے۔ فرانسیسی بندرگاہ جبوتی سے ادیس ابابا تک کوئی ۵۰۰ میل کی ریل فرانسیسیوں نے بنائی ہے۔ اٹلی ہمیشہ سے اس گھات میں ہے کہ اپنی دونوں نوآبادیوں اریٹریا اور سومالی لینڈ کے درمیان ریل بنا کر انھیں ملالے اور اب تو یہ پورے ملک حبش کو اپنی ملک بنانا چاہتا ہے۔ اس لئے کہ افریقہ کے کوئی سوا کروڑ مربع میل کے رقبہ میں اس کو جو حصہ اب تک ملا ہے وہ سب کا سب ریگستانی اور بے کار ہے اور اگر اب کہیں کچھ مل سکتا ہے تو یہیں ملک حبش میں۔

اس وقت بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان کی رائے عامہ اٹلی کے غاصبانہ اقدام کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتی مگر یہ رائے عامہ صدیوں کی سیاسی چالاکیوں سے ایسی کڑھ گئی ہے کہ باہر والے اس سے اکثر دھوکا کھا جاتے ہیں۔

اسی اٹلی سے انگلستان ابھی ۱۹۲۵ء میں یہ سازباز کر رہا تھا کہ تم نیل ازرق پر بند باندھنے کی تجویز کو حبشی حکومت سے منواؤ تو ہم اریٹریا اور سومالیہ کے درمیان اطالوی ریل کی تجویز کی حمایت کریں گے۔ اٹلی چاہتا تھا

کہ مغربی حبش کو صرف اس کے حلقۂ اثر میں تسلیم کر لیا جائے لیکن فرانس کی مخالفت کے ڈر سے معاملہ ٹلتا رہا۔ ۱۹۲۴ء میں پھر بات چیت شروع ہوئی ۱۹۲۵ء میں تو انگلستان اور اٹلی میں ایک خفیہ معاہدہ بھی ہو گیا، جس کی خبر فرانس کو لگ گئی۔ اُدھر فرانس بگڑا، اِدھر حبش نے معاملہ کو جمعیۃ اقوام میں پیش کرنا چاہا۔ تو لندن اور روم کے شاطران سیاست نے جیسے تیسے معاملہ کو دبا دیا اور حبش کو راضی کرنے کے لئے ۱۹۲۸ء میں اٹلی نے اس سے ایک معاہدہ کیا اور ادیس ابابا سے عصبہ تک موٹر کی سڑک بنا دینے کا وعدہ بھی کیا اور یہ بھی کہ اٹلی کے اس بندرگاہ میں حبش کو آزاد آمد و رفت کا حق حاصل ہو گا۔

غرض جمعیۃ اقوام کے یہ تینوں ممتاز رکن جو حق و انصاف کے ضامن بنے ہیں دراصل اپنی اپنی گھات میں ہیں۔ اور اگر مال کی تقسیم پر آپس میں سمجھوتہ ہو گیا تو معلوم ہے کہ حبش کے حق میں ان کا فیصلہ کیا ہو گا۔ البتہ دوسری قومیں جن کے قدم یہاں پہلے سے جمے ہوئے نہیں ہیں وہ بھی اس بانٹ میں حصہ تاک رہی ہیں۔ چنانچہ امریکہ نے اپنے ایک نہایت قابل سیاسی کو جو ماسکو میں سفیر تھے اب اس پسماندہ ملک میں سفیر بنا کر بھیجا ہے۔ جاپان کے تعلقات تو اور بھی زیادہ تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔ شہزادہ عاریہ عربہ جو شاہ حبش کا بھتیجا ہے خاص مشن پر جاپان گیا تھا۔ وہاں ایک جاپانی امیرزادی یعنی وای کونٹ کروداکی بیٹی پر عاشق ہو گیا۔ رشتہ ہونے والا تھا کہ کہتے ہیں مسولینی نے مداخلت کر کے اسے روکا۔ اُدھر جاپانی ماہرین تجارت جوق جوق اس ملک میں پہنچ رہے ہیں۔ ۲۰ لاکھ ایکڑ زمین انھیں روئی کی کاشت کے لیے دی گئی ہے۔

جاپانی مال نے اٹلی کی تجارت کو تقریباً ختم کر دیا ہے۔ جرمنی اور بلجیم سے اسلحہ پہنچ رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ترکی بھی فوج کی تعلیم کے لیے اپنے ماہر بھیج رہا ہے۔ اس لئے جمعیۃ اقوام کی ملی بھگت کے لئے بھی معاملہ کچھ بہت آسان نہیں ہے۔ اور باہر کی کمک سے قطع نظر خود یہ حبشی غیر متمدن سہی لیکن شجاع ہیں اور آزادی کی قدر جانتے ہیں اور اپنے ملک سے محبت کرتے ہیں۔ ابھی کوئی ۴۰ ہی سال تو ہوئے ہیں کہ انھوں نے اٹلی کی فوجوں کو شکست فاش دی تھی۔ چار لشکر تہ تیغ کر ڈالے تھے، ہزاروں قیدی پکڑے تھے۔ روم میں مغرور اطالوی سپہ سالار کا کورٹ مارشل، کرسپی کی وزارت کا ٹوٹنا، چار لاکھ پونڈ کا تاوان جو متمدن رومیوں نے اس غیر متمدن ملک کو ادا کیا تھا، ابھی سب کو یاد ہے۔ اس لئے ابھی یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ مسولینی کے اس اقدام غاصبانہ کا حشر کیا ہو گا۔ بہر حال مسولینی نے

نے ایک بڑا جوا کھیلا ہے۔ اگر پانسہ پڑ گیا تو وہ اطالوی تاریخ میں جولیس سیزر کا ہمدوش ہوگا اور ناکام رہا تو شاید اطالوی سیاست کا نقشہ یکسر بدل جائے۔ اس کی کامیابی سے حق کی شکستوں کی طویل فہرست میں ایک اور کا اضافہ ہوگا۔ قوت کے پرستاروں کے لئے تقویت ایمان کے لئے ایک اور معجزہ ہاتھ آئے گا۔ لیکن اگر اہل حبش نے اپنی آزادی کی خاطر اپنا خون مردانہ وار بہایا تو ضمیر انسانیت کے لئے ایک اور تازیانہ بھی ہوگا جو کہ بیدار ہونے پر حق تلفیوں کے اس قرض کو دمڑی دمڑی چکانے کی تدابیر نکالے گا۔

عقبہ جہاں قوی اس فکر میں ہیں کہ دوسروں کے ملکوں کا انتظام کریں اور غیر متمدن قوموں کو تمدن اور تہذیب کا سبق دینے کے لئے مجبوراً ان کے علاقوں پر قابض ہوں وہاں ایسے کمزور بھی ہیں جو اپنے گھر کا انتظام دوسروں کے سپرد کر دینے کی فکر میں رہتے ہیں۔ ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ شرق اردن کے فرمانروا امیر عبداللہ نے برطانوی جنرل اسٹاف کے افسر اعلیٰ سر آرچیبلڈ مانٹگومری میسم برگ سے ایک معاہدہ کیا ہے کہ آئندہ عقبہ کے تحفظ کی ذمہ داری برطانوی افواج اور برطانوی بیڑہ کے سپرد ہوگی۔

عقبہ بظاہر ایک چھوٹا سا گاؤں ہے لیکن یہ نہایت اہم بندرگاہ بن سکتا ہے۔ جنگ عظیم کے زمانہ میں کرنل لارنس اور امیر فیصل نے یہیں سے دمشق اور مدینہ والی سڑک پر حملے کئے تھے۔ اور یہی ترکی فوج کے مشرقی بازو اور شام

کے خلاف فوجی کارروائیوں کا مرکز تھا۔ کہتے ہیں کہ مشرق قریب میں اگر فوجی اہمیت کے اعتبار سے دو تین مقامات منتخب کئے جائیں تو ان میں سے ایک یہ بھی ہوگا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ امیر عبداللہ سے اس کی حفاظت کا بارگراں نہ اٹھ سکا اور انھوں نے یہ فرض برطانوی افواج کو تفویض فرما دیا!

ترکی | ترکی جو برابر اسلامی رواداری کی روایات کو قائم رکھنے میں کوشاں ہے جس طرح پہلے بارہا یہی ملکوں سے نکالے ہوئے یہودیوں کو پناہ دے چکا ہے اب بھی جرمنی کے بہت سے نامور یہودی فاضلوں کو بلا کر اپنی درسگاہوں میں کام لے رہا ہے۔ اس کے علاوہ ابھی حال میں اس نے جمعیۃ اقوام کی درخواست پر کوئی دو ہزار روسیوں کو جو روسی انقلاب کے باعث اپنے وطن سے ہجرت کرکے ترکی میں آبسے تھے شہریت کے پورے پورے حقوق عطا کر دئے ہیں۔ ترکی نے حال میں اپنے کارخانوں اور تجارتی کاروبار سے پردیسیوں کو مجبوراً ہٹایا تھا۔ اس کی وجہ سے ان روسی مہاجرین میں سے بھی بہت سے بارروزگار ہو گئے تھے۔ مگر چونکہ یہ اپنے وطن کو واپس نہ جاسکتے تھے ترکی نے انھیں اپنا لیا۔ انھیں ترکوں کے سے حقوق دئے گئے اور ترکوں کے سے فرائض بھی ان پر عائد کئے گئے ہیں۔

... ...

آزادی ایسی جنس نہیں کہ ایک دفعہ حاصل کر لی جائے۔ اسے روز حاصل کرنا ہوتا ہے اور وہی اسے رکھ سکتا ہے جو روز اس کے حصول میں ساعی رہے۔ اس لئے آزاد قومیں اپنی آزادی کو برقرار رکھنے کے لئے آنے والی نسلوں کو اس کے برتنے کی مشق کراتی ہیں۔ اکثر ممالک میں یہ کام مدارس میں کیا جاتا ہے۔ ترکی نے پچھلے دنوں ایک نیا تجربہ اس سلسلہ میں کیا۔ یعنی ایک ہفتہ کے لئے اپنے تمام بڑے بڑے شہروں اور قصبوں کا انتظام اپنے ابتدائی اور ثانوی مدارس کے بچوں کے سپرد کر دیا تھا۔ بچوں کی عمر دس اور پندرہ سال کے درمیان تھی۔ صرف اتنی نگرانی تھی کہ ان کے احکام معقول ہوں، عمال کو ان کی بجاآوری کی تاکید تھی۔ یہ تجربہ ان بچوں کے لئے مدنیات کے سیکڑوں اسباق سے زیادہ مؤثر ثابت ہوا ہوگا۔

یہ بات تو معلوم ہے کہ ترکی پارلیمنٹ میں بس ایک ہی جماعت ہے یعنی وہ جماعت جسے صدر جمہوریہ کمال اتاترک کی قیادت کا شرف حاصل ہے، اس لئے پارلیمنٹ سے باہر اس جماعت کے جو اجلاس ہوتے ہیں ان کی قراردادیں پارلیمنٹ کے لئے بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ اس جماعت نے اپنے گذشتہ سالانہ اجلاس میں اس بات کی کوشش کی کہ اپنے پروگرام کو وضاحت کے ساتھ چند دفعات کی شکل میں پیش کر دے۔ یہ پروگرام کمالی پروگرام کہلائے گا یا مذہب کمالیت۔ یہ ۶ دفعات ذیل پر مشتمل ہے:۔

(۱) اقتدار اعلیٰ پارلیمنٹ کی وساطت سے قوم کو حاصل ہے۔

(۲) طبقات کی تمیز مٹائی جاتی ہے اور مرد اور عورت کے حقوق مساوی تسلیم کئے جاتے ہیں۔

(۳) فلاح عام کے کاروبار اور وہ صنعتیں جن کا تعلق تحفظ قومی سے ہے حکومت کی ملک ہوں گی اور حکومت بقیہ صنعتی کاروبار کی بھی نگرانی رکھے گی اور جب ضرورت سمجھے گی اسے خرید لے گی۔

(۴) مذہب افراد کا نجی معاملہ ہے۔ اس میں حکومت مداخلت نہ کرے گی سوائے اس حالت کے کہ مذہب کو رجعت پسندی کا بہانہ بنا کر جمہوریت کے وجود کو خطرہ میں ڈالنے کی کوشش کی جائے۔

(۵) ملکیت شخصی اور حریت شخصی کی ضمانت کی جاتی ہے بشرطیکہ یہ مفاد عامہ سے متصادم نہ ہوں۔

(۶) ملک کے جملہ وسائل، انسانی اور مادی، اس کے تحفظ کے لئے کام میں لائے جائیں گے۔

... ...

اسی اجلاس میں یہ تجویز بھی پیش ہوئی کہ ترکی عورتوں کے لئے نقاب کا استعمال قانوناً ممنوع قرار دیا جائے۔ مگر جلسہ نے اس تجویز کو رد کر دیا۔ وجہ یہ بیان کی گئی کہ عورتیں خود ہی نقاب کو ترک کر رہی ہیں، جو اب تک ترک نہیں کر سکی ہیں وہ دوسری بہنوں کی مثال سے متاثر ہو کر خود ترک کر دیں گی۔ اس میں جبر سے کام لینا بے سود ہے۔

... ...

ساری دنیا میں جنگ کی جو فضا پیدا ہو گئی ہے اور مختلف ممالک جس طرح اپنے نوجوانوں میں جنگی روح پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اس کی ایک مثال ترکی میں بھی ملتی ہے۔ ترکی وزارت نے طے کیا ہے کہ فوج میں داخل ہونے کی عمر سے پہلے ہی تمام لڑکوں اور لڑکیوں کو کچھ فوجی تعلیم دینی چاہیے۔ اس کا مفصل نصاب

جنرل اسٹاف تیار کر رہا ہے ۔ یہ فیصلہ بھی کیا گیا ہے کہ ہوائی جہازوں کی تعداد دوگنی کر دی جائے ۔ تقریباً ۶ کروڑ روپیہ سالانہ کم سے کم ۵۰۰ ہوائی جہازوں کے بیڑہ کی خریداری اور مرمت وغیرہ کے لئے صرف کیا جائے گا ۔

... ...

ازمر (سمرنا) سے ایدین کو جو ریل انگریزی سرمایہ سے تیار ہوئی تھی اسے ترکی حکومت نے ۵۰ لاکھ ڈالر میں خرید لیا ہے ۔

عراق و ایران | عراق اور ایران میں اپنے سرحدی دریا شط العرب کے متعلق جھگڑا ہے ۔ معاملہ جمعیۃ الاقوام کے سامنے پیش تھا ۔ اٹلی کے مندوب بیرن الواسی ثالث مقرر ہوئے تھے ۔ جمعیۃ کی کونسل کے گذشتہ اجلاس میں انھوں نے یہ اطلاع دی کہ فریقین سمجھوتہ پر رضامند نہیں ہوئے لیکن ان کا خیال ہے کہ دونوں کو براہ راست گفت وشنید پر آمادہ کیا جا سکتا ہے اور چونکہ معاملہ بہت زیادہ اہم نہیں ہے اس لئے زیادہ کشیدگی کا اندیشہ نہیں ہے ۔

معاملہ یہ ہے کہ ۱۸۴۷ء کے معاہدہ ارض روم اور ۱۹۱۴ء کے ایک پروٹوکول کی رو سے شط العرب پر اقتدار اعلیٰ تمامتر ترکی کو حاصل تھی ۔ جنگ کے بعد چونکہ عراق کو ترکی حکومت کے تمام حقوق وراثت میں ملے ہیں لئے اب شط العرب پر کامل اقتدار کا دعویدار ہے ۔ ایران اس دعوے کو تسلیم نہیں کرتا اس لئے عراق نے جمعیۃ اقوام میں مرافعہ کیا ہے کہ میرا اقتدار تسلیم کرایا جائے ۔

حکومت عراق کا کہنا یہ ہے کہ علاوہ مذکورہ بالا قانونی حق کے یہ بات بھی دیکھنے کی ہے کہ ایران کے پاس تو ہزاروں میل کا سمندری ساحل ہے اور ہمارے پاس کچھ بھی نہیں ۔ ہمارے لئے سمندر تک پہنچنے کا راستہ بس اسی شط العرب کے ذریعہ ہے ۔ اس لئے ہم اپنے قانونی اقتدار میں کسی کو شریک نہیں بنانا چاہتے ۔ ہاں اگر ہمارا قانونی حق تسلیم کرلیا جائے تو ہم ایران سے گفتگو کرکے یہ کرسکتے ہیں کہ اس دریا میں جہازرانی کی نگرانی کے لئے ایک ایرانی عراقی مشترکہ بورڈ مقرر کردیں اور کسی غیر جانبدار ثالث کو صدر مقرر کردیا جائے ۔

ایران کی دلیل یہ ہے کہ ۱۸۴۷ء کا معاہدہ اور ۱۹۱۴ء کا پروٹوکول اس معاملہ میں اس وجہ سے معتبر نہیں کہ ایرانی مجلس نے ان دونوں کی تصدیق نہیں کی ہے ۔ ایرانیوں کو موجودہ انتظامات سے کسی قسم کی تکلیف نہیں ہے البتہ

وہ چاہتے ہیں کہ اگر قانونی حق اقتدار بھی تسلیم ہو جائے تو اچھا ہے۔ داشتہ آید بکار۔ لیکن ایران کا مقدمہ کمزور ہے اور گمان غالب یہی ہے کہ عراق کا مطالبہ تسلیم کر لیا جائے گا۔

روس | روسی انقلاب کے بانی اسے قومی انقلاب نہیں سمجھتے تھے بلکہ ایک عالمی انقلاب کا آغاز۔ اس گروہ کی ساری ذہنیت پر بین الاقوامی تعاون کا تصور غالب تھا۔ وہ قومیت اور وطنیت کو "بورژوا" سرمایہ داری کا فریب جانتے تھے اور ملکی اور سیاسی حقوق کے مٹ جانے اور دنیا کے ایک کارخانہ کی طرح منظم ہو جانے پر عقیدہ رکھتے تھے۔ اسی رجحان کی وجہ سے وہ کسان سے گھبراتے تھے اور صنعتی مزدور کو اپنا سب سے بڑا مددگار جانتے تھے۔ اس لئے کہ زراعت پابند مقام ہے، صنعت کے لئے ساری دنیا ایک منڈی ہے؛ یہی وجہ ہے کہ کسان ہر جگہ وطنی اور قومی تحریکوں کا حامل ہے اور مزدور بین الاقوامی تحریکوں کا۔

لیکن روس کا یہ انقلابی اور بین الاقوامی رجحان واقعات سے دوچار ہو کر رفتہ رفتہ بدل رہا ہے۔ خود لینن کی جدید معاشی سیاست گویا اس تبدیلی کا پہلا قدم تھا۔ لینن نے بروقت پہچانا کہ اگر روسی انقلاب کو کامل ناکامی سے بچانا ہے تو کسان کو ساتھ لینا ہوگا اور ایک حد تک اس کے تعصبات کا پاس کرنا پڑے گا۔ اس کے بعد سیاسی ضرورتوں نے روس کو اکثر سرمایہ دار قوموں سے معاہدے کرنے پر مجبور کیا۔ ایشیا میں جاپان کے ڈر سے اس نے یورپ میں سرمایہ دار ملکوں سے دوستی شروع کی اور اب رفتہ رفتہ عالمی انقلاب کی جگہ ایک منظم حیات قومی نے لے لی ہے۔ کسان جسے مارکس سے لے کر آج تک تمام اشتراکی مفکر نہایت حقارت اور نفرت کی نگاہ سے دیکھتے آئے ہیں اور جسے ہمیشہ رجعت پسندی کا مجسمہ سمجھتے رہے ہیں اس منظم حیات قومی کے لئے بمنزلہ ریڑھ کی ہڈی کے ہے۔ اس لئے اس کے ساتھ جو بدسلوکی روا رکھی جاتی تھی وہ برابر کم ہو رہی ہے۔ پرانے راسخ العقیدہ اشتراکی اس پر ناخوش ہیں مگر حقائق سے دست و گریباں نئے اشتراکی عالمی انقلاب کے خیال کو پس پشت ڈال کر قومی زندگی کو کسان کی مدد سے اشتراکی اصولوں پر منظم کرنے کی فکر میں ہیں اور اس کوشش میں اپنے نظری عقائد کا کچھ حصہ چھوڑ کر کسان سے سمجھوتہ کرنا چاہتے ہیں۔

حال میں جو خبریں روس سے آئی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ عالمی انقلاب کی جگہ قومی تنظیم نے بڑی حد تک لے لی ہے۔ یکم مئی کو جب تمام مغربی ممالک میں مزدور انقلابی مظاہرے کرتے ہیں۔ جس تاریخ کو روس میں

یوں سمجھیے کہ عالمی انقلاب کی آمد کا جشن منایا جاتا تھا، اس مرتبہ رنگ بالکل بدلا ہوا تھا۔ عالمی انقلاب کا تذکرہ بھی نہ تھا۔ نہ مزدوروں کے بین الاقوامی اتحاد کا اتنا چرچا تھا جتنا کہ اس موقع پر پہلے ہوا کرتا تھا۔ اس کی جگہ ایک شدید جذبہ وطن پرستی کا مظاہرہ تھا۔ خاص طور پر اس بات کی کوشش کی گئی تھی کہ دوسرے ملکوں کے جو لوگ موجود تھے ان پر روسی فوجی قوت کا اثر ڈالا جائے۔ "کمیونسٹ انٹرنیشنل" کی طرف سے جو پیام اس موقع پر دنیا کے مزدوروں کو جاتا ہے وہ بھی اس مرتبہ بہت روکھا پھیکا تھا۔ پہلے کی طرح اس میں سرمایہ داری کے دیو سے نبرد آزمائی کی دعوت نہ تھی۔ بس یہ مشورہ تھا شرح اجرت بڑھانے اور کام کا وقت گھٹانے کی تدبیریں کرنی چاہئیں!

پرانی روایات انقلابی سے اپنے کو آزاد کرنے کے خیال ہی سے غالباً اسٹالین نے حال ہی میں قدیم بولشویکوں کی جماعت کو منتشر کرنے کا حکم دلوادیا۔ یہ جماعت ان اشتراکیوں پر مشتمل تھی جو ۱۹۱۷ء کے انقلاب سے پہلے کمیونسٹ تھے اور اس زمانہ میں جب اس سے زندگی خطرہ میں پڑتی تھی ان اصولوں کی حمایت کرتے رہے تھے۔ پہلے تو اسٹالین نے اس جماعت کے ممتاز ارکین کو مثلاً ٹروٹسکی، کامینوو، زینوویوف، توسکی وغیرہم کو ختم کیا اور اب کل جماعت کو منتشر کرادیا۔ ایک طرف قدیم نظریین کی مخالفت کو یوں ختم کیا۔ دوسری طرف کسانوں کی "رجعت پسند" جماعت کے ساتھ بھی رعایتیں کیں مثلاً اسی سال کے اندر اندر متعدد تبدیلیاں رونما ہوچکی ہیں۔ اجناس حاصل کرنے کے جو کارڈ مزدوروں کو ملا کرتے تھے اور جن سے صنعتی مزدوروں کو دوسرے تمام طبقات آبادی پر خاص فوقیت حاصل تھی ان کا سلسلہ ختم کردیا گیا۔ فروری میں نظام انتخابات کو اس طرح بدلا گیا کہ کسانوں کے خلاف جو باتیں پڑتی تھیں وہ ہٹ گئیں۔ نئے نظام کے ماتحت آئندہ انتخابات میں کسانوں کی رائے کو غلبہ حاصل ہوگا۔ پرانے نظام کی رو سے شہری آبادی کو بمقابلہ کسانوں کے اپنی تعداد سے سہ چند نیابت کا حق تھا۔ یہ حق اب باقی نہیں رہا۔ بالواسطہ انتخاب کے طریقہ سے بھی کسانوں کا اثر گھٹتا تھا، یہ طریقہ بھی اب ختم کردیا گیا ہے۔ اب رائے دہی بلاواسطہ ہوگی اور خفیہ۔ ۱۸ برس سے اوپر کا ہر شہری بلالحاظ پیشہ اور سکونت رائے دینے کا حق دار ہوگا۔ کسانوں کی تعداد چونکہ ساڑھے بارہ کروڑ سے اوپر ہے اور شہری آبادی صرف ۴ کروڑ، اس لئے ظاہر ہے کہ غلبہ کسانوں کا ہوگا۔

کسانوں کے ساتھ معاشی رعایتیں بھی کی گئی ہیں مثلاً جو کسان مشترک کھیتوں میں کام کرتے ہیں انھیں اپنی نجی زمین رکھنے کا جو حق تھا اس کے رقبہ میں معتدبہ اضافہ کردیا گیا ہے، اپنی شخصی ملکیت میں جتنے جانور رکھنے کی اجازت

تھی ان کی تعداد بھی بڑھادی گئی ہے۔ ان نجی جانوروں کی خریداری میں حکومت نے امداد کا وعدہ بھی کیا ہے۔ کسان کے ساتھ ان رعایتوں کی بڑی وجہ تو وہی ہے جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے یعنی عالمی انقلاب کی جگہ قومی تنظیم کے خیال کی تقویت اور جنگ کے وقت کسانوں کی وفاداری کی ضرورت کا احساس لیکن اگر اس سے کوئی یہ سمجھے کہ یہ روسی انقلاب کی ناکامی کے آثار ہیں تو یہ غلط ہوگا۔ اس کے برعکس اشتراکی معیشت کی کامیابی ہی نے کسانوں کے ساتھ اس جدید رویہ کا امکان پیدا کیا ہے۔ اب کسان پہلے کی طرح بے قابو نہیں اور شہری آبادی کے لئے غذا کی فراہمی کا مسئلہ طے ہو چکا ہے، اب اس فراہمی کے لئے کسان پر ظلم کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔ صنعت نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ اس کا کام چلانے کے لئے، یعنی اس کے لئے پردیس سے کلیں اور سامان خریدنے کے لئے کسانوں کے گاڑھے پسینہ کی کمائی کو چھین چھین کر باہر بھیجنے کی مجبوری باقی نہیں رہی، اور خود زراعت میں اشتراکی طریقۂ کاشت کو اتنا فروغ ہو گیا ہے کہ اب خالص انفرادی نظام کے دوبارہ رائج ہونے کا اندیشہ پہلے کی طرح باقی نہیں رہا۔ دنیا میں اکثر ہوا ہے کہ کامیابی کی خاطر اور کامیابی کی وجہ سے ذہنی اور فکری تجاویز میں زمین آسمان کا تغیر ہو جاتا ہے۔ روس میں بھی پہلے لینن نے کامیابی کی خاطر خالص اشتراکی پروگرام میں تبدیلی کی، اب اسٹالین اس میں کامیابی کی وجہ سے کسانوں کے ساتھ اور رعایتیں کر رہا ہے اور کر سکتا ہے۔ لیکن اس تغیر نے روسی انقلاب کی بین الاقوامی حیثیت کو بہت بدل دیا ہے۔ خیال ہے کہ روس بھی رفتہ رفتہ قومی اشتراکیت کا نمونہ ہو جائے گا اور دوسری اشتراکی قومیتوں سے تصادم کے بعد شاید بین الاقوامی انقلاب کی باری آئے گی۔

(ب) ہندوستان

نوجوانوں کی بے روزگاری | یونائیٹڈ پریس کے ایک پیغام مورخہ پٹنہ ۱۴ اگست ۱۹۳۵ء سے معلوم ہوا کہ پولیس کے سپاہیوں کی سات خالی جگہوں کے لئے تقریباً تین ہزار نوجوان صوبہ کے مختلف حصوں سے شہر کی کوتوالی کے سامنے انٹرویو کے لئے جمع ہوئے۔ یہ امیدوار انتخاب کرنے والے افسر کی نگاہ کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے اس درجہ مضطرب تھے کہ ان میں سے ہر شخص دوسرے کو دھکا دے کر افسر کے سامنے آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس سے جو بدانتظامی پیدا ہوئی اس کا سدباب کرنے کے لئے پولیس کانسٹبلوں کو بلانا پڑا اور انھوں نے اس مجمع کو قوت کا

استعمال کرکے پیچھے ڈھکیل دیا۔

پولیس کے سپاہیوں کو شاید پندرہ روپے تنخواہ ملتی ہے۔ ان کے فرائض بڑی جفاکشی، مستعدی اور دلیری کا مطالبہ کرتے ہیں۔ کبھی کبھی انھیں سیاسی اور مذہبی مجمعوں پر لاٹھیاں اور گولیاں چلانا پڑتی ہیں، محکمۂ سی آئی ڈی کے مخبر ہونے کی حیثیت سے بعض وقت نہایت ناخوشگوار بلکہ شرمناک رپورٹیں دینا پڑتی ہیں، مقدموں کی تیاری میں ضمیر فروشی سے کام لینا پڑتا ہے لیکن ان تمام مواقع کے باوجود سات سپاہیوں کی جگہوں کے لئے تین ہزار امیدوار دور دراز مقامات سے سفر کرکے پٹنہ میں جمع ہوئے تاکہ پولیس کی انتظامی لاٹھیوں سے امن و انصاف اور قانون کے علمبرداران کی تواضع و مدارات کرسکیں۔

اس منظر کی دردناک عبرت خیزی کسی تبصرہ کی محتاج نہیں ہے!

یونائیٹیڈ پریس کی اس اطلاع سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ ان لوگوں میں کتنے تعلیمیافتہ نوجوان تھے، کتنے میٹرک اور ایف اے پاس اور گریجویٹ تھے اور کتنے ایسے تھے جو معمولی طور پر خواندہ تھے لیکن اس کمی کی تلافی دوسری اطلاعوں، سرکاری رپورٹوں اور بے روزگاری کے متعلق مختلف صوبوں میں جو تحقیقاتی کمیٹیاں بٹھائی گئی تھیں ان کی جمع کی ہوئی معلومات سے ہوجاتی ہے۔ ۱۹۳۱ء کی مردم شماری میں درج ہے کہ ۱۷-۱۹۱۶ء میں گریجویٹوں کی تعداد ۶ ہزار تھی جو ۳۱-۱۹۳۰ء میں بڑھ کر ۱۱ ہزار ہوگئی۔ اور انڈر گریجویٹوں کی تعداد جو ۱۷-۱۹۱۶ء میں ۴۴ ہزار تھی ۳۱-۱۹۳۰ء میں ۶۶ ہزار ہوگئی۔ صوبہ مدراس میں بے روزگاری کا تخمینہ کرنے کے لئے دو جگہوں کے واسطے آزمائشی اشتہار دیے گئے۔ ایک جگہ پی۔ ڈبلو۔ ڈی کے محکمہ میں ایک منشی کی تھی جس کی تنخواہ ۳۵ روپیہ ماہوار تھی اور دوسری ایک تجارتی فرم میں اتنی ہی تنخواہ کے ایک محرر کی تھی۔ پہلی کی لئے ۶۶۶ اور دوسری کے لئے ۸۰۰ درخواستیں آئیں۔ مدراس میں بنچ کے ایک منشی کی جگہ کے لئے شہر مدراس اور مضافات کے ۵۰۰ وکیلوں نے درخواستیں دیں۔ کچھ زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ مدراس میں معمولی پولیس کے سپاہیوں کی جگہ کے لئے بہت سے گریجویٹوں نے درخواستیں دی تھیں۔ اسی قسم کی اطلاعیں پنجاب سے بھی موصول ہوئی ہیں۔ سندھ میں ایک گریجویٹ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ جوتوں کی مرمت اور پالش کرکے اپنی بقائے حیات کے وسائل فراہم کررہا ہے۔

بے روزگاری کے متعلق افراد یا کمیٹیوں نے جو اظہار رائے کیا ہے ان کے چند اقتباسات بھی نمونہ

کے لئے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں :۔

"ہمارا نظام تعلیم ایک بانس کے درخت کے مانند ہے جس کا ہر جوڑ گویا ایک امتحان ہے اور جس کا قطر جڑ سے لے کر پھننگ تک تقریباً یکساں رہتا ہے' اس کی شاخیں نہیں ہوتیں اور پھننگ پر جو پتیوں کی چھتری ہوتی ہے وہ بہت مختصر رقبہ کو ڈھک سکتی ہے۔ ضرورت جس چیز کی ہے وہ ایک پھیلا ہوا درخت ہے جس کی شاخوں کو تنے کے متعدد مقامات سے پھوٹ کر جس قدر زیادہ سمتوں میں ممکن ہو پھیلنا چاہئے اور محض پھننگ پر اپنا پھیلاؤ محدود نہ رکھنا چاہیئے" (بنگال بے روزگاری کمیٹی کی رپورٹ)

"ہمارے ہائی اسکولوں اور کالجوں کی خرابی یہ نہیں ہے کہ ان میں پیشہ کی تعلیم نہیں دی جاتی بلکہ بڑی خرابی یہ ہے کہ ایک خاص لیکن بہت زیادہ محدود پیشہ کی تربیت کے لئے پوری توجہ مرکوز کردی جاتی ہے۔ عملی اور افادی پہلوؤں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان میں کوشش یہ کی جاتی ہے کہ طلبہ کو اس طرح تربیت دی جائے کہ وہ فارغ التحصیل ہو کر سرکاری افسر' وکیل' ڈاکٹر اور کاروباری محرر سکیں" (ایجوکیشن آف انڈیا مصنفہ مے ہیو)

پنجاب کمیٹی کی تحقیقات کے سلسلہ میں سر جارج انڈرسن ایک میٹرکولیٹ کی تعریف اس طرح کرتا ہے کہ "یہ ایک لاوارث ہے جو تمام دنیا میں خدائی خوار پھرتا ہے اور جو اس لئے بے روزگار رہتا ہے کہ اس میں کسی حیلہ سے لگنے کی صلاحیت ہی نہیں ہوتی" سر جارج ہمارے موجودہ طریقۂ تعلیم کی مذمت کرتا ہے اور کہتا ہے کہ "اس کا خاص مقصد یہ ہے کہ لڑکوں کو خارجی امتحان کے لئے تیار کیا جائے جن میں کامیاب ہونے کے بعد اکثر طالب علم ایک اور دامِ فریب میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ مدرسوں میں لڑکے منشی گیری کے پیشہ کے لئے تیار کئے جاتے ہیں جو اس وقت ضرورت سے زیادہ بھرا ہوا ہے اور ہزاروں آدمیوں کو روزگار مہیا کرنے سے قاصر ہے"

"موجودہ طریقۂ تعلیم کے مصنف لارڈ مکالے نے لکھا تھا کہ "ہمیں موجودہ حالات میں پوری کوشش کرنا چاہئے کہ ایک ایسا طبقہ پیدا ہو جو ہمارے اور کروڑوں کی اس آبادی کے درمیان جس پر ہم حکومت کرتے ہیں ایک مترجم کا کام کرے۔ ایسے اشخاص کا طبقہ جو رنگ اور خون کے اعتبار سے ہندوستانی ہوں لیکن ذوق' رائے' اخلاق اور ذہن کے لحاظ سے انگریز ہوں" لیکن اس کا دردناک پہلو یہ ہے کہ مترجموں اور منشیوں کے پیدا کرنے کا کام ابھی تک جاری ہے اور مستقبل قریب میں اس کا کوئی امکان نظر نہیں آتا کہ کسی قسم کی تبدیلی سے آئندہ

بہت سے سالوں تک کوئی خوشگوار نتیجہ پیدا ہو سکے گا۔" (بنگال کمیٹی کی رپورٹ)

اوپر جو کچھ لکھا گیا یہ ہماری تعلیمی کوششوں کا ماحصل ہے۔ جن پودوں کو والدین نے اپنے خون سے سینچا، ان کا یہ انجام ہے۔ جن کی خاطر بہت کچھ ایثار کیا، ہزاروں تکلیفیں اٹھائیں، سینکڑوں ارمانوں اور حوصلوں کی پرورش کی کہ بڑھاپے میں یہ ہمارا سہارا ثابت ہوں گے ان کے آرام و آسایش اور فارغ البالی سے ہمارے دل کو سکھ اور چین نصیب ہوگا یہ ان کا حسرتناک حشر ہے۔

اس کا کون جوابدہ ہے۔ کس کی غیر ذمہ دارانہ امید پروری اس مایوسی کا سبب ہے۔ کیا نوجوانوں کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ ان لوگوں سے بازپرس کریں جنھوں نے مجرمانہ غفلت سے کام لے کر ان کی زندگیوں کو برباد کیا ہے۔ نوجوانوں نے اپنی عمر اور ان کے والدین نے اپنا سرمایہ کالج کی ڈگریاں حاصل کرنے میں کیوں ضائع کیا؟ درسگاہوں کے فریب میں وہ کیسے پھنسے؟ حکومت نے تعلیمی اداروں کی دھوکہ دہی سے ان بے وقوفوں کو کیوں نہیں بچایا؟ کمشنروں، گورنروں، وائسرایوں اور جماعت عاملہ کے ارکان نے کیوں ایسے اداروں کی امداد اور سرپرستی کی، انھیں تعلیم کی آزادی کے چارٹر دیے جنھیں وہ جانتے تھے یا جن کے متعلق انھیں جاننا چاہئے تھا کہ وہ ملک میں تعلیمیافتہ بے روزگاروں کی ایک فوج بنا ڈالیں گے؟ تمام دنیا میں حکومتیں بے روزگاری کے انسداد کی ذمہ داری قبول کرتی ہیں۔ لوگوں کے معیار حیات کی کمی کے الزام کے لئے اپنے آپ کو جوابدہ سمجھتی ہیں اپنی رعایا کی محنت اور اس کے سرمایہ کو بربادی سے محفوظ رکھنے کی سعی کرتی ہیں اور اگر ان کی کوششوں کے باوجود لوگوں میں بے روزگاری پھیلنے لگتی ہے تو ہر قسم کی امداد دینا اپنا فرض منصبی سمجھتی ہیں۔ وہ سرچارج اینڈرسن کی طرح بے گناہ، بے تعلق اور بے درد ہو کر صرف خرابیوں کے مبالغہ آمیز اظہار پر قناعت نہیں کرتیں۔ وہ حل سوچتی ہیں اور حل نہیں سوچ سکتیں تو انھیں اس کے نتائج اور عواقب کو بھگتنا پڑتا ہے۔ ہماری غیر ذمہ دار حکومت بے روزگاری کو رفع کرنے کے لئے کیا کام کر رہی ہے۔ کیا وہ اس بات پر خوش ہے کہ جو منشی پہلے اُسے دو سو اور ڈھائی سو کی تنخواہ پر رکھنے پڑتے تھے اب بیس پچیس میں اپنا دین و ایمان اس کے ہاتھ پر فروخت کر دینے کے لئے تیار ہیں۔ کیا صورت حال کی یہ روش اس کے نزدیک پسندیدہ ہے۔ لوگوں کو ذلیل خوار اور خودداری سے معرا دیکھ کر صرف کمینے، خودغرض اور حاسد لوگ خوش ہو سکتے ہیں۔ کیا حکومت کچھ نہیں کر سکتی۔ کیا وہ بالکل بے بس

ہے۔ اگر ایسا ہے تو اسے اعتراف شکست کر کے حکومت سے دست بردار ہو جانا چاہئے کیونکہ دنیا کی دوسری حکومتیں ان مسائل کا حل سوچ رہی ہیں اور ان کے یہاں بے روزگاری میں برابر کمی ہو رہی ہے۔ روس میں بے روزگاری میں نمایاں کمی ہو گئی ہے بلکہ یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ وہاں بے روزگاری کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ ورلڈ اکانومک سروے ۳۴-۱۹۳۳ء میں درج ہے "بے روزگاری کسی ایسے ملک میں پیدا ہی نہیں ہو سکتی جہاں ہر کام کرنے والے کو کوئی نہ کوئی کام کرنا پڑتا ہے۔ جہاں نہ صرف پیدائش دولت بلکہ اجرتیں قیمتیں اور معاشی زندگی کا ہر عامل ایک ایسے پہلے سے سوچے ہوئے منصوبہ کا پابند ہے جو کل قوم کے مشاغل پر بصورت مجموعی حاوی ہے۔ امریکہ میں پریسیڈنٹ روزولٹ کی باقاعدہ کوششوں سے گذشتہ سال روزگار کے اعداد کا تناسب بڑھ کر ۵۶ : ۶۷ ہو گیا۔ سلطنت متحدہ برطانیہ میں ۹۲ : ۹۹ ہو گیا اور جرمنی میں ۶۸ : ۸۴ ہو گیا (اعداد انٹرنیشنل لیبر ریویو)۔ ہندوستان کے متعلق اس قسم کے اعداد نہیں دئے گئے ہیں اس لئے صحیح موازنہ ممکن نہیں ہے لیکن اس کے ماننے میں کسی کو تامل نہیں ہو سکتا کہ یہاں اس قسم کی کوئی منظم کوشش ابھی تک نہیں کی گئی ہے۔ ہندوستان کی قدرتی دولت سے بہت کم فایدہ اٹھایا گیا ہے۔ یہاں صنعت، زراعت اور تجارت کو ترقی دینے کا ابھی بے انتہا امکان موجود ہے۔ نئے روزگار نہ صرف موجودہ بلکہ اس سے بھی زیادہ آبادی کے لئے فراہم کئے جا سکتے ہیں اور معیار حیات بلند سے بلند تر ہو سکتا ہے۔ روس اگر سترہ اٹھارہ سال کے عرصہ میں اپنے ملکی وسائل دولت کو ناقابل یقین حد تک ترقی دے سکتا ہے تو ہندوستان کے لئے بھی یہ ممکن ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ صحیح جذبۂ عمل پیدا ہو، ایمان دار کارکن اس کام کو ہاتھ میں لیں اور کسی خاص دستور العمل کے مطابق کام کیا جائے۔

حکومت ہند کا قانون | ۲ اگست ۱۹۳۵ء کو ملک معظم نے حکومت ہند کے نئے قانون کو منظور کر لیا یعنی ہندوستان کو سوراج عطا کر دیا گیا۔ خدا ہمارے بادشاہ کو سلامت رکھے! اس طرح رضا و رغبت کے ساتھ اور پر امن طریقہ پر حق حکومت سے دست بردار ہونے کی مثالیں دنیا میں کم نظر آتی ہیں۔ یہ سب کچھ تو ہوا لیکن تعجب اس بات پر ہے کہ ہندوستان کے لینے والوں کو کیا ہو گیا ہے؟ کیا ریپ وان ونکل کی طرح یہ کسی گہرے خواب میں ڈوبے ہوئے ہیں؟ ابھی زیادہ دن نہیں گذرے سوراج کے حصول کے لئے ہندوستان کے ہر شہر و قریہ میں ایک

طوفان بے تمیزی برپا تھا یا اب سوراج مل گیا تو وہ سکوت طاری ہے جس سے مردے بھی عبرت حاصل کر سکتے ہیں۔ ہندوستان کے لوگ کس شہر خموشاں میں ہیں؟ یہ شادیانے کیوں نہیں بجاتے، چراغاں کیوں نہیں کرتے، جشن کیوں نہیں مناتے، ایک دوسرے کو مبارکباد کیوں نہیں دیتے؟ سوراج اب کیا اس قدر بے حقیقت ہو گیا کہ اس کے لئے قوم کے کسی فرقہ اور طبقہ کے منہ سے تحسین و مرحبا کا لفظ نہیں نکلتا۔ کیا سوراج یوں ہی لیا کرتے ہیں اور جب مل جاتا ہے تو ایسے ہی گونگے اور بہرے بنے بیٹھے رہتے ہیں!

آیئے یہ بھی دیکھیں سوراج میں ملا کیا ہے؟ مرکز میں وفاقی مجلس قانون ساز، جس کے ایوان اعلیٰ کو مالی اختیارات ایوان ادنیٰ کے مساوی حاصل ہوں گے۔ وفاقی بجٹ دونوں ایوانوں کے مشترکہ اجلاس میں منظور ہوا کرے گا۔ اس مشترکہ اجلاس کے ۶۰۵ ارکان ہوں گے جن میں سے ۲۲۹ کو ہندوستانی ریاستیں نامزد کر کے بھیجیں گی اور ۱۵۶ ایوان اعلیٰ کے رکن ہوں گے جنھیں امرا کی ایک نہایت مختصر اقلیت براہ راست انتخاب کر کے بھیجے گی۔ ان ۶۰۵ ارکان کی جس تعداد سے ترقی پسند ہونے کی توقع وابستہ کی جا سکتی ہے وہ تقریباً ۲۵۰ ہو گی۔ لیکن یہ ۲۵۰ ارکان بھی براہ راست منتخب نہیں ہوں گے بلکہ صوبوں کی مجالس قانون ساز سے منتخب ہو کر آئیں گی۔ صوبوں کی جن مجالس میں قوم پرستوں کی اکثریت ہو گی وہاں سے تو ممکن ہے سب کانگریسی رکن منتخب ہو جائیں ورنہ رجعت پسند جماعتوں کے ارکان منتخب ہوں گے۔ بجٹ کے اسّی فی صدی حصہ پر اراکین کو کوئی اختیار نہ ہو گا، صرف بیس فیصدی پر انھیں اختیار حاصل ہو گا اور یہاں بھی گورنر جنرل کے اختیارات خصوصی کی پکڑ موجود رہے گی۔ ریلوے کا انتظام ایک ایسے بورڈ کے ماتحت ہو گا جس پر مجلس قانون ساز کو کوئی اختیار حاصل نہ ہو گا۔ رزرو بنک پر بھی مجلس کا کوئی اختیار نہیں ہو گا یعنی سکہ اور شرح مبادلہ بھی ان کی دسترس سے باہر ہو گا۔ گویا روپیہ میں دوآنی ملی اور وہ بھی کھوٹی!

صوبوں کو نام کے لئے صوبہ جاتی خود مختاری عطا کی گئی ہے لیکن ثانوی ایوانوں کے قیام سے رجعت پسند جماعت کو زیادہ مضبوط کر دیا گیا ہے۔ انڈین سول سروس کے جو سکریٹری وزرا کو ملیں گے وہ عموماً وزرا کے احکام اور ان کی نگرانی قبول نہ کریں گے۔ تمام امپیریل سروسیں وزرا کے اقتدار سے باہر ہوں گی۔ ان کی تنخواہ، ترقی، سزا کسی بات کا وزیروں کو اختیار نہ ہو گا۔ وزرا دراصل اپنے محکمہ کے ملازموں کے غلام ہوں گے۔ گورنر کے

مالی اختیارات بہت وسیع ہوں گے۔ گورنر اپنے قانون تو مجلس قانون ساز سے آزاد رہ کر بنا سکے گا لیکن مجلس قانون ساز اپنا کوئی قانون گورنر کی مرضی کے بغیر نہ بنا سکے گی۔

حکومت کی طرف سے یقین دلانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ تحفظات محض نام کے لئے ہیں اور جب حکومت منتقل کی جاتی ہے تو عارضی طور پر بعض اختیارات کا انتقال ملتوی کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح تجارتی اور فرقہ وارانہ امتیازات بھی ہمیشہ کی رہنے والی چیزیں نہیں ہیں۔ اگر ہندوستانیوں نے نیک نیتی سے دستور کو چلانا چاہا تو ان تحفظات کے استعمال کی کبھی ضرورت ہی پیش نہ آئے گی اور یہ بے کاری کی وجہ سے آپ ہی آپ فنا ہو جائیں گے۔ لیکن ہندوستانیوں کے گذشتہ تجربے بہت تلخ ہیں۔ وہ اب آسانی سے اس ابلہ فریبی کے شکار نہ ہوں گے۔

رسالہ:۔

مصحف مصحف ماہوار مدیر مسئول جناب شاکر نائطی۔ تقطیع متوسط۔ ضخامت ۵۲ صفحات کتابت وطباعت اور کاغذ بہتر۔ قیمت سالانہ ؎۔ مقام اشاعت عمرآباد (مدراس)

صوبہ مدراس کے مسلمانوں کو اُردو سے ہمیشہ سے شغف رہا ہے اور اس زبان کے بہت اچھے اچھے شاعر اور ادیب یہاں پیدا ہو چکے ہیں۔ اخبارات و رسائل بھی اکثر اسی زبان میں نکلتے رہے ہیں اب جناب شاکر نائطی صاحب عمرآباد نے ایک نیا رسالہ مصحف جاری کیا ہے۔ جو مضامین، ترتیب۔ لکھائی چھپائی غرض ہر حیثیت سے شمالی ہند کے کسی رسالے سے کم نہیں ہے۔ مضمون نگاروں میں مولانا سید سلیمان ندوی۔ مولانا محوی لکھنوی۔ جناب یاس عظیم آبادی، حضرت احسن مارہروی۔ جناب نوح ناروی حضرت امجد حیدرآبادی۔ جناب نصیرالدین ہاشمی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ اُردو کے قدرداں اس کی بیش از بیش قدردانی فرمائیں گے۔

(ح - ح)

تنقید و تبصرہ

کتب

نغمۂ روح ۔ تسکار ۔ خیالات مہاتما گاندھی۔

نغمۂ روح | اختر انصاری صاحب کے اشعار کا مجموعہ مع مقدمہ ۔ بڑی سائز، حجم ۸۰ صفحہ، کتابت، طباعت، کاغذ معمولی، قیمت عمر

ایک مختصر سے مقدمے میں اختر انصاری صاحب نے اپنے اور دوسروں کے چند ملفوظات جن میں آرٹ اور اس کے مختلف شعبوں کی تعریف ہے، جمع کر دیے ہیں ۔ ان کا لب لباب یہ ہے کہ آرٹ زندگی سے بے تعلق اور آزاد ہے ۔ اس نظریے کے اگر کچھ معنیٰ ہو سکتے ہیں تو یہ ہیں کہ آرٹ کا کام فرد کی شخصیت کا اظہار ہے اور اس میں وہ اجتماعی زندگی کے مقاصد کا پابند نہیں۔ واقعے کی حیثیت سے یہ صحیح ہے کہ اجتماعی روح کے کمزور ہو جانے کی وجہ سے زندگی کے اور شعبوں کی طرح آرٹ کا رشتہ بھی زندگی سے ٹوٹ جاتا ہے۔ مشرق میں یہ حالت عرصے سے ہے اور مغرب میں بھی کچھ دن سے پیدا ہوگئی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ آرٹ نے مسخ ہو کر وہ صورت اختیار کی ہے جو اب ہمارے سامنے ہے۔ خیر اس بحث کا یہاں موقع نہیں۔ مقصود تو اختر انصاری صاحب کے کلام کی تنقید ہے اور وہ بھی مروجہ معیار کے مطابق۔

اختر صاحب اپنے اکثر ہمعصروں کی طرح صرف جذبات انسانی، خصوصاً درد و الم یاس و حرماں کے مصور ہیں :۔

تم سمجھتے ہو شعر کہتا ہوں   اپنے زخموں سے کھیلتا ہوں میں
کوئی رنگوں میں، کوئی شعر میں، کوئی سُر میں   درد اپنا کوئی نالوں میں کہا کرتا ہے

ان کے انبساط کی حد یہ ہے :۔

میرے مایوس دل میں لے اختر ۔۔۔ اس طرح سے اُمید آتی ہے
جس طرح اک اداس چہرے پر ۔۔۔ مسکراہٹ سی کھیل جاتی ہے

کبھی کبھی فطرت کا مطالعہ کرتے ہیں مگر وہ بھی انھیں اپنی طرح مغموم نظر آتی ہے۔ آب رواں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں۔

کس قیامت کا بھرا ہے سوز تیرے ساز میں

بسنت میں اور بہار میں انھیں فطرت کے طرب و نشاط کا احساس ہوتا ہے مگر اتنا نہیں کہ ان کی دل تنگی اور دل گیری کو دور کر دے۔

نزہت فصل بہاری عیش کی بنیاد ہے

لیکن اسے دیکھ کر انھیں حسرت ہوتی ہے۔

میرے دل کی اجڑی دنیا میں بھی آجائے بہار

بہ تقاضائے عمر ان کے دل میں امنگ اٹھتی ہے۔

ابل رہا ہے نشاط و سرور کا دریا ۔۔۔ رواں جگر سے نظر تک ہے نور کا دریا

اور اس سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:۔

مے نشاط کا تو ایک جام ہے گویا ۔۔۔ مجھے حیات ابد کا پیام ہے گویا

"گویا سے" اندازہ کر لیجیے کہ اس امنگ کی بساط کتنی ہے۔
اختر صاحب نغمے کے عاشق ہیں مگر اکثر نغمے سے زیادہ مغنیہ ان کے دل کو کھینچتی ہے۔

زمزمہ سنج مطربہ جس دم ۔۔۔ طرب افزا سروں میں گاتی ہے
زندگی کی اندھیری راتوں میں ۔۔۔ ایک بجلی سی کوند جاتی ہے

"طاعت" میں "مے و انگبیں" کی لاگ نہ ہوتی تو اچھا تھا۔

اختر صاحب اگر اپنے موضوع کلام کو اپنے مشاہدے اور احساس کو اس سے زیادہ وسیع نہیں کرنا چاہتے

تو وہ جانیں مگر انھیں الفاظ کی مناسبت اور بندش کی چستی کی طرف سے غافل نہیں ہونا چاہئے۔ نئی پود کے اکثر شاعروں کی سہل انگاری شاعری کا خون کر رہی ہے۔ کسی نے شاعر کی تعریف میں کہا ہے۔

برائے پاکی لفظے شبے بروز آرد — کہ مرغ و ماہی باشند خفتہ او بیدار

ہمارے سخنوروں کی شب بیداری سینما اور تھیٹر تک محدود ہے۔ شعر کہنے کے لئے انھیں اس کی ضرورت نہیں۔ رسالے کے اڈیٹر کا تقاضا صبح کی ڈاک سے آتا ہے سہ پہر کی ڈاک سے غزل یا نظم سانچے میں ڈھل کر چلی جاتی ہے۔

ہم اختر صاحب کے سلیس اور بے لطف اشعار کے نمونے دکھا چکے۔ اب کچھ مثالیں ان نامناسب الفاظ، غلط ترکیبوں اور سست بندشوں کی پیش کرتے ہیں جو اس مجموعے میں کہیں کہیں پائی جاتی ہیں۔

لے دنیوی شکوہ و زر و جاہ کے خیال — مجھ سے نہ بول عرش پہ میرا دماغ ہے

"مجھ سے نہ بول" خفگی کے موقع پر کہا جاتا ہے "مجھ کو نہ چھیڑ" کہئے۔

کم زور اور سست تھی کاغذ پہ وہ غزل — گائی گئی تو چیز ہی کچھ اور ہو گئی

الفاظ تیر بن کے دلوں میں اتر گئے — لفظوں میں روح نغمہ کچھ اس طرح کھو گئی

تیر دل میں اترنا نہیں چھبتا ہے۔ "لفظوں میں روح نغمہ کچھ اس طرح کھو گئی" یہ گانے کی تعریف ہے یا غزل کی مذمت۔

تیری نازک اور پتلی انگلیاں — ساز کے تاروں کو جب کرتی ہیں مس

کانپنے لگتی ہے زہرہ عرش پر — دل پکار اٹھتا ہے "بس اللہ بس"

یہ بھی ہجو ملیح معلوم ہوتی ہے۔ "کانپنے" کے لفظ نے یہ خرابی پیدا کی ہے۔

صدقے جاؤں بہار ساون کے

"بہار ساون" کی ترکیب غلط ہے خواہ حضرت دتا تریہ کیفی کچھ بھی فرمائیں۔

اب قوم کا تنفس محتاج ہے تپش کا — تیری جلن سے اس میں چنگاریاں ہوں بند

تنفس کا لفظ اردو میں دم کے معنی میں نہیں دم چڑھنے کے معنی میں آتا ہے۔ اس شعر کو پڑھ کر ایک

علامۂ عصر کا قول یاد آگیا "فلاں انجمن میں کیا رکھا ہے چند شخص بیٹھے اونگھا کرتے ہیں"۔

مجموعی طور پر اختر صاحب کا کلام بہت اچھا ہے اور وہ نوجوان شاعروں کی صف اول میں جگہ پانے کے مستحق ہیں۔ (ع - ح)

شکار | از جناب قطب یار جنگ مرحوم اول تعلقہ دار سرکار نظام۔ حجم ۴۰۰ صفحات تقطیع بڑی، کتابت و طباعت عمدہ، کاغذ نفیس، قیمت مجلد ۵ روپے۔ ملنے کا پتہ مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد (دکن)

انگریزی اور دوسری مغربی زبانوں میں شکار پر اور ہندوستان کی بعض بہترین شکارگاہوں پر بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ہمارے ملک میں باوجودیکہ شکار کا ذوق عام ہے اور شکار کی بھی کثرت ہے لیکن تعجب کا مقام ہے کہ اردو زبان میں اس موضوع پر ابھی تک کچھ نہیں لکھا گیا تھا۔ اس لئے نوآموز اور انگریزی زبان سے ناواقف شکاریوں کے لئے سوائے پرانے اور غلط سلط تجربات کے کوئی چیز راہ نما نہ تھی۔ اس کتاب کی تالیف و اشاعت نے اس کمی کو بڑی حد تک پورا کر دیا ہے۔

شروع میں انتساب کے بعد نواب قطب یار جنگ مرحوم کے مختصر حالات زندگی ہیں۔ ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب صاحب کو زمانۂ طالب علمی سے ورزش اور شکار کا شوق تھا، تعلیم سے فارغ ہو کر حیدرآباد محکمۂ فوج میں ملازم ہوئے پھر اول تعلقہ دار (ڈپٹی کمشنر) ہو گئے۔ تقریباً ایسے اضلاع میں ہوا جو شکار کا مشہور مرکز ہیں اس لئے اس شوق کو پورا کرنے کا خوب موقع ملا اور گویا ملازمت کا اکثر حصہ شکار میں گزرا۔

سوانح حیات کے بعد خود مصنف کا طویل مقدمہ ہے۔ اس میں انھوں نے شکار کو دوسرے ورزشی کھیلوں (sports) سے افضل بتایا ہے۔ پھر نشانہ اندازی کا طریقہ بتایا ہے۔ بندوق اور اس کے سامان کے متعلق مفید اور قیمتی ہدایات درج کی ہیں۔ شکار کے سامان کی پوری تفصیل لکھی ہے اور یہ بتایا ہے کہ شکاری کے ساتھ کس قسم کے آدمی ہونا چاہئیں۔ اس کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے اس میں انھوں نے شکار کی قسمیں بتائی ہیں مثلاً چیتے سے ہرن کو شکار کرنا، مچھلی پکڑنا، جال لگا کر پرندوں کو پکڑنا، کسی آلۂ جارحہ یا بندوق سے جانوروں کا شکار کرنا وغیرہ۔ انھوں نے بتایا ہے کہ یہ کتاب بندوق کے شکار کے متعلق ہے۔

بندوق کے شکار کی انھوں نے دو قسمیں کی ہیں، اسمال گیم (چھوٹا شکار) اور بگ گیم (بڑا شکار یا بڑے جانوروں کا شکار)۔ اسمال گیم میں انھوں نے سنائپ، بٹیر، ہریل، تیتر، تلیر، کبوتر، مور، آبی پرندوں اور خرگوش کا ذکر کیا ہے۔ بگ گیم میں تمام چرندوں اور درندوں کا ذکر ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے ہرن، چکارہ، جنگلی بکری، جنگلی مینڈھی، چیتل، نیل گائے، بارہ سنگھے اور سانبھر کا حال لکھا ہے۔ سانبھر کے بیان پر کتاب کا پہلا حصہ ختم ہو جاتا ہے۔

بعد میں درندوں اور ان جانوروں کا حال ہے جو انسان کے لئے درندوں کی طرح خطرناک ہیں مثلاً جنگلی بھینسا، بیل، گینڈا، ہاتھی وغیرہ۔ دوسرے حصہ میں پہلے شیر کا بیان ہے اور ۲۲۲ صفحے پر ختم ہوا ہے۔ اس کے بعد تیندوا یا گلدار، چیتے، بھیڑئے، جنگلی کتے، سیاہ گوش سہی، ریچھ، سؤر، گور، ماہابنس، جنگلی بھینسے اور گینڈے اور سب سے آخر میں شیر ببر کا حال ہے۔ فاضل مؤلف نے ان جانوروں کے شکار کے طریقے ہی نہیں بتائے ہیں بلکہ ہر جانور کی پیدائش، زمانہ پیدائش، بچپن، جوانی، بڑھاپا اور عادات و خصوصیات کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے۔

یہ مواد انھوں نے انگریزی کی مستند تصانیف اور خود اپنے تجربے کی مدد سے فراہم کیا ہے۔ کتاب کی دلچسپی قائم رکھنے اور مختلف باتوں کو سمجھانے کے لئے انھوں نے بیشتر اپنے اور کمتر دوسرے شکاریوں کے شکار کے واقعات درج کئے ہیں۔ شیر کے بیان میں انھوں نے خاص طور پر اس کا التزام رکھا ہے۔ یہ واقعات اس قدر دلچسپ اور بعض اوقات اس قدر حیرت انگیز ہیں کہ پڑھنے والا ہمہ تن محو ہو جاتا ہے۔ یہ موضوع بجائے خود دلچسپ ہے لیکن مؤلف کے طرز تحریر نے اسے دلچسپ تر بنا دیا ہے۔ روانی بیان، صفائی و سلاست کو دیکھ کر اس امر کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ مصنف کو سیف و قلم پر یکساں قدرت حاصل ہے۔

یہ کتاب وقت کے بہترین شکاری کے تجربات اور مشہور و مستند مغربی مصنفین کی کتابوں کا نچوڑ ہے۔ اگر اس میں کوئی کمی ہے تو صرف تصویروں کی۔ تصویروں سے کتاب اور بھی دلچسپ اور مفید ہو جاتی۔ ناشر صاحب کا وعدہ ہے کہ دوسرے ایڈیشن میں وہ تصویروں کا اضافہ کر دیں گے۔

ہمارے خیال میں یہ کتاب تجربہ کار شکاریوں کے لئے بہترین مشیر اور نو آموز شوقینوں کے لئے مستند رہنما کا کام دے گی۔

(ح۔ ح)

خیالات مہاتما گاندھی (دو حصہ) از پادری سی۔ اف۔ اینڈریوز۔ حجم ہر دو حصہ ۱۲۵ صفحات، تقطیع چھوٹی، کتابت وطباعت اور کاغذ متوسط۔ دونوں حصوں کی قیمت عہ۔ ملنے کا پتہ: رفعت یار خاں۔ حکیم بلڈنگ۔ تیسری منزل، مومن پورہ بمبئی نمبر ۱۱۔

اس کتاب میں پادری سی۔ ایف۔ اینڈریوز نے مہاتما گاندھی کے اصول وخیالات اور ان کی خود نوشت سوانح حیات کے منتخب حصوں کو جمع کر دیا ہے۔ کتاب کا مقصد خود ان کے الفاظ میں ان بڑے بڑے اصولوں اور خیالات کی جو مہاتما گاندھی کی پُر از واقعات زندگی کا طرۂ امتیاز رہے ہیں تحریری شہادت کی امداد سے تشریح کرنا ہے۔

کتاب میں علاوہ خاتمے اور ضمیموں کے بیس باب ہیں۔ پہلے ۹ بابوں میں مہاتما گاندھی کے اصول اور خیالات ہیں اور دوسرے حصہ میں ان کی سوانح حیات کا انتخاب۔ پادری صاحب کا طریقہ یہ رہا ہے کہ وہ پہلے تو مہاتما گاندھی کے خیالات واصول کی اپنے الفاظ میں تشریح کرتے یا اپنے تاثرات ظاہر کرتے ہیں پھر مزید تشریح یا ثبوت کے لئے، خود گاندھی جی کی تحریروں کے اقتباسات پیش کرتے ہیں اور یہ طریقہ شروع سے آخر تک رہا ہے۔ مہاتما گاندھی کی زندگی اور ان کے اصول وعقائد پر اب تک بہت سی کتابیں لکھی جا چکیں۔ یہ کتاب ان میں ایک مفید اضافہ ہے۔ پادری صاحب نے اسے بہت محنت اور سلیقے سے مرتب کیا ہے اور بہت سے اہم مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔ کتاب کا اردو ترجمہ بھی بہت صاف، سلیس اور رواں ہے۔

(ح۔ ح)

رسائل:۔

کنول (ماہوار) مدیر جناب منظر صدیقی اکبرآبادی۔ تقطیع متوسط۔ حجم ۸۴ صفحات کتابت وطباعت بہتر کاغذ اوسط درجے کا قیمت سالانہ ۳ ، فی پرچہ ۵ ، مقام اشاعت آگرہ۔

جناب منظر صدیقی نے یہ رسالہ جاری کیا ہے۔ پہلا پرچہ محنت اور سلیقہ سے مرتب کیا گیا ہے۔ رسالے میں علمی وادبی مضامین۔ فسانے، نظمیں، غزلیں۔ غرض ہر طرح کا سامان موجود ہے شعرا اور مضمون نگاروں میں بھی بعض اچھے اچھے نام نظر آتے ہیں۔ بلاک کی بھی تین تصاویر ہیں۔ اگر منظر صاحب اسی محنت ودلچسپی سے کام کرتے رہے تو رسالہ بہت جلد مقبولیت حاصل کرے گا۔

(ح۔ ح)

شذرات

اپریل کے مہینہ میں اندور میں ایک ہندی کانفرنس کا انعقاد ہوا تھا۔ مہاتما گاندھی اس کے صدر تھے۔ اس میں ہندی کی ترقی کے لئے بہت سی تجویزیں منظور ہوئیں منجملہ ان کے ایک تجویز یہ تھی کہ ہندوستان کے مختلف صوبوں کی زبانوں اور ادیبوں کو ایک دوسرے سے قریب تر کرنے کی کوشش کی جائے اور ہندی زبان کو ہندوستان کی مشترکہ قومی زبان ہونے کی حیثیت سے ملک کی تمام زبانوں کے ادب کی نمایندگی کا موقع دیا جائے۔ اس غرض کے حصول کے لئے فی الحال تین آدمیوں کی ایک کمیٹی بنا دی گئی ہے اور اس کمیٹی کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اپنے ارکان کی تعداد میں اضافہ کرسکتی ہے۔ کمیٹی نے اس سمت میں ابتدائی قدم اس طرح اٹھایا ہے کہ ہندی زبان میں ایک رسالہ "ہنس" جاری کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے اور صوبوں کی مختلف زبانوں میں جو مضامین مندرجہ ذیل عنوانات کے ماتحت چھپتے رہتے ہیں ان کا ترجمہ اس رسالہ میں شائع ہوا کرے گا۔

(۱) مختلف صوبوں کے ادبی اور تمدنی واقعات پر مختصر نوٹ۔

(۲) صوبوں کے ادبیات کی تاریخ کا ایک مختصر خاکہ جس میں خاص زور ان کی جدید ترقی اور قومی رجحانات پر دیا گیا ہو۔

(۳) صوبوں کے ادب کی بہترین غزلیں۔

(۴) صوبوں کے ادب کے بہترین افسانے۔

(۵) ایک مسلسل مضمون۔

(۶) مختلف صوبوں کے عوام میں جو ادب رائج ہو۔

(۷) مختلف زبانوں کے بہترین ڈرامے۔

(۸) صوبوں کے ادبوں میں جن نثر نگاروں اور شاعروں کا درجہ بلند و ممتاز ہے ان کی سیرۃ نگاری کے نمونے اور ادبی تنقیدیں۔

(۹) مختلف صوبوں کے ممتاز لوگوں کی لفظی تصویریں۔

(۱۰) صوبوں کے ادبوں اور تمدنوں کا باہمی مقابلہ۔

(۱۱) مختلف زبانوں میں جو کتابیں شائع ہوتی ہیں ان پر تبصرہ۔

(۱۲) مختلف رسالوں میں جو وقتی ادب شائع ہوتا ہے اس کی اشاعت ہندی ترجمہ کے ساتھ۔

(۱۳) غیر ملکی ادب پر مختصر نوٹ۔

(۱۴) صوبہ جاتی زبانوں کے بہترین ناولوں کے خلاصے۔

(۱۵) ہندوستان کے لئے مشترک رسم الخط پر بحث و مباحثہ۔

اس کمیٹی کے ارکان نے اردو کا شمار بھی صوبہ جاتی زبانوں میں کیا ہے اور ہمارے پاس اشتراک عمل کے لئے اپنا لٹریچر روانہ کیا ہے۔ کیا اردو واقعی ایک فرقہ اور صوبہ کی زبان ہے؟ اس کا جواب باتوں سے نہیں کاموں سے دیا جاسکتا ہے۔ جو کام کرے گا وہ آہستہ آہستہ نکموں اور ناکاروں پر حاوی ہو جائے گا۔ کام کی منطق تمام لفظی منطقوں سے زیادہ طاقتور ہوتی ہے۔

حضرت جوش ملیح آبادی نے ہمارے پاس ایک اپیل اشاعت کے لئے بھیجی ہے۔ وہ ایک رسالہ "کاخ بلند" دہلی سے نکالنا چاہتے ہیں۔ جوش صاحب نے زبان و ادب کی جو خدمات انجام دی ہیں ان سے اردو داں طبقہ بخوبی واقف ہے۔ اس رسالہ کے ذریعہ سے ان کا ارادہ یہ ہے کہ اپنے میدان عمل کو اور وسیع کریں اور اپنی باقی زندگی ملک میں بیداری پیدا کرنے کے لئے وقف کردیں۔ ان کا ارادہ نہایت مستحسن ہے اور ان کا مطالبہ بھی کچھ بہت زیادہ نہیں۔ چندہ دس روپیہ ہے اور وہ رسالہ کے اجراء سے پہلے چاہتے ہیں کہ ایک ہزار خریدار اس چندہ کو پیشگی منی آرڈر کردیں۔ ہم ان کی اپیل بجنسہ دوسرے صفحہ پر درج کررہے ہیں۔ ہمیں یقین ہے جناب جوش کے قدردان انھیں مایوس نہ کریں گے۔

بڑی چھٹیوں کے بعد جامعہ کھل گئی ہے۔ داخلہ ابتدائی اور ثانوی جماعتوں میں پچھلے سال سے اچھا رہا ہے۔

نئے دارالاقامہ بھی خوب آرام دہ اور وسیع ہیں۔ پڑھائی کا کام شروع ہوگیا ہے۔

شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کو بنارس کی قومی جامعہ نے تقسیم اسناد کے موقع پر خطبہ پڑھنے کے لئے مدعو کیا تھا۔ صاحب موصوف نے وہاں جو خطبہ پڑھا اُسے ہم جامعہ کی آیندہ اشاعت میں پیش کریں گے۔

مولوی شفیق الرحمن صاحب ناظم ہمدردان جامعہ کو ضلع بارہ بنکی میں عمارات جامعہ کے لئے چندہ کی فراہمی میں اچھی کامیابی ہوئی۔ اس ضلع سے تقریباً تیرہ سو روپیہ جمع ہوگیا۔ آج کل وہ ضلع الہ آباد کا دورہ کر رہے ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جامعہ

جلد ۲۴	ماہ اکتوبر ۱۹۳۵ء	نمبر ۱۰

فہرست مضامین

(پروفیسر محمد مجیب بی ۔ اے (آکسن) پرنٹر و پبلشر نے جامعہ برقی پریس دہلی میں چھپوا کر شائع کیا)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جامعہ

نمبر ۱۰	ماہ اکتوبر ۱۹۳۵ء	جلد ۲

فہرست مضامین

(پروفیسر محمد مجیب بی۔ اے (آکسن) پرنٹر و پبلشر نے جامعہ برقی پریس دہلی میں چھپوا کر شائع کیا)

حالی

مولانا حالی مرحوم کی زندگی کے حالات یا تو اس مختصر یادداشت میں ملتے ہیں جو انھوں نے خود مرتب کی تھی اور جو مکتوبات حالی اور مقالات حالی کے ساتھ شائع ہوئی، یا اس چھوٹے سے رسالے میں جو محمد امین زبیری صاحب نے لکھا ہے۔ امید ہے کہ اس موقع پر جب حالی صدی کا جشن بڑی دھوم دھام سے منایا جارہا ہے، ہمارے اہل قلم میں سے کوئی مولانا حالی کی ایک مبسوط سیرت لکھنے کا ڈول ڈالے گا۔ ہماری آنکھیں مولوی عبدالحق صاحب کی طرف لگی ہوئی ہیں۔

ہم اس مضمون میں ایک سرسری خاکہ مولانا حالی کی سیرت کا پیش کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ایک دھندلی سی، ادھوری تصویر ہے جو مولانا کی نظم و نثر کو پڑھ کر اور ان کے حالات ان کے عزیزوں سے سن کر، ذہن میں قائم ہوگئی ہے۔

اس تصویر میں ایک معلم، ایک نقاد، ایک مصلح قوم کے خط و خال بھی موجود ہیں لیکن دل کی کیفیت جو آنکھوں سے جھلکتی ہے صاف کہہ رہی ہے کہ یہ ایک شاعر کا چہرہ ہے۔

شاعر کا مفہوم ہمارے ملک میں بہت محدود ہوگیا ہے۔ ہم ایک عرصے سے ایک خاص کینڈے کے شاعر دیکھتے آئے ہیں اور ہم نے سمجھ رکھا ہے کہ سب شاعر ایسے ہی ہوتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ شاعر کا ہیولےٰ ایک ہے مگر تربیت کے فرق سے اس کی صورتیں دو ہو جاتی ہیں۔ وہ جوہر جو سب شاعروں میں عام ہیں یہ ہیں: تخیل کی تیزی، نظر کی باریکی، حسن اور تناسب کی پرکھ، احساس کی شدت خصوصاً محبت اور خودی کے جذبات کی فراوانی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ شاعر کس زمانے میں پیدا ہوتا ہے اور اسے ان جوہروں کی تربیت کے لیے کون سا میدان ملتا ہے۔

اگر زمانہ انتشار کا ہے، معاشرت کا شیرازہ بکھر چکا ہے، فرد کا رشتہ جماعت سے ٹوٹ گیا ہے، سب اپنے اپنے حال میں اور اپنی اپنی فکر میں ہیں تو شاعر بھی باہر کی دنیا سے آنکھ بند کرکے اندر کی دنیا میں ڈوب جاتا ہے۔

اس کا تخیل اور اس کا مشاہدہ نفس کے دائرے کو اپنی جولانی کے لئے تنگ پاتا ہے تو اس واردات کو جو قلب پر گزرتی ہے بڑھا چڑھا کر بیان کرتا ہے اور اس میں نئی نئی باریکیاں پیدا کرتا ہے۔ یہاں تک کہ مشاہدے کی قید ہی ٹوٹ جاتی ہے۔ محض خیال کے جادو سے وہ ایک طلسم حیات باندھتا ہے اور اسی میں مگن رہتا ہے۔ اس کی نظر حسن اور تناسب کو ڈھونڈتی ہیں مگر وہ عالم فطرت اور عالم معاشرت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا بلکہ اپنے مذاق کے مطابق ایک خیالی پیکر حسن تراشتا ہے اور اس کی خفیف سی جھلک کسی انسان میں دیکھ کر اسے اپنا معشوق بنا لیتا ہے۔ محبت کا جذبہ جس کی وسعت نامحدود ہے سمٹ کر اسی ایک مرکز پر قائم ہو جاتا ہے اور اس کی شدت بہت بڑھ جاتی ہے۔ وہ اور تمام جذبات کو اپنے رنگ میں رنگتا اور شاعر کی ساری زندگی پر چھا جانا چاہتا ہے۔ مگر خودی کا جذبہ جو اس داخلیت کی فضا میں پھیل کر خود پرستی کی حد تک پہنچتا ہے محبت یا عشق کا حریف مقابل بن جاتا ہے عشق اور خودی کی اس کشمکش سے شاعر کی نفسی زندگی میں ایسے پیچ پڑ جاتے ہیں جو کھولے نہیں کھلتے۔ وہ وارفتہ مزاج، بے چین اور چڑچڑا ہو جاتا ہے۔ وہ شدت سے محبت کرتا ہے اور اس سے زیادہ شدت سے شکایت کرتا ہے۔ جب معشوق اس پیکر خیال سے مختلف ثابت ہوتا ہے جو اس کے ذہن میں ہے، جب اصلی زندگی طلسمی زندگی سے ٹکراتی ہے، تو وہ کڑھتا ہے، مچلتا ہے، فریاد کرتا ہے۔ اس کی وضع نفسی کی پیچیدگی، اس کے جذبات کا انتشار اور شدت، اس کے اسلوب بیان میں پیچیدگی، مبالغہ اور بے ربطی پیدا کر دیتی ہے۔ اردو شاعری نے اگر پہلے نہیں تو انیسویں صدی کے شروع سے یہی رنگ اختیار کر لیا تھا۔ جو لوگ اس صدی میں پیدا ہوئے انھوں نے آنکھ کھول کر دیکھا تو انھیں صرف اسی قسم کی شاعری اور اسی قسم کا شاعر نظر آیا۔ کسی اور طرز کے شاعر کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ اگر زمانہ موافق ہو، روح اجتماعی زندہ ہو، افراد کا رابطہ حیات و کائنات سے قائم ہو، شاعر کی خلقی صفات کو نشوونما کا موقع ملے تو وہ کچھ اور ہی چیز ہو جاتا ہے۔ تخیل کی تیزی مشاہدے کی وسعت کے ساتھ مل کر اسے خدا کی دنیا اور انسان کی زندگی کی جیتی جاگتی تصویر دکھاتی ہے۔ اس وسیع جلوہ گاہ میں اسے حسن و تناسب کا حقیقی جلوہ حسن صورت اور حسن معنی کا صحیح امتزاج نظر آتا ہے۔ وہ فطرت کی ہم آہنگی اور معاشرت کے توازن سے آشنا ہوتا ہے تو اس کے جذبات میں بھی ربط ضبط اور اعتدال پیدا ہو جاتا ہے۔

اس کا جذبۂ محبت نوعی ہمدردی کے ساتھ مل کر اس قدر وسعت حاصل کرتا ہے کہ دوستی، صلۂ رحم، حب وطن، حب انسان سب پر حاوی ہو جاتا ہے اور اگر وہ حب الٰہی کا حوصلہ کرے تو اسے زیب دیتا ہے۔ شاعر کی خودی کو یہ عالمگیر محبت کاٹ چھانٹ کر سنوارتی ہے۔ انانیت کے کانٹے نکل جاتے ہیں۔ خودداری، غیرت، اغنائے نفس کے پھول باقی رہ جاتے ہیں۔ زندگی اور خیالات کی حقیقت اور ہم آہنگی اسلوب بیان سے سادگی اور سچائی بن کر ٹپکتی ہے۔ یہ شاعر متین، خود مزاج، منکسر اور بردبار ہوتا ہے۔ وہ نفس انسانی، عالم معاشرت، عالم فطرت کے حقائق کو ہمدردی کی نظر سے خود دیکھتا ہے اور دوسروں کو دکھاتا ہے۔ دردو سوز اسی کا حصہ ہے اس لئے کہ اسے صرف اپنا ہی غم نہیں سارے جہان کا غم ہوتا ہے۔ عاشقی کا دعویٰ اسی کو پھبتا ہے اس لئے کہ وہ اپنی خودی کا عکس معشوق کی ذات میں نہیں ڈھونڈھتا بلکہ معشوق کی حقیقی صفات کو دیکھ کر بے ساختہ اس کی طرف کھنچتا ہے۔ زندگی کی تلخیاں اسے بھی چکھنی پڑتی ہیں۔ محبت کی کڑیاں اسے بھی جھیلنی پڑتی ہیں مگر وہ ضبط اور متانت کو ہاتھ سے نہیں دیتا۔ فریاد بھی کرتا ہے تو سادگی اور سچائی سے۔

شاعر کے اس تصور کو ذہن میں رکھ کر حالی کی زندگی پر نظر ڈالئے۔ خواجہ الطاف حسین حالی ۱۸۳۷ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔ باپ کا سایہ بچپن ہی میں سر سے اٹھ گیا۔ بھائی بہنوں کی سرپرستی میں اس دریتیم کی پرورش ہوئی۔ حالی کو شروع سے "خود بخود تعلیم کا شوق حد سے زیادہ تھا مگر باقاعدہ اور مسلسل تعلیم کا کبھی موقع نہیں ملا۔" پہلے پانی پت کے دستور کے مطابق کلام مجید حفظ کیا۔ اس کے بعد فارسی کی ابتدائی کتابیں اور عربی صرف و نحو پڑھی۔ ۱۷ برس کی عمر میں حالی کی شادی کردی گئی اور بہ ظاہر ان کی تعلیم کا دروازہ بند ہو گیا۔

مگر علم کی لگن نے چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ حالی "گھر والوں سے روپوش ہو کر" دلی چلے آئے۔ اور ڈیڑھ برس وہاں رہ کر کچھ صرف و نحو اور کچھ ابتدائی کتابیں منطق کی پڑھیں۔ یہاں انھیں غالب کی صحبت میں بیٹھنے کا موقع ملا۔ مرزا کے فارسی اور اردو شعر جو سمجھ میں نہیں آتے تھے وہ ان سے حل کیا کرتے تھے اور ان کے چند فارسی قصیدے بھی ان سے پڑھے۔ شاعری کا جوہر جو فطرت نے حالی کی طبیعت میں ودیعت کیا تھا غالب کے فیض تربیت سے ابھرنے لگا۔ ایک آدھ غزل اردو فارسی کی کہہ کر غالب کو دکھائی تو انھوں نے

کہا "اگرچہ میں کسی کو فکرِ شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا لیکن تمھاری نسبت میرا خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کرو گے"۔ سترہ اٹھارہ برس کی عمر کے لڑکے سے غالب جیسے جوہر شناس نے یہ بات کچھ دیکھ کر اور کچھ سمجھ کر کہی ہوگی۔

بزرگوں اور عزیزوں کے جبر سے حالی کو اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر پانی پت واپس جانا پڑا۔ حصار میں سرکاری ملازمت کے سلسلے میں داخل ہوئے مگر ۱۸۵۷ء کی بدامنی میں گھر چلے آئے۔ کوئی چھ برس تک وہیں رہ کر بغیر کسی ترتیب اور نظام کے کبھی منطق یا فلسفہ، کبھی حدیث، کبھی تفسیر پڑھتے رہے۔

۱۸۶۳ء میں نواب مصطفےٰ خاں صاحب شیفتہ رئیس جہانگیر آباد نے انھیں طلب کیا اور آٹھ برس تک نہایت شفقت اور محبت سے اپنے پاس رکھا۔ نواب صاحب اردو اور فارسی کے خوش گو شاعر تھے۔ ستھرا اور پاکیزہ مذاقِ سخن رکھتے تھے۔ ہم مذاق مربی کی صحبت سے حالی کی شاعری چمک اٹھی۔ اس عرصہ میں وہ غالب سے اصلاح لیتے رہے مگر اس سے اتنا فائدہ نہیں ہوا جتنا نواب صاحب کی صحبت سے۔ "وہ مبالغہ کو ناپسند کرتے تھے اور سیدھی سادی سچی باتوں کو محض حسنِ بیان سے دلفریب بنانا اسی کو منتہائے کمالِ شاعری سمجھتے تھے۔"

۱۸۶۹ء میں غالب نے وفات پائی۔ حالی نے اپنے شفیق استاد کا جو مرثیہ لکھا وہ ایک طرف ان کے کمالِ شاعری کا نمونہ ہے تو دوسری طرف ان کی احسان شناسی اور عقیدت مندی کو ظاہر کرتا ہے جو شاعروں کے یہاں بہت کم یاب جنس ہے۔ غالب کی سیرت کا وہ نقشہ کھینچا ہے کہ اس سے بہتر قلمی تصویر ہماری نظم و نثر میں نہیں ملتی۔ یونانیوں کے ذہن میں جو تصور "انسانیت" کا تھا اس کی جھلک حالی کو غالب کی ذات میں نظر آئی اور اسے انھوں نے شعر کا جامہ پہنا کر بقائے دوام بخش دی۔

مظہرِ شانِ حسنِ فطرت تھا　　　معنیِ لفظِ آدمیت تھا

یہ ایک شعر ایک قصیدے سے کم نہیں ہے۔

تھوڑے ہی دن کے بعد نواب شیفتہ کا بھی انتقال ہوگیا۔ حالی کو پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو میں جگہ مل گئی۔ یہاں ان کے ذمہ یہ کام تھا کہ جو ترجمے انگریزی سے اردو میں ہوں ان کی عبارت کو درست کر دیا

کریں - لاہور کے اس چار برس کے قیام نے حالی کے مذاق ادب اور مذاق شعر کو بہت کچھ بدلا ۔ انگریزی کتابوں کے ترجموں پر نظر ڈالنے سے حالی کی طبع سلیم نے وہ باتیں اخذ کرلیں جو لوگوں کو انگریزی ادب کی تحصیل میں عمریں کھپانے سے بھی حاصل نہیں ہوتیں ۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ "نامعلوم طور پر آہستہ آہستہ مشرقی لٹریچر خاص کر عام فارسی لٹریچر کی وقعت دل سے کم ہونے لگی" ادھر مولوی محمد حسین آزاد نے ایک مشاعرے کی بنیاد ڈالی "جو ہندوستان میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل نیا تھا اور جس میں بجائے مصرع طرح کے کسی مضمون کا عنوان شاعروں کو دیا جاتا تھا کہ اس عنوان پر اپنے خیالات جس طرح چاہیں نظم میں ظاہر کریں ۔"

حالی نے اس مشاعرے کے لئے چار نظمیں "برکھارت" "نشاط امید" "مناظرۂ رحم و انصاف" اور "حب وطن" لکھیں ۔ ۱۸۷۵ء یا ۱۸۷۶ء میں وہ لاہور سے دہلی اینگلو عربک اسکول کی مدرسی پر بدل آئے ۔

یہ حالی کی زندگی اور ان کی شاعری کا پہلا دور ہے ۔ ان کے اس زمانے کے حالات بہت کم معلوم ہیں ۔ ان کے مکتوبات میں جو شائع ہوئے ہیں ۱۸۸۱ء سے پہلے کا کوئی خط نہیں ۔ ان کی نظم و نثر سے سوائے اس کے کہ ان کے جذبات و خیالات کا اندازہ ہو زندگی کے واقعات کا کچھ پتہ نہیں چلتا اس لئے کہ خود ستائی اور خود فروشی ان کا شیوہ نہیں تھا ۔ جو کوئی حالی کی سیرت لکھے گا اسے اس دور کے حالات معلوم کرنے میں بڑی کرید اور تلاش سے کام لینا پڑے گا ۔

بہرحال جو کچھ معلوم ہو سکا اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حالی کی آدھی سے زیادہ عمر عسرت اور گمنامی میں کٹی ۔ ان کی شادی خوش حال گھرانے میں ہوئی تھی مگر ان کی غیرت نے یہ گوارا نہ کیا کہ گھر کی روٹیاں توڑیں ۔ ان کے بزرگوں کو اپنے علم و فضل کی وجہ سے سلطنت مغلیہ سے مدد معاش ملتی تھی ۔ سلطنت کے زوال کے بعد حالی کے والد کو اور خود ان کو انگریزی حکومت کی نوکری کرنی پڑی مگر زمانے کا رنگ بدل چکا تھا مشرقی علوم کی قدر نہیں رہی تھی ۔ نئے حکمرانوں کے ہاں رسوخ حاصل کرنے کے لئے جن صفات کی ضرورت تھی ان سے حالی محروم تھے ۔ اس لئے چھوٹے عہدوں سے آگے نہیں بڑھ سکے ۔ مگر اس کے باوجود ان کے احباب میں چھوٹے بڑے سب ان کا احترام کرتے تھے ۔

ان کے پاکیزہ اخلاق اور سیدھی سادی خاموش طبیعت میں کس غضب کا وقار ہوگا کہ غالب جیسا

شخص اپنے نوجوان شاگرد کے آگے جھکتا تھا۔ ایک بار کا ذکر ہے کہ حالی نے واعظانہ جوش میں "نماز پنجگانہ کی فرضیت پر ایک لمبا چوڑا لکچر لکھ کر ان کے سامنے پیش کیا جس میں ان سے اس بات کی درخواست کی تھی کہ آپ کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر یا ایما و اشارے سے غرض جس طرح ہو سکے نماز پنجگانہ کی پابندی اختیار کریں۔" غالب کے پاس اس زمانے میں گم نام خط بہت آیا کرتے تھے جس میں لوگ "ان کے افعال و اعمال پر بہت نازیبا طریقے سے نفریں و ملامت کرتے تھے اور کھلم کھلا گالیاں تک لکھتے تھے۔" حالی کی تحریر پڑھ کر برس پڑے، اپنی گنہگاری کا اعتراف ایسے دل خراش الفاظ میں کیا جس سے انتہائی رنج و غصہ ظاہر ہوتا تھا۔ دوسرے روز انھوں نے حالی کو ایک غزل لکھ کر بھیجی جس میں ان کی نصیحت گری کا شکوہ تھا۔ حالی نے معذرت کے طور پر ایک قطعہ ان کی خدمت میں روانہ کیا۔ اس کو پڑھ کر غالب نے ایک قطعہ شیفتہ کو بھیجا جن کے ساتھ حالی دلی میں مقیم تھے۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ غالب اور شیفتہ دونوں حالی سے کس قدر محبت رکھتے تھے اور ان کی کتنی عزت کرتے تھے۔

قطعہ

تو اے کہ شیفتہ و حسرتی لقب داری	ہمی بہ لطف تو خود را امیدوار کنم
چو حالی از من آشفتہ بے سبب رنجید	تو گر شفیع نہ گردی بگو چہ کار کنم
دوبارہ عمر دہندم اگر بفرض محال	براں سرم کہ دراں عمر این دو کار کنم
یکے ادائے عبادات عمر پیشینہ	دگر بہ پیشگہ حالی اعتذار کنم

حالی نے پھر انتہائی ندامت کے ساتھ معذرت کا قطعہ لکھا۔ آخر غالب نے یہ کہہ کر کہ "لیس بیت کحتی موقوف" اس قصے کو ختم کیا۔ اس واقعے سے حالی کے مذہبی جوش کا بھی پتہ چلتا ہے جو وہ اس عمر میں رکھتے تھے، اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نصیحت کی رو میں ادب کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جانے کا انھیں کتنا رنج ہوا۔

مگر زمانے کا اثر کس غضب کا ہوتا ہے کہ حالی جیسا جوان صالح شاعری کی محفل میں قدم رکھ کر وہی بگلا راگ گانے لگا جو وہاں چھڑا ہوا تھا۔ یہ زمانہ وہ تھا کہ ہندوستان میں تمدن و معاشرت کے انتہائی تنزل کے ساتھ شاعری بھی پستی کی حد کو پہنچ گئی تھی۔ انفرادیت اور داخلیت کا رنگ جس کا ذکر ہم نے اس مضمون کے ابتدا میں کیا ہے، چھایا ہوا تھا۔ اور وہ بھی ایسا بگڑا ہوا رنگ جس نے اخلاق کے ساتھ ادب کو بھی بگاڑ دیا۔ داخلیت

اور جذبات پرستی اشخاص میں ہو یا قوموں میں جوانی کے ساتھ کھپ جاتی ہے مگر خزاں عمر میں کسی طرح نہیں نبھ سکتی۔ ساون کے اندھے کو ہرا ہی ہرا سوجھے تو ایک بات ہے مگر کاتک کا اندھا ہرا ہی ہرا دیکھنا چاہے تو سمجھنا چاہیے کہ عقل کی آنکھوں سے بھی معذور ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کا شباب مدت ہوئی رخصت ہو چکا تھا۔ گردش روزگار نے ان کی کمر توڑ دی تھی مگر وہ جوان بننے کے شوق میں اکڑتے پھرتے تھے۔ ان کے ولولے سرد ہو چکے تھے مگر ٹھنڈی گرمیاں ابھی تک چلی جاتی تھیں۔ جوانی کے نشے میں انسان خود بخود اپنے نفس کی کیفیات میں ڈوب کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتا ہے لیکن جوانی کے گزر جانے کے بعد وہ کوشش کر کے یہ بے خبری پیدا کرنی چاہے تو اس کے دو ہی طریقے ہیں یا تو وہ عیش و عشرت کے گرداب میں چکر کھاتا ہے یا ترک و تجرد کے سراب میں لوٹا کرتا ہے۔ خود پرستی کی یہ دونوں راہیں لوگ اپنے اپنے مذاق کے مطابق اختیار کر رہے تھے۔ اکثر شعرا خرابات مغاں میں "بگیر و بنوش" کا شور مچا رہے تھے اور بعض گوشۂ خلوت میں "بگذار و بگذر" کا نعرہ لگا رہے تھے۔

حالی کی طبیعت بالقوۃ انفرادیت اور داخلیت سے کوسوں دور تھی، مگر زمانے کے طوفان اور جوانی کے ہیجان نے انھیں بھی اس چکر میں ڈال دیا۔ عنفوان شباب میں انسان کو پہلے پہل خودی اپنی جھلک دکھا کر چھپ جایا کرتی ہے اور وہ اس کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے پھر جب زمانے کی ہوا بھی اسی رخ چل رہی ہو تو اس کی سرگشتگی کا کیا ٹھکانا! تاہم حالی کی صلاحیت طبع نے اور غالب و شیفتہ کے فیض تربیت نے انھیں بہت کچھ سنبھالے رکھا۔ غالب سے انھوں نے حسن تخیل، ندرت فکر، شوخی گفتار سیکھی، اور شیفتہ سے بیان کی سادگی اور سلاست کا ذوق حاصل کیا۔ اردو اور فارسی کے قدیم استادوں میں سے یوں تو سبھی کے کلام کا مطالعہ انھوں نے کیا ہوگا مگر میر، درد اور سب سے زیادہ سعدی کا اثر ان کے اشعار میں نظر آتا ہے۔ اسی کی برکت ہے کہ غزل کے اس رنگ میں بھی جو حالی نے محض عارضی محرکات کی بنا پر اختیار کیا تھا اور جس سے انھیں خلقی مناسبت نہیں تھی، ایسے ایسے شعر مل جاتے ہیں :-

قلق اور دل میں سوا ہو گیا　　　دلاسا تمھارا بلا ہو گیا

دکھانا پڑے گا ہمیں زخم دل　　　اگر تیر اس کا خطا ہو گیا

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں — مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں
قفس میں جی نہیں لگتا کسی طرح — لگا دو آگ کوئی آشیاں میں
بیاں ہے لیجئے جب نام اس کا — بہت وسعت ہے میری داستاں میں

جو دل پہ گزرتی ہے کیا تجھ کو خبر ناصح — کچھ ہم سے سنا ہوتا پھر تو نے کہا ہوتا

اس دور کا شاہکار غالب کا مرثیہ ہے جس کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں۔ اس کا مقابلہ حالی کی قدیم غزلوں سے کیجئے تو آپ دیکھیں گے کہ رسمی قافیہ پیمائی اور سچی شاعری میں کیا فرق ہے۔ جب شاعر کے دل پر چوٹ لگتی ہے اور اسے اپنے جذبات کے اظہار کے لئے میدان بھی وسیع ملتا ہے تو وہ کیا چیز کہہ جاتا ہے۔

لاہور کے طرز جدید کے مشاعرے کی نظمیں صاف کہہ رہی ہیں کہ حالی کی طبیعت پرانی شاعری کی کال کوٹھری سے نکل کر کھلے میدانوں میں جولانی دکھانے کے لئے بے چین تھی۔ بس ایک ذرا سی چھیڑ کی ضرورت تھی۔ ورنہ جو شخص آدھی عمر غزل گوئی میں صرف کر چکا ہو وہ پہلی کوشش میں "نشاط امید" اور "حب وطن" جیسی نظمیں کبھی نہیں کہہ سکتا۔

سنئے اور لطف اٹھائیے :۔

اے مری امید میری جاں نواز — اے مری دل سوز میری کارساز

. . . .

کاٹنے والی غم ایام کی — تھامنے والی دل ناکام کی
دل پہ پڑا آن کے جب کوئی دکھ — تیرے دلاسے سے ملا ہم کو سکھ
تو نے نہ چھوڑا کبھی غربت میں ساتھ — تو نے اٹھایا نہ کبھی سر سے ہاتھ

. . . .

تجھ سے ہے محتاج کا دل بے ہراس — تجھ سے ہے بیمار کو جینے کی آس

خاطرِ رنجور کا درماں ہے تو — عاشقِ مہجور کا ایماں ہے تو

....

ہوتی ہے نو پشت پہ ہمت کی جب — مشکلیں آساں نظر آتی ہیں سب

....

عزم کو جب دیتی ہے تو میل جبت — گنبدِ گردوں نظر آتا ہے پست
تونے دیا آکے ابھار اجہاں — سمجھے کہ مٹھی میں ہے سارا جہاں

اے سپہر بریں کے سیارو — اے فضائے زمیں کے گلزارو
اے پہاڑوں کی دلفریب فضا — اے لب جو کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا
اے عنادل کے نغمۂ سحری — اے شب ماہتاب تاروں بھری
اے نسیم بہار کے جھوکو — دہر نا پائدار کے دھوکو
یوں تو ہر حال میں ہمیں ہو عزیز — تھے وطن میں مگر کچھ اور ہی چیز

"حب وطن" کے آخری حصے سے ظاہر ہوتا ہے کہ حالی کے دل میں درد ملت کا جذبہ بیدار ہو چکا ہے۔ ان کا دل اپنے تمدن و معاشرت کی بربادی پر کڑھتا ہے اور اسکی ترقی کی آرزو رکھتا ہے۔ لیکن ابھی تک اس میں مصلحانہ جوش پیدا نہیں ہوا ہے اور جوش پیدا ہوتا تو کیونکر؟ ملک کی جو حالت وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے وہ انتہا سے زیادہ مایوس کن تھی۔ ۵۷ء کے قہر و غضب کے بعد لوگوں کے دل پر خوف، ہیبت، مایوسی کا سکہ بیٹھا ہوا تھا۔ ابنائے زمانہ اکثر نئے آقاؤں کی ہواداری میں مصروف تھے۔ پرانے وفادار اپنی خدمات کے صلے لے رہے تھے اور نئے خیر خواہ نئی خدمات انجام دینے کی فکریں کر رہے تھے۔ افراد کو چھوڑ کر مسلمان عام طور پر سہمے ہوئے، روٹھے ہوئے، اپنے گھروں میں بیٹھے تھے اور نئی حکومت، نئی تعلیم، نئی تہذیب سے کچھ واسطہ نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ان کا انجام کیا ہوگا۔

سنہ ۷۶ء میں دلّی آنے کے بعد حالؔی کے دل پر انتہائی مایوسی اور افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ جوانی کی ندی چڑھ کر اتر چکی تھی اور طبیعت سکون پر آکر گزری ہوئی زندگی کا جائزہ لے رہی تھی۔ لاہور کے قیام میں حالؔی کا مذاقِ شعر بدل چکا تھا۔ اب انھیں اپنی پچھلی شاعری نکمی نظر آتی تھی اور اتنی عمر کے اکارت جانے کا بے حد قلق تھا۔ پھر یہ مشکل تھی کہ نئی آرزوئیں جو ان کے دل میں ابھرنے کے لیے بےچین تھیں مایوسی کے بوجھ سے ابھرنے نہیں پاتی تھیں بلکہ سچ پوچھیے تو حالؔی کو ان کا پوری طرح احساس بھی نہ تھا۔

دردِ دل ہوسے ہست و ندانم کہ کدام است

اس یاس و بے دلی سے حالی کو نجات دینے والا وہی شخص تھا جس نے اس نازک وقت میں تمام مسلمانوں کی دستگیری کی۔ سرسید احمد خاں کو اس تدبر اور حکمتِ عملی کا بچا کھچا سرمایہ ملا تھا جس کی بدولت مسلمانوں نے سات آٹھ سو برس ہندوستان پر حکومت کی۔ انھوں نے دیکھا کہ سلطنت کے زوال کے بعد مسلمانوں کی زندگی کا اب کوئی مرکز باقی نہیں رہا ہے اور ان کا انتشار انھیں ہلاکت کی طرف لے جا رہا ہے۔ مصلحت شناسی کی نظر سے زمانے کے رنگ کو پہچان کر انھوں نے ایک طرف تو تمدن و معاشرت کے بکھرے ہوئے اجزا کو "قوم" یا "ملت" کے شیرازہ میں باندھنے کی کوشش کی اور دوسری طرف حکومتِ وقت سے، جہاں تک اس ذلت و افتادگی کی حالت میں ممکن تھا، عزت کے ساتھ مصالحت کرنے کا ڈول ڈالا جسے آج ان کے موافقین و مخالفین دونوں اپنی کم نظری سے ابدی وفاداری کا عہد سمجھتے ہیں۔ سرسید کو یقین تھا کہ مغربی علوم حاصل کرنا اور ایک حد تک مغربی تہذیب اختیار کرنا نہ صرف مسلمانوں کی ترقی کے بلکہ ان کی زندگی کے لیے ضروری ہے۔ چنانچہ انھوں نے پہلے ایک علمی انجمن کی، پھر ایک تعلیم گاہ اور ایک تعلیمی کانفرنس کی بنا ڈالی کہ مسلمانوں کو جدید تعلیم کی طرف راغب کریں۔

سرسید کی شخصیت اور ان کی تحریک کا حالؔی پر عجیب و غریب اثر پڑا۔ انھیں وہ رہنما مل گیا، وہ راہِ عمل نظر آگئی، وہ مقصدِ حیات ہاتھ آگیا جسے ان کا دل ڈھونڈھتا تھا۔ انھوں نے دل میں ٹھان لی کہ اپنی زندگی اور اپنی شاعری کو اس کام میں صرف کریں گے کہ مسلمانوں کے ادب و شعر کے مذاق کو سنواریں، ان کے دل میں جذبۂ قومی کو بیدار کریں اور تعلیم و ترقی کا شوق پیدا کریں۔

۱۸۷۹ء میں سرسید کی فرمائش سے حالی نے مسدس مدوجزر اسلام لکھا جس میں ان کی نئی قوت اور نیا جوش پورے شباب پر نظر آتا ہے۔ اس کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب شاعر اپنا دکھڑا رونے کے بجائے ایک قوم کے عروج وزوال کی داستان سناتا ہے، خیال آرائی اور مبالغے کو ترک کرکے اصلیت کا نقشہ کھینچتا ہے، لفاظی کو چھوڑ کر سیدھی سادی زبان اختیار کرتا ہے، تو اس کے کلام میں اعجاز کا اثر پیدا ہوجاتا ہے۔ مسدس ان نظموں میں سے ہے جو مردہ قوموں کو جلا دیتی ہیں۔

سرسید کی بدولت شاعر کو قوم مل گئی اور قوم کو شاعر مل گیا۔ اب حالی کی زندگی قوم کی خدمت کے لئے وقف ہوگئی۔ چند سال تک وہ ملازمت کے سلسلے کو نبھاتے رہے۔ عربک اسکول دہلی سے بدل کر ایچیسن کالج لاہور میں طلبہ کے اتالیق مقرر ہوئے اور تھوڑے دن بعد اپنی جگہ پر واپس آگئے۔ مگر اس عرصہ میں وہ برابر ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسوں میں شریک ہوتے رہے اور اپنی نظموں سے حامیان تعلیم کے دلوں کو گرماتے رہے۔ ۱۸۸۷ء میں جب سرآسماں جاہ نے دولت آصفیہ کی طرف سے ان کا وظیفہ مقرر کیا تو فکر معاش سے مطمئن ہوکر وہ علمی اور ادبی مشاغل میں مصروف ہوگئے۔

حالی نے جو مقصد اپنی زندگی کے قرار دئے تھے ان میں سے ایک یہ تھا کہ ملک کے ادبی مذاق کی اصلاح کریں۔ اس کے دو طریقے ہوسکتے تھے۔ تنقید کے صحیح اصول مقرر کرنا اور عمدہ نمونے پیش کرنا۔ حالی نے ان دونوں طریقوں سے کام لیا۔ ۱۸۹۳ء میں انھوں نے اپنی قدیم وجدید غزلوں کا مجموعہ ایک مبسوط مقدمے کے ساتھ شائع کیا جس میں شعروشاعری کے اصولوں سے حکیمانہ بحث کی گئی ہے۔ یہ مقدمہ ان کے حسن ذوق، وسعت نظر اور جدت خیال کا آئینہ ہے۔ جب کوئی غیر شاعر شعر کی علمی تنقید پر قلم اٹھاتا ہے تو عموماً منطقی بحثوں میں پڑ کر اصل حقیقت کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ مگر حالی خود شاعر ہیں اس لئے انھوں نے اصولی مسائل کے ساتھ ساتھ فن کی باریکیوں کو بھی خوب سمجھا ہے اور خوب سمجھایا ہے۔ اردو میں حالی سے پہلے شعر کی تنقید کے معنی صرف یہ سمجھے جاتے تھے کہ لفظوں اور ترکیبوں کو اساتذہ کے کلام کی کسوٹی پر کس کر دیکھ لیں۔ حالی نے پہلے پہل یہ بحث چھیڑی کہ شاعری کی روح کیا ہے اور وہ شعر میں کیوں کر پیدا ہوتی ہے۔

نثر میں تنقید شعر کے علاوہ حالی نے سیرت نگاری کی صنف کو اختیار کیا۔ ۱۸۸۶ء میں انھوں نے "حیات سعدی"، ۱۸۹۶ء میں "یادگار غالب" اور ۱۹۰۱ء میں سرسید کی سیرت "حیات جاوید" کے نام سے شائع کی۔ یہ تینوں بزرگ وہ ہیں جنھوں نے مختلف حیثیتوں سے ان کی زندگی پر اثر ڈالا ہے۔ غالب ان کے استاد تھے، سعدی جگت استاد ہیں۔ مگر جس حد تک حالی نے ان سے کسب فیض کیا ہندوستان کے کسی شاعر نے نہ کیا ہوگا۔ ان کے کلام میں سعدی کا رنگ اتنا صاف جھلکتا تھا کہ لوگ انھیں "سعدی ہند" کہنے لگے۔ اور سرسید تو ان کی زندگی کے دوسرے دور میں ان کے مرشد ہی تھے۔ حالی کی احسان شناسی کا یہ بھی ایک ثبوت ہے۔ انھوں نے اپنے ادبی اور روحانی رہنماؤں کی سیرت لکھ کر ان کو حیات جاوید بخش دی۔

سیرت نگاری میں بھی حالی نے وہی مجددانہ شان دکھائی جو شعر اور تنقید شعر میں دکھائی تھی۔ یہ تینوں کتابیں خصوصاً "حیات جاوید" محض واقعات کی پوٹ اور تعریفوں کا پشتارہ نہیں بلکہ جدید طرز کی سوانح عمری کا نمونہ ہیں جس میں انسان کی پوری زندگی پر اور اس کے عمل پر تبصرہ کیا جاتا ہے، اس کا تعلق اس زمانے سے دکھایا جاتا ہے جس میں وہ پیدا ہوا۔ باوجود اس کے کہ حالی ان تینوں بزرگوں سے، جن کی سیرت انھوں نے لکھی، خصوصاً سرسید سے انتہائی عقیدت رکھتے تھے مگر نہ تو انھوں نے ان کی خوبیوں کو بڑھا چڑھا کر دکھایا ہے اور نہ جان بوجھ کر ان کی برائیوں کو چھپایا ہے۔

حالی کی نثر بھی اپنے رنگ میں ان کی نظم سے کم نہیں۔ اس میں بھی پختگی اور سادگی کی وہی شان پائی جاتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ سلاست اور روانی میں نثر کبھی نظم کا مقابلہ نہیں کر سکتی خصوصاً وہ نثر جس میں علمی مضامین ادا کیے جائیں۔ پھر بھی ان کا اسلوب بیان اتنا صاف اور سلجھا ہوا ہے کہ مشکل سے مشکل مسائل کو پانی کر دیتے ہیں اور لطف یہ کہ علمی متانت و وقار کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پاتا۔

ادب و شعر کی تہذیب و تجدید کے علاوہ دوسرا بڑا مقصد حالی کے سامنے یہ تھا کہ مسلمانوں کے دل میں جذبۂ ملی اور حمیت قومی پیدا کریں اور ان کے اس جوش سے تعلیم کی ترقی اور اخلاق و معاشرت کی اصلاح کا کام لیں۔ مسدس کے بعد انھوں نے "تعصب و انصاف" "کلمۃ الحق" "مناظرہ واعظ و شاعر" "پھوٹ اور

ایکے کامناظرہ" "شکوۂ ہند" "ننگ خدمت" کے ذریعے سے مسلمانوں کو ان کے اخلاقی عیوب پر غیرت دلائی
ان کے بزرگوں کے اوصاف یاد دلائے اور احتساب نفس اور تہذیب نفس کا سبق پڑھایا۔ "بیوہ کی مناجات"
سے ایک شرمناک معاشرتی ظلم کی طرف متوجہ کیا اور "ترکیب بند بر مدرسۃ العلوم" "مسلمانوں کی تعلیم" اور اس
قسم کی متعدد نظموں سے سرسید کی تعلیمی تحریک کی اہمیت سمجھائی اور اس کی مدد پر آمادہ کیا۔

عام طور پر شاعر، چاہے وہ اپنے کلام میں عمل کی کتنی ہی تلقین کرتے ہوں، خود عمل کے ہیٹے ہوتے ہیں۔
مگر حالی ان شاعروں میں سے نہیں تھے۔ انھوں نے جہاں تک ہو سکا سرسید کے کام میں ان کا ہاتھ بٹایا۔ ان
کے ساتھ ڈیپوٹیشن میں حیدر آباد گئے۔ اپنی ذاتی کوشش سے پانی پت اور کرنال میں چندہ کر کے ایک معقول رقم
ان کی نذر کی اور اپنے کنبے کے لڑکوں کو علی گڑھ میں داخل کرا دیا۔ اس کے علاوہ اپنے طور پر تعلیم کی ترویج
میں دل وجان سے کوشش کرتے رہتے تھے۔ کوئن وکٹوریہ کی جوبلی کے موقع پر انھوں نے پانی پت میں ایک
اسکول قائم کرنے کی کوشش کی مگر کافی چندہ نہ ہو سکا جتنی رقم جمع ہوئی تھی اس سے ایک کتب خانے کی
عمارت بنوا کر وکٹوریہ لائبریری قائم کر دی جو اب میونسپل کمیٹی کے انتظام میں ہے۔ آخر عمر میں حالی مسلم اسکول
اور ایک لڑکیوں کا اسکول قائم کیا جس کی وجہ سے پانی پت اور آس پاس کے علاقے کے مسلمانوں میں تعلیم
کا چرچا ہوگیا۔ ان تعلیمی خدمات کے اعتراف میں وہ ۱۹۰۷ء میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس کراچی کے
صدر منتخب ہوئے۔ جو خطبہ انھوں نے اس موقع پر پڑھا وہ کانفرنس کے نہایت مفید اور پر مغز خطبات میں سے
ہے جن کی تعداد دو چار سے زیادہ نہ ہوگی۔

علی گڑھ کے ٹرسٹی کی حیثیت سے انھوں نے اس کے انتظامی امور میں بہت کچھ مدد دی اور جب
کبھی کالج میں کوئی جھگڑا اٹھا انھوں نے نہایت آزادی کے ساتھ انصاف کی حمایت اور ترقی پسند جماعت کی
ہمنوائی کی۔ سرسید کی محبت ان کے دل میں بسی ہوئی تھی مگر حق کی محبت اس سے بھی زیادہ تھی۔ اس لئے بعض
موقعوں پر انھوں نے کھلم کھلا سرسید کی مخالفت کی مثلاً ۱۸۹۷ء میں جب یورپین اسٹاف کالج کے معاملات
پر حاوی ہوگیا تھا انھوں نے اس کا زور توڑنے میں سرسید کی مخالف جماعت کا ساتھ دیا۔ اسی طرح مسٹر
ماریسن اور مسٹر آرچبولڈ سے جو اختلافات ہوئے اس میں بھی وہ آزاد پارٹی کے ساتھ تھے۔

اب ذرا ایک نظر حالی کی ذاتی زندگی پر بھی ڈالئے۔ ایک سن رسیدہ عالم، شاعر، حق پرست، حق گو، صاف دل، پاک باطن، حلیم، منکسر، خود دار، غیرت مند، محبت کا پتلا، اخلاق کا مجسمہ، دوستوں کا دوست، عزیزوں کا کفیل، غیروں کا ہمدرد، پانی پت میں رہتا ہے۔ اس کا دل محبت سے معمور ہے، اس کی زندگی خدمت کے لئے وقف ہے کس کی محبت اور خدمت؟ علم و ادب کی، ملک و قوم کی، خاندان کی، ہمسایوں کی۔ ادھر تصنیف و تالیف کا شغل جاری ہے ادھر لوگ اپنی نظمیں اور کتابیں اصلاح کے لئے بھیجتے ہیں، علمی کاموں میں مشورہ طلب کرتے ہیں، ادبی مسائل کا حل چاہتے ہیں۔ یہ شخص سب کی فرمائشیں پوری کرتا ہے، سب کو جواب دیتا ہے اور اس عجز و انکسار کے ساتھ جیسے ان کے احسان کا شکریہ ادا کر رہا ہے۔ کوئی تعریف کرے تو شرمندہ ہوتا ہے، بجا اعتراض ہو تسلیم کر لیتا ہے، بیجا اعتراض ہو چپ ہو رہتا ہے۔ دشمن پھبتیاں کستے ہیں، گالیاں دیتے ہیں، یہ چشم پوشی سے کام لیتا ہے۔ دوستوں میں سے کوئی جواب دینا چاہے تو اسے منع کر دیتا ہے۔ بغض و حسد کے بادل برستے ہیں اور برس کر کھل جاتے ہیں، حلم کا دریا بہتا چلا جاتا ہے۔

کنبہ بہت بڑا ہے۔ اپنی اولاد، بھائی بہنوں کی اولاد، اولاد کی اولاد۔ مگر یہ مرد خدا اتنا بڑا دل رکھتا ہے جس میں ایک ایک کی گنجائش ہے۔ قریب کا عزیز ہو یا دور کا سب کے ساتھ ایک سی شفقت، ایک سا سلوک۔ محبت جب نامحدود ہو تو قریب اور بعید کا فرق باطل ہو جاتا ہے۔ اور اس شخص کی محبت بھی محض رقت قلب نہیں عملی محبت ہے۔ وہ سب کے دکھ سکھ میں شریک ہے، مشکلوں میں ہدایت کرتا ہے، ضرورت کے وقت دستگیری کرتا ہے، بیماری میں تیمار دار ہے، مصیبت میں غمخوار ہے، خاندان بھر کے بچوں کی تعلیم کا کفیل اور تربیت کا نگراں ہے اور خاندان کے باہر بھی ہمسایوں کے ہونہار لڑکوں کو اپنی قلیل آمدنی میں سے وظیفے دے کر مدرسے میں پڑھنے بھجواتا ہے، جو پڑھ چکے ہیں ان کی معاش کی فکر کرتا ہے، جو برسر کار ہیں ان کی ترقی میں کوشاں ہیں۔

وہ سچا دین دار ہے، مومن ہے، عابد ہے، زاہد ہے، احکام ظاہر کا پابند ہے، طریق باطن کا سالک ہے مگر اسے نہ دین کا گھمنڈ ہے، نہ ایمان کا، نہ عبادت کا، نہ زہد کا، نہ شریعت کا، نہ طریقت کا۔ وہ اپنی نجات کا وسیلہ دو چیزوں کو سمجھتا ہے جو اصل میں ایک ہیں۔ محبت اور خدمت۔

حالی کی سیرت کی یہ ایک دھندلی سی تصویر ہے۔ آپ اسے صاف روشنی میں دیکھنا چاہیں تو ان کے

کلام کا مطالعہ کیجیے۔ ہم حالی کے دوسرے دور کے کلام کا تھوڑا سا نمونہ پیش کر کے اس مضمون کو ختم کرتے ہیں۔ طویل بہت ہو چکا ہے۔ تنقید اور تشریح کی گنجائش نہیں اور نہ اس کی ضرورت ہے۔ حالی کا کلام آپ ہی اپنی تنقید اور آپ ہی اپنی شرح ہے۔

کامل ہے جو ازل سے وہ ہے کمال تیرا　　　باقی ہے جو ابد تک وہ ہے جلال تیرا
ہے عارفوں کو حیرت اور منکروں کو سکتہ　　　ہر دل پہ چھا رہا ہے رعب جمال تیرا
کاوش میں ہے الٰہی گو کد امیں ہے طبیعی　　　جو حل ہوا نہ ہوگا وہ ہے سوال تیرا
چھوٹے ہوئے ہیں گو جی پر دل بندھے ہوئے ہیں　　　ملنے سے بھی سوا ہے چھٹنا محال تیرا

تو نہیں ہوتا تو رہتا ہے اچاٹ　　　دل کو یہ کیسی لگا دی تو نے چاٹ
ملتیں رستوں کے ہیں سب ہیر پھیر　　　سب جہازوں کا ہے لنگر ایک گھاٹ

شکوہ کرنے کی خو نہ تھی اپنی　　　پر طبیعت ہی کچھ بھر آئی آج
چور ہے دل میں کچھ نہ کچھ یارو　　　نیند پھر رات بھر نہ آئی آج

تذکرۂ دلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ　　　نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز
ڈھونڈھتا ہے دل شوریدہ بہانے مطرب　　　درد انگیز غزل کوئی نہ گانا ہرگز
صحبتیں اگلی مصور ہمیں یاد آئیں گی　　　کوئی دلچسپ مرقع نہ دکھانا ہرگز
لے کے داغ آئے گا سینے پہ بہت اے سیاح　　　دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز
مٹ گئے تیرے مٹانے کے نشاں بھی اب تو　　　اے فلک اس سے زیادہ نہ مٹانا ہرگز

وقت نازک ہے اپنے بیڑے پہ　　　موج حائل ہے اور ہوا ناساز

یا تھپیڑے ہوا کے نے اُبھرے — یا گیا کشمکش میں ڈوب جہاز

رہا ہوں رند بھی اے شیخ پارسا بھی میں — مری نگاہ میں ہے رند و پارسا ایک ایک

ہم آج بیٹھے ہیں ترتیب کرتے دفتر کو — ورق جب اس کا اڑا لے گئی ہوا ایک ایک

بہار نے بھی نہ بلبل تری بجھائی آگ — جگر کے پار رہے اب تک تری نوا ایک ایک

آگے بڑھے نہ قصہ عشق بتاں سے ہم — سب کچھ کہا مگر نہ کھلے رازداں سے ہم

اب شوق سے بگاڑ کی باتیں کیا کرو — کچھ پا گئے ہیں آپ کے طرز بیاں سے ہم

یاروں کو تجھ سے حالی اب سرگرانیاں ہیں — نیندیں اچاٹ دیتی تیری کہانیاں ہیں

خاور سے باختر تک جن کے نشاں تھے برپا — کچھ مقبروں میں باقی ان کی نشانیاں ہیں

کھیتوں کو دے لو پانی اب بہہ رہی ہے گنگا — کچھ کر لو نوجوانو! اٹھتی جوانیاں ہیں

فضل و ہنر بڑوں کے گر تم میں ہوں تو جانیں — گر یہ نہیں تو بابا وہ سب کہانیاں ہیں

خواب راحت میں وہ لذت تیرے اے پیری نہیں — جو جوانی میں مزہ دیتی تھیں شب بیداریاں

اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیش عشق — رکھی ہے آج لذت زخم جگر کہاں

ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور — تجھ سے جہاں میں لاکھ سہی تو مگر کہاں

بیقراری تھی سب امید ملاقات کے ساتھ — اب وہ اگلی سی درازی شب ہجراں میں نہیں

جی ڈھونڈھتا ہے بزم طرب میں انھیں مگر — وہ آئے انجمن میں تو پھر انجمن کہاں

در فیض حق بند جب تھا نہ اب کچھ — فقیروں کی جھولی میں اب بھی ہے سب کچھ
ہر اک کو نہیں ملتی یاں بھیک واعظ — بہت جانچ لیتے ہیں دیتے ہیں تب کچھ
یہ طبل تہی ہیں جو بجا رتے ہیں — جنھیں کچھ خبر ہے وہ کہتے ہیں کب کچھ

وفا اغیار کی اغیار سے سن — مری الفت در و دیوار سے پوچھ
تصور میں کیا کرتے ہیں جو ہم — وہ تصویر خیال یار سے پوچھ

کبک و قمری میں ہے جھگڑا کہ چمن کس کا ہے — کل بتا دے گی خزاں یہ کہ وطن کس کا ہے

یاد ایام کہ بے رنگ تھی تصویر جہاں — دست مشاطہ نہ تھا محرم زلف دوراں
گل خود رو سے بسا تھا چمن کون و مکاں — چار سو حسن خداداد کا سکہ تھا رواں
وضع عالم میں نہ آیا تھا تغیر اب تک
خط قدرت کی وہی شان تھی اور نوک پلک
طفل معصوم کے مانند تھا یہ عالم پیر — تھے ہم اک صنعت بے چون و چرا کی تصویر
ملک فطرت میں نہ تھی سلطنت نفس شریر — طبع نے مملکت روح نہ کی تھی تسخیر
خواب غفلت کی گھٹا دل پہ نہ چھائی تھی بہت
دن چھپا تھا ابھی اور رات نہ آئی تھی بہت

اے راست گوئی کیا قہر ہے تو — اے حق کی تلخی کیا زہر ہے تو

ہے ناگواری پہچان تیری
الحق مُرّا ہے شان تیری

یاروں کو کرتی اغیار تو ہے
جلوائی گھر گھر تلوار تو ہے

خونخوار لشکر ہیں ساتھ تیرے
رنگیں لہو میں ہیں ہاتھ تیرے

تیرے جلو میں رسوائیاں ہیں
سنگت میں تیری تنہائیاں ہیں

ہوتی ہے جس جا تو جلوہ گستر
دفتر بہت سے ہوتے ہیں ابتر

پڑتی ہے ہلچل ہر مرحلے میں
آئی ہے دنیا اک زلزلے میں

اے راست گوئی اے ابر رحمت
ہے اس چمن میں تیری ہی برکت

گر تو نہ ہوتی یاں سایہ افگن
برباد کب کا ہوتا یہ گلشن

عالم ہے سرسبز تیرے قدم سے
آباد یہ گھر ہے تیرے دم سے

تو بے کسوں کی یاور رہی ہے
تو گمرہوں کی رہبر رہی ہے

جن بستیوں میں تو چھائی
کھیتی انھیں کی یاں لہلہائی

مشرق میں جب تھی تیری حکومت
چھائی ہوئی تھی مغرب میں ظلمت

جب دور تیرا مغرب میں آیا
مغرب کو تو نے مشرق بنایا

وہ مسلمانوں کی ہر بازی میں سبقت کیا ہوئی
وہ حجازی غیرت اور ترکی حمیت کیا ہوئی

ہم مسلمانوں سے ہے لے منہ ننگ اسلام کو
تھا لقب خیر الامم جس کا وہ امت کیا ہوئی

جی کسی کی عزت افزائی سے خوش ہوتا نہیں
دل گواہی جس پہ دیتا تھا وہ عزت کیا ہوئی

دین و دولت، علم و دانش ہم میں کچھ باقی نہیں
حق نے پوری کی تھی جو ہم پر وہ نعمت کیا ہوئی

ملک و مال و سلطنت اک آنی جانی چیز تھی
جو ہمیشہ رہنے والی تھی وہ دولت کیا ہوئی

جھٹ پٹے کے وقت گھر سے ایک مٹی کا دیا
ایک بڑھیا نے سر رہ لا کے روشن کر دیا

تا کہ رہ گیر اور پردیسی کہیں ٹھوکر نہ کھائیں
راہ سے آساں گذر جائے ہر اک چھوٹا بڑا

یہ دیا بہتر ہے ان جھاڑوں سے اور اس لمپ سے
روشنی محلوں کے اندر ہی رہی جن کی سدا

گر نکل کر اک ذرا محلوں سے باہر دیکھئے
ہے اندھیرا گھپ در و دیوار پر چھایا ہوا

سرخ رو آفاق میں وہ رہنما مینار ہیں
روشنی سے جن کی ملاحوں کے بیڑے پار ہیں

اے مرے زور اور قدرت والے
حکمت اور حکومت والے

میں لونڈی تیری دکھیاری
دروازے کی تیرے بھکاری

موت کی خواہاں جان کی دشمن
جان پہ اپنی آپ اجیرن

اپنے پرائے کی دھتکاری
میکے اور سسرال پہ بھاری

سہہ کے بہت آزار چلی ہوں
دنیا سے بیزار چلی ہوں

دل پہ میرے داغ ہیں جتنے
منہ میں بول نہیں ہیں اتنے

بیاہ کے دم پائی تھی نہ لینے
لینے کے یاں پڑ گئے دینے

....

سیلانی جب باغ میں آئے
پھول ابھی تھے کھلنے نہ پائے

پھول کھلے جس وقت چمن میں
جا سوئے سیلانی بن میں

پیت نہ تھی جب پایا پیتم
جب ہوئی پیت گنوایا پیتم

....

آتی جاتی چیزیں ہیں خوشیاں
چلتی پھرتی چھاؤں ہیں ارماں

منگنی بیاہ برات اور رخصت
میل ملاپ سہاگ اور سنگت

۷۹۴
د

ہیں دو دن کے سب بہلاوے   آگے چل کر ہیں پچھتاوے

ریت کی سی دیوار ہے دنیا   اوچھے کا سا پیار ہے دنیا

مولانا حالی کے آبا و اجداد

میں نے عرصۂ دراز کی تلاش و تحقیق اور بہت کچھ محنت و کاوش کے بعد شمس العلماء مولانا الطاف حسین حالی کی ایک مبسوط سوانح عمری قلمبند کی ہے جو "تذکرۂ حالی" کے نام سے انشاء اللہ عنقریب شائع ہوگی۔ اپنے محترم دوست محمد عاقل صاحب ایم۔ اے نائب مدیر جامعہ کے ارشاد کی تعمیل میں اس تذکرہ کے اولین دو باب میں قارئین جامعہ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ امید ہے کہ حالی کے قدرداں جو ملک میں کافی موجود ہیں انھیں دلچسپی کے ساتھ مطالعہ فرمائیں گے۔

(محمد اسمٰعیل)

باب اوّل

مولانا کا نام و نسب اور خاندان

والد اور والدہ کی طرف سے مولانا کا شجرۂ نسب

آج اس بات کو پورے سو برس گذر چکے ہیں جبکہ شمالی ہند کے مشہور تاریخی شہر پانی پت میں نظم اردو کا بہترین نقاد، جدید اور نیچرل شاعری کا بانی اور قومی، اصلاحی اور اخلاقی نظموں کا زبردست مجدد پیدا ہوا۔ والدین نے الطاف حسین نام رکھا۔ یہی وہ بچہ ہے جو بڑا ہو کر شمس العلماء مولانا خواجہ الطاف حسین حالی کے نام سے دنیا میں مشہور ہوا۔

مولانا والدہ کی طرف سے سید ہیں اور والد کی جانب سے انصاریوں کی اس شاخ سے تعلق رکھتے ہیں جو مشہور اور جلیل القدر صحابی حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی اولاد سے ہیں۔ مولانا کے دونوں شجرے یہاں درج کیے جاتے ہیں جو نہایت تلاش سے فراہم کیے گئے ہیں۔

والد کی طرف سے شجرۂ نسب

مولانا خواجہ الطاف حسین حالی بن خواجہ ایزد بخش بن خواجہ بو علی بخش بن خواجہ محمد بخش بن خواجہ غلام محمد بن خواجہ عبد السبحان بن خواجہ عبد الکریم بن خواجہ مسلم بن خواجہ زین الدین احمد بن خواجہ عبد الکافی

بن خواجہ[11] ضیاء الدین بن خواجہ[12] ابو راشد بن خواجہ[13] ابو حامد بن خواجہ[14] ابو تراب بن خواجہ[15] نصیر الدین محمود بن قاضی[16] خواجہ ملک علی بن خواجہ[17] میرک علی شاہ بن خواجہ[18] مسعود بن خواجہ[19] عمر بن خواجہ[20] ابراہیم بن خواجہ[21] عثمان بن خواجہ[22] ابو طاہر بن خواجہ[23] عتبہ بن خواجہ[24] انفع بن شیخ[25] نافع بن خواجہ[26] ملک شرف الدین امیر محمود شاہ انجو الملقب بہ آق خواجہ بن خواجہ[27] محمد الملقب بہ امیر شیخ ابو اسحٰق بن خواجہ[28] فضل اللہ بن خواجہ[29] عبد اللہ بن اسعد[30] انصاری بن شیخ[31] محمد (ثانی) بن شیخ[32] نصیر بن شیخ محمد[33] (اول) بن شیخ[34] الاسلام ابو اسمٰعیل خواجہ عبد اللہ انصاری معروف بہ پیر ہرات بن ابو المنصور[35] محمد بن ابی[36] معاذ انصاری بن محمد[37] انصاری بن احمد[38] انصاری بن علی[39] انصاری بن جعفر[40] انصاری بن ابو منصور[41] مت الانصاری بن حضرت[42] خالد ابو ایوب انصاری خزرجی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

شجرۂ نسب والدہ کی طرف سے

مولانا[1] خواجہ الطاف حسین حالی بن امتہ[2] الرسول زوجہ خواجہ ایزد بخش بنت سید[3] محمد شفیع بن سید محمد[4] امین بن سید[5] عبد الرحمٰن بن سید[6] عبد الرحیم بن سید[7] ابو القاسم بن سید[8] علی بن سید[9] منجھو بن سید[10] محمد بن سید[11] امجد بن سید[12] نعمت اللہ بن سید[13] اخوند بن سید[14] حسام الدین بن سید[15] شمس الدین بن سید[16] معظم بن سید[17] مرتضیٰ بن سید[18] نور الدین بن سید[19] مغیث بن سید[20] محمد بن سید[21] موسیٰ بن سید[22] ابی تمیم بن سید[23] یحییٰ بن سید[24] ابراہیم بن سید[25] موسیٰ مکحول بن سید[26] ابو جعفر بن حضرت سید[27] اسماعیل شہید بن حضرت[28] سید احمد بن حضرت[29] امام ابو القاسم اسماعیل شہدا یوری بن حضرت[30] سید محمد ناطق بن حضرت[31] اسماعیل ناطق بن حضرت[32] امام جعفر صادق بن حضرت[33] امام ابو جعفر محمد باقرؓ بن حضرت[34] امام علی زین العابدینؓ بن حضرت[35] سیدنا امام حسینؓ بن حضرت[36] سیدہ فاطمہ زہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا بنت خاتم[37] الانبیاء افضل الرسل حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

باب دوم

آباؤ اجداد

حضرت ابو ایوب انصاری، حضرت ابو منصور مت الانصاری، شیخ الاسلام خواجہ عبد اللہ انصاری
ملک محمود شاہ انجو، خواجہ میرک علی شاہ، قاضی خواجہ ملک علی انصاری۔

جیسا کہ بیان ہو چکا ہے مولانا، حضرت خواجہ ابو ایوب انصاریؓ کی اولاد سے ہیں۔ آپ کے آباؤ اجداد

میں سے اکثر بزرگ نہایت نامور اور مشہور ہوئے ہیں۔ چند کا نہایت ہی مختصر تذکرہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

حضرت ابوایوب انصاری آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر صحابی ہیں۔ جب حضور نے مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ کو ہجرت فرمائی ہے تو یثرب پہنچ کر سب سے اول جس خوش قسمت انسان کو آنحضرت کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا وہ حضرت ابوایوب ہی تھے۔ جب تک مسجد نبوی اور اہل بیت اطہار کے لئے حجرے نہ بن لیے آنحضورؐ آپ ہی کے مکان میں قیام پذیر رہے۔ دراصل یہ کوئی تھوڑا شرف نہیں ہے جو تمام انصار کے مقابلہ میں حضرت ابوایوب کو حاصل ہوا۔ تمام صحابہ اسی شرف کی وجہ سے آپ کی نہایت تعظیم کرتے تھے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنے زمانۂ خلافت میں آپ کا وظیفہ پانچ ہزار سے بڑھا کر بیس ہزار کر دیا تھا۔ علاوہ ازیں چالیس غلام ان کا کاروبار کرنے کے لئے ان کو مرحمت فرمائے تھے۔

سنہ ۵۲ھ میں آپ ایک لشکر میں شامل ہو کر شام میں جہاد کے لیے گئے۔ لشکر کا امیر یزید بن حضرت معاویہؓ تھا۔ مگر ابھی راستے ہی میں تھے کہ آپ ایسے شدید بیمار ہو گئے کہ زندگی کی آس نہ رہی۔ یزید عیادت کے لئے آیا تو آپ نے اسے وصیت کی کہ "اگر میں مرجاؤں تو میرے جنازے کو لے کر مع فوج کے روانہ ہونا اور کفار کی سرزمین میں جہاں تک جانا تمہارے لئے ممکن ہو سکے چلے جانا۔ جب دیکھو کہ آگے بڑھنا بالکل ناممکن ہے تو وہیں مجھے دفن کر دینا اور لوٹ آنا۔" اس بوڑھے صحابی رسولؐ کی ہمت، اولوالعزمی اور بلند خیالی پر غور کرو کہ کتنی عجیب و غریب ہے۔ اس وصیت سے ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ اس جوش میں فوج برابر آگے بڑھتی جائے گی اور دشمن کا ملک فتح ہوتا جائے گا۔ کتنا پاک جذبہ اور کتنا بہادرانہ خیال تھا۔ سچ ہے ؎

حق کو ہوتا ہے جنھیں دنیا میں کرنا سربلند
خصلتیں یہ برگزیدہ ان کو ہوتی ہیں عطا

یزید نے اس مقدس وصیت کی پوری پوری تعمیل کی۔ جب اس جلیل القدر صحابی کا انتقال ہو گیا تو یزید نے فوج کو تیاری کا حکم دیا۔ جنازہ آگے آگے اور فوج پیچھے پیچھے لڑتی بھڑتی روانہ ہوئی یہاں تک کہ بالکل قسطنطنیہ کی دیواروں کے نیچے جنازہ پہنچ گیا۔ آگے راستہ کہاں تھا۔ پس یزید نے جنازہ وہیں دفن کر دیا اور شاہ قسطنطنیہ سے کہلا بھیجا کہ ہم نے اپنے ایک محترم بزرگ کو یہاں دفن کیا ہے اگر تم نے دشمنی میں آکر ان کے مزار کی بے حرمتی کا

ارادہ کیا تو یاد رکھنا کہ شام میں عیسائیوں کے جس قدر گرجا ہیں فوراً سب کے سب زمین کے برابر کروا دوں گا۔

یہی خوف تھا جس کے باعث حضرت ابو ایوبؓ کا مزار باوجود غیر سلطنت اور دشمن کے ملک میں ہونے کے ہمیشہ محفوظ رہا۔ جب ۱۴۵۳ء میں سلطان محمد فاتح نے قسطنطنیہ کو فتح کیا تو اس نے آپ کے مزار کو پختہ اور عظیم الشان بنوا دیا اور وہ آج تک زیارت گاہ خاص و عام ہے۔ ترکی کے تمام سلاطین عثمانیہ کی رسم تاجپوشی آپ ہی کے پرانوار مزار پر عمل میں آتی رہی ہے۔

حضرت ابو منصور مت الانصاری

یہ حضرت ابو ایوبؓ کے لڑکے ہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے زمانۂ خلافت میں ایک مہم حضرت احنف بن قیسؓ صحابی کی زیر سردگی خراسان بھیجی تھی۔ حضرت ابو منصور اسی فوج میں شامل ہو کر مدینہ سے گئے تھے۔ خراسان پہنچ کر آپ نے مقام ہرات مستقل سکونت اختیار کر لی اور پھر واپس مدینہ نہ آئے۔ آپ نے اپنی شادی بھی ہرات میں کی تھی اور غالباً یہی تعلق وہاں مستقل قیام کا باعث ہوا۔

شیخ الاسلام حضرت خواجہ عبداللہ انصاری

حضرت ابو ایوبؓ کی اولاد میں یہ بزرگ نہایت زبردست عالم اور بے عدیل فاضل گزرے ہیں۔ تمام متقدمین ان کی بزرگی، علم، زہد و تقویٰ اور پاکیزگی و پرہیزگاری کے قائل ہیں۔ فن حدیث کے بہت بڑے امام اور صوفی کامل تھے۔ ان کے فضائل و مناقب سے کتب تصوف و سیر بھری پڑی ہیں۔ بہت سی کتب کے مصنف، بڑے ادیب اور اعلیٰ درجے کے خطیب تھے۔ ۸۰ سال کی عمر میں ۲ ربیع الاول ۴۸۱ھ کو ہرات میں وفات پائی۔ علمائے فرنگی محل لکھنؤ آپ کی اولاد سے ہیں۔

ملک شرف الدین محمود

خواجہ ملک شرف الدین امیر محمود شاہ انجو الملقب بہ آق خواجہ غزنوی دور میں فارس و کرمان اور عراق عجم کا فرماں روا تھا۔ سلطان مسعود بن سلطان محمود غزنوی کے ہاتھ سے شکست کھا کر ملک چھوڑنے پر مجبور ہوا۔ انجو فارسی میں امیر سامان کو کہتے ہیں اور ترکی میں موتیوں کو۔

میرک علی شاہ

ہرات کا فرماں روا اور نہایت دلیر، شجاع اور عقلمند تھا۔ علم دوست اور علماء کا قدرداں تھا۔ ۶۷۳ھ میں انتقال کیا۔

خواجہ ملک علی

نہ معلوم کیا وجوہات ہوئیں کہ اپنے باپ میرک علی شاہ فرماں روائے ہرات کے انتقال کے

بعد خواجہ ملک علی ہرات چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے ہندوستان چلے آئے۔ مولانا حالی کے آباو اجداد میں یہ سب سے پہلے شخص ہیں جو ہندوستان آئے ہیں۔ چنانچہ مولانا ان کے متعلق ایک جگہ فرماتے ہیں:۔

"ساتویں صدی ہجری اور تیرھویں صدی عیسوی میں جبکہ غیاث الدین بلبن تخت دہلی پر متمکن تھا، شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری معروف بہ 'پیر ہرات' کی اولاد میں سے ایک بزرگ خواجہ ملک علی نام جو علوم متعارفہ میں اپنے عام معاصرین سے ممتاز تھے ہرات سے ہندوستان میں وارد ہوئے۔ چونکہ غیاث الدین اس بات میں نہایت مشہور تھا کہ وہ قدیم اشراف خاندانوں کی بہت عزت کرتا ہے اور اس کا بیٹا سلطان محمد علماء وشعراء اور دیگر اہل کمال کا حد سے زیادہ قدرداں تھا اس لئے اکثر اہل علم اور خاندانی لوگ ایران و ترکستان سے ہندوستان کا قصد کرتے تھے۔ اسی شہرت نے خواجہ ملک علی کو سفر ہندوستان پر آمادہ کیا تھا۔ چنانچہ سلطان غیاث الدین نے چند عمدہ اور سیر حاصل دیہات پرگنہ پانی پت میں اور معتد بہ اراضی سواد قصبہ پانی پت میں بطور مدد معاش اور بہت سی زمین اندرون آبادی قصبہ پانی پت واسطے سکونت کے ان کو عنایت کی۔ اور منصب قضاء، وصدارت وتشخیص نرخ بازار اور تولیت مزارات ائمہ جو سواد پانی پت میں واقع ہیں اور خطابت عیدین ان کے متعلق کر دی۔ پانی پت میں جو اب تک ایک محلہ انصاریوں کا مشہور ہے وہ انھی بزرگ کی اولاد سے منسوب ہے۔"

خواجہ ملک علی انصاری ۶۶۵ھ مطابق ۱۲۶۶ء میں مع اپنے دو بیٹوں خواجہ محمد مسعود اور خواجہ محمد نصیر الدین کے پانی پت میں وارد ہوئے تھے۔ اُس وقت پانی پت علماء اور فضلاء کا مرکز بنا ہوا تھا اور علم و تصوف کے دریا یہاں لہریں مار رہے تھے۔ خواجہ ملک علی نے جو یہ علمی صحبتیں اور مذہبی چرچے دیکھے تو یہیں رہ پڑے اور ایسے رہے کہ آپ کی اولاد آج تک یہاں آباد ہے اور بڑے بڑے معزز اور نامور بزرگ ان میں ہو چکے ہیں۔

مولانا حالؔی کی ایک غیر مطبوعہ تحریر

شمس العلماء مولانا حالؔی کے پانی پت کے استادوں میں سے ایک بزرگ مولوی خواجہ ابراہیم حسین انصاری بھی تھے جن کا تذکرہ حضرت شمس العلماء نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں کیا ہے۔ مولوی خواجہ ابراہیم حسین صاحب کا جب ۱۳۰۸ھ / ۱۸۹۱ء میں پانی پت میں انتقال ہوا تو ان کی قبر کا کتبہ لکھنے کے لیے لایق اور قابل شاگرد سے زیادہ اور کون شخص موزوں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ مولانا نے اپنے واجب التعظیم استاد کی قبر کے کتبے کی جو عبارت لکھی وہ میں آج ۴۴ برس کے بعد تبرکاً شائع کر رہا ہوں۔ اس سے جہاں آج پہلی مرتبہ مولانا کی ایک غیر مطبوعہ تحریر پبلک میں آ رہی ہے وہاں مولانا کے ایک ایسے استاد کے حالاتِ زندگی پر بھی کافی روشنی پڑتی ہے جن کے حالات اس وقت تک عام طور پر معلوم نہیں تھے۔ مولوی خواجہ ابراہیم صاحب کی قبر عیدگاہ پانی پت کے بالکل سامنے بجانب شمال واقع ہے اور قبر پر مندرجہ ذیل عبارت کا کتبہ لگا ہوا ہے۔ مولوی ابراہیم حسین صاحب کے فرزند مخدومی جناب مولوی محمد علی حیدر صاحب نے میرے دریافت کرنے پر فرمایا کہ یہ عبارت مولانا حالؔی نے لکھی تھی۔ اس کے علاوہ یہ تحریر مولانا کے اپنے ہاتھ کی تحریر کردہ میں نے خود ان کے مسودات میں دیکھی ہے۔

(محمد اسماعیل پانی پتی)

مرقد خواجہ ابراہیم حسین انصاری

ولادتِ ایشاں در ماہ رجب ۱۲۳۶ھ در پانی پت واقع شدہ۔ بعد از تعلیم ضروریات دین در آغاز شباب برائے تکمیل علم ترک وطن اختیار کردند و از مولانا فضل حق خیرآبادی در سہارنپور و از مولانا واجد علی در لکھنؤ علوم عقلیہ اخذ نمودند۔ باز از سید میرن صاحب قبلہ کسبِ دینیات از فقہ و تفسیر و کلام پرداختند و ہفت سالہ در لکھنؤ اقامت داشتہ سند اجتہاد و امامت مذہب اثنا عشریہ از جناب مجتہد العصر سید محمد صاحب لکھنوی غفر لہٗ حاصل کردہ بہ پانی پت مراجعت فرمودند و پنجاہ سال در درس و تدریس و وعظ و تذکیر مرجع انام و مقبولِ خاص و عام ماندہ۔ چہاردہم رجب ۱۳۰۸ھ داعی اجل را لبیکِ اجابت گفتند۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

فلسفۂ ترقی

اے عزیزو! تم بھی ہو آخر بنی نوعِ بشر
غل ہے کیا نوعِ بشر میں کچھ تمھیں بھی ہے خبر؟

کر رہا ہے خاک کا پتلا وہ جوہر آشکار
ہو رہی ہے جس سے شانِ کبریائی جلوہ گر

رفتہ رفتہ یہ غبارِ ناتواں پہنچا ہے واں
طائرِ وہم و تصور کے جہاں جلتے ہیں پر

اس نے ان کمزور ہاتھوں سے مسخر کر لیا
ابر و برق و باد سے تا بحر و بر و دشت و در

حق نے آدم کو خلافت اپنی جو کی تھی عطا
دے رہے ہیں اس خلافت پر گواہی بحر و بر

تھا ارسطو اور فلاطوں کو بہت کچھ جن پہ ناز
ہو گئے تقویمِ پارینہ وہ سب علم و ہنر

کل کی تحقیقات نظروں سے اتر جاتی ہے آج
بڑھ رہا ہے دمبدم یوں آج کل علمِ بشر

قوتِ ایجاد نے اب یاں تلک پکڑا ہے زور
شام کی ایجاد ہو جاتی ہے باسی تا سحر

ساز و ساماں جو نہ تھے کل بادشاہوں کو نصیب
کوڑیوں کے مول بکتے پھرتے ہیں وہ دربدر

کہتے ہیں مغرب سے جب ہوگا برآمد آفتاب
عرصۂ آفاق میں ہوگی قیامت جلوہ گر

دوستو! شاید وہ نازک وقت آپہنچا قریب
آ رہی ہے روشنی مغرب سے اک اٹھتی نظر

رَو ترقی کی چلی آتی ہے موجیں مارتی
اگلے وقتوں کے نشاں کرتی ہوئی زیر و زبر

دستکاری کو مٹاتی، صنعتوں کو روندتی
علم و حکمت کی پرانی بستیاں کرتی کھنڈر

ہوشیاروں کو کرشمے اپنے دکھلاتی ہوئی
غافلوں کو موت کا پیغام پہنچاتی ہوئی

ہند میں بھی یارو! آپہنچا ہے اس رَو کا قدم
جو ہیں ناقابل اب ان کا کھلنے والا ہے بھرم

ہے ترقی، پر تنزل بھی ہے اس کے ساتھ ساتھ
یہ کسی کے حق میں امرت ہے کسی کے حق میں سم

پست کو بالا یہ کر دیتی ہے اور بالا کو پست
کر دیا زیر و زبر اس نے، جہاں رکھا قدم

گل کھلایا اس نے جو انقصائے مشرق میں ابھی ‏ ‏ اس کے لکھنے وقت ہاتھوں میں لرزتے ہیں قلم

چین جو وسعت میں کم اک برّ اعظم سے نہ تھا ‏ ‏ اک جزیرہ کی لپیٹ نے کر دیا اس کو بھسم

دیکھنا پیچھے نہ ہم جنسوں سے رہ جانا کہیں ‏ ‏ حق میں ہمسایہ کے ہمسایہ کا بڑھنا ہے ستم

جانتے ہو لے عزیزو! ہے تنزل چیز کیا؟ ‏ ‏ "اس پہ کر لینا قناعت مل گیا جو بیش و کم"

گو کہ ہے افراد کے حق میں یہ خصلت کیمیا ‏ ‏ حق میں لیکن قوم کے یارو یہی خصلت ہے سم

تن پہ تھا فاروق اعظمؓ کے پھٹا کرتا، مگر ‏ ‏ قوم کی خاطر بھری نیت نہ لے کر ملک جم

جیتے ہیں وہ دنیا میں کیڑے مکوڑوں کی طرح ‏ ‏ جن کو بڑھنے کی تمنا اور نہ کچھ گھٹنے کا غم

جس طرح موری کا کیڑا خوش ہو اپنے حال پر ‏ ‏ گذرے جو حالت اسی میں بس مگن رہتے ہیں ہم

پر زمانہ کہہ رہا ہے یہ بہ آواز بلند ‏ ‏ یا قدم آگے بڑھاؤ ورنہ لو راہ عدم

بے ترقی ملک میں جینا ہے دشوار آجکل
وحشیوں کی موت ہے شائستہ قوموں کا عمل

ہو نہ ہمدردی کا عنصر قوم میں یارو جہاں ‏ ‏ واں ترقی کے لئے سب کوششیں ہیں رائگاں

راس بیڑے کو ترقی کے نہیں کوئی ہوا ‏ ‏ جوش ہمدردی سے ہوتا ہے جہاز اس کا رواں

قوم تھی یونان کی دنیا میں اک محدود قوم ‏ ‏ ہو گئی حب وطن سے فخر اقوام جہاں

ایک کو کچھ ایک کی پروا نہ ہو جب قوم میں ‏ ‏ ہے حماقت قوم کی کثرت پہ ہونا شادماں

قوم کس گنتی میں ہے وہ دل نہ ہوں جس کے ملے ‏ ‏ گو کہ وہ کثرت سے اپنی گھیر لے سارا جہاں

ٹکڑے ٹکڑے ہو رہے ہیں جن کے دل وہ قوم کیا! ‏ ‏ ہے وہ اک مقتل لہو روتا ہے جس پر آسماں

یاد رکھو پڑ گئی جس ملک یا ملت میں پھوٹ ‏ ‏ ہیں وہ اس مہماں سرا میں کوئی دن کے میہماں

غزنوی، غوری، مغل، سادات، لودھی اور غلام ‏ ‏ رہ گئے نوبت بہ نوبت ہند پر جو حکمراں

دن برے جب آئے اور باہم لگے سر پھوڑنے ‏ ‏ صفحۂ ہستی سے ان کا مٹ گیا نام و نشاں

دین کہتے ہیں جسے وہ خیر خواہی کا ہے نام ‏ ‏ ہے مسلمانو! یہ ارشاد رسولؐ انس و جاں

ہیں نمازیں اور روزے اور حج بے کار سب
سوزِ امت کی نہ چنگاری ہو گر دل میں نہاں

جس کا تم بھرتے ہو کلمہ جس پہ پڑھتے ہو درود
نام پر جس کے عزیزو تم فدا کرتے ہو جاں

جیتے جی امت کی لَو دل کو رہی اس کے لگی
وقت آخر اُمتی اُمتی اس کے تھا وردِ زباں

بھائی بھائی ہو گئے ہو دین کی برکت سے تم
ہے غضب گر بھائیوں پر ہوں نہ بھائی مہرباں

کھول کر دیکھو کتاب اللہ کی کہتی ہے کیا!
”کلمہ پڑھ لینے سے کچھ حاصل نہیں بے امتحاں

دین کا دعویٰ اور امت کی خبر لیتے نہیں
چاہتے ہو تم سند اور امتحاں دیتے نہیں

ان سے کہہ دو ہے مسلمانی کا جن کو ادّعا
قوم کی خدمت میں پوشیدہ ہے بھید اسلام کا

وہ یہی خدمت یہی منصب ہے جس کے واسطے
آئے ہیں دنیا میں سب نوبت بہ نوبت انبیا

قوم کی خدمت میں کر دیں اپنی جب عمریں تمام
تب فرائض سے نبوت کے ہوئے عہدہ برآ

وہ رسولِ ہاشمیؐ وہ رحمۃ للعالمینؐ
پیروی کا جس کی دم بھرتے ہو تم صبح و مسا

جانتے ہو قوم سے تھا اپنی کیا اس کا سلوک
اس طرف سے تھی جفا اور اس طرف سے تھی دعا

کونسی تکلیف تھی جو قوم نے اس کو نہ دی
پر کبھی چاہا نہ اس نے قوم کا اپنی بُرا

جب اُحد میں ہو گیا دندانِ پاک اس کا شہید
قوم کے حق میں نہ نکلا منہ سے کچھ اس کے سوا

”کر ہدایت قوم کو یارب! کہ ہیں معذور یہ“
”ان کی عقلوں پہ ہے پردہ جہل و غفلت کا پڑا“

قوم کے حملے رہے جبتک کہ اس کی ذات پر
خندہ پیشانی سے سب ان کے سہے جور و جفا

پر لگی جب قوم سب مل کر مٹانے نامِ حق
اور خدا کا پوجنا بندوں کو مشکل ہو گیا

غیرتِ حق نے نہ دی پھر مہلتِ صبر و شکیب
دین کی آخر حمایت پر کھڑا ہونا پڑا

لشکرِ حق سے مگر جب ہو گئی مغلوب قوم
پھر وہی شفقت، وہی رحمت، وہی احسان تھا

تھی یہی وہ قوم جس کے حق میں فرماتے تھے آپ
”ہے عرب کی دوستی جزو دین اور ایمان کا“

تھی یہی وہ قوم تھا جس کے لیے ارشاد یہ
”قوم کا خادم ہے آقا سب کا بے چون و چرا“

قوم کے خادم رہے اور دوست جبتک اہلِ دیں　　دین اور دنیا میں بول اسلام کا بالا رہا

پڑ گئے خود غرضیوں نے جبکہ دل ایک اک کے پھاڑ　　حکم جو مالک کا تھا بندوں کو وہ پورا ہوا

حکم تھا اس کا کہ جھگڑوں سے رہو تم برکنار

ورنہ کھو بیٹھو گے سب اپنا وقار اور اعتبار

سچ کسی دانا نے تھا یہ قوم سے اپنی کہا　　"جو کہ حامی قوم کے ہیں ان کا حامی ہے خدا"

دیکھ لو ممتاز دنیا میں وہی قومیں ہیں آج　　قوم پر قربان ہے جن کا ہر اک چھوٹا بڑا

یاں تلک پھیلا ہے اب قوموں میں قومیت کا درد　　اپنے ایک اک فرد پر قوموں کی جانیں ہیں فدا

ملک سارا چھین کر بھی ان کو چین آتا نہیں　　اپنے اک مقتول کا جب مانگتے ہیں خوں بہا

اختلافِ دین و مذہب گھل رہا تھا جس میں زہر　　جس نے ملکوں میں دیئے تھے خون کے دریا بہا

دمبدم وہ اختلاف اب بن رہا ہے اتفاق　　زہر میں ہونے کو ہے پیدا اثر تریاق کا

کر رہا ہے جوشِ ہمدردی کی صورت میں ظہور　　وہ تعصب جس نے باپوں سے کئے بیٹے جدا

دیتے ہیں وہ اپنے ذاتی فائدوں پر خاک ڈال　　اپنے جب نقصان میں ہو قوم کا ان کی بھلا

وہ ہملٹن کی جواں مردی سنی ہوگی کہ جب　　ہوگئی فرخ سیر کو ہاتھ سے اس کے شفا

قوم پر قربان کردیں اپنی امیدیں تمام　　آپ کچھ لینا نہ چاہا اپنی خدمت کا صلا

ہے اسی حب وطن کا اس کی یہ سارا ظہور　　ہند پر ہے آج جو برطانیہ فرماں روا

ایک ماما جس کو دس ملتے ہیں ہفتہ میں شلنگ　　جس کے کنبے کا سب اس تنخواہ پر ہے آسرا

جا کے دے آتی ہے خوش خوش ایک ہفتہ کی طلب　　قوم کی خاطر کہیں سنتی ہے جب چندہ کھلا

ہے غرض چندہ کی کیا؟ اس سے نہیں کچھ اس کو کام　　قوم کا نام آیا اور قابو سے دل باہر ہوا

حق کو ہوتا ہے جنھیں دنیا میں کرنا سربلند　　خصلتیں یہ برگزیدہ ان کو ہوتی ہیں عطا

ان کے مفلس قوم کی خاطر وہ کر جاتے ہیں کام　　پست قوموں میں نہیں کرسکتے جو کام اغنیا

ہے انھیں ہمدردیوں کا ان کی یہ ثمرہ کہ آج　　اس کرہ کے گرد ہیں چھائی ہوئی مثل ہوا

لوہا مقناطیس کی جانب ہے کھنچتا جس طرح
اس طرف کھنچتی چلی جاتی ہے دنیا اس طرح

ہے یہ قوموں کی ترقی اور تنزل سے عیاں — خود تنزل میں ہے سرچشمہ ترقی کا نہاں
ایک کا ہے جو تنزل، دوسرے کا ہے عروج — اس کا بکتا ہے مکاں تب اس کی چلتی ہے دکاں
کوئی یاں بنتا نہیں جب تک نہ بگڑے دوسرا — گھاس کھد جاتی ہے جب پڑتی ہے تب کھیتی میں جاں
ہوتے ہوتے خشک جب دریا میں خاک اڑنے لگی — تب ہوئے نہروں سے جنگل غیرت باغ جناں
چہچہے مرغ چمن کو تب ہوئے جا کر نصیب — کر چکا کیڑے مکوڑے جب ہزاروں نوش جاں
جان لو قسمت کسی کی جاگنے والی ہے اب — جب سنو یارو! بگڑتا کوئی گھر یا خانداں
آسماں سے بن کے خواں آتا نہیں اقبال کا — ہے وہی اک چیز کل مہماں یہاں تھی آج واں
میزباں کی دیکھتی ہے آنکھ جب بدلی ہوئی — واں سے اٹھ کر دوسرا جا ڈھونڈھتی ہے میزباں
جانے والا ہے مقرر ان کا گھر غیروں کے پاس — جو کمر باندھے ہوئے بیٹھے ہیں گھر کھونے پہ یاں
قصر و ایواں ہوں مبارک تم کو اے محنت کشو — عیش کے بندے بہت ہونے کو ہیں بے خانماں
یاد رکھو ہوں گے اب حقداران کے جانشیں — ہاتھ سے حق کھو دیے اپنے جنھوں نے رائگاں
ہوں گے مزدور اور کمیرے ان کے قائم مقام — پھرتے ہیں بے کار جن کے کودک و پیر و جواں
اے مسلمانو! فلک کی گردشوں سے غافلو! — تم کو رخصت ہے لٹاؤ وقت و دولت رائگاں
دیکھو جب غیروں کو تم بڑھتا کرو اپنے پہ ناز — ہیں تمھارے عیش و غفلت کی یہ سب فیاضیاں
مت کرو شکوہ مشیت کا خدا ظالم نہیں — بلکہ ظالم ہیں تمھاری اپنی بد اعمالیاں
ہے یہ قانون الٰہی جو کبھی ٹلتا نہیں — گو جگہ سے اپنی ٹل جائے زمین و آسماں

چھٹتی جائیں گی وہ قومیں جو بگڑتی جائیں گی
ٹہنیاں جو سوکھتی جائیں گی جھڑتی جائیں گی

"منقول از کلیات نظم حالی"
مرتبہ محمد اسمٰعیل صاحب پانی پتی

کیا مسلمان ترقی کر سکتے ہیں؟

جو قوم ترقی کے بعد تنزل کے درجے پر پہنچ جاتی ہے وہ ایک ایسی ابتر حالت میں ہوتی ہے کہ اس کے دوبارہ ترقی کرنے سے اکثر لوگ مایوس ہو جاتے ہیں' یا یوں کہو کہ اس کی قابلیت کا جوہر نظروں سے چھپ جاتا ہے یہاں تک کہ اگر وہ ترقی کرنے کا ارادہ کرتی ہے تو اس کی سعی ایک حرکت مذبوحی سمجھی جاتی ہے اور اگر وہ سنبھلنا چاہتی ہے تو اس پر سنبھالے کا گمان کیا جاتا ہے۔ یہی حال آج کل ہماری قوم کا ہے۔

اگرچہ بعضے مومن مسلمان جو کبھی اپنی نسبت بدگمان نہیں کرتے مسلمانوں کی قوم کو اب بھی اعلیٰ درجے کی ترقی کے قابل سمجھتے ہیں لیکن امید ہے کہ وہ جس قدر زمانے کے حالات سے واقف ہو کر دنیا کی ترقیات کا اندازہ کریں گے اور جس قدر اپنی ترقی کے مواقع پر غور فرمائیں گے اسی قدر ان کی رائے کی غلطی ان پر ظاہر ہوتی جائے گی۔

البتہ جو لوگ مسلمانوں کی بہبودی سے بالکل مایوس ہیں اور اس بات کا یقین رکھتے ہیں کہ "ان میں کسی قسم کی ترقی کا مادہ باقی نہیں رہا اور ان کی اصلاح میں کوشش کرنے والے ایک محال بات کے پیچھے پڑے ہیں۔" ان کی رائے نہایت غور اور توجہ کے لائق ہے کیونکہ جن لوگوں کی یہ رائے ہے وہ ہماری قوم میں اعلیٰ درجے کے لائق آدمی ہیں اور ہماری موجودہ حالت جس سے بدتر کوئی حالت نہیں ہو سکتی سراسر انھیں کی رائے کی تائید کرتی ہے یعنی وہ ایک ایسا دعویٰ کرتے ہیں جس کا ثبوت خود ان کے دعوے ہی میں موجود ہے۔ ایک ایسے بیمار کی نسبت جس کی طاقت روز بروز زائل ہوتی جا رہی ہو' جس کی غذا بالکل مفقود ہو' جو علاج معالجے سے سو سو کوس بھاگتا ہو یہ کہنا کہ "وہ چند روز کا مہمان ہے" ایک ایسا دعویٰ ہے کہ آپ ہی اپنی دلیل ہو سکتا ہے۔

وہ خیالات جو مسلمانوں کے ترقی نہ کر سکنے کے متعلق عام طور پر پیش کیے جاتے ہیں

۱- پہلا خیال :- مذہب مانع ترقی ہے

وہ لوگ (جن کی رائے اوپر بیان کی گئی) مسلمانوں کی موجودہ حالت کی شہادت کے سوا اور بھی دلیلیں پیش کرتے ہیں - وہ کہتے ہیں کہ :-

"مسلمانوں کی مذہبی تعلیم ہی دنیوی ترقی کے لئے مانع ہے - پس تاوقتیکہ مسلمان مذہب سے دست بردار نہ ہوں دنیوی ترقی نہیں کر سکتے - لیکن اس صورت میں وہ مسلمانوں کی ترقی نہ ہوگی بلکہ ایک ایسی قوم کی ترقی ہوگی جس سے اسلام کا کچھ تعلق نہ ہو"

ہمارے نزدیک یہ ایک دلچسپ فقرہ ہے جو مسلمانوں کی ترقی و تنزل کی بحث کے وقت ہمیشہ استعمال کیا جاتا ہے -

دنیا میں کوئی قوم شائستہ یا ناشائستہ ایسی نہیں ہے جس کی مذہبی تعلیم اب یا کسی وقت دنیوی ترقیات کی مانع نہ خیال کی گئی ہو -

اور سب قوموں کو جانے دو - عیسائی قومیں جو اس وقت دنیوی ترقیات میں تمام دنیا سے فائق ہیں اور جو علم و دولت کے ساتھ ساتھ اپنے مذہب کو بھی ترقی دے رہی ہیں ان کا مذہب ہمارے مروجہ مذہب سے بھی زیادہ دنیوی ترقی کا منافی سمجھا جاتا تھا - جس وقت یورپ میں علم و حکمت کا ستارہ چمکا اور مذہبی خیالات اس کی روشنی میں مضمحل ہونے لگے اس وقت مذہبی پیشواؤں اور خود گورنمنٹ کی طرف سے کونسی مزاحمت تھی جو نہیں ہوئی - جن لوگوں نے مذہب کو حشو و زوائد سے پاک کرنا چاہا اور آزادانہ تحریر و تقریر کرنی شروع کی اس وقت ان کو کیسے کیسے سخت عذاب دیئے گئے - ہزاروں آدمی جلائے گئے اور ہزاروں نہایت تکلیفیں اور اذیتیں پہنچا کر ہلاک کئے گئے -

سنہ ۱۳۹۴ء میں وکلف جو عیسائی مذہب کا مصلح تھا اور جس نے کتب مقدسہ کو انگلستان کی زبان مروجہ میں ترجمہ کیا تھا، اس کے معتقدوں پر سخت عذاب کیا گیا -

سنہ ۱۴۱۳ء میں آزادی مذہب کی بیخ کنی کے واسطے قانون جاری کئے گئے -

سنہ ۱۵۳۹ء میں اسکاٹ لینڈ میں مصلحان مذہب پر انواع و اقسام کے ظلم کئے گئے اور ساٹھ آدمی بدعت

کے الزام پر جلتی آگ میں جلائے گئے۔

۱۵۵۵ء میں کئی رفار مر بدعتی ہونے کے الزام میں جلائے گئے اور تمام قید خانے اس قسم کے بدعتیوں سے بھر گئے۔

۱۶۴۱ء میں جبکہ آئرلینڈ میں بغاوت ہوئی تو چالیس ہزار پروٹسٹنٹ قتل کئے گئے۔

سترھویں صدی عیسوی کے اخیر تک ارسطو کی حجتوں نے تمام یورپ کے مدارس کو ایسا جکڑ بند کر رکھا تھا کہ وہ مذہب کی رکن رکین سمجھی جاتی تھیں اور یہ تمام بندشیں اس وقت تک نہ ٹوٹیں جب تک کہ لارڈ بیکن نے نہایت زور آور تحریروں سے ان کو نہ توڑا۔

کوپرنکس نے جس وقت سیارات کی نسبت اپنی تحقیقات ظاہر کی تو تمام کلیسا نے ایک زبان ہو کر اس کو مردود ٹھیرایا۔

گلیلیو نے ۱۶۰۹ء میں دوربینیں بنائیں اور سیارات کے متعلق بہت سے حالات مشاہدہ کئے مگر اس کو انعام یہ ملا کہ قید کیا گیا۔ اگرچہ ہر چند اس نے بہت زبردست اور صاف دلیلوں سے سمجھایا کہ یہ باتیں دین یا کتاب مقدس سے کچھ منافات نہیں رکھتیں مگر کسی نے التفات نہ کیا۔

غلامی کے موقوف کرنے میں یورپ کو بے شمار مزاحمتیں پیش آئیں۔

لوتھر کی کتاب جو پوپ لیو دھم کے برخلاف لکھی گئی تھی ۱۵۲۰ء میں جلائی گئی۔ اسی طرح کے اور بیشمار واقعات پیش آئے جن کے بیان کرنے کا یہ محل نہیں ہے۔

آخر تعلیم نے تمام الف و عادت اور تعصبات کو دبا لیا اور عیسائی مذہب بہ قدر ضرورت وقتاً فوقتاً حشو و زوائد سے پاک ہوتا رہا۔ اب وہی عیسائی قومیں ہیں کہ جس طرح دنیوی ترقیات میں تمام دنیا سے سبقت لے گئی ہیں اسی طرح اپنے مذہب کی اشاعت اور حمایت میں تمام عالم کی قوموں سے زیادہ سرگرم ہیں۔

پس یہ خیال کہ مسلمان جب تک اپنے مذہب سے دست بردار نہ ہوں دنیوی ترقی نہیں کر سکتے، صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

اصل یہ ہے کہ ہر مذہب ایک مدت کے بعد اپنی اصلیت سے متجاوز ہوتے ہوتے ایک طومار طویل الذیل

ہو جاتا ہے اور جب تک کوئی سخت ضرورت داعی نہیں ہوتی وہ برابر بڑھتا چلا جاتا ہے لیکن جب زمانے کی ضرورتیں اہل مذہب کو شکنجے میں کھینچتی ہیں تو وہ مذہب کی اصلیت دریافت کرنے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور بہت سے ملکی توانین اور بہت سے قصے کہانیاں، بہت سے رسم و رواج، بہت سے بیجا تعصبات اور بہت سے ظنون و اوہام جو امتداد ایام کے سبب مذہب کے عناصر و ارکان بن جاتے ہیں ان سے دست بردار ہو کر اصل مذہب پر قناعت کرتے ہیں۔ وہ خود ایسا نہیں کرتے بلکہ زمانہ کی ضرورتیں ان کو ایسا کرنے پر مجبور کرتی ہیں مثلاً ہندوستان کا ایک شریف مسلمان جو عورت کے گھر سے باہر نکلنے کو خلاف شرافت ہی نہیں بلکہ خلاف شریعت بھی جانتا ہے جب اہل و عیال کے ساتھ سفر حج کرتا ہے تو اس کو مجبوراً پردہ نشینی کے وہ قاعدے توڑنے پڑتے ہیں جن کو وطن میں لازمۂ اسلام خیال کرتا تھا۔ ایک شیعی مسلمان جو مشرکین کے دودھ دہی اور مٹھائی وغیرہ سے پرہیز کرتا ہے جب کوئی لمبا سفر کرتا ہے تو اس کو لاچار سب کچھ گوارا کرنا پڑتا ہے۔

انیسویں صدی کے آغاز میں جب محمود ثانی سلطان روم نے فوج کو فرنگستانی قواعد سکھانے کی نہایت سخت ضرورت سمجھی اور ینگچری فرقے نے جن کی فوج شجاعت اور استقلال میں بے مثل اور شمار میں ایک لاکھ سے زیادہ تھی کافروں کی قواعد سمجھ کر اس کے سیکھنے سے انکار کیا اور کسی طرح وہ اپنی سرکشی سے باز نہ آئی تو آخر مجبور ہو کر اس فرقے کے ایک ایک متنفس کو قتل کرنا پڑا۔ اگرچہ اس فوج کے قتل ہونے سے سلطنت کو سخت صدمہ پہنچا لیکن زمانے کی ضرورتوں نے سلطان کو ایسے قتل عام پر مجبور کر دیا۔ اور اس دن سے فرنگستانی قواعد روم میں جاری ہو گئی۔ بےشک ینگچری فرقے کی یہ بغاوت و سرکشی مذہبی خیالات کا نتیجہ تھی لیکن چونکہ حقیقت میں اس کی بنیاد محض تعصب پر تھی نہ کہ اصول مذہب پر اور زمانے کی ضرورتیں بھی مجبور کر رہی تھیں کہ بغیر نئے آلات جنگ سے مسلح ہوئے اور موجودہ طرز نبرد آزمائی سے واقف ہوئے بغیر چارہ نہیں، اس لئے تمام علماء نے متفق اللفظ ہو کر ایک لاکھ بہادر اور کار آزمودہ فوج کے قتل کا فتویٰ دے دیا۔

الغرض مذہبی توہمات جب ہی تک مانع ترقی رہتے ہیں جب تک زمانے کی ضرورتیں اہل مذہب کو مجبور نہیں کرتیں۔

آج سے تیس برس پہلے ہندوستان میں ایک مسلمان بھی ایسا نہ ہوگا جو انگریزی زبان سیکھنے کو معصیت

نہ جانتا ہو۔ لیکن اب برخلاف اس کے ایک مسلمان بھی ایسا نہ ہوگا جو انگریزی سیکھنے کو ضروری نہ سمجھتا ہو۔

کیا وہ پہلا خیال ایک مذہبی خیال نہ تھا؟ اور کیا اس خیال کے بدل جانے سے مسلمان اسلام سے دست بردار ہوگئے؟ حاشا ثم حاشا۔

پس یہ خیال بالکل غلط ہے کہ جب تک مسلمان اسلام سے دست بردار نہ ہوں دنیوی ترقی ہرگز نہیں کرسکتے۔ البتہ جب تک کوئی ہم کو یہ نہ جتائے کہ کیا ضرورتیں درپیش ہیں تب تک نہ مذہبی توہمات ہمارے دل سے دور ہو سکتے ہیں اور نہ ترقی کا خیال ہمارے دل میں پیدا ہوسکتا ہے اور وہ شئے تعلیم ہے جس کے پھیلانے میں چند باہمت لوگ کوشش کر رہے ہیں۔ اگرچہ قوم ان کی چیخ و پکار سے بیدار نہیں ہوتی لیکن اشح المؤدبین (زمانہ) ان کو بہت جلد ہوشیار کردے گا۔

۲۔ دوسرا خیال: ایک بار تنزل کے بعد دوبارہ ترقی نہیں ہوسکتی

دوسری دلیل وہ یہ پیش کرتے ہیں کہ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں سنی گئی جس نے ایک بار تنزل کے درجہ کو پہنچ کر دوبارہ ترقی کی ہو۔

لیکن ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ دوبارہ ترقی کرنے سے کیا مطلب ہے؟ اگر دوبارہ سلطنت حاصل کرنا مراد ہے تو ہم تسلیم کرتے ہیں (بلکہ ہمارے نزدیک اگر دنیا واقعی عالم اسباب ہے تو ممکن نہیں) کہ جو قومیں زمانۂ موجودہ کے فنون جہانبانی و کشورکشائی میں اپنے بنی نوع سے پیچھے رہ گئی ہیں ان کو کبھی سلطنت اور حکومت میں استقلال کا درجہ حاصل ہوسکے یا جو مستقل نظر آتی ہیں ان کا استقلال قائم رہ سکے۔

زمانۂ قدیم اور دور متوسط میں جبکہ جنگی طاقتیں تمام قوموں کی تقریباً یکساں تھیں اس وقت ہر قوم سلطنت اور حکومت حاصل کرنے کی قابلیت رکھتی تھی اور خاص خاص اسباب سے کبھی یہ قوم اس قوم پر اور کبھی وہ قوم اس قوم پر غالب آجاتی تھی۔

لیکن زمانۂ حال میں قواعدِ جنگ و آلاتِ حرب کے لحاظ سے دنیا کی حالت دگرگوں ہے۔ ایک قوم آسمان پر ہے تو دوسری قوم تحت الثریٰ میں ہے۔ اور جو قومیں ترقی کر چکی ہیں ان کا فرض ہے کہ مغلوب قوموں کو کبھی ان وسائل میں اپنے برابر نہ ہونے دیں جن کے سبب سے ان کو غلبہ حاصل ہوا ہے۔ پس ضرور ہے کہ ترقی یافتہ

قوموں کا غلبہ اور رعب داب روز بروز بڑھتا جائے اور جن قوموں نے اپنی حد سے آگے قدم نہیں بڑھایا وہ نوبت بہ نوبت مضمحل ہوتی جائیں لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ مسلمانوں کی ترقی کے لیے کوشش کرنا محض فضول ہے صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

ہر قوم بلکہ ہر شخص کی ترقی کی ایک جداگانہ حد ہے اور اس حد تک پہنچنا اس کا ضروری فرض ہے۔ ایک شخص جس کے تمام اعضائے جسمانی درست اور مضبوط ہیں اور ذہن و حافظہ بھی عمدہ ہے بے شک ہر علم و ہنر میں ترقی کرسکتا ہے۔ وہ جس طرح ایک اعلیٰ درجے کا فاضل ہوسکتا ہے ویسا ہی ایک اعلیٰ درجے کا سپاہی بھی ہوسکتا ہے۔ لیکن ایک دوسرا شخص جس کا فہم، ذہن اور حافظہ عمدہ ہے مگر ایک ہاتھ سے بالکل اپاہج ہے وہ اگرچہ ایک عمدہ سپاہی نہیں بن سکتا لیکن ایک اعلیٰ درجے کا فاضل ضرور ہوسکتا ہے اور اس لیے اس کا نہایت ضروری فرض ہے کہ علمی ترقیات میں جہاں تک ہوسکے کوشش کرے۔

اگر دوبارہ ترقی کرنے سے یہ مراد نہیں ہے جو اوپر ذکر کی گئی تو ہم تسلیم نہیں کرتے کہ کسی قوم نے تنزل کے بعد ترقی نہیں کی۔

اور ملکوں کو جانے دو۔ ہندوستان ہی میں ایسی قومیں موجود ہیں جو نہایت پست ہوکر دوبارہ بلند ہوئی ہیں مثلاً گجرات میں پارسی یا بنگالہ میں ہندو۔ ان دونوں قوموں کا حال جو دو سو برس پہلے تھا اور ان کی موجودہ حالت دونوں کا مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انھوں نے کس قدر ترقی کی ہے۔

اس کے سوا کوئی روشن اور صاف دلیل اس بات کی نہیں ہے کہ جب گورنمنٹ کی طرف سے ہماری تعلیم، ہماری تجارت اور ہماری صنعت و حرفت میں کوئی صریح مزاحمت نہ ہو تو بھی ہم ان شاخوں میں ترقی نہیں کرسکتے۔ ایک یہودیوں پر جب تک یورپ میں ظلم و ستم ہوتا رہا اور وہ غلامی کی حالت میں رہے تب تک ان کی ترقیات جس قدر وہ رعیت ہونے کی حالت میں کرسکتے تھے رکی رہیں لیکن جب سے یورپ میں آزادی پھیلی اور ان کو رعیت کے پورے پورے حق دیے گئے تب سے ان کی حالت پہلے کی نسبت نہایت بہتر ہے بعض ملکوں میں تو انھوں نے حکمراں قوموں کے برابر حقوق حاصل کیے ہیں۔ عموماً ہر ملک میں ان کی حالت اچھی ہے۔ ان کی تجارت تمام دنیا میں پھیلی ہوئی ہے اور ان کی دولت روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ بعض دولتمند ان میں ایسے

ایسے ہیں کہ یورپ کی بڑی بڑی سلطنتیں ان کی قرضدار ہیں۔

۳۔ تیسرا خیال۔ موجودہ تعلیمی کوششوں کا نتیجہ کچھ نہ نکلے گا لہذا کوشش بے سود ہے

جو لوگ مسلمانوں کی ترقی سے بالکل مایوس ہیں وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ:۔

"اس کوشش کا نتیجہ جو کہ مسلمانوں کے بعض خیر خواہ کر رہے ہیں اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ چند آدمی کسی قدر امتیاز حاصل کر لیں۔ کیونکہ آج تک جتنے آدمیوں کو ترقی کا خیال ہوا ہے وہ اس قدر تھوڑے ہیں کہ انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ پس اگر سو دو سو برس میں ہزار دو ہزار مسلمان ممتاز ہو گئے تو اس کو قومی ترقی نہیں کہہ سکتے۔

لیکن ہم پوچھتے ہیں کہ مسلمانوں کو کے دن سے ترقی کا خیال پیدا ہوا ہے؟ اگر انصاف سے دیکھا جائے تو اس خیال کی عمر اور پرچہ تہذیب الاخلاق کی عمر برابر نکلے گی۔ پس جو کچھ اس قلیل عرصے میں ہوا وہ ترقی کی معمولی چال سے بہت زیادہ ہے۔ اس کے سوا ترقی کی رفتار ابتدا میں ہمیشہ سست ہوتی ہے لیکن وہ جس قدر بڑھتی جاتی ہے اسی قدر تیز ہوتی جاتی ہے۔ جو بیمار روز بروز بگڑتا جاتا ہے اس کا ادنیٰ افاقہ بھی نہایت تسلی بخش ہوتا ہے اور اگر پھر کوئی غلطی نہیں ہوتی تو اس کی صحت اور طاقت روز بروز ترقی کرتی ہے اور یہ ترقی بھی یوماً فیوماً بڑھتی جاتی ہے۔

۴۔ چوتھا خیال۔ پہلے سے ترقی کن قوموں کے برابر چونکہ ہم نہیں ہو سکتے لہذا ترقی بے فائدہ ہے

بعض اوقات یہ بھی کہا جاتا ہے کہ "جو قومیں پہلے سے ترقی کر رہی ہیں ان کے برابر ایک ایسی قوم ہرگز نہیں ہو سکتی جس کو سب سے پیچھے ترقی کا خیال پیدا ہوا ہو۔ پس اگر بالفرض مسلمانوں نے اب ترقی کرنے کا پختہ ارادہ بھی کیا تو کچھ فائدہ نہیں ہے کیونکہ ایسی حالت میں ہم ان ترقی یافتہ قوموں سے ہمیشہ پیچھے ہی رہیں گے۔"

بے شک یہ بات صحیح ہے لیکن ہماری کوشش صرف اس بات میں ہونی چاہئے کہ ہم اپنی ہموطن قوموں سے جنھوں نے ہم سے بہت پہلے قدم آگے بڑھایا ہے کسی چیز میں کم نہ رہیں اور اس میں کچھ شبہ نہیں کہ ہم اس کوشش میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ محکوم قوموں کی ترقی ہمیشہ ایک خاص حد پر جا کر پھیکی ہو جاتی ہے جس سے آگے بڑھنے کا محل ان کے لئے باقی نہیں رہتا۔ پس اگر ان میں سے ایک قوم آگے بڑھ گئی ہے اور دوسری قوم پیچھے رہ گئی ہے تو پس ماندہ قوم کو مایوس نہ ہو جانا چاہئے کیونکہ اگر راہ میں نہیں تو اخیر منزل پر جا کر

دونوں مل جائیں گی۔ اور یہ بھی ناممکن نہیں ہے کہ راہ ہی میں پچھلا قافلہ اگلے قافلہ سے جا ملے کیونکہ بعض اوقات ایسی اضطراری حالتیں پیش آتی ہیں کہ پچھلوں کو معمولی رفتار سے کسی قدر زیادہ جلد قدم اٹھانا پڑتا ہے یہانتک کہ وہ راہ ہی میں اگلوں سے جا ملتے ہیں۔

اصل مانع ترقی مایوسی اور نا امیدی ہے

بہرحال یہ تمام موانع جو اوپر ذکر کیے گئے ہم کو ترقی سے مایوس کرنے والے نہیں ہیں البتہ صرف ایک بات ایسی ہے جو تمام منصوبوں اور ارادوں کو خاک میں ملا دیتی ہے اور وہ ترقی کی طرف سے مایوسی اور نا امیدی ہے۔

جو قوم عام تعصب اور جہالت میں مبتلا ہوتی ہے وہ ہمیشہ چند ایسے روشن ضمیر آدمیوں کی ہمت اور کوشش سے رو براہ ہوتی ہے جو تعلیم کی بدولت تعصب اور جہالت کی اندھیری کوٹھری سے باہر نکل آتے ہیں اور قوم کی ابتر حالت دیکھ کر ان کے دل میں بے اختیار ایک ولولہ اٹھتا ہے اور قومی اصلاح و ترقی کی طرف دل و جان سے متوجہ ہو جاتے ہیں۔

اسی بنا پر ہم کو یہ امید تھی کہ جو نوجوان ہماری قوم میں اعلیٰ درجے کی تعلیم پائیں گے وہ اس کام کے ذمہ دار ہوں گے۔ مگر برخلاف اس کے ہم دیکھتے ہیں کہ وہ جس قدر ایجوکیشن اور سویلزیشن (تعلیم و تہذیب) میں اعلیٰ درجہ حاصل کرتے ہیں اسی قدر قوم کی ترقی سے مایوس نظر آتے ہیں یہانتک کہ وہ جن نفوس مقدسہ کو قومی ترقی کے خیال میں سرگرم پاتے ہیں ان پر تعجب کرتے ہیں کہ یہ کیوں کوشش کر رہے ہیں؟ اور کیوں کر کر رہے ہیں؟

ہائی ایجوکیشن (اعلیٰ تعلیم) کی بدولت ان کی مثال ایسے شخص کی مانند ہے جو اندھیری رات میں ایک نہایت روشن کمرے سے باہر نکلتا ہے اور باہر آکر اس کو در و دیوار کچھ نظر نہیں آتا۔ وہ باہر چلنے پھرنے والوں کے پاؤں کی آہٹ سن کر تعجب کرتا ہے کہ یہ لوگ کیونکر اس اندھیرے میں چل پھر رہے ہیں اور آخر گھبرا کر پھر اسی روشن کمرے میں گھس جاتا ہے۔ وہ اتنا توقف نہیں کرتا کہ روشنی کی چکاچوند جس نے اس کی آنکھوں کو خیرہ کر رکھا ہے کم ہو جائے اور تاریکی میں اس کو بھی روشنی محسوس ہونے لگے اور وہ بھی اوروں کی طرح چل پھر سکے۔

اسی طرح ہماری قوم کے نوجوان ایجوکیٹڈ (تعلیم یافتہ) جنھوں نے یورپ کی سویلزیشن (تہذیب) کو اپنی

آنکھ سے دیکھا ہے یا تعلیم کے ذریعے سے اس کا اندازہ کیا ہے وہ جب مغربی قوموں کی حالت کو اپنی قوم کی موجودہ حالت سے مقابلہ کرتے ہیں تو دونوں حالتوں میں وہ نسبت پاتے ہیں جو محض نور اور محض ظلمت میں ہے اور بیشک بادی النظر میں ایسی ہی نسبت معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت میں ایسا حال نہیں بلکہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اندھیرے میں کچھ اجالا بھی ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ دو چار شخصوں کی کوشش سے چند روز میں وہ نتائج پیدا ہوئے ہیں جن کی کسی طرح توقع نہ تھی۔ پس اگر دس بیس بالیاقت آدمی توجہ اور کوشش کریں تو بہت کچھ کر سکتے ہیں۔

صرف دو چیزیں ہیں جن پر دنیا کی کامیابی اور ناکامی کا مدار رکھا گیا ہے۔

(۱) امید۔

(۲) ناامیدی۔

ہزاروں دشوار کام جو بالیقین محال بلکہ ناممکن سمجھے گئے تھے امید کی بدولت اور کوشش کے ذریعے نہ صرف ممکن بلکہ سرانجام پائے ہیں اور ہزاروں سہل اور آسان کام ناامیدی اور ہمت ہار دینے کی وجہ سے ناتمام اور ادھورے رہے ہیں۔ دیکھو کلمبس نے صرف امید ہی کے بھروسے پر ایک ایسا کام سرانجام کیا جس کو تمام عالم محال سمجھتا تھا۔ کلائو نے صرف امید ہی کے سہارے پلاسی میں وہ فتح حاصل کی جس کے نتائج کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھے ؎

بجز امید نہ ... عشق کیشاں است   کسے نداد تسلی دل زلیخا را

"منقول از مقالات حالی"
شائع کردہ انجمن ترقی اردو

دنیا کی کل علم سے چلتی ہے یا عمل سے؟

یہاں علم سے ہماری مراد مجرد علم ہے جو عمل سے بالکل خالی ہو۔ اور عمل سے مراد محض عمل ہے جس میں علم کو کچھ دخل نہ ہو۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کی کل علم سے چلتی ہے یا عمل سے؟

اگر ہم کو یہ بات دریافت کرنا ہو کہ چراغ کی بتی کا اشتعال اوکسیجن سے قائم رہتا ہے یا ہائیڈروجن سے یا دونوں سے، تو ہم کو چاہیے کہ ایک دفعہ بتی کو محض اوکسیجن میں اور دوسری دفعہ محض ہائیڈروجن میں رکھ کر دیکھیں۔ اگر دونوں میں بجھ جائے تو سمجھنا چاہیے کہ ہوا کے دونوں جزوں کو اس کے اشتعال میں دخل ہے اور اگر ہائیڈروجن میں بجھ جائے اور اوکسیجن میں نہ بجھے تو جاننا چاہیے کہ اس کے اشتعال کا باعث محض اوکسیجن ہے نہ ہائیڈروجن۔

اسی طرح اگر ہم یہ دیکھنا چاہیں کہ دنیا کی کل علم سے چلتی ہے یا عمل سے تو ہم کو چاہیے کہ اول ایک ایسا ملک فرض کریں جس میں اہل علم و اہل نظر کے سوا کوئی کام کرنے والا اور ہاتھ پاؤں ہلانے والا نہ ہو اور پھر دیکھیں کہ وہ ملک کتنے دن آباد رہتا ہے۔ پھر ایک دوسرا ملک فرض کریں جس میں اَن پڑھ محنتی مزدوروں کے سوا اہل علم کا نام و نشان نہ ہو اور پھر دیکھیں کہ وہ ملک آباد رہتا ہے یا نہیں۔

ہم اول ایک ایسا خطہ فرض کرتے ہیں جس کے باشندے جہاں عالم، فلسفی، ریاضی داں، مصنف، اوریٹر (Orator) شاعر اور بڑے بڑے فاضل ہیں مگر ان میں کوئی خدا کا بندہ ایسا نظر نہیں آتا جو ان واجب التعظیم اپاہجوں کے کھانے پہننے اوڑھنے، رہنے سہنے اور لکھنے پڑھنے وغیرہ کا سامان مہیا کرے۔ اول تو کسی ملک میں بغیر کارکن جماعتوں کے ایسی آبادی کا وجود میں آنا ہی ناممکن ہے لیکن اگر بفرض محال کسی خطہ میں ایسی ناشدنی کولونی (آبادی) چند روز کے لئے آباد ہو جائے تو اس کا انجام کیا ہوگا؟ ممکن ہے کہ بعض کو مطالعہ کے ذوق و شوق میں ایک آدھ روز بھوک پیاس نہ لگے، بعض کو کسی مشکل مسئلے کے حل ہو جانے کی خوشی میں ایک دو وقت کھانے کی کچھ پرواہ نہ رہے یا بعض کو کسی مضمون کی دھن میں کچھ دیر تک خورونوش کا کچھ خیال نہ آئے مگر

بہت جلد وہ آپ کو ایک ایسی مخلوق پائیں گے جو بھوکی ہے مگر کوئی اس کا رازق نہیں ننگی ہے مگر کوئی اس کا ستار نہیں، حاجتمند ہے مگر کوئی اس کا قاضی الحاجات نہیں۔ اب یا تو انھیں خود اپنے اعلیٰ اور اشرف ہاتھوں سے وہ تمام حقیر اور ذلیل کام سرانجام کرنے پڑیں گے جو عوام کالانعام کو کرنے چاہئیں یا فوراً اس ملک سے ہجرت کر کے کسی ایسے خطہ میں جا کر رہنا پڑے گا جہاں ان کے لئے فرمانبردار بندے یا بندہ پرور خدا موجود ہوں۔ دونوں حالتوں میں نتیجہ یہ نکلے گا کہ "دنیا کی کل محض علم سے نہیں چل سکتی"۔

اس کے بعد ہم ایک دوسرا ملک فرض کرتے ہیں جس کے تمام باشندے ان پڑھ اور بے علم ہیں مگر محنتی، جفاکش اور اپنی ضروریات زندگی کے مہیا کرنے میں نہایت سرگرم ہیں۔ گو انھوں نے زراعت یا تجارت یا صنعت و دستکاری کے اصول کتابوں میں نہیں پڑھے مگر وہ اپنی تمام ضروریات جن پر انسان کی زندگی موقوف ہے خود مہیا کرتے ہیں۔ قدرتی خواہشیں اور نیچرل ضرورتیں ان کو جس طرح سکھاتی گئیں اور متواتر تجربوں سے جس قدر ان کی سمجھ بوجھ بڑھتی گئی وہ اپنے تمام کام برابر سرانجام کرتے رہے۔ بونا، جوتنا، بُنج بیوپار، صنعت اور دستکاری غرضکہ تمام اہم اور ضروری کام رفتہ رفتہ بقدر ضرورت انجام دینے لگے۔ اب ان کی کوئی ضرورت بند نہیں رہتی اور کوئی کام اٹکا نہیں رہتا۔ ایک اناج پیدا کر کے لاتا ہے، دوسرا پیستا ہے، تیسرا پکاتا ہے اور تینوں مل کر کھاتے ہیں۔ ایک کپاس بوتا ہے، دوسرا اُسے کاتتا ہے، تیسرا بنتا ہے، چوتھا سیتا ہے اور چاروں مل کر پہنتے ہیں۔ اُن کو چوری یا ڈکیتی کا مطلق خوف نہیں کیونکہ ان کے پاس اپنے ہاتھ پاؤں کی محنت کے سوا کوئی دولت نہیں۔ ان کو غنیم کے حملہ کا کچھ ڈر نہیں کیونکہ وہ اپنے ہاتھ پاؤں سے چوکس اور غنیم کے مقابلے کے لئے مستعد اور تیار ہیں۔ ان میں کوئی بدکار اور بدچلن نہیں کیونکہ ان کو اپنے کام دھندوں میں بدکاری اور بدچلنی کی فرصت ہی نہیں۔ ان میں کوئی روگی اور بیمار نہیں کیونکہ ان میں کوئی طبیب اور ڈاکٹر نہیں۔ ان میں کوئی مذہبی تکرار نہیں کیونکہ ان میں کوئی واعظ یا ملا نہیں۔ ان میں کوئی پولٹیکل اختلاف نہیں کیونکہ وہ سب کنسرویٹو (Conservative) ہیں۔ ان میں کوئی عدالتی جھگڑا نہیں کیونکہ ان میں کوئی اور بیرسٹر نہیں۔ ان میں اس کے سوا کوئی عیب نہیں کہ وہ سویلائزڈ (مہذب و تعلیم یافتہ) نہیں۔ اور اس سے صاف ظاہر ہے کہ دنیا کی کل عمل سے چلتی ہے نہ علم سے۔

اب فرض کرو کہ اس ملک کے باشندوں کا میل جول کسی ایسے ملک والوں سے ہو گیا جن کے تمام کام

علمی اصولوں پر مبنی ہیں۔ انھوں نے زراعت، تجارت، صنعت و دستکاری اور تمام جنگی اور ملکی مہمات میں علم ہی کو اپنا رہبر بنایا ہے۔ کیا معمار اور کیا بڑھئی، کیا لوہار اور کیا کمہار، کیا درزی اور کیا کفش دوز غرضکہ تمام پیشہ ور محض علم کی ہدایت سے اپنے تمام کام سر انجام کرتے ہیں۔

اس قسم کی باعلم و عمل قوم کے میل جول اور لین دین نے اس آباد ملک کے اَن پڑھ باشندوں کو سخت نقصان پہنچایا۔ ان کی تجارت نے ان کے اخراجات زندگی حد سے زیادہ بڑھا دیئے، ان کی صنعت کے مقابلے میں ان کی صنعت ماند ہو گئی۔ ان کی دستکاری نے ان کی دستکاری کو اینڈ کر دیا۔ مگر ایک مدت تک ان کو اس بات کی مطلق خبر نہ ہوئی کہ ہمارے پیشہ ور کیوں بے کار ہو گئے؟ ہماری کمائیوں میں کیوں برکت نہ رہی؟ ہمارے اخراجات روز بروز کیوں بڑھتے جاتے ہیں؟ اور ہماری آمدنی ہمارے اخراجات کو کیوں مکتفی نہیں ہوتی؟

لیکن اس غیر قوم سے جوں جوں میل جول بڑھتا گیا اُن کو ان کی اور ان کو اُن کی زبان سیکھنے کی ضرورت زیادہ ہوتی گئی۔ انھوں نے اول ان کی زبان سیکھی پھر رفتہ رفتہ ان کے علم بھی سیکھنے لگے۔ جن علموں کے ذریعے سے انھوں نے ہر فن میں ترقی کی تھی وہ علم بھی انھوں نے حاصل کئے مگر سوائے رٹ لینے کے کوئی عملی فائدہ ان کے علموں سے نہ اُٹھایا۔ وہ علم کو عمل کی غرض سے سیکھتے تھے، انھوں نے علم کو محض علم کے واسطے سیکھا۔ وہ اس نتیجہ پر پہنچ چکے تھے کہ علم آدمی کے لئے بنا ہے مگر یہ مشکل ابھی یہیں تک پہنچے تھے کہ آدمی علم کے لئے بنا ہے۔ وہ علم سے خود بھی لذت اور فائدہ اٹھاتے تھے اور اپنے ملک اور قوم کو بھی اس کے فوائد پہنچاتے تھے۔ انھوں نے گونگے کی طرح گڑ کھایا اور کسی نے نہ جانا کہ کھٹا ہے یا میٹھا۔ وہ دنیا کی مختلف زبانیں اس لئے سیکھتے تھے کہ تمام عالم میں پھرتے تھے، غیر ملکوں کے آدمیوں سے ملتے تھے، مختلف قوموں کے علوم و فنون سے آگاہی حاصل کرتے تھے اور ان کو اپنی زبان میں نقل کرتے تھے۔ انھوں نے بھی ان کی دیکھا دیکھی غیر ملکوں کی زبانیں اور غیر قوموں کی بولیاں سیکھیں، مگر نہ اس لئے کہ غیر ملکوں میں سفر کریں اور غیر قوموں کے علوم و فنون اپنی زبان میں منتقل کریں بلکہ اس لئے کہ طوطے کی طرح کہیں "حق اللہ پاک ذات اللہ" اور کہیں "ست گوروت داتا" بول اٹھیں۔ وہ لیمپ روشن کرنے کے لئے، میز لکھنے کے لئے، کرسی بیٹھنے کے لئے، گھنٹہ وقت دیکھنے کے لئے اور فرش بچھانے کے لئے خریدتے تھے۔ انھوں نے ان کی ریس سے یہ سب چیزیں فراہم تو کیں مگر نہ لیمپ کو جلایا، نہ میز پر لکھا، نہ کرسی پر بیٹھے، نہ گھنٹے میں وقت دیکھا

اور نہ فرش کو بچھایا بلکہ کباڑی کی طرح سارا گھر اسباب سے بھر لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان لوگوں کی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ علم کے ذوق وشوق میں انھوں نے ہاتھ پاؤں ہلانے بالکل چھوڑ دیئے اور علم کا ادب ان کو دنیا کے ذلیل کاموں میں ہاتھ ڈالنے سے مانع ہوا۔ اب تاوقتیکہ وہ علم کو عمل کی غرض سے نہ پڑھیں اور اس سے عملی فائدے نہ اٹھائیں تب تک ممکن نہیں کہ ان کی حالت درست ہو۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ دنیا کی کل علم سے نہیں چلتی بلکہ عمل سے چلتی ہے۔

اس تمثیل سے ہمارا یہ مطلب نہیں کہ ہم کو علم کی ضرورت نہیں بلکہ ہم کو اس وقت علم کی نہایت ضرورت ہے اور ایسی ضرورت ہے جیسے پیاسے کو ٹھنڈے پانی کی ضرورت ہوتی ہے لیکن جس طرح ٹھنڈے پانی کی کلیاں کرنے سے پیاس نہیں بجھتی بلکہ اور زیادہ بھڑک اٹھتی ہے اسی طرح سطحیوں کی مانند کتابوں کے الفاظ اور علوم کی اصطلاحات یاد کرنے سے اور طوطے کی طرح علمی مسائل اور قواعد ازبر کرنے سے کوئی شخص نہ آپ کو اور نہ ملک کو کوئی اصلی فائدہ نہیں پہنچا سکتا بلکہ اندیشہ ہے کہ ایسے لوگ ملک کے حق میں مضر ثابت ہوں جس علم کی ہم کو ضرورت ہے وہ وہ علم ہے جو ہماری ساکن اور پژمردہ قوتوں کو متحرک اور شگفتہ وشاداب کرے، نہ کہ وہ علم جو ہمارے متحرک اور شگفتہ قویٰ کو بھی ساکن اور پژمردہ کر دے۔ ایسے علم سے بےعلمی سو درجے بہتر ہے بقول شخصیکہ "بخشو بی بلی چوہا لنڈورا ہی جئے گا"۔

"منقول از مقالات حالی"
شائع کردہ انجمن ترقی اردو

ہم جیتے ہیں یا مر گئے؟

عربی میں ایک مشہور مقولہ ہے کہ
یعنی کام کرنا زندوں کو شایاں ہے اور بے کار رہنا مردوں کو۔ اس قول کے موافق ہم دیکھنا چاہتے ہیں
کہ ہماری قوم میں کچھ جان باقی ہے یا نہیں؛ سچ یہ ہے کہ اگر مستثنیٰ مثالوں سے قطع نظر کی جائے تو نہایت افسوس کے
ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہماری قوم میں کچھ جان باقی نہیں رہی اور بے اختیار یہ شعر زبان پر آتا ہے۔

ایتہا النفس اجملی جزعاً[1]　　ان الذی تحذرین قد وقعا

اس بات کے بیان کرنے کی کچھ ضرورت نہیں ہے کہ ہر قوم کی ترقی کا مدار صرف اس بات پر ہے کہ اُس کے
افراد میں عموماً مستعدی، محنت اور استقلال کے ساتھ کام کرنے کی عادت پائی جائے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کسی خاندان بلکہ
کسی قوم میں اگر ایک شخص بھی ایسا پیدا ہو جاتا ہے جس میں یہ صفات موجود ہوں تو اس کی ذات سے تمام خاندان بلکہ
تمام قوم کو فائدہ پہنچتا ہے۔ پس جس قوم کے افراد میں عموماً یہ خصلتیں پائی جائیں گی ممکن نہیں کہ وہ قوم اپنی بساط کے
موافق ترقی میں کوئی ممتاز درجہ حاصل نہ کرے لیکن جہاں تک کہ ہم اپنی قوم کی حالت پر غور کرتے ہیں اس میں چاروں
طرف ہم کو ایک سناٹا نظر آتا ہے اور وہ اسلام جو بحر قلزم کی طرح موجیں مارتا ہوا اٹھا تھا آج بحر منجمد کی طرح ساکن
اور بے حس و حرکت معلوم ہوتا ہے۔

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم　　اب ہوئے خاک، انتہا ہے یہ

ترقی کی پہلی سیڑھی اپنے تنزل کا یقین ہے اور امن و آزادی ترقی کے دو بڑے معاون ہیں۔
ہم کو اپنے تنزل کا پورا یقین ہو گیا ہے۔
امن و آزادی جو برٹش حکومت کی بدولت ہم کو اس زمانے میں حاصل ہے وہ کسی عہد اور کسی دور

---

[1] یعنی اے دل اپنی بیقراری کو کم کر (کیونکہ) جس بات کا تجھ کو ڈر تھا وہ تو ہو چکی۔

میں ہندوستان کو نصیب نہیں ہوئی۔

ترقی کے نمونے بھی اپنے ہم وطنوں میں رات دن اپنی آنکھ سے دیکھتے ہیں۔

ترقی کی قابلیت بھی ہم میں اُسی قدر ہے یا ہونی چاہئے جس قدر کہ ہندوستان کی اعلیٰ سے اعلیٰ قوم کو قدرت نے عطا کی ہے۔

باوجود ان تمام باتوں کے ہم دیکھتے ہیں کہ ترقی کی روح ہم میں اب تک پیدا نہیں ہوئی۔

ہم خوب جانتے ہیں کہ ہم کو کچھ کرنا چاہئے لیکن کچھ کرتے نہیں۔

ہم کو بھوک شدت سے لگی ہوئی ہے مگر چاہتے ہیں کہ کہیں سے پکا پکایا ہاتھ لگ جائے تو کھالیں۔

ہم پیاس کے مارے مرے جاتے ہیں مگر منتظر ہیں کہ کوئی خدا کا بندہ ہمارے حلق میں آکر پانی چوا جائے۔

ہم توکل کو اس لئے ضروری نہیں سمجھتے کہ اس میں خدا پر بھروسہ کرنا ہوتا ہے بلکہ اس لئے کہ توکل کی بدولت ہم کو ہاتھ پاؤں ہلانے نہیں پڑتے۔

ہم تدبیر کو اس لئے بے سود خیال نہیں کرتے کہ وہ تقدیر الٰہی کا مقابلہ نہیں کرسکتی بلکہ اس لئے کہ تقدیر کے حیلے سے ہم کو کچھ کرنا نہیں پڑتا۔

ہم دنیا اور دنیا کے کاموں کو اکثر فانی اور حقیر بتاتے ہیں مگر نہ اس لئے کہ فی الحقیقت ہم دنیا کو ایسا ہی سمجھتے ہیں بلکہ صرف اس لئے کہ ہم کو اپنے ہاتھ پاؤں ہلانے نہ پڑیں۔

ہم اس حیلہ جو لومڑی کی طرح انگور کے خوشوں سے اس لئے ناک نہیں چھڑاتے کہ ان کو کھٹا سمجھتے ہیں بلکہ اس لئے کہ ان کے توڑنے میں ہم کو دقت معلوم ہوتی ہے۔

ہم کہتے سب کچھ ہیں مگر کرتے کچھ نہیں ہماری حالت ہم کو جھٹلاتی ہے اور ہمارے افعال ہمارے قول کی تکذیب کرتے ہیں۔

ہم قدریہ اور جبریہ دونوں فرقوں کو گمراہ بتاتے ہیں مگر ہم خود قدری بھی ہیں اور جبری بھی۔ ہمارے دعوے قدریوں کے سے ہیں اور ہمارے کام جبریوں جیسے۔ ہماری زبان قدری ہے اور ہمارا دل جبری۔

مسلمانوں میں قوت عملی کا فقدان اور اس کی چند مثالیں

اگرچہ ہم میں لائق آدمیوں کا قحط ہے تاہم کم و بیش مصنف، لکچرار اور شاعر ہم میں موجود ہیں۔ ہمارے مصنفین کو یہ شکایت ہے کہ پڑھنے والوں میں قوت منفعلہ نہیں اور پڑھنے والوں کو یہ شکایت ہے کہ مصنفوں میں قوت فاعلہ نہیں۔ ہمارے اسپیکر اور لکچرار جب کچھ بولتے ہیں تو بعض اوقات ان میں قومی جوش کسی طرح کم نہیں معلوم ہوتا، ہمارے شاعر جب کچھ پڑھتے ہیں تو قومی ہمدردی ان کے ایک ایک لفظ سے ٹپکتی ہے مگر فی الحقیقت ان کے کلام میں اور فونوگراف کی آواز میں کچھ فرق نہیں ہوتا۔ گویا ایک ہوا بھری ہوئی تھی جب وہ نکل گئی تو اب بالکل خالی ہیں۔

ہماری قوم میں انگریزی تعلیم [جو پریکٹیکل آدمی (عملی کام کرنے والے اشخاص) پیدا کرنے کا دعویٰ کرتی ہے] چشم بد دور روز بروز بڑھتی جاتی ہے اور تعلیم یافتہ اصحاب کی تعداد میں ہر سال معقول اضافہ ہوتا رہتا ہے مگر افسوس ہے کہ مستثنیٰ صورتوں کے سوا عملی قوت اور سلیف ہیلپ (اپنی مدد آپ کرنے) کا مادہ ان میں تعلیم کے بعد اتنا بھی باقی نہیں رہتا جتنا کہ مدرسہ میں داخل ہوتے وقت وہ اپنے ساتھ لائے تھے۔

ان میں سے ایک گروہ وہ ہے جس کی بڑی دوڑ بی۔ اے یا ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد یہ ہے کہ مڈل پاس کئے ہوئے طلبہ کی طرح سرکاری نوکری کے لئے ادھر ادھر سلسلہ جنبانی کرتا پھرے اور ذریعوں اور سفارشوں کی تلاش میں ایک مدت تک سرگردان و پریشان رہے۔ ان کو اپنے دست و بازو پر اتنا بھی بھروسہ نہیں ہوتا جتنا کہ چرندوں اور پرندوں کو اپنی قوت لایموت کی تلاش میں ہوتا ہے۔ وہ وجہ معاش کو غلامی یعنی نوکری ہی پر منحصر جانتے ہیں۔ ان میں اور ایک غریب اورنیٹل اسکالر (عالم عربی یا فارسی) میں صرف اتنا ہی فرق ہوتا ہے کہ انھوں نے زمانے کی ضرورت کے مطابق باقاعدہ غلامی کا پیشہ سیکھا ہے اور اس بیچارہ نے نہیں سیکھا۔ ان میں سے جن کو سرکاری نوکری مل جاتی ہے ان کو چار ناچار کتاب بالائے طاق رکھنی پڑتی ہے اور لکھنے پڑھنے سے ہمیشہ کے لئے دست بردار ہونا پڑتا ہے۔ ان کی مثال بعینہ اس بدقسمت عربی گھوڑے کی سی ہے جس کو گھوڑ دوڑ کے لئے تیار کیا گیا ہو اور پھر بجائے گھوڑ دوڑ کے چھکڑے یا ہل میں جوتا گیا ہو۔

مگر وہ عالی ہمت گریجویٹ جو نوکری کو پسند نہیں کرتے یا نوکری ان کو پسند نہیں کرتی ان کا حال پہلوں

سے بھی گیا گذرا ہے۔ اگر وہ چھکڑے یا ہل میں جوت دیئے جاتے تو کچھ کام بھی آتے، لیکن اب وہ کسی کام کے نہیں۔ ان کی کوششیں اکثر بے مصرف ہوتی ہیں جن سے نہ ان کو اور نہ کسی اور کو کچھ فائدہ پہنچتا ہے۔ ان کو رومن ایمپائر (سلطنت روم) کی تمام ہسٹری اور اس کے تنزل کے اسباب ازبر ہوتے ہیں مگر اپنی ہستی کی مطلق خبر نہیں ہوتی۔ وہ یورپ کے مصنفوں، موجدوں اور رفارمروں کے کام نہایت فخر کے ساتھ بیان کرتے ہیں لیکن سوائے اس کے کہ ان کے کارنامے بیان کرکے اپنی واقفیت کی داد چاہیں خود کچھ نہیں کرتے اور نہ کرسکتے ہیں۔ وہ ہندوستانیوں کے حقوق جو گورنمنٹ کے ذمہ ہیں کمال ادب سے بیان کرتے ہیں مگر ان کے، ان کے خاندان کے اور ان کی قوم کے حقوق جو خود ان کے ذمہ ہیں ان پر کبھی غور نہیں کرتے۔ وہ گورنمنٹ کے انتظام پر نکتہ چینی کرنے میں آندھی ہیں مگر اپنے گھر کے انتظام سے محض بے پروا۔

ہمارے بہت سے نوجوان ولایت سے تعلیم پاکر آئے ہیں اور اس پارس کی پتھری کو چھو آئے ہیں جو مس کو طلا کردیتی ہے۔ وہ اپنی عمر کا ایک عمدہ حصہ اس قوم میں بسر کرآئے ہیں جو حب وطن اور قومی ہمدردی کو اپنا دین و ایمان سمجھتی ہے۔ انھوں نے برسوں اس ملک کی ہوا کھائی ہے جہاں انسان علم و عمل کے سایہ میں پرورش پاتا ہے مگر جب وہ مع الخیر ہندوستان میں پہنچتے ہیں تو اکثر کی حالت بعینہٖ اس شعر کی مصداق ہوتی ہے۔

مکّہ گیا، مدینہ گیا، کربلا گیا ۔۔۔ جیسا گیا تھا ویسا ہی چل پھر کے آگیا

حب وطن اور قومی ہمدردی ان میں اتنی بھی باقی نہیں رہتی جتنی کہ وہ یہاں سے اپنے ساتھ لے کر جہاز میں سوار ہوئے تھے، قوم سے ان کو نفرت ہوجاتی ہے اور ہندوستانی سوسائٹی میں شریک ہونے سے ان کو شرم آنے لگتی ہے۔ جس حقارت سے کہ انگریز ہندوستانیوں کو دیکھتے ہیں وہ ان سے بھی زیادہ حقارت کی نگاہ سے اپنے ہم وطنوں کو دیکھنے لگتے ہیں۔ انگریز ان کو ہاف سویلائزڈ (نیم وحشی) کہتے ہیں تو وہ ان کو اَن سویلائزڈ (وحشی مطلق) کا خطاب دیتے ہیں۔ وہ اپنی قوم کو ترقی اور اصلاح کے ناقابل بتاتے ہیں اور اس لئے ان کی بھلائی کے لئے مطلق کوشش نہیں کرتے بلکہ جو لوگ ایسے کاموں میں کوشش کرتے ہیں ان کی کوششوں پر ہنستے ہیں اور ان کو بے سود خیال کرتے ہیں۔ یہ تمام شہادتیں اس بات کی ہیں کہ ہماری قوم میں عملی قوت باقی نہیں رہی۔

کبھی کبھی ہمارے بھائیوں کے دل میں ایک غیر معمولی جوش دودھ کے ابال سے بھی زیادہ خود بخود اٹھتا ہے۔
کبھی وہ اپنے چند ہم خیال آدمیوں کو متفق کر کے ایک انجمن قوم کی بھلائی کے لئے منعقد کرتے ہیں۔
کبھی مسلمانوں کی تعلیم کے لئے کوئی اسلامی یا انگریزی مدرسہ قائم کرتے ہیں۔
کبھی کوئی رسالہ یا اخبار محض قوم کے فائدے کی غرض سے جاری کرتے ہیں۔

اسی طرح کبھی ایک تدبیر کبھی دوسری تدبیر خاص قوم کی بھلائی کے لئے کرتے ہیں اور اکثر ان تدبیروں کے محرک جہاں تک ہم کو معلوم ہے فی الواقع نہایت خلوص اور صدق دل سے ان کاموں کو شروع کرتے ہیں اور ان کا یہ دلی ارادہ ہوتا ہے کہ تادم واپسیں ان کاموں میں کوشش کریں گے اور ان کو ترقی دیں گے۔ مگر درحقیقت ان کی حرکت ایک حرکت مذبوحی ہوتی ہے۔ وہ ایک ہی دو جست کے بعد بالکل ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں۔ ان کا کوئی منصوبہ (الا ماشاء اللہ) پورا نہیں ہوتا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ جو کچھ ہم کرنا چاہتے ہیں وہ نہیں کر سکتے۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ ہم میں قوت عملی باقی نہیں رہی۔

ہم میں ہزاروں بلکہ لاکھوں ایسے سمجھدار آدمی موجود ہیں جو پرانی بیہودہ رسموں کو برا جانتے ہیں شادی اور غمی میں جو بے دریغ روپیہ صرف ہوتا ہے اس کو محض فضول اور لغو بلکہ گناہ اور معصیت سمجھتے ہیں۔ جو لوگ ایسے موقعوں پر سودی روپیہ قرض لے کر خرچ کرتے ہیں ان پر نہایت افسوس کے ساتھ ہاتھ ملتے ہیں مگر جب ویسا ہی موقع خود ان کو پیش آتا ہے تو آنکھیں بند کر کے اسی اندھے کنوئیں میں آپ بھی کود پڑتے ہیں جس میں اوروں کو گرتے دیکھ کر افسوس کرتے تھے۔ اکثر لوگ لڑکیوں کی تعلیم کو نہایت ضروری سمجھتے ہیں اور دل سے اس بات کے خواہاں ہیں کہ ان کی تعلیم کا کسی مناسب اور قابل اطمینان طریقے سے رستہ نکلے۔ اس باب میں لوگوں کی ترغیب اور تحریص کے لئے کتابیں اور رسالے تصنیف کرتے اور اخباروں میں مضامین لکھتے ہیں مگر عملی طور پر کوئی کارروائی ان سے نہیں ہو سکتی اور زبانی جمع خرچ کے سوا وہ کوئی عملی کرشمہ نہیں دکھا سکتے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ عملی قوت ہم میں باقی نہیں رہی۔

ہم میں ہزاروں بلکہ لاکھوں ایسے ہیں جو تنگیٔ معاش کے سبب نہایت حیران و پریشان ہیں اور چاہتے ہیں کہ جس حیلے سے روٹی میسر آئے وہ طریقہ اختیار کریں۔

بعضے بیوپار کرتے یا دوکان کھول کر بیٹھتے ہیں، اگر اپنے پاس کافی سرمایہ نہیں ہوتا تو چند اور اشخاص کو بھی اپنے ساتھ شریک کر لیتے ہیں لیکن سوا ان لوگوں کے جو قدیم سے تجارت پیشہ رہے ہیں باقی سب ہمیشہ نقصان اٹھاتے ہیں، دوالہ نکالتے ہیں، مقروض ہوتے ہیں اور پھر کبھی بھول کر بیوپار یا دوکان کا نام نہیں لیتے۔ بعضے کھیتی میں قسمت آزمائی کرتے ہیں۔ بعضے صیغۂ تعمیرات سرکاری میں ٹھیکے لیتے ہیں۔ بعضے پریس جاری کرتے ہیں۔ بعضے اخبار نکالتے ہیں۔ مگر جہاں دیکھیے اخیر نتیجہ ہمیشہ ناکامی، خسارہ اور مایوسی ہوتی ہے۔ اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عملی قوت ہماری قوم میں باقی نہیں رہی۔

اگر کسی خاندان میں حسن اتفاق سے ایک کماؤ پیدا ہو جاتا ہے تو تمام خاندان اس کے سہارے پر فکر معاش سے فارغ البال ہو جاتا ہے۔ ایک کماتا ہے اور بیس کھاتے ہیں۔ ایک شکاری ہے اور بیس اس کے فضلہ خوار ہیں۔ وہ کماتے کماتے تھک جاتا ہے مگر یہ کھاتے کھاتے نہیں تھکتے۔ کھاتے ہیں اور غراتے ہیں۔ مرغی اپنی جان سے جاتی ہے اور کھانے والوں کو مزہ نہیں آتا۔ یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ ہم میں قوت عمل باقی نہیں رہی۔

آٹھ برس سے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس مختلف شہروں میں صرف اس لئے ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی ترقی کی جو تدبیر کسی کے ذہن میں آئے وہ اس کو مجمع عام میں پیش کرے اور جو تجویز بعد بحث و مباحثہ کے اتفاق یا کثرت رائے سے صائب اور معقول قرار پائے اس سے عام مسلمانوں کو مطلع کیا جائے تاکہ جو باتیں ان کے کرنے کی ہوں ان کو عمل میں لائیں لیکن آج تک کانفرنس کی ایک صلاح پر بھی غالباً کسی نے عمل نہیں کیا بلکہ بجائے اس کے کہ خود اپنے دل میں شرمندہ ہوں الٹے کانفرنس کی کارروائیوں پر نفریں کرتے ہیں اور اس کو محض لغو اور بے سود بتاتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ جس طرح ان میں قوت عمل باقی نہیں اسی طرح وہ اپنے فرائض کو بھی نہیں سمجھ سکتے اور مثل جمادات کے اپنے آپ کو کسی تکلیف کا مکلف نہیں جانتے۔

ہماری قوم میں جو اس قابل ہیں کہ ترقی و تنزل کے مفہوم کو سمجھتے ہیں اور اپنے میں اور دوسری ترقی یافتہ اقوام میں ان کو کم و بیش فرق محسوس ہوتا ہے وہ دو حال سے خالی نہیں یا پرانے خیال والے ہیں یا نئے خیال والے۔ جو پرانے خیالات رکھتے ہیں اور قومی تنزل کے اخیر نتائج کا بخوبی اندازہ نہیں کر سکتے وہ اس حیلے سے سعی و کوشش کو بے سود بتاتے ہیں کہ دنیوی تنزل اور دنیوی ترقی سب ہیچ ہے۔ انجام دونوں کا فنا ہے۔ ہم کو صرف وہاں

کی فکر کرنی چاہیئے جہاں ہمیشہ رہنا ہے اور بس۔

نئے خیال والے جو ترقی و تنزل کی ماہیت اور اس کے نتائج سے بخوبی واقف ہیں اور دیگر اقوام کی ترقی اور اپنے تنزل میں جو نسبت ہے اس کو سمجھے ہوئے ہیں ان میں اکثر کا یہ قطعی فیصلہ ہے کہ مسلمانوں کی قوم ہرگز ابھرنے والی نہیں۔ اس کا ضعف کسی ایسے مرض کے سبب سے نہیں ہے جو روارت مادہ سے عارض ہوا ہو تاکہ اس کو قابل علاج سمجھا جائے بلکہ اس سبب سے ہے کہ اس میں حرارت غریزی باقی نہیں رہی اور اس لئے اس کو سنبھالنے کی کوشش کرنی محض بے فائدہ ہے۔

الغرض کیا پرانے خیال والے اور کیا نئے خیال والے دونوں عموماً سعی و کوشش کو عبث اور رائیگاں خیال کرتے ہیں۔ پہلے اس لئے کہ ترقی ضروری نہیں اور پچھلے اس لئے کہ ترقی ممکن نہیں۔ اسی طرح ہمارے بعضے گروہ کچھ نہیں کر سکتے اور بعضے کچھ کرتے نہیں اور یہ بہت بڑا ثبوت اس بات کا ہے کہ ہماری قوم میں عملی قوت باقی نہیں رہی۔

عملی قوت والوں سے وہ لوگ مراد نہیں ہیں جو محنت مزدوری اور پیشے یا حرفے کے ذریعے سے بُری بھلی طرح اپنا پیٹ پال لیتے ہیں۔ ایسے لوگ تو مردہ سے مردہ قوم میں بھی جب تک کہ اس قوم کے تھوڑے بہت افراد دنیا میں موجود ہیں ضرور ہے کہ پائے جائیں کیونکہ ؎

این شکم بے ہنر پیچ پیچ صبر ندارد کہ بسازد بہ ہیچ

نہیں بلکہ وہ لوگ مراد ہیں جو زمانے کی رفتار کے موافق نہ صرف باتوں سے بلکہ کاموں سے قوم کے لئے خود نمونہ بن کر اس کو ترقی کی طرف مائل کریں مثلاً معاشرت میں جو خرابیاں ان کو نظر آئیں صرف ان کی برائی اور مذمت کرنے ہی پر اکتفا نہ کریں بلکہ خود ان کو ترک کر کے قوم کے لئے ایک مثال قائم کریں۔ معاش کے وہ جائز ذریعے جو قوم کی اکثر جماعتوں میں معیوب گنے جاتے ہیں جیسے دوکانداری یا صنعت و دستکاری، ان کو خود اختیار کر کے ان جماعتوں کی جھجک دور کریں۔ تجارت کے وہ اصول جن کے ذریعے سے کم مقدور آدمی بھی بڑی بڑی تجارتیں کر سکتے ہیں، ان پر خود کاربند ہو کر قوم میں تجارت کا چرچا پھیلائیں۔ اسی طرح ترقی کی ہر شاخ میں خود کچھ کر کے دکھائیں تاکہ اور لوگ بھی ان کی دیکھا دیکھی وہی رستہ اختیار کریں۔ تعلیم جو ترقی کی جڑ ہے اُس کی اشاعت میں دم سے، قدم سے، درم سے، قلم سے غرض ہر طرح کوشش کریں۔

مختصر یہ ہے کہ تعلیم یافتہ نوجوان جن کو ترقی کا مقدمۃ الجیش کہنا چاہیئے وہ اپنی اپنی قابلیت اور اپنے اپنے مذاق کے موافق ایسے کام اختیار کریں جو اولاً خود ان کے حق میں اور ثانیاً قوم اور ملک دونوں کے حق میں مفید ہوں۔

لیکن افسوس ہے کہ ایسے آدمی قوم میں نایاب ہیں اور اسی لئے ہم کو اس میں شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ ہمارے قوائے متحرکہ بالکل معطل اور بے کار ہو گئے ہیں۔ ہماری جرأت اور دلیری مفقود ہو گئی ہے۔ ہم میں ہمت اور اولوالعزمی کا نام و نشان نہیں رہا۔ ہم کہنے کو انسان ہیں لیکن جمادات سے بدتر۔ ہم بظاہر زندہ ہیں، لیکن حقیقت میں مردہ۔

پس ہماری قوم میں جن بزرگوں کو ترقی کا خیال ہے ان کو غور کرنا چاہیئے کہ یہ عام خاموشی اور سناٹا جو ہماری قوم میں ہر طرف نظر آتا ہے اور یہ مردنی جو ہمارے تمام طبقوں پر چھائی ہوئی ہے آیا یہ محض ایک اتفاقی بات ہے جس کا کچھ فکر نہیں کرنا چاہیئے بلکہ ایک دوسرے اتفاق کا منتظر رہنا چاہیئے جس سے تمام قوم کی حالت خود بخود بدل جائے؟ یا ایسا نہیں ہے بلکہ یہ وبائے عام نہایت زبردست اور قوی اسباب سے تمام قوم میں پھیلی ہے اور جب تک کہ نہایت زبردست تدبیروں سے اس کا تدارک نہ کیا جائے گا اور آئندہ نسلوں کی تعلیم میں عملی تربیت کی روح نہ پھونکی جائے گی اس وقت تک مسلمانوں میں قومی زندگی پیدا ہونی دشوار ہے۔

"منقول از مقالات حالی"
شائع کردہ انجمن ترقی اردو

تحفۃ الاخوان

(اقتباسات)

نیند غفلت کی ہے سرتا سر مسلط قوم پر
سب کی آنکھیں ہیں کھلی، سوتے ہیں لیکن بے خبر

مصر کی ممیاں ہیں سب گویا نہیں جن میں حیات
گو وہ جیتے جاگتے آتے ہیں ظاہر میں نظر

خاندانوں کو رہا ہے پیٹ دورِ روزگار
آج بگڑا یہ گھرانا، اور کل اجڑا وہ گھر

پر نگاہِ بد کی جو زد میں نہیں آئے ابھی
جانتے ہیں دورِ گردوں کا نہیں ہم تک گذر

بھیڑیا نوبت بہ نوبت گوسفندوں کو شکار
کر رہا ہے، اور نہیں کچھ گوسفندوں کو خبر

ہم جو بنتے بھی ہیں تو اکثر بگڑنے کے لئے
گرتے ہیں بانسوں ابھرتے ہیں اگر بالشت بھر

قوم کو اپنے تنزل سے ابھرنے کی امید
اہلِ علم و اہلِ دولت سے بہت کچھ تھی، مگر

اہلِ دولت کا ہے اس عالم سے اک عالم جدا
عالمِ بالا سے بھی ہے جو کئی منزل ادھر

جن دعاؤں کی پہنچ ہے عالمِ بالا تک
ان دعاؤں کا نہیں ڈیوڑھی تلک ان کی گذر

اب رہے عالم، سو اتنا وقت ان کو کہاں
دین کا پھر کون ہے دنیا میں وہ الجھیں اگر

کون جا کر چین میں پھر دین کی دعوت کرے؟
کون گمراہوں کی لے جاپان میں جا کر خبر؟

حجتِ حق کون لندن میں کرے جا کر تمام؟
کون برلن میں کرے تبلیغ قرآن و خبر؟

کون ہے ان کے سوا اسلام کے فرقوں کو جو
مل کے آپس میں نہ ہونے دے کبھی شیر و شکر

ان کی غفلت کا وہ عالم، ان کی فرصت کا یہ حال
ہو یہ بیڑا کیوں نہ پھر منجدھار میں زیر و زبر

ہیں یہی گر قوم کے ساتھ آج بے پروائیاں
تو یہ سن لو تم کہ کل ہیں کھڑی رسوائیاں

ایسے کچھ بیٹھے ہیں فارغ یا رب کھولے کمر
جو مہم درپیش تھی وہ کر چکے گویا کہ سر

قوم میں تعلیم پھیلانی تھی سو پھیلا چکے
ہو گیا وہ بیج جو بویا تھا نخلِ بارور

پر جو سچ پوچھو تو ہم اب تک اسی منزل میں ہیں
باندھ کر اٹھے تھے جس منزل سے احرامِ سفر

روشنی تعلیم کی کچھ کچھ جو یاں پاتے ہو تم
سب یہ جگنو کے سے چمکارے ہیں اے اہلِ نظر

ہے جہالت کا اندھیرا ہم پہ جو چھایا ہوا
اس اندھیرے ہی میں آتے ہیں یہ سب جلوے نظر

سارے ہو جاتے ہیں چمکائے ابھی کافور یہ
اس اندھیرے سے ذرا نکلو اجالے میں اگر

ہم نے یہ مانا کہ تھے ہم جو زمیں پکڑے ہوئے
اس سے آگے کچھ قدم ہم نے بڑھایا ہے مگر

دیکھنا یہ ہے کہ اوروں سے ہے کیا نسبت ہمیں؟
اور بڑھتے ہیں گزوں، بڑھتے ہیں ہم گر انچ بھر

جبکہ ٹھیری ہم میں اور اوروں میں یہ نسبت، تو ہم
اتنے ہی یاں گھٹ رہے ہیں بڑھ رہے ہیں جس قدر

پست ہے ہمسر سے جو اپنے، یہ سمجھا دو اسے
خاک ہے وہ، گو کہ ہے پہونچا ہوا افلاک پر

اپنی پستی کے نشاں پاتے ہیں ہر منزل میں ہم
کیا تجارت، کیا صناعت، اور کیا علم و ہنر

کھل رہے ہیں جو کلوں کے کارخانے ملک میں
جن کے مالک ہیں وطن کے اہلِ ہمت سربسر

جو کہ ہیں ملکی ترقی کے لئے اک فالِ نیک
جن میں امیدیں ہیں مثلِ روزِ روشن جلوہ گر

قوم کا حصہ نہ واں پاؤ گے تم اس کے سوا
شام کو قلیوں کی اک فوج آئے گی تم کو نظر

کون سا پستی کا حصہ اب رہا ہے اس کے بعد؟
یہ وہ پستی ہے کہ بس تحت الثرا ہے اس کے بعد

ہم نے مانا ہے موافق جن سے دورِ ماہ و سال
بھاگوان ایسے بھی ہیں اس قوم میں، پر خال خال

چند جانیں بچ رہی تھیں جو کہ قومِ نوح میں
ساٹھ ملین میں ہے وہ ان بھاگوانوں کی مثال

ان کی کیا عزت ہے یارو؟ قوم ہے جن کی ذلیل
ان کو کیا راحت ہے؟ جن کی قوم ہے سب خستہ حال

ہے وہ ایسا، غول میں قلیوں کے جیسے ایک میٹ
ہے ہزاروں مفلسوں میں ایک اگر آسودہ حال

شال گدڑی سے ہے واں سو مرتبہ بدتر جہاں
ہوں ہزاروں گدڑیاں اور ایک کے کاندھے پہ شال

یاد رکھو! ہے فراخ اسلام کا دامن بہت
دی ہے بنیادِ اخوت اس نے کل امت میں ڈال

ہیں اسی امت میں جو ڈھوتے ہیں دن بھر ٹوکری | ہیں اسی امت میں جو ہیں دھونکتے دن رات کھال
ہیں انھیں میں جن کے سینے میں نہیں آیا سماں | جب سے آنکھ ان کی کھلی دیکھا ہے گھر میں اپنے کال
ہیں انھیں میں جو کہ بہر نفقۂ فرزند و زن | سامنے ایک ایک کے پھیلاتے ہیں دست سوال
ان عزیزوں کی اخوت سے جنھیں آتا ہو ننگ | نام لیں فہرست سے اسلام کی اپنا نکال
ورنہ ذلت سے نکالیں ان کو، اور یہ جان لیں | ان کی ذلت میں انھیں عزت سے رہنا ہے محال
گھر میں اپنے بیٹھ کر جو چاہے سو بن لے کوئی | غیر قوموں میں نہیں حاصل اسے جز انفعال
کہتے ہیں غیر اس کو، ہم جنسوں میں اجلا دیکھ کر | یہ وہی کوا ہے لیکن ہنس کی چلتا ہے چال

وہ یہی خطرہ ہے جس کے ڈر سے مال و جان سب
کر رہے ہیں اپنی قوم پر قربان سب

"منقول از کلیات نظم حالی"
مرتبہ شیخ محمد اسمٰعیل صاحب پانی پتی

رُوحِ مسحُور

فرانس کے شہرۂ آفاق سحر نگار روماں رولاں کی تازہ ترین تصنیف ایک مسلسل ناول ہے جو بستہ بستہ چھ جلدوں میں The Soul Enchanted ("روح مسحور") کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس معرکۃ الآرا ناول کی جان ایک عورت اینٹ ریویر کی سیرت کشی ہے جس میں فطرت انسانی کے اس رمز شناس نے اپنے آرٹ کا پورا اعجاز دکھا دیا ہے۔ اینٹ کا بچپن اور عہد شباب گھر کی محفوظ چار دیواری میں بسر نہیں ہوا بلکہ بہت سی شورشوں، طغیانیوں اور طوفانوں میں سے گذرا ہے۔ اگر وہ معمولی مٹی کی بنی ہوئی ہوتی تو اس بحر پر آشوب میں اس کی شخصیت تنکے کی طرح بہہ جاتی لیکن اس کو فطرت نے یہ صلاحیت بخشی ہے کہ وہ ہر تجربے سے خواہ وہ کتنا ہی تلخ اور ناگوار کیوں نہ ہو اپنی سیرت کی تعمیر کرتی ہے۔ اس کی نظر زیادہ وسیع، اس کا دل زیادہ حساس، اس کا دماغ زیادہ روشن ہوتا جاتا ہے۔ اپنی لغزشوں اور کمزوریوں کی بدولت اس کی نظر فطرت انسانی میں زیادہ گہری ہو جاتی ہے اور اس کی نگاہ ان پردوں کو چیرتی ہوئی چلی جاتی ہے جن میں ہم اپنی روح کی واردات کو پوشیدہ رکھنا چاہتے ہیں اس کا عمل اس اصول پر ہے کہ

درماں ز درد ساز اگر خستہ تن شوی
خوگر بہ خار شو کہ سراپا چمن شوی

اس ارتقائے پیہم کا نتیجہ یہ ہے کہ جب وہ زندگی کے نصف النہار سے گذر کر شام کی طرف مائل ہوتی ہے تو ہم اس کے دل اور دماغ کو ان غیر معمولی خوبیوں سے مالا مال پاتے ہیں جو عافیت کی زندگی کا ثمر نہیں ہوتیں بلکہ دنیا کے گرم و سرد اور تلخ و شیریں تجربات کو جھیلنے سے پیدا ہوتی ہیں اس کے دل میں اتنی وسعت ہے کہ سارے جہان کا دکھ درد اس میں سما جائے۔ اس کی روح میں انسانی آزادی کے لئے تڑپ ہے جس کی وجہ سے وہ تمام عمر ایک مجاہدانہ زندگی بسر کرتی ہے اور

ن تمام قوتوں اور تحریکوں کے خلاف جنگ کرتی ہے جو موجودہ یورپ میں انسانی ضمیر کی آزادی کا
ون کررہی ہیں اور حق پرستوں اور انصاف دوستوں کے لئے عرصۂ حیات کو تنگ کررہی ہیں۔ مگر
س کی سیرت کی سب سے زبردست خصوصیت اس کی بے پناہ اثر آفرینی ہے۔ جو شخص، مرد،
عورت، جوان، بوڑھا اس کے اثر میں آجاتا ہے اس کے رنگ میں رنگ جاتا ہے۔ وہ نہ صرف
سونے کو کندن بنا دیتی ہے بلکہ کچے لوہے کو بھی فولاد میں تبدیل کر دیتی ہے۔ اس سے ٹکرا کر پتھر
سے شرارے نکلنے لگتے ہیں۔ اس کے خالق مجازی نے اس کی محبوب سیرت میں انسانیت اور
قیادت کے بہترین جوہر جمع کر دئے ہیں :-

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پُرسوز
یہی ہے رخت سفر میر کارواں کے لئے

شاہراہ زندگی پر اس کو جو دوست اور عزیز ملتے ہیں وہ ان کی فطرت پر اپنی آزاد روح کے
آتشیں نشان ثبت کرتی چلی جاتی ہے۔ انھیں میں سے ایک دوست ایک نامور سائنس داں
جولین ہے جس کی سیرت کا ارتقا مختصر طور پر ذیل کے ترجمے میں دکھایا گیا ہے۔ تیس سال قبل
اس کی نسبت اینٹ سے قرار پائی تھی لیکن اس وقت تک اس کا دل و دماغ سماجی بندشوں
اور تعصبات کا غلام تھا۔ اس نے اپنی خوش نصیبی کو نہ پہچانا اور سوسائٹی کے اعتراضات اور
ناراضگی کے خوف سے اینٹ کو ہاتھ سے کھو دیا۔ لیکن اینٹ کے اس اثر کو کیا کرتا جو نہایت
خاموشی کے ساتھ دن کی پھیلتی ہوئی روشنی کی طرح، بغیر اس کے علم کے، اس کی روح کے اندر
سرایت کر گیا تھا۔ چونکہ زمین سنگلاخ تھی اور اس پر بہت کچھ خس و خاشاک اور اینٹوں پتھروں کا
انبار تھا اس لئے ان بے باک بیجوں کو پھوٹنے اور اگنے میں عرصہ لگا جو اینٹ نے اس کی طبیعت
میں بو دئے تھے لیکن وہ رفتہ رفتہ ظاہر ہو کر رہے۔ مندرجہ ذیل صفحات سے کچھ اندازہ ہوگا کہ
کس طرح یہ قدامت پرست، روایت پسند، کمزور دل کا سائنس داں اپنے زمانے کی ایک
متحرک اور حرکت آفریں قوت بن گیا۔

جن حضرات نے روماں رولاں کی تصانیف کا مطالعہ کیا ہے انھیں اندازہ ہوگا کہ اس کی تحریر میں ایک خاص انداز گریز ہے جس کی وجہ سے ترجمہ میں بہت دقت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ جذبات خیالات اور واقعات کی طرف نہایت لطیف اور خفیف اشارے کرتا ہوا گذر جاتا ہے اور اکثر خیالات کے منطقی تسلسل کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ لہذا اس ترجمے کی خرابیوں اور نقائص کی ذمہ داری زیادہ تر تو میری ذاتی نا قابلیت پر ہے لیکن ایک حد تک اس کا سبب مصنف کا مخصوص انداز تحریر بھی ہے جس میں ایک شان دل آویزی ضرور ہے لیکن اس میں وضاحت سے زیادہ طائر خیال کی سبک رفتاری اور بظاہر بے راہ روی کا اظہار ہوتا ہے۔

یہ ترجمہ "روح سحور" کی پانچویں جلد Combat (جنگ) میں سے کیا گیا ہے۔

خواجہ غلام السیّدین

جولین نے کبھی آرام نہیں لیا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جنھیں آرام لینا آتا ہی نہیں، کام کئے بغیر اس کا جینا محال تھا۔ روزی کمانے کے لئے نہیں بلکہ اپنی ذہنی زندگی کی تشفی کے لئے اس کو کام کرنا لازم تھا۔ اس شدید دماغی محنت نے اس پر دوسرے خیالات کی راہیں بند کر دی تھیں مگر اچھی طرح بند نہ کی تھیں کیونکہ کبھی کبھی دروازہ کھل جاتا اور ہوا کے جھونکے اندر آجاتے اور جولین اچھی طرح گرم نہ ہو پاتا تھا۔

لیکن اب وہ اپنے پرانے مکان میں آگ کے سامنے بیٹھا سردی سے نہیں کانپتا تھا جیسا اس زمانے میں اس کا حال تھا جب اس کی اینٹ سے راہ و رسم تھی۔ وہ ماضی کے گھر سے باہر نکل آیا تھا اور اس نے طبقۂ متوسط کے تمام تعصبات کو بھاری کپڑوں کی طرح اتار کر پھینک دیا تھا۔ اینٹ نے اس کی کتابوں کو پڑھا تھا اور اس کی حقیقت شناس آنکھوں کے سامنے اپنے اس پرانے دوست کی فطرت بے نقاب ہو گئی تھی۔

پینتیس سال کی عمر میں اس متوسط طبقہ کے فرانسیسی کے لئے، جو فطرتاً ڈرپوک اور بزدل تھا، جس کے بچپن پر اس کی سخت گیر اور مطلق العناں ماں کی حکومت مسلط رہی تھی جس کے خوش عقیدہ، قدامت پرست مذہبی خاندان کے صدیوں پرانے اخلاقی اور روحانی عقیدوں نے پرانے لباس کی طرح اس کے دماغ کو جکڑ دیا تھا،

اپنے نفس کا اس قدر مکمل اور تدریجی محاسبہ کرنا بڑی جرأت کا کام تھا۔ مگر اس نے بغیر اپنے نفس کو دھوکا دئے ایک ایک کر کے ان تمام چیزوں کو اتار پھینکا تھا جن پر اس کو پہلے عقیدہ تھا لیکن وہ اس امتحان میں باطل ثابت ہوئی تھیں۔ یہ ضرور ہے کہ اس حرکت کے بعد انسان کو اپنی عریانی کا شدید احساس ہوتا ہے اور وہ سوچتا ہے کہ خود کو کس طرح ان لوگوں کو دکھائے جنھوں نے اسے انھیں جھوٹوں میں ملبوس دیکھا ہے جن میں وہ اپنی عریانی کو ڈھانپے رہتے ہیں، جو ساری دنیا کی عریانی دیکھنے کو تیار نہیں ہوتے، جو اپنی روح کی اصلی صداقت کو دیکھ کر خوف زدہ ہو جاتے ہیں اور اسے مثل پوشیدہ اعضا کے انجیر کے پتے سے ڈھانک لیتے ہیں۔

جولین کی حالت اس وجہ سے زیادہ نازک تھی کہ وہ ان کم مایہ تارکین مذہب میں سے نہیں تھا جو ایک عقیدہ کو آسانی سے ترک کر کے دوسرے کو آسانی سے اختیار کر لیتے ہیں اور "آزاد خیالی" اور لامذہبی کے جذبات کی خدمت کرنے لگتے ہیں۔ وہ بازار میں تنہا کھڑا تھا اور سرد ہوا کے جھونکوں میں اس کا جسم عریاں تھا۔ یہ بڑی کٹھن آزمائش تھی لیکن یہ شخص باوجود اپنی طبیعت کی کمزوری کے اپنے راستے سے نہیں ہٹا۔ خدا کا شکر ہے کہ اس کے گھر والے ایسے تھے جنھیں اس کی ذہنی کشمکش میں کوئی دلچسپی نہیں ہوئی۔ (یہ بڑی محرومی ہے کہ کسی شخص کو کوئی ایسا رفیق نہ ملے جس سے وہ آتش دان کے سامنے بیٹھ کر تبادلۂ خیال کر سکے۔ لیکن اس میں آسودگی بھی ہے کیونکہ اس شخص کا کیا حال ہوگا جس کو اپنی زندگی کے ہر لمحہ میں ایسے شخص کے ساتھ نباہنا پڑے جو اس کے خیالات اور عقائد سے دشمنی رکھتا ہو؟) اس کی ماں نے اپنے انتقال سے کچھ عرصہ پہلے اس کی شادی ایک تندرست "سلیم العقل" عورت سے کر دی تھی جو صاحب جائداد تھی، خاصی خوبصورت تھی، گھر کا انتظام اچھا کرتی تھی لیکن مذہب نا آشنا بھی اور باقی ہر اعتبار سے ناقابل! اور اس کا دماغ ہر قسم کی کاوش اور جستجو سے اس درجہ بے نیاز تھا جو اس کی قسم کی عورتوں کے لئے بھی غیر معمولی بات تھی۔ وہ کبھی کتاب کو کھول کر نہ دیکھتی تھی۔ شادی سے پہلے نوجوانی کے زمانے میں اس نے خانقاہ کے مدرسے میں بہت سی کتابوں کو مجبوراً پڑھا تھا اور ان کو پڑھتے ہوئے بارہا جمائیاں لی تھیں۔ اب وہ ان سے اس درجہ اکتا گئی تھی کہ اس کے خیال میں شادی کا ایک بڑا فائدہ یہ تھا کہ وہ اطمینان کے ساتھ انھیں معطل کر سکتی تھی۔ اسے یہ شکایت نہ تھی کہ اس کا شوہر اپنی زندگی کاغذوں اور کتابوں میں بسر کرتا ہے۔ مردوں کے اپنے کاروبار ہوتے ہی ہیں، اسے ان میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔

اسے نہ اپنے شوہر سے بہت محبت تھی نہ نفرت ۔ اسے روز کھانے کی میز پر اور شب خوابی کے وقت اس کی صحبت ناگوار معلوم نہ ہوتی تھی لیکن خدانخواستہ زیادہ باعث مسرت بھی نہ تھی ۔ وہ طبعاً کافی حریص تھی اور جولین میں حرص کا مادہ نہ تھا ۔ مختصر یہ کہ اسے اپنے شوہر سے معمولی محبت تھی لیکن اتنی نہیں کہ اسے یہ کرید پیدا ہو کہ اس کے دل و دماغ پر کیا واردات گذر رہی ہیں ۔ اس کے خانگی فرائض میں یہ چیز شامل نہ تھی کہ وہ اس بند الماری کی جھاڑ پونچھ بھی کرے ۔

اسے شاید اس روحانی زلزلے کی مطلق خبر نہ ہوتی جس نے اس کے شوہر کو پینتالیس سال کی عمر میں اُس قناعت شعار جمود سے جھنجوڑ کر بیدار کر دیا تھا جو "معقولیت پسند" لوگوں کے بنائے ہوئے نظام معاشرت و مذہب کو بے چون و چرا تسلیم کر لیتا ہے لیکن اس کے نیک نیت دوستوں اور اس پادری نے جو اس کا اعتراف سنا کرتا تھا اس کو واضح طور پر یہ بتایا تھا کہ ایک نیک عیسائی بیوی کا کیا فرض ہونا چاہیے اگر اس کا شوہر اپنی مثال اور عمل سے اپنی جماعت کی روحانی رسوائی کا باعث ہو ۔ اب بیوی نے میاں کے سامنے رقت وزاری اور بحث و احتجاج شروع کیا ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گھر کا امن تو برباد ہو گیا لیکن نظام اخلاق کو اس سے کوئی فائدہ نہ پہنچا کیونکہ ظاہر ہے کہ بیچاری نیک نیت کانسٹنس مطلق یہ نہ سمجھتی تھی کہ اس کے شوہر کا جرم کیا ہے ۔ لہذا اس کی گفتگو کے ذریعے اس کی اصلاح ہونا ناممکن تھا ۔ وہ لوگوں سے ان تمام معاملات میں بہت درشتی سے پیش آتا تھا جن کا تعلق اس کی آزاد خیالی سے ہو ۔ اور اس عنوان پر اس کی بیوی کی حماقت اس قدر صراحت کے ساتھ ظاہر ہوتی تھی کہ وہ اس کی پردہ پوشی کرنے سے قاصر تھا ۔ اسے خود بھی کبھی کبھی اپنی حماقت کا دھندلا سا احساس ہوتا تھا لیکن اور سب بیوقوفوں کی طرح اس کی حماقت نے اس کی ضد میں اور اضافہ کر دیا تھا ۔ خدا جانے اس معاملے کا کیا حشر ہوتا اگر اس کے پادری نے جو اس سے زیادہ مصلحت شناس تھا اُسے خاموشی کی ہدایت نہ کر دی ہوتی ۔ کیونکہ اسے یہ اندیشہ تھا کہ کہیں ناعاقبت شناس طریقہ پر مذہب کی حمایت کر کے وہ کوئی فضیحہ رسوائی پیدا نہ کرے ۔ وہ اپنے حجرہ میں بیٹھا اس مصیبت زدہ بیوی کی رقت اور پریشاں بیانی کو سنتا تھا اور اس کی بے ریا شکایات اور اندیشہ ناک نیک نیتی کو روکنے کی کوشش کرتا تھا ۔ اس عورت کو جسے عمر میں پہلی دفعہ حوادث نے بے فکری کی جنت سے نکال دیا تھا، وہاں دوبارہ واپس پہنچانا ضروری تھا ۔ اسے اس مقصد کی تحصیل میں زیادہ مشکل نہیں ہوئی کیونکہ اس نے

آسانی سے یہ بات تسلیم کرلی کہ خدا اس کو اس کے شوہر کی بداعمالیوں کے لئے ذمہ دار نہیں ٹھہرائے گا اور گمراہوں سے بحث ومباحثہ کرنے اور ان کی تردید کرنے میں یہ اندیشہ ہے کہ مبادا وہ اپنی ضد میں اور زیادہ شدت کے ساتھ مبتلا ہو جائیں۔ اس کا سب سے زیادہ ضروری فرض یہی ہے کہ وہ خدا سے اس بدنصیب شخص کی نجات کے لئے دعا مانگے۔ باقی خدا کے اختیار کی بات ہے۔ ("باقی" کا مطلب یہ تھا کہ آیا خدا اس کو عذاب ابدی میں گرفتار کرے گا یا نہیں! کانشنس دل سے یہ چاہتی تھی کہ ایسا نہ ہو لیکن اگر ایسا ہونا ہی ہے .... تو بہتر ہے کہ اس کا خیال ہی نہ کیا جائے۔ انسان کی اپنی مصیبتیں کیا کم ہیں!)

جب اپنی بیوی کے مایوسی اور مظلومی کے انداز سے متاثر ہو کر جولین نے، جس کو اپنے فعل کے نتائج پر کسی قدر پشیمانی ضرور تھی، چاہا کہ اپنے خیالات کو بہت سادہ طریقے پر اسے سمجھائے جس طرح کوئی استاد کسی کم عمر اور کم سمجھ بچے کو کوئی بات سمجھاتا ہے تو اس نے اپنے سارے انداز سے خوف کا اظہار کیا گویا وہ کہتی ہو:-

"نہیں نہیں کون اس بیکار جھگڑے میں پڑے۔ اور فرض کرو یہ بات اس کی سمجھ میں آجائے تو کیسا زبردست حادثہ ہو؟ جیسے کوئی شخص جو برف کے پہاڑ پر چڑھ رہا ہو کسی ایسے بیوقوف کے ساتھ رسی میں بندھ جائے جو نیچے پھسل رہا ہو نہیں، آپ کی عنایت، میں اس کے ساتھ رسی میں بندھنے کو تیار نہیں۔ افسوس بیچارے جولین کے حال پر!"

اس نے کہا کہ مجھے کیوں سمجھاتے ہو۔ میں بیوقوف کیا سمجھوں گی (وہ اپنے بیوقوف ہونے پر دل میں خوش تھی اور فخر کرتی تھی .... "مبارک ہیں وہ جن کی عقل مفلس اور ہمت پست ہے") بے چارہ جولین! اور اس خیال سے کہ وہ غریب اکیلا تاریکی کے غار کی طرف پھسلا جا رہا ہے وہ اس بات کی انتہائی کوشش کرتی تھی کہ اس کے ساتھ عمدہ سلوک کرے، اس کی زندگی کو پرسکون اور خوشگوار بنائے، اسے اچھے اچھے کھانے کھلائے!

....

"اس دنیا کی زندگی میں تو غریب کو کچھ راحت مل جائے!"

جولین خوب سمجھتا تھا کہ اس کی رفیق زندگی کیوں اس کے ساتھ اس درجہ مہربانی کا سلوک کر رہی ہے لیکن اس کی بدولت اسے کم از کم اپنے گوشۂ تنہائی میں امن نصیب تھا۔ اس کے آتشدان کی آگ میں زیادہ

گرمی نہ تھی لیکن اپنے خیالات کے لبادے میں لپیٹ کر وہ اپنا کام بغیر کسی دخل اندازی کے انجام دے سکتا تھا۔ اسے زندگی سے زیادہ توقعات رکھنے کا کوئی حق نہ تھا کیونکہ اس نے اپنی زندگی کو تباہ کر دیا تھا، بے شک تباہ کر دیا تھا۔ یہ بات اس کی ذہن کی گہرائیوں میں ایک مبہم عقیدہ کی طرح مسلط تھی۔ وہ اس بات کی احتیاط کرتا تھا کہ اس جذبے کی تہ کو نہ ٹٹولے۔ اب کیا فائدہ؟ اسے ایک موقع نصیب ہوا تھا مگر اس نے یہی نہیں کہ اسے ہاتھ سے کھو دیا ہو بلکہ اس کو صریحاً مسترد کر دیا تھا۔ اس نے خود کو اس عورت سے چھڑا لیا تھا جس میں اس کی سچی رفیق حیات بننے کی صلاحیت تھی۔ سولہ برس تک اس کی داخلی زندگی، جس پر اس غیر موجود دوست کی حکمرانی تھی، لوگوں کی نظر سے پوشیدہ؛ اس کی خارجی زندگی، اس کی ازدواجی اور خانگی زندگی سے باہر (یا اس کے اندر) بسر ہوئی تھی۔ یہ محض اینٹ کے چہرے کی یاد یا اس کا جسمانی تصور نہ تھا (وہ بھی ضرور تھا لیکن یہ ذی فہم شخص دل کے معاملات میں کم نظر واقع ہوا تھا اور دوست کی جسمانی تصویر مدھم پڑ گئی تھی) جو اس کے دل و دماغ پر حاوی تھا بلکہ وہ آتشیں نشان جو اس نے اس کے دماغ کی تہ میں چھوڑا تھا۔ جولین کی اندرونی زندگی میں اس کی وجہ سے انقلاب پیدا ہو گیا تھا۔ ایک مدت گذر چکی تھی یعنی ۱۹۰۵ء سے آج تک اس کی آرینٹ سے ملاقات نہیں ہوئی تھی لیکن اینٹ کا اثر اس کی روح میں کارفرما تھا۔ حسرت و افسوس نے اندر ہی اندر اس کی روح کو اس سانچے میں ڈھال دیا تھا جو وہ اس کے لئے پسند کرتی تھی یا جولین کا اپنا خیال تھا کہ وہ اس کے لئے پسند کرتی۔

لہذا اپنی زندگی کی اس عظیم الشان جدوجہد اور اپنی آزاد خیالی کے لئے وہ اینٹ کا مرہون منت تھا۔ اس پوشیدہ تخمیر نے پانی کو شراب بنا دیا اور اس دماغ کے اندر جو گھر کی چار دیواری میں محدود تھا سارے عالم کائنات کے بے باک بیج بو دئے۔ ان کو زمین سے پھوٹ نکلنے میں کافی عرصہ لگا لیکن وہ خود اپنے دوستوں، عزیزوں اور ساتھیوں سے بہت پیشتر محسوس کرنے لگا تھا کہ آزادی کے بیج اس کی روح میں مکین ہیں۔ اسے ان کی نقاب کشائی کرنے کی جلدی نہ تھی۔ اس ابتدائی زمانے میں اس نے جس قدر کتابیں لکھیں سب سائنس کے مضامین پر تھیں۔ ان سے اس کے اجتہاد فکر کا ضرور پتہ لگتا تھا لیکن وہ تمام تر اصلاحی مسائل تک محدود تھیں۔ اس کی کیا وجہ تھی؟ مصلحت شناسی اور احتیاط؟ یا اپنے دوستوں اور عزیزوں

کا لحاظ جن کو یقیناً اس کے بے باکانہ اظہار خیال سے تکلیف ہوگی؟ یا اعلان جنگ کے لئے آمادہ نہ ہونا؟ یا اس کی فطری جھجک جو اس کو اپنی خودی کے پوشیدہ ترین رازوں کے متعلق اجازت گفتار نہ دیتی تھی؟ یا ممکن ہے کہ ان سب سے بڑھ کر اس کا باعث وہ رازداری کا جذبہ ہو جس کا تقاضا یہ تھا کہ وہ اپنے دل کے تمام گہرے اور بیش بہا معاملات کو جو اس کے اور اس کی روحانی زندگی کی خیالی شاہد یعنی اس کی غیر موجود اینٹ کے درمیان مشترک تھے احتیاط کے ساتھ پردہ خفا میں رکھے؟

مگر عجیب بات یہ ہے کہ اس نے اس درمیان میں اصلی اینٹ سے ملنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ وہ اس کا پتہ لگاتے ہوئے بھی ڈرتا تھا۔ اور یہ کوئی بڑی مردانگی کی بات نہ تھی یا اپنی پریشانی کے اندیشہ سے اس نے یہ بھی معلوم نہیں کیا کہ اینٹ کو کسی مصیبت یا محتاجی کی وجہ سے امداد کی ضرورت تو نہیں ہے۔ یہ بالکل ایسی بات تھی جیسے بعض "بہت کمزور دل کے لوگ" کسی جانور کو زخمی یا کچلا ہوا دیکھ کر منہ پھیر لیتے ہیں کیونکہ وہ نظارہ ان کے لئے بہت تکلیف دہ ہوتا ہے یا ممکن ہے تکلیف وہ ثابت ہو اور اسی سبب سے وہ اس کے زخم کی مرہم پٹی کرنے کی کوشش نہیں کرتے؟ ہم ایسے بے ہمت لوگوں کو خوب سمجھتے ہیں! وہ خود کو اس بات پر بہت ملامت بھی کرتا تھا کہ اس کا شمار ایسے لوگوں میں ہے۔ حالانکہ اُسے اپنی اس کمزوری کا علم ہے۔ اسے اپنی ان پرانی کمزوریوں کو دور کرنے میں کافی مدت لگی بلکہ درحقیقت وہ کبھی بھی ان پر پوری طرح قابو نہ پاسکا۔ گلدان کی تہ میں ذرا سا زنگ باقی رہ گیا تھا اور اس کے ناخن برابر اس کو کھرچتے رہتے تھے۔

زنگ ہر کسی میں ہوتا ہے، اینٹ میں بھی تھا۔ لیکن روح کی نجات دراصل اس میں ہے کہ پانی بہتا رہے اور زندگی کی نالیاں بند نہ ہونے پائیں۔ تازہ پانی ہو، نیا پانی ہو........ بدترین روحانی فساد وہ ہے جو تالاب کے بند پانی کی وجہ سے پیدا ہو جاتا ہے۔ بہتی ہوئی ندی تو اپنے برتن کو دھو کر صاف کر دیتی ہے۔ اینٹ کی ندی ہمیشہ بہتی رہی تھی۔ اس نے جولین کو جھنجوڑ کر اس کے معمولانہ جمود سے نکالا تھا اور اس روحانی جہنم سے نجات دلائی تھی جس میں وہ قناعت کے ساتھ پناہ گزیں ہو گیا تھا اور جس میں ہزاروں انسانی کیڑے مکوڑے نباتات کی سی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس نے خود دکھ اٹھا کر، اپنے جذبات کی شدت اور جوش سے اور اپنے تاریکی میں چمکتے ہوئے شعلے کے اثر سے اس میں حرکت پیدا کر دی تھی اور زندگی کے راز

اس پر کھول دئے تھے ۔

علاوہ اس کے (یہ بات قابل افسوس ضرور ہے لیکن سچ ہے) اس کا روحانی ارتقا بہت کچھ اس صدمہ کی بدولت ہوا تھا جو اس کی ذات سے اینٹ کو پہنچا تھا جب ہم اپنے محبوب کو بے جا دکھ پہنچاتے ہیں اور ہم میں اتنی قوت ہوتی ہے کہ اس کو شدت کے ساتھ محسوس کریں تو یہ علم ہماری روح کے لئے ایک پیغام بیداری بن جاتا ہے ۔ اس تجربے کے طفیل اور اپنی ندامت کی وجہ سے فطرت انسانی کو سمجھنے میں جولین کی نظر زیادہ گہری ہوگئی تھی، انصاف کا احساس قوی تر ہوگیا تھا ۔ اس کی فطرت کا ہر وقت یہ تقاضا تھا کہ اس نے ایک کو جو تکلیف پہنچائی تھی اس کی تلافی دوسروں کی خدمت کے ذریعہ کرے ۔ اینٹ نے اس کی طرف سے قرضہ ادا کیا تھا ۔ (اب اسے اینٹ کا قرضہ ادا کرنا تھا ۔)

جولین کا تعلق فرانس کے قدیم متوسط طبقے سے تھا جس میں بہت سی پرانی خرابیاں جڑ پکڑ گئی ہیں جو جمع کی ہوئی دولت کو بہت سختی کے ساتھ اپنی گرفت میں رکھتے ہیں لیکن یہی لوگ ادائے قرض کو اپنا فریضۂ مذہبی سمجھتے ہیں اور انھیں ہر وقت یہ فکر دامن گیر رہتی ہے کہ مرنے سے پہلے اسے ادا کر جائیں جب وہ اپنے کھیتوں میں چلتے پھرتے ہیں تو پرندوں کے گیت ان کو موسم بہار اور کیف محبت کی یاد نہیں دلاتے ۔ انھیں تو بٹیر کی آواز بھی یہی کہتی سنائی دیتی ہے :

"اپنے قرضے ادا کردو ، اپنے قرضے ادا کردو ۔"

جولین نے اپنا قرضہ ادا کردیا ۔

کون اس کا یقین کرسکتا تھا ؛ شاید اسے خود بھی اس کا علم نہ ہو لیکن واقعہ یہ ہے کہ انھیں قرضوں کو ادا کرنے کی وجہ سے اس نے خود کو جنگ عظیم کے زمانے میں اپنی مرضی کے خلاف اس معاشرتی کشمکش میں گھرا ہوا پایا جس کے خیال سے بھی اس کا جسم اور روح دونوں گریز کرتے تھے ۔ اس تہلکہ سے پیشتر جب اس کی غیر مفتوح روح اپنی خودی میں محصور اپنی قوتوں کو مجتمع کئے آزادی حاصل کرنے کے لئے جد و جہد کر رہی تھی ، تو اینٹ ، نظر سے پوشیدہ ، ہر وقت اس کے ساتھ تھی ۔ اس کو لب ہلانے کی ضرورت نہ تھی ۔ اسے یہ دکھائی دیتا تھا کہ وہ اس کے سامنے چلی جا رہی ہے اور وہ کبھی خود سے یہ سوال نہ کرتا تھا کہ

یہ راستہ اسے کہاں لے جائے گا۔ راستہ صرف ایک ہی تھا، وہ راستہ جس پر اس کے قریب ہی اینٹ کے سبک رفتار قدم اٹھ رہے تھے۔

اس کی تصانیف کا رجحان رفتہ رفتہ سائنس کی تاریخ اور فلسفہ کی طرف ہوتا جاتا تھا اور عمل اور ردعمل کے تسلسل سے اس کا دماغ ایک طرف تو خود کو دین مسیحی کی ان پیچ دار بیلوں سے رہا کرا رہا تھا جو اس کی نقل و حرکت کو روکتی تھیں اور دوسری طرف اسے خیالات کے ایک ایسے جنگل میں لے جاتا تھا جو نہ صرف مذہب کی حدود سے آگے نکل گیا تھا بلکہ اس کے زمانے کی سائنس اور عقلیت کی حدود سے بھی پرے تھا۔ یہ سفر ایسا ہی معرکہ خیز تھا جیسے واسکوڈے گاما کا سفر اور اس کے لئے بھی طوفان کی راس کا طواف کرنا ضروری تھا۔ ایک دفعہ لنگر اٹھانے کے بعد قیام کے لئے کوئی بندرگاہ نہ تھی محض ابر و باد اور موجوں کے رحم پر بھروسہ تھا۔ خشکی کو خیر باد کہنے کے بعد انسان کا وطن یا تو سمندر کی سطح ہے یا اس کی تہ!

کیتھولک مذہب کا لاطینی پیرو ایک دفعہ اپنے عقیدوں کو ترک کرنے کے بعد شک کے سمندر میں کبھی لنگر نہیں ڈالتا۔ وہ ان جرمنوں اور انگریزوں کی طرح ایک جگہ پر قائم نہیں ہوتا جو محض احتجاج کرتے ہیں، یا جنھوں نے مدت ہوئی پراٹسٹنٹ بن کر احتجاج کیا تھا۔ وہ تو سیدھا تہ کو پہنچنا چاہتا ہے اور تہ ہوتی ہی نہیں! وہ پانی کے نیچے اپنے لئے کوئی لکڑی کا پُل نہیں بناتا جو تاریک گہرائیوں کے اوپر معلق ہو مثل "مصلحوں" کے جو ہمیشہ آدھے کو مسترد کرتے ہیں اور آدھے کو قبول کر لیتے ہیں! وہ تنہا ہوتا ہے اور عریاں اور تیرتا چلا جاتا ہے۔ اس کو پانی پر سہارنے کے لئے صرف اس کے ہاتھ پاؤں ہوتے ہیں۔ اُسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ڈوبنے کا وقت آنے والا ہے لیکن وہ بچاؤ کے لئے کسی کا سہارا نہیں تکتا۔ ....

جولین نے خود کو عقل کی سخت گیر اور حقیقت شناس راہبری کے سپرد کر دیا تھا جو ناحق سے کوئی مفاہمت کرنے کو تیار نہیں ہوتی مثل ان لوگوں کے جو مروجہ عقائد اور سوسائٹی کی عائد کی ہوئی تمام بندشوں اور قیود کے سامنے اپنا سر تسلیم خم کر دینے کے بعد ان سے منحرف ہو جاتے ہیں۔ اسے دونوں سے ایسی شدید مخالفت پیدا ہو گئی تھی جو انصاف کی حدود سے بھی متجاوز تھی۔ وہ اس بات کو خود بھی سمجھتا تھا لیکن اس میں یہ صلاحیت نہ تھی کہ اس انتقام سے دست بردار ہو جائے۔ وہ خود کو ملامت کے طور پر "مرتد جولین" کہتا تھا۔

اوراس آرزوئے انتقام میں جوجلد اس کی تحریروں میں ظاہر ہونے لگی وہ دراصل خود کو سزا دے رہا تھا یعنی اس شخص کو جو وہ پہلے تھا۔

یہ بات پہلی مرتبہ اس کے فلسفیانہ مضامین میں رونما ہوئی۔ مذہبی گروہ نے یہ محسوس کیا کہ ان میں مذہب پر حملہ کیا گیا ہے۔ انھوں نے اس کے خلاف بہت شور وغوغا کیا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ چوٹ کاری لگی ہے۔ اس نے اور زیادہ چوٹیں کیں مگر چند تلخ اور شدید مقابلوں کے بعد ان لوگوں کو اندازہ ہوگیا تھا کہ مصلحت پسپائی اور خاموشی میں ہے (اس معاملے میں تمام "صحیح الخیال" اخباروں نے حیرت انگیز اتحاد عمل ظاہر کیا اور جولین کی تصانیف کا ذکر کرنا بھی چھوڑ دیا) مگر جولین اور اس کے قدیم ساتھیوں میں صاف صاف تفرقہ پڑگیا تھا۔ پرانے ملاقاتیوں سے سلام علیک اب بھی ہوتی تھی لیکن وہ کھلم کھلا ظاہرداری تھی۔ اس سے کسی کو دھوکا نہیں ہوسکتا تھا۔ پیشین گوئی کرنے والے کہا کرتے ہیں کہ "فوجوں کی تیاری جنگ نہیں ہے" لیکن وہ اس وقت ایک دوسرے کو دیکھ کر اطمینان کے ساتھ مسکراتے نہیں۔ جنگ ہونے والی ہے، جنگ آپہنچی! گھنٹہ بجنے کی دیر ہے.......

جولین کے مخالفوں نے غالباً خود جولین سے زیادہ واضح طور پر صورت حال کو سمجھ لیا تھا کیونکہ خود اسے ابھی پوری طرح اس انقلابی روح کا احساس نہیں ہوا تھا جو اس میں پوشیدہ تھی۔ جب موٹر کاریں ہر وقت سڑک کے کنارے کی عمارتوں کے بیچ میں سے شور مچاتی ہوئی گذرتی رہتی ہیں تو بغاوت کی "خودکلامی" پر خواب کی سی کیفیت طاری ہوجاتی ہے جیسے مسوڑوں کی تکلیف وہ بھڑک۔ وہاں چیز ہی کیا ہے جس پہ انسان اپنے دانت جمائے! لیکن یہ سکون فریب دہ ہے۔ جولین کو معلوم تھا کہ اس کی بے پناہ تنقید اس کے مردہ عقائد کی سطح کو توڑ کر سوسائٹی کے سڑے ہوئے خول تک پہنچ گئی ہے۔ اب اس کا فرض تھا کہ وہ اپنے نشتر سے اس پیپ سے بھرے ہوئے زخم کو اندر تک ٹٹولے لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے اس بات کو ثابت کرنے میں تاخیر کی کہ تمام نظام معاشرت اور اس کے بنیادی اخلاقی اصول بگڑ چکے ہیں اور تباہ ہونے والے ہیں۔ اگر وہ ایسا کرتا تو اسے اپنے لئے کوئی دوسرا مکان تلاش کرنا پڑتا اور چالیس سال تک ایک گھر کے اندر زندگی گذارنے کی وجہ سے اس کو نقل مکان کے خیال سے وحشت ہوتی تھی لیکن وہ

یہ بھی جانتا تھا کہ اسے پرانے مکان کو چھوڑنے کا نوٹس مل چکا ہے لیکن وہ تن بہ تقدیر اس مہلت کے ختم ہونے کا انتظار کر رہا تھا جب اسے مجبوراً وہاں سے جانا پڑے گا۔۔۔۔۔۔۔ علاوہ بریں ماضی کی اس کارواں سرائے میں ایک بہت بڑا بازار ایسا بھی تھا جس کی کنجی واپس کرنے کو اس کا دل نہ مانتا تھا اگر وہ اس کو کھول کر دیکھنے کے لئے اندر بھی نہ جاتا تھا۔ وہاں صدیوں سے خاک جمی ہوئی تھی اور اس نے اس خاک آلود مکان کے تمام دروازے اور کھڑکیاں بند کر دی تھیں۔ اس میں دن کی روشنی لانا اور جھاڑو دینا کہاں کی مصلحت ہے! وہ بڑا بازار وطن کا بازار تھا۔ ۱۹۱۴ء سے پہلے فرانسیسیوں کا صرف یہی ایک دیوتا تھا جس کے آگے سب سر جھکاتے تھے اور تمام دیوتاؤں پر زندگی کے عام قانون کی حکمرانی تھی یعنی مجموعی اور انفرادی موت کی، بڑھاپے کی بیماری کی، کیڑے مکوڑوں کی جو منبر کو کھا جاتے ہیں۔ سوائے وطن کے اور کوئی دیوتا ایسا نہ رہا تھا جس پر حملہ نہ کیا گیا ہو۔ مگر اس بارے میں مذہبی لوگ اور 'آزاد خیال' سب ہی متفق تھے بالخصوص آزاد خیال لوگ کیونکہ اس کے علاوہ ان بچاروں کو کہیں قدم جمانے کی جگہ تک نہ تھی۔ کیسی دردناک اور قابل رحم تھی یونیورسٹی کے استاد اعظم بوڑھے لیویس کی یہ فریاد: "اگر تم میرا وطن مجھ سے چھین لو تو میرے پاس کیا رہ جائے گا؟ پھر میں کا ہے کے واسطے زندہ رہوں گا؟"

افسوس ان بوڑھے آدمیوں پر جو آخری دن تک اپنی پہاڑیوں کی پرسکون مگر تنگ فضا میں بند رہے! ان کے لئے ضروری تھا کہ یہ زمین، جس میں ان کے تمام مردے پندرہ سو برس سے گڑے ہوئے تھے، ان کے قدموں کے نیچے ہو۔ ذرا ان کے "وطن" کو ہلا دو اور انھیں یہ معلوم ہوتا تھا کہ روئے زمین پر تہلکہ پڑ گیا۔ جن لوگوں کو کبھی زلزلے کا تجربہ ہوا ہے وہ جانتے ہیں کہ ایسے وقت میں تمام جانداروں پر کیسا عجیب اور ناقابل بیان کرب طاری ہو جاتا ہے۔ صرف ایک ہی اٹل نقطہ ہے جس پر انسان نے سب کچھ بنایا ہے۔ جب وہی ہٹ جائے یا ہل جائے تو باقی کیا رہا؟ چونکہ جولین کی حس غیر معمولی طور پر تیز تھی اس لئے اس نے زمین کی خوفناک گڑگڑاہٹ کو قبل از وقت محسوس کیا اور اس کی روح کو جس کا پرانا آسرا معرض خطر میں تھا ایک خاص قسم کا مبہم سا درد محسوس ہوا جسے وہ اچھی طرح نہ سمجھ سکتا تھا۔ اسی وجہ سے اس نے ادھر سے اپنی نظریں اور زیادہ ہٹا لیں۔ وہ خاموش کھڑا اندر ہی اندر کڑھتا تھا اور اپنے آخری بت کو جو باقی رہ گیا

تھا ہاتھ لگاتے ہوئے ہچکچاتا تھا۔ لیکن جن لوگوں سے اس نے قطع تعلق کر لیا تھا ان میں سے بعض ایسے تھے جو پادریوں کی طرح ضمیرِ انسانی کو سمجھنے میں مہارت رکھتے تھے۔ انھیں میں اس کا مرشدِ روحانی بھی تھا جو ایک ہوشیار اور معمر شخص تھا، جس کے ہونٹ والٹیر کی طرح پتلے تھے (لیکن اس کی آنکھوں میں برخلاف والٹیر کے طنز کے لئے گنجائش نہ تھی۔ وہ روح کے گھر میں کسی حیلہ سے یا ڈاکہ زنی کر کے گھس آتی تھیں۔) انھوں نے اس کی بغاوت کی اٹھان ہی سے سمجھ لیا تھا کہ اس خودسر باغی میں آتنی مصلحت شناسی نہیں ہے کہ مناسب اور غیر مناسب میں تمیز کر سکے اور وہ ضرور اس سب سے بڑے بت پر بھی ہاتھ ڈالے گا۔ وہ اپنے ہاتھوں کو اپنی لانبی آستینوں میں ڈالے صبر کے ساتھ اس حادثہ کا انتظار کر رہے تھے مگر وہ عطائی اتنے سمجھدار نہ تھے جنھوں نے جولین کو بھی اپنا سا ایک قابلِ اعتبار آزاد خیال سمجھا جس نے ان کے خیال میں "عبادت خانے" کے ساتھ محض "جلسہ گاہ" کی خاطر دغا کی تھی اور خود کو روایتی، قوم پرست، دنیا دار، واجب التعمیل اور متوسط طبقے کی ذہنیت کے ساتھ وابستہ کر لیا تھا۔ انھوں نے اس کے لئے مدرسۃ العلوم فرانس کے دروازے کھول دئے اور اس کو "علوم اخلاقی اور سیاسی کی اکیڈمی" کا ممبر بنا لیا اور وہ اس کے لئے صرف اسی ایک چیز کے منتظر تھے جو سب سے بڑھ کر ہے اور انسان کو "غیر فانی" بنا دیتی ہے (یعنی فرانسیسی اکیڈمی کی ممبری)، اس اعزاز کے لئے بعض ذی اثر ممبران اکیڈمی کی نظرِ انتخاب اس پر پڑ چکی تھی اور اس کے پرانے استاد نے بھی جس کا دردناک اور طفلانہ مقولہ ہم نے اوپر نقل کیا ہے، اُسے یقین دلایا تھا کہ دو تین سال کے اندر اندر اس کا انتخاب یقینی ہے۔ وہ اس بات کے لئے ذاتی طور پر کوشاں تھا۔ نہ معلوم کیوں اس بوڑھے آدمی کو جولین سے بہت محبت ہو گئی تھی۔ اس نے اپنی جماعت میں اس کا بچپن کا زمانہ دیکھا تھا، پھر اُسے یونیورسٹی کے طالب علم کی حیثیت میں بھی دیکھا تھا۔ بغیر اس کے خیالات کی گہرائیوں کو ٹٹولے ہوئے اُسے جولین کے چہرے سے انس پیدا ہو گیا تھا۔ جب وہ لکچر دیتا ہوتا تو اس کی آنکھوں کو یہ چہرہ جس میں نوجوانی کی سنجیدگی اور وفاداری جھلکتی تھی بھلا معلوم ہوتا تھا۔ استاد اور شاگرد کی آنکھوں آنکھوں میں جو ایک دوسرے پر مسکراتی رہتی تھیں اس طویل رفاقت کے دوران میں ایسی محبت کے مراسم پیدا ہو گئے تھے جیسی باپ بیٹے میں ہوتی ہے۔ بوڑھے استاد کو یقین تھا کہ جولین کی ذات میں اسے اپنا روحانی وارث مل گیا ہے اور جولین نے جو اس کا احترام کرتا تھا اور اس کا شکرگذار تھا کبھی

خود سے یہ سوال نہیں پوچھا تھا کہ وہ اپنے استاد کی توقعات پر پورا اترتا ہے یا نہیں۔

جب جنگ شروع ہوئی تو ملک کے اہل علم یعنی یونیورسٹی کے سربرآوردہ اراکین نے خود کو برضا و رغبت اپنے ملک کی خدمت کے لئے وقف کر دیا۔ دفتری ذہانت کے ہراول یعنی یونیورسٹی کے افسر اعلیٰ نے اپنے مخصوص شاگردوں کے لئے اس نئے نظام مدافعت میں جس کو وہ ترتیب دے رہا تھا ایک نمایاں جگہ تجویز کی۔ یعنی اہل علم کی ذہنی قوت جس کو پہلی مرتبہ فوجی لباس پہنایا جا رہا تھا اور جس کو عقلی گولہ بارود کے کارخانوں میں استعمال کرنا مقصود تھا۔ تاریخ، سائنس، قوت تقریر سب چیزیں اس کام میں مفید تھیں۔ اگر وہ جولین کو اسی معاملہ میں پس پشت ہی پڑا رہنے دیتا تو زیادہ قرین مصلحت تھا۔ وہ از خود محاذ جنگ پر نہ آتا اور غالباً اپنے بزرگوں، ہم چشموں اور معاصرین سے ان تمام نتائج پر بحث و مباحثہ نہ کرتا جو پڑھنے اور دستخط کرنے کے لئے وہ اس کے سامنے پیش کرتے۔ لیکن یہ کس قدر دور اندیشی کے خلاف تھا کہ اس سے یہ کہا جائے کہ تم ان سب دلائل اور نتائج کو گھڑنے میں شرکت کرو! یہ سچ ہے کہ وہ اپنے طور پر ایمانداری کا ثبوت دے رہے تھے! ان لوگوں کے جذبات قومیت اس قدر شدید اور مستحکم تھے اور انھیں اس قدر کامل یقین تھا کہ یہ جذبات حق کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں کہ اگر کبھی حق کا تقاضا یہ ہوتا کہ ان کے جذبات کی تردید کرے تو وہ بلا تامل حق کا گلا گھونٹ دیتے یا اس سے وہی کہلوا لیتے جو وہ چاہتے تھے۔ ضرورت صرف اتنی ہی تھی کہ شکنجہ پر کس کر اس کے اعضا کو ذرا کھینچ دیا جائے (اس بات کا کچھ تو اثر ہونا چاہئے کہ سوربون یونیورسٹی کے قائم کرنے والوں میں ایسے ماہرین علوم و فنون بھی تھے جو ان لوگوں پر سوالوں کی بوچھار کرتے تھے جن سے انھیں سچی بات قبول کرانی ہوتی تھی!) جولین اس فن کا ماہر نہ تھا۔ وہ سچ کی آواز سنتا تھا اور یہ نہ جانتا تھا کہ اس پر "جرح" کرنے کے کیا معنی ہیں۔ اس نے جرمنی کے جنگی مراسلات کا مطالعہ کر کے نہایت سادگی سے وہی رپورٹ لکھی جو ان سے مستنبط ہوتی تھی۔ بحث شروع ہوئی اور جب معلوم ہوا کہ اس کی رپورٹ اس کے ساتھیوں کے نتائج سے مختلف ہے تو ان کا باہمی اختلاف ظاہر ہو گیا۔ یہ اختلاف بہت صاف اور اچانک اور شدید تھا۔ جب بے احتیاطی سے کسی دماغی کام کرنے والے کی کوئی دکھتی ہوئی رگ چھیڑ دی جائے تو اسے غصہ میں سرخ نہیں بلکہ سفید نظر آتا ہے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ جب حرارت زیادہ بڑھ جاتی ہے تو آگ سرخ سے سفید ہو جاتی ہے۔ جب

جولین نے جنگ کے متعلق اپنے ایک دوست کے بیان کو سنا تو وہ ہونٹوں تک سفید پڑ گیا۔ اس نے اپنا ہاتھ زور سے میز پر مارا اور چلا کر کہا "مگر یہ تو سراسر جھوٹ ہے۔"

اس پر کیسا زبردست ہنگامہ برپا ہوا! اس نے جس شخص کی ہتک کی تھی وہ اس کا ایک عزیز اور محترم دوست تھا۔ حیثیت پروفیسر کے اس کی بڑی شہرت تھی۔ لوگ اس کی علمی قابلیت اور دیانتداری کی بہت قدر کرتے تھے۔ جولین نے فوراً ہی معافی مانگی اور گھبراہٹ میں الجھے ہوئے طریقے پر اپنی رائے کو سمجھانے کی کوشش کی تاکہ وہ اس کے ساتھیوں کو زیادہ قابل اعتنا معلوم ہو۔ لیکن جس چہرے پر اس کا طمانچہ پڑا تھا اس پر اس کا نشان ثبت ہو گیا تھا اور اس کی آنکھوں میں نہ مٹنے والی نفرت پیدا ہو گئی تھی۔ کوئی علمی کام کرنے والا کبھی اپنے ایسے ساتھی کو معاف نہیں کرتا جو اس کی ذات میں ان چیزوں کو دیکھ لے جنہیں وہ خود اپنے سے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتا ہو کیونکہ اب خواہ وہ کچھ کرے اُسے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ جو چیز دیکھنے سے وہ بچنا چاہتا ہے، وہ اس میں موجود ہے۔ جولین پر اپنے اس حریف سے بھی زیادہ ہیبت طاری تھی جس پر اس نے یہ ضرب کاری لگائی تھی۔ وہ تمام راستے دل میں یہ کہتا رہا "اور غضب یہ ہے کہ وہ دیانتدار ہے!" جولین جانتا تھا کہ وہ دیانتدار ہے۔ وہ اس بات کی تصدیق کے لیے سولی پر چڑھنے کو تیار تھا۔ بے غرضی کی زندگی، حق کی پرستش...... اس نے زہرخند کیا اور کہا "واہ رے ایماندار لوگوں کی صداقت!"

اس تجربے نے اس کی دنیا کو بالکل ہی درہم و برہم کر دیا۔ اب اس کو اپنی سخت مذہبی تعلیم کے اثرات کا احساس ہوا۔ جو لوگ بہت زیادہ محتاط ہوتے ہیں وہی اکثر مذہب سے قطع تعلق کر لیتے ہیں۔ ان کا خیال ہوتا ہے کہ وہ آزادی کے ذوق میں ایسا کر رہے ہیں لیکن دراصل اس میں پاکیزگی کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے اور تلاش حق کا وہ ذوق جو باطل کے ساتھ معاملہ کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔ اس کو خیال تھا کہ یہ چیز اُسے تہذیب سے باہر ذہنی آزادی کے مدعیوں میں مل جائے گی لیکن یہ وہاں بھی مفقود تھی۔ جولین نے اس لحاظ اور مروت کو دونوں ہاتھوں سے دھکیل دیا جس نے اب تک اس کے گرد و پیش کے ایماندار آدمیوں کی پردہ پوشی کی تھی اور معاملات پر بے لاگ طریقے سے تنقید شروع کر دی۔ اس زمانہ میں اس نے نہ معلوم اپنے کتنے ساتھیوں کو سپرد خاک کیا مگر اس میں اتنی جرأت نہ تھی کہ ان پر تعزیتی تقریریں بھی کرتا۔ اس نے اب تک ان کو اسی

قدر عزت کی نظر سے دیکھا تھا کہ ان کی ذلت اس کی اپنی ذلت تھی۔

اس لئے اپنے استاد سے بگاڑ کرنا سب سے زیادہ تکلیف دہ ثابت ہوا۔ کیونکہ یہ مفارقت بہت خاموشی کے ساتھ ہوئی جس طرح کوئی باپ بستر مرگ پر اپنی جان دے اور مرتے وقت درد انگیز اور ملامت آمیز نظر سے چپ چاپ اپنے بیٹے کو دیکھے۔ اس نے بغیر کسی اظہار ناراضگی کے جولین کی تحریر کو پڑھنے سے انکار کر دیا کیونکہ جب جولین اپنی مرضی کے خلاف ایک راستے پر ڈال دیا گیا تو وہ تلاش حق سے باز نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ اپنی تحریر کو لے کر اپنے استاد کے پاس آیا۔ اس نے کہا "نہیں، میں اسے نہیں دیکھوں گا۔ بالکل بے کار بات ہے......" اس نے اپنے چوڑے ہاتھ کو جو بڑھاپے کی وجہ سے سوجا ہوا تھا جولین کے ہاتھ پر رکھا اور کہا:۔

"میرے دوست تم مجھے بہت رنج پہنچا رہے ہو۔ غور تو کرو۔ تم اپنے تمام مستقبل کو تباہ کر رہے ہو۔ ہماری توقعات کو باطل کر رہے ہو، ہمارے فرض مشترک کی ادائیگی میں کوتاہی کر رہے ہو۔"

ان الفاظ نے جولین میں سختی پیدا کر دی۔

"ہم سب کا، تمام سائنس کے خادموں کا مشترکہ فرض صرف ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ حق کی خدمت کریں خواہ اس کی قیمت کچھ بھی دینا پڑے۔ تم نے خود مجھے یہ سبق پڑھایا ہے۔"

بوڑھے آدمی نے اپنا بھاری سر ہلایا اور اس کی خون آشام آنکھوں میں شعلہ کی سی چمک پیدا ہوئی:

"حق کبھی ہمارے وطن سے جدا نہیں ہو سکتا۔ دونوں کا اقتضا ایک ہی ہے۔"

"تسلیم ہے لیکن وطن کا فرض ہے کہ جادۂ حق سے منحرف نہ ہو۔" جواب ملا "وطن سب پر مقدم ہے۔ ہم سب اس کے خادم ہیں، سب ہیں لیکن ——— " مگر استاد نے قطع کلام کر کے کہا "ہر چیز جو ہمارے پاس ہے بغیر استثنا کے۔" دونوں خاموش ہو گئے۔ بوڑھے آدمی کی آنکھوں کا شعلہ بجھ گیا تھا۔ اس نے جولین کی طرف نہیں دیکھا۔ وہ منتظر تھا کہ جولین بولے اور وہ الفاظ کہے جن کی اس کو توقع تھی۔ جب یہ خاموشی طول پکڑ گئی تو اس نے اپنا سر اٹھایا جو ایک بیمار شیر کا سا تھا اور اپنے بھاری پپوٹوں کو کھولا جو تابوت کے ڈھکنے کی یاد دلاتے تھے اور اس کی بھاری نم آگیں نگاہ نے محبت، خوف اور التجا

کے ساتھ جولین کی نگاہ کو تلاش کیا۔ جولین کے دل میں اس نگاہ نے تلاطم برپا کر دیا لیکن اس کے منہ سے اس کے سوا کیا نکل سکتا تھا "میں حق کو کیسے ہاتھ سے دے سکتا ہوں جو میری ملکیت نہیں، جس کی ملکیت میں خود ہوں۔"

مگر اس نے اپنے منہ سے یہ نہیں کہا۔ بے فائدہ ایک اور زخم لگانے سے کیا حاصل! لیکن اس کے استاد کے وہ زخم ضرور لگا کیونکہ اس نے جولین کی آنکھوں میں ان الفاظ کو پڑھا جو اس کے ہونٹوں سے نہیں نکلے۔ بھاری پپوٹے بند ہو گئے اور اس کا سر اس کے سینہ پر جھک گیا۔ جب ذرا دیر کے لئے اس کا سانس سمایا تو یہ زخم خوردہ بزرگ بدقت تمام اپنی کرسی سے اٹھا اور اس نے اپنے ہاتھوں کے بل میز کا سہارا لیا۔ جولین اس کی مدد کرنے کے لئے تیزی کے ساتھ آگے بڑھا لیکن جس طرح کوئی رعشے کا مریض بے ڈھنگے پن سے اشارہ کرتا ہے اس نے بغیر جولین کی طرف نگاہ اٹھائے اس کو روک دیا۔ اس نے مڑ کر پیچھے کی طرف بھی نہیں دیکھا بلکہ سر اور کمر جھکائے اپنے بھاری قدموں سے کھٹ کھٹ کرتا ہوا باہر چلا گیا۔ جولین کے انکار سے اس پر ضرب کاری لگی تھی جس سے جانبر ہونا محال تھا۔

جولین کی طبیعت کے آدمی کے لئے وہ چوٹ جو کسی دوسرے کے لگے کچھ کم تکلیف دہ نہیں ہوتی۔ انسان اپنی چوٹ کی طرح اس کا علاج بھی نہیں کر سکتا۔ اپنی تو کھال نئی پیدا ہو جاتی ہے اور زخم مندمل ہو جاتا ہے مگر ہم دوسروں کے بجائے کیسے کھال پیدا کر سکتے ہیں۔ اس لئے ان کے زخم ہمیں کھٹکتے رہتے ہیں..... مگر اس کے باوجود جولین جیسے شخص کو یہ تشویش پیہم ذہنی تحقیق اور جستجو سے باز نہیں رکھ سکتی تھی کیونکہ جذبہ تحقیق اپنے مقتولوں اور مجروحوں کے اوپر سے ہوتا ہوا گذر جاتا ہے۔ جولین اپنے دماغ سے یہ نہ کہہ سکتا تھا۔

"ٹھیر جاؤ...... اور جو کچھ تم نے دیکھا ہے وہ بھول جاؤ۔"

وہ کبھی کوئی چیز نہ بھولتا تھا۔ یہ اس کی ایک دماغی کمزوری تھی۔ وہ آگے بڑھا جاتا تھا۔ حجت و تکرار کا طالب تھا۔ وہ اپنے طریقۂ عمل میں بہت احتیاط کرتا تھا۔ وہ محض اپنے لئے روشنی کا طالب تھا۔ اُسے دوسروں کے راستے کو روشن کرنے کی جلدی نہ تھی۔ وہ ان لوگوں کو اچھی طرح پہچان گیا تھا اور جانتا تھا کہ وہ روشنی کے جویا نہیں ہیں۔ لیکن ان لوگوں کو محض اس خیال سے کوفت ہوتی تھی کہ وہ ان کے قریب

موجود ہے اور اس کے خاموش محاسبہ سے ان کی تردید ہوتی ہے گویا وہ ان پر محض اپنی خاموشی سے حکم لگا رہا ہے (کیونکہ اب وہ اُس کو نظر انداز نہ کر سکتے تھے اور ان کا غصہ اس کے تحمل اور ضبط سے اور بڑھ جاتا تھا۔) اندھی جبلت سے مجبور ہو کر انھوں نے اس کے ضبط اور خاموشی کو توڑنے کی کوشش کی۔ سب سے زیادہ اشتعال دلانے والا اس کا وہ دوست تھا جس کی دوستی اب جانی دشمنی میں تبدیل ہو گئی تھی (جس کے رخسار پر ہمیشہ کے لئے اس کے طمانچہ کا نشان ثبت ہو گیا تھا۔ جولین کو انھوں نے خاموش رہنے نہیں دیا خاموش رہنے اور آزادیٔ فکر میں تو بڑا آرام ہے۔ لہذا انھوں نے اس کے سامنے ایک تحریری اعلان پیش کیا جس پر دستخط کرنے سے اس نے انکار کر دیا۔ انھوں نے اصرار کیا کہ اپنے وجوہات بتاؤ۔ جولین اپنے عقائد کا عام اعلان کرنے سے بہت گھبراتا تھا لیکن اس نے اپنے فرض کی ادائگی سے کوتاہی نہیں کی اور وجوہات کو بیان کر دیا۔ اس کا بیان اس قدر صریح اور واضح تھا کہ اس کو دیکھ کر وہ لوگ بہت زچ ہوئے جنھوں نے ناعاقبت اندیشی سے اس کو اس تحریر پر مجبور کیا تھا اور اگر ان کا بس چلتا تو وہ الفاظ واپس اس کے گلے میں اتار دیتے لیکن احمقانہ جوش میں وہ خود ہی نیچے آرہے۔ انھوں نے دشمن کے لئے ایک جال لگایا تھا اور خود ہی اس میں پھنس گئے۔ اگر وہ اپنے غیض و غضب کو اندر ہی بند رکھتے تو شاید معاملہ زیادہ نہ بڑھتا مگر اخبار نویسوں کو اس کی اڑتی ہوئی خبر مل گئی اور ان میں سے ایک نے کسی طرح اس مرتد کے خطرناک بیان کی ایک نقل حاصل کر لی۔ سیاسی ناظر کی حماقت نے کریلے کو اور نیم پر چڑھا دیا۔ اس کے اعلان سے جہاں لوگوں کو یہ معلوم ہوا کہ یونیورسٹی کے اراکین نے کس طرح حب وطن کے جوش میں اپنے ایک نا اہل رکن پر کلنک کا ٹیکہ لگایا ہے وہاں انھیں بارود خانہ کا راستہ بھی معلوم ہو گیا اس پر مزید ستم یہ ہوا کہ مضمون میں سے بہت سے حصوں کو جن میں کوئی خاص بات نہ تھی جو نہ دوسروں سے زیادہ شورش انگیز تھے نہ کم، بھونڈے طریقہ پر حذف کر دیا گیا۔ اس سے عوام کے تخیل کو اور اشتعال ملا اور انھیں زیادہ سخت اور بے پناہ مضامین کی تلاش ہوئی چنانچہ جولین کو خود اپنا مضمون پڑھ کر تعجب ہوا اور اس کی فطری جھجک نے اس سے سوال کیا ”مگر یہ باتیں کس نے کہیں؟ تم سے کس نے کہلائیں؟“

لیکن وہ خود سے یہ سوال کرتے ہی خاموش ہو گیا اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے اینٹ اس کے برابر

کھڑی اس کی تحریر پڑھ رہی ہو۔ جولین بھی کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنے کمرے میں دو تین چکر لگائے۔ پھر وہ بیٹھ گیا اور مسکرایا:۔

"اچھا جو اس عورت کی مرضی...... جو ہونا ہے ہو جائے گا۔"

بالآخر "اس عورت" نے اپنا مقصد حاصل کر لیا تھا جس طرح اس نے خود نظام معاشرت کی زنجیریں توڑ ڈالی تھیں اسی طرح اب جولین سے بھی وہی کرا لیا۔ اب وہ تنہا تھا، اس کی صحبت میں تنہا تھا لیکن وہ ایسا خیال پرست نہ تھا کہ یہ نہ سمجھے کہ "وہ" دراصل اس کے اپنے دماغ کا عکس ہے۔ اسے زندہ جیتی جاگتی گوشت اور پوست کی اینٹ کی ضرورت تھی جو اس کے دوش بدوش اس دنیائے آب و گل میں جدوجہد کرے لیکن اب بھی اسے کبھی یہ خیال پیدا نہیں ہوا کہ اس کی تلاش کرے۔ اب وقت گذر چکا تھا اور بازی ہاری جا چکی تھی۔ وہ ان تقدیر پرستوں میں سے تھا (خدا ان پر اپنی برکت نازل کرے۔ میں ان کی تعظیم کرتا ہوں مگر ان کی ہانڈی پر رشک کی نظر نہیں ڈالتا انھیں ہی ان کے ٹیچا رے لینے مبارک ہوں!) جو شکست سے خائف نہیں ہوتے، اس کو قبول کر لیتے ہیں مگر اس کا کوئی تدارک نہیں کرتے۔ جولین خودداری کے ساتھ اپنے گھر کے صحرا میں زندگی بسر کرتا رہا جس میں اس کی خوش نصیبی سے ایک بچی کے شور و غل سے کچھ جان سی پڑ چلی تھی۔ گھر سے باہر کی تمام دنیا اس کے لئے ایسا ویران ماحول بن گئی تھی جو مخاصمت پر تلی ہوئی تھی۔ اس کے علمی اور تعلیمی مشاغل منقطع ہو گئے۔ اکیڈمی کے معزز اراکین آیندہ احتیاط رکھیں گے کہ صرف اپنے ہم خیالوں کو اکیڈمی میں داخل کریں یعنی وزرا اور افسران اور ان کی اپنی قسم کے ارباب علم جنھوں نے وطن کے نیک مقصد کی خاطر حق کے ساتھ دغا کی تھی۔ جولین کے استاد اور مربی نے اس کے محبت آمیز خطوط کا جواب نہیں دیا اور اس رسالے کو بغیر پڑھے واپس کر دیا جس میں جولین نے اعتدال کے ساتھ اور مخالفین کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے اپنا یہ مقالہ پیش کیا تھا کہ جنگ کی ذمہ داری تمام قوموں کی مشترکہ ہے اور تمام اہل علم کا فرض ہے کہ وہ جلد باہمی مصالحت کرانے میں کوشاں ہوں۔ فرانسیسی "جماعت عمال" کے سورماؤں نے جو خود ہر طرح سے محفوظ تھے لیکن گھر پر رہ جانے والے لوگوں کے محافظ بن بیٹھے تھے کئی مرتبہ اس کے یونیورسٹی کے لکچروں میں گڑبڑ پیدا کرنے کی کوشش کی......

جولین نے اس کے بعد اور کوئی چیز ایسی نہیں لکھی جس سے عام رسوائی ہو لیکن اس میں اس کی مصلحت شناسی کو دخل نہ تھا۔ خیروں کا ناطراب زیادہ ہوشیار ہو گیا تھا اور اسکی لکھی ہوئی ایک سطر بھی شائع نہ ہوسکتی تھی یہانتک کہ اس کے وہ رسائل بھی جو عمارات قدیمہ کے متعلق تھے شبہ کی نظر سے دیکھے جاتے تھے مگر اس کا دماغ بالکل بے خوف تھا۔ وہ جس راستے پر پڑتا تھا اس سے کوئی چیز اس کو ہٹا نہ سکتی تھی۔ اس کا جسم بغیر چون وچرا، بغیر کسی شکایت یا اظہار مسرت کے وفاداری کے ساتھ اس کے دماغ کی پیروی کر رہا تھا اور بوقت ضرورت اس کے اشارے پر گھسان کی لڑائی میں کود جانے کو تیار تھا۔

لیکن ۱۹۱۵ء اور ۱۹۱۹ء کے درمیان وہ اس مقام تک نہیں پہنچا تھا۔ اس عرصے میں وہ خاموشی اور یکسوئی کے ساتھ غور وفکر میں مصروف رہا۔ اس کے "ارتداد" کی وجہ سے اس کے گرد جو خلا قائم ہو گیا تھا اس کی وجہ سے اسے اور فرصت مل گئی اور اس ذہنی تنہائی کی بدولت اس کی جرات میں اضافہ ہوا اور اس کی فطرت میں اور زیادہ گہرائی پیدا ہو گئی۔ اس نے دوسروں کے سہارے کے بغیر اپنا کام نکالنا سیکھ لیا۔ وہ لوگ جنھوں نے اس کو زمین کی ہوا سے محروم کرکے پہاڑ کی ہوا کھانے پر مجبور کیا تھا اپنی عداوت اور اپنے مقصد میں ناکامی کی وجہ سے اور زیادہ برافروختہ تھے کہ انھوں نے خواہ مخواہ اس فضیحت اور رسوائی کو دبایا کیونکہ ان کی کوششوں سے وہ دب تو گئی لیکن اس کا انسداد نہیں ہوا۔

جولین کے نقادانہ دماغ اور وجدان میں جو نادر توازن قائم ہو گیا تھا اس کا پختہ ثمر وہ تصنیف تھی جس کا نام اس نے "اونتین کے لوگوں کا مکالمہ" (Dialogues of the People on the Aventine.) رکھا تھا جس میں اہل روح، جو شہر سے اپنا رشتہ منقطع کر چکے ہیں آپس میں ہنگامہ خیز تبادلہ خیال کرتے ہیں اور اس مرتبہ اس شخص کو آخری لفظ کہنے کا موقع نہیں ملتا جو محض شکم پری کی نیابت کرتا ہے: "جو روٹی کھانا چاہتا ہے وہ اس کو حاصل کرنے کے لئے کام کرکے دکھائے۔" "اپنے ہاتھوں کو سامنے کرو، اے عالمو، فاضلو، مصورو، مصنفو۔ اپنے اعمال کا دفتر پیش کرو۔ تم نے گذشتہ سو برس میں کیا خدمات انجام دی ہیں کہ تم رائے عامہ کے حاکم (یا غلام) بنے رہے ہو؟" یہ بڑی دلچسپ نمائش تھی۔ تمام قلم کے سورما اسٹیج پر لائے گئے تھے! لیکن اصل ڈراما تماشائی کی روح میں تھا جس نے اس کو دیکھ کر

حقارت کے ساتھ منہ پھیر لیا۔ اس نے یہ دیکھا کہ لوگ شہر کے باہر خیمے لگائے رات کے وقت آگ کے گرد بیٹھے اس سرخ دھوئیں کو دیکھ رہے ہیں جو آسمان کی خلیج کی طرف بلند ہو رہا ہے جہاں ٹوٹتے ہوئے تاروں کی حیثیت چنگاریوں سے زیادہ نہیں۔ اس کا ذہن بغیر کسی خارجی رہنمائی کے اپنی ذات میں اس وقت ایک انقلاب پیدا کر رہا تھا جس وقت یورپ کے قلب میں قوموں کی شورہ پشتی انقلاب برپا کر رہی تھی۔ لیکن اس کا دماغ خارجی واقعات سے بے خبر تھا اور اس نے دوسروں پر اپنا اثر ڈالنے کی کوشش نہیں کی۔ اس زمانے میں جولین نے اپنے نتائجِ افکار کو شائع نہیں کیا بلکہ جنگ ختم ہو جانے کے بعد بھی جب اشاعت کتب پر زیادہ روک تھام نہیں رہی تھی اور وہ آسانی سے اپنی کتابوں کی اشاعت کا انتظام کر سکتا تھا اس نے ایسا نہیں کیا۔ اپنے خیالات کی تشہیر سے اُسے تکلیف ہوتی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اگر وہ انھیں شائع کرتا تو دن کی تیز روشنی میں اسے خود اپنی روح کے پوشیدہ راز دیکھنے پڑتے اور جب باہر کی روشنی ایک مرتبہ اس کے گھر میں داخل ہو گئی تو وہ دوبارہ کیسے اپنا دروازہ بند کر سکے گا؟ تاریکی کا زمانہ ختم ہو گیا تھا۔ سایہ ڈھل چکا تھا لیکن شام کی وہ دھندلی سی روشنی باقی تھی جو اربابِ فکر کو طبعاً بہت مرغوب ہوتی ہے ....

لہذا جنگ کے فوراً بعد اس نے محض ان تمام تصانیف کو شائع کیا جو سائنس کی تاریخ سے متعلق تھیں۔ اس کا خیال تھا کہ اس کی وہ تحریریں بالکل معروضی ہیں لیکن اس کی پرزور شخصیت نے جو عرصے تک جرأت آزما تنہائی میں پرورش پاتی رہی تھی اور جس کی کمان سالہا سال کے ضبط کی وجہ سے خوب تنی ہوئی تھی ان بے پناہ تیروں کی طرف خیال نہیں کیا جو وہ اپنی تصانیف کے ہر باب میں حال اور ماضی کی ریاکاریوں اور دروغ بافیوں کے خلاف چلا رہا تھا۔ چونکہ ایک زمانے میں وہ سب خود اس کی ذات میں جمع رہی تھیں اس لئے دراصل وہ خود اپنے خلاف تیر چلا رہا تھا۔ پھر تیر چلانے والا کون رہا تھا؟ وہ خود ہمارا یہ نیا جولین جس کی قلب ماہیت ہو گئی تھی۔ اس تبدیل شدہ انسان نے اپنے کو آزاد کرنے کی کوشش میں خون کا غسل کیا تھا۔ اس کے تیروں کی یہ بوچھار ایک پورے ذہنی عہد اور سوسائٹی کے ایک ایسے دور کے خلاف تھی جس کا انجام قریب تھا، جس کے جسم پر ان زخموں کے نشان صاف نظر آرہے تھے۔

یہ جری شخص، جو یکہ و تنہا نہایت آزادی اور بے جگری کے ساتھ اپنے اجتہادی خیالات کی ترتیب

میں مشغول تھا در اصل مستقبل کی تشکیل کر رہا تھا اگرچہ خود اسے اس کا مطلق شان گمان نہ تھا۔ وہ لاعلمی میں انسانوں اور قوموں کے اس عظیم الشان کارخانے میں کام کر رہا تھا جہاں اس جیسے بہت سے لوگ ایک ایک نظام جدید، ایک دنیائے نو کی تعمیر میں کوشاں تھے۔ اور بعد میں جب اُسے اس کا احساس ہوا، جب خارجی واقعات جرّانہ طور پر اس کے کتب خانے کے گوشۂ عافیت میں گھس آئے تو اس نے خود کو انقلاب کی جماعت میں بھرتی پایا۔ اس وقت تک یہ "انجان انقلابی" مسلسل دس سال مخالفوں کی ذہنیت کے خلاف اپنے بے پناہ تیر چلا چکا تھا۔

اور ابھی اُسے اس بات کا پوری طرح احساس بھی نہیں ہوا تھا کہ اینٹ نے جو اس وقت کئی ہفتے کی علالت کے بعد روبصحت تھی اپنے بستر علالت ہی پر اس کی تصانیف کا مطالعہ کیا اور ایک ہی نظر میں اس حقیقت کو، اس کی ذہنیت کے اس انقلاب عظیم کو پہچان لیا۔ مسرت نے اس کے سینے میں جوش مارا اور پرانی محبت جو ابھی تک زندہ تھی بیدار ہو گئی۔ اسے محسوس ہوا کہ اس نے بھی خلاقی کی ہے — اس شخص کی، جو اس سے محبت کرتا تھا، اس کا جولین، تیر انداز!

تفاسیر القرآن

قرآن اللہ کا پیغام اور آسمانی نور ہے جو بنی نوع انسان کے لئے شمع ہدایت بنا کر اُتارا گیا۔ صحابہ کرام نے جن کی زبان میں قرآن اُترا تھا اور جو اس کے اولین مخاطب تھے بے تکلف اس کو سمجھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات جو عمل بالقرآن کا نمونہ تھی ان کے لئے اسوۂ حسنہ تھی۔ انھوں نے جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس پر عمل کرتے دیکھا اسی طرح خود اس کی تعمیل کرنے لگے۔ اور زندگی کے ہر شعبہ میں اپنے عمل کو اسی کے مطابق رکھا۔

یہ کتاب جیسا کہ اس کا دعویٰ ہے مفصل اور نور مبین ہے۔ اس کی تعلیمات عمل کرنے اور نصیحت لینے کے لئے واضح اور روشن ہیں۔ صحابۂ کرام پر یہ حقیقت کھل گئی تھی کہ یہ کتاب انسان کے ظاہری اور باطنی اعمال کو سنوارنے کے لئے نازل ہوئی ہے۔ اسی کے مطابق اپنے اعمال کو رکھنا اس کے اتارنے والے کے نزدیک مقبولیت کا ذریعہ ہے۔ اس لئے وہ نظری بحثوں میں زیادہ نہیں الجھے۔ انھوں نے اس کی آیات کی توضیح اور تشریح کے لئے سوالات بھی بہت کم کئے۔ کیونکہ ان چیزوں میں قومیں اس وقت پھنستی ہیں جب ان کے ایمان اور عمل میں ضعف پیدا ہو جاتا ہے اور صحابۂ کرام کی قوت ایمان اور جذبۂ عمل کا وہ عالم تھا کہ ان کی ایک نگاہ سے بڑے بڑے فلسفیوں اور عالموں کے ذخیرے سوخت ہو سکتے تھے۔

عہد صحابہ کے بعد پہلی صدی ہجری کے اواخر میں جب دوسری قومیں بھی جو عرب نہ تھیں اسلام کے آغوش میں آچکی تھیں قرآن کریم کی تشریح اور توضیح کی ضرورت پیش آئی۔ چنانچہ اس وقت سے تفسیریں لکھی جانے لگیں بیان کیا جاتا ہے کہ سب سے پہلی تفسیر خلیفہ عبدالملک کی فرمائش سے سعید بن جبیر نے مدون کی تھی لیکن وہ معدوم ہو گئی۔ تیسری صدی ہجری میں امام ابن جریر طبری نے اپنی مشہور تفسیر لکھی جو آج بھی موجود ہے اور اُم التفاسیر کہی جاتی ہے۔ کیونکہ اس کے بعد سے آج تک جس قدر تفسیریں لکھی گئی ہیں وہ سب کی سب اسی سے ماخوذ ہیں۔ ابن جریر نے اپنی تفسیر میں بہ سلسلہ اسناد اس کل علم کو جمع کر دیا جو قرآن کے متعلق اس وقت تک مسلمانوں کے پاس تھا۔

طبری کے بعد علمائے اسلام نے اس قدر تفسیریں لکھیں جن کا شمار نہیں کیا جا سکتا اور آج تک ان کا سلسلہ جاری ہے۔ جس طرح ہر زمانہ میں فقہا اور محدثین کی کثرت رہی اسی طرح مفسرین کی بھی جماعت ہر عہد میں رہی۔ بعض بعض تفسیریں اس قدر مبسوط لکھی گئیں کہ دو دو سو اور تین تین سو جلدوں میں ختم ہوئیں۔ تفسیر حدائق البیان کے متعلق مورخین لکھتے ہیں کہ پانسو جلدوں میں تھی۔ لیکن ان مفسروں نے جہاں تک قرآن کی تشریح کا تعلق ہے طبری کی تفسیر پر کچھ زیادہ اضافہ نہیں کیا۔ صرف اسرائیلی قصوں، مجوسیوں کے افسانوں، علما کے اختلافات اور اقوال کو درج کرکے اس کو بڑھانے کی کوشش کی۔ بعض بعض مفسروں نے اپنے اپنے خاص خاص اعتقادات یا فنی زاویۂ نگاہ سے تفسیریں لکھیں اور قرآن کو اسی رنگ میں رنگنا شروع کیا۔ فلسفیوں نے فلسفیانہ بحثیں کیں۔ معتزلہ نے اعتزال اور صوفیہ نے تصوف کا رنگ بھرا۔ فقہا نے استنباط مسائل پر زیادہ رجحان رکھا اور مورخوں نے تاریخی تفصیلات لکھیں اور انھیں چیزوں کا نام تفسیر رکھا گیا۔ علامہ زمخشری نے تو کشاف میں اپنا سارا زور بدیع اور بیان پر صرف کر دیا ہے۔ تفسیر محض نام کے لئے ہے۔ حقیقت میں امام رازی کی تفسیر کبیر کے متعلق جو فقرہ مشہور ہے کہ "اس میں سب کچھ ہے بجز تفسیر کے" وہ کشاف پر زیادہ چسپاں ہے اس لئے کہ امام رازی نے تو بہت کچھ قرآنی مسائل حل کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔

الغرض آج ہزاروں تفسیروں کے لکھے جانے کے بعد بھی اگر کوئی تفسیر کارآمد ہے تو ابن جریر طبری ہی کی ہے۔ وہی پہلی تفسیر ہے اور اسی کو اب تک آخری تفسیر بھی سمجھنا چاہئے۔ اس سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ آغاز عہد اسلام میں صحابۂ کرام اور تابعین اعلام نے قرآنی آیات کو کس طرح سمجھا تھا اور قرآن فہمی میں ان کے اندر کس قسم کے اختلافات تھے۔

طبری کی یہ تفسیر قرآن فہمی کے لئے ایک ذخیرہ تھی۔ اس سے مدد لے کر قرآنی حقائق کو واضح کرنے کی کوشش کی جا سکتی تھی لیکن مابعد کے مفسروں نے بجز نقل در نقل کے کوئی خاص ترقی نہیں کی اور یہ فن ذرا بھی آگے نہیں بڑھا۔ اب تک جس قدر تفسیریں لکھی گئی ہیں ان میں غور کرنے سے بڑے بڑے نقائص نظر آتے ہیں جو حسب ذیل ہیں:-

(۱) سب سے پہلی اور ابتدائی خرابی یہ ہے کہ ان مفسروں نے قرآن کی تشریح کے اصول نہیں مقرر کئے۔ زمانۂ مابعد میں اگرچہ علمائے اصول نے کچھ قواعد مرتب کئے ہیں لیکن وہ قرآن فہمی کو پیش نظر رکھ کر نہیں بنائے گئے

ہیں بلکہ زیادہ تر الفاظ اور اس کے استعمال کے متعلق ہیں اور محض قیاسی ہیں جن سے ہر نقطہ پر اختلاف کی گنجائش موجود ہے اور پھر بالکل ناکافی۔ علامہ ابن تیمیہ نے جو ترجمان القرآن کے لقب سے مشہور تھے کچھ اصول لکھنے شروع کئے تھے مگر صرف تمہید ہی لکھ سکے۔ شاہ ولی اللہ صاحب مرحوم نے بھی اصول تفسیر میں فوز الکبیر نامی ایک رسالہ لکھا مگر اس کو اصول کہنا کسی طرح صحیح نہیں۔ وہ تو صرف ان کی قرآن فہمی کی نوعیت ہے اور بس۔

الغرض تفسیر قرآن کے اصول ابھی تک قطعاً مرتب نہیں ہو سکے ہیں۔ حالانکہ ایسے اہم علم کے لئے سب سے پہلا کام یہی تھا کہ اس کے اصول بنائے جاتے۔ اس لئے یہ تمام تفاسیر جو لکھی گئی ہیں کسی علمی یا عقلی اصول پر مبنی نہیں ہیں۔

(۲) ان مفسروں نے قرآن کی تفسیر کا جو طریقہ رکھا ہے وہ وہی ہے جس کے مطابق کسی انسانی کتاب کی تشریح کی جاتی ہے یعنی فاتحہ سے شروع کر کے ایک ایک آیت کی سلسلہ وار تفسیر لکھتے چلے جاتے ہیں اور آخر تک پہونچا دیتے ہیں۔ اس سے آیات اور الفاظ کے معانی کی شرح تو ضرور ہو جاتی ہے مگر قرآن نہیں سمجھ میں آتا یعنی اس کی کوئی تعلیم حل نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ اس کی تعلیمات اس ترتیب اور ربط کے ساتھ نہیں بیان کی گئی ہیں جس طرح انسانوں کی کتابوں میں ہوتی ہیں۔ بلکہ اس کی ہر تعلیم متعدد سورتوں اور آیتوں میں اس کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی ہے تا وقتیکہ کسی خاص مسئلہ کے متعلق اس کی تمام تعلیمات متفرق سورتوں سے نکال کر جمع نہ کر لی جائیں اور ان کو صحیح ترتیب کے ساتھ مرتب نہ کیا جائے وہ مسئلہ ہرگز سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ لہذا ان تفسیروں اور ترجموں سے جو سلسلہ بسلسلہ آیات کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں قرآنی تعلیمات کی مطلق توضیح نہیں ہوتی۔ فہم قرآن کے لئے ایسے ترجموں اور تفسیروں کی نوعیت تقریباً وہی ہے جو فن طب میں کتب مفردات کی ہے جن میں حروف تہجی کی ترتیب کے ساتھ دواؤں کے نام، خواص اور بدل وغیرہ لکھ دئے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کوئی شخص ان کو پڑھ کر طبیب نہیں ہو سکتا بعینہ ان تفاسیر و تراجم کے مطالعہ سے بھی کوئی قرآن کا عالم نہیں ہو سکتا۔

(۳) ایک خاص عیب یہ ہے کہ ان تفسیر نگاروں نے خود اپنے دماغوں سے بہت کم محنت لی ہے، الا ماشاء اللہ۔ زیادہ تر اپنے سے پہلے مفسروں کے اقوال اور روایتیں درج کی ہیں۔ بہت سے مفسر تو اس قسم کے ہیں جنھوں نے اپنی تفسیریں محض ثواب کا ذخیرہ اور جنت کا ذریعہ سمجھ کر لکھی ہیں یعنی تقرباً الی اللہ خدام قرآن میں

داخل ہوگئے ہیں۔ بحالیکہ ان کی تفسیروں میں کوئی چیز ایسی نہیں ملتی ہے جس پر کسی طالب قرآن کی زبان سے ان کے لئے مغفرت کی دعا نکلے یا جو بوجھ اپنی تصنیف کا وہ پڑھنے والوں پر ڈال گئے ہیں اس کی کوئی تلافی ہو سکے۔ اگر بعضوں نے دماغ سے کام بھی لیا ہے تو یہ کہ اپنے خاص نظریہ کو موقع بے موقع قرآن کے ذریعہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ کرمانی کی تفسیر عجائب الغرائب اور وہ تفسیر جو شیخ محی الدین ابن عربی کی طرف منسوب ہے اسی قسم کی ہیں۔ یہ درحقیقت خالص تفسیر بالرائے ہیں جن سے سوائے انسانی خیالات کے آسمانی پیغام کی ماہیت نہیں سمجھی جا سکتی۔

(۴) عام طور پر ان تفاسیر میں آیات اور الفاظ قرآن کی تشریح روایات سے کی گئی ہے۔ روایت کا بجائے خود جو درجہ ہے وہ ظن سے زیادہ نہیں ہے۔ اس طرح پر قرآن کو جو بالکل یقینی ہے اور جس پر ہر مسلمان ایمان رکھتا ہے ان مفسروں نے مظنون تشریحوں میں ڈال دیا ہے اور اس کے مفہوم کی قطعیت کھو دی ہے۔

بالخصوص تفسیر میں جو روایات ہیں ان کا بڑا حصہ تو خود محدثین کے نزدیک موضوع ہے اور اسرائیلیات تو بیشتر ناقابل اعتبار ہیں۔ قدیم مفسروں نے ان روایات کا سلسلۂ اسناد بھی لکھا تھا مگر متاخرین نے اس کو بھی حذف کر دیا جس کی وجہ سے بعد کی تفسیروں میں وہی قصے اور وہی روایتیں بلا اسناد کے منقول ہوئے اور عوام میں ان کی حیثیت مسلّمات کی سی ہو گئی اور بہت سی آیات کی غلط تفسیریں امت میں رائج ہو گئیں۔ یہی وجہ ہے کہ جس قدر تفاسیر کی کثرت ہوتی گئی اسی قدر مسلمانوں کو قرآن کریم کی اصلی اور صحیح تعلیم سے بعد ہوتا گیا۔

(۵) یہ مفسرین بالعموم قرآن میں نسخ کے قائل ہیں۔ اس لئے محکم اور یقینی آیات پر بھی نسخ کے احکام لگاتے چلے جاتے ہیں بلکہ جن لوگوں نے ناسخ اور منسوخ آیات پر کتابیں لکھی ہیں ان کی تو کوشش یہی ہے کہ جس قدر ہو سکے نسخ دکھلائیں۔ ان کے بیان کے مطابق نصف بلکہ اس سے بھی زیادہ احکامی آیتیں منسوخ ہیں۔

شاہ ولی اللہ صاحب نے زیادہ غور کیا تو ان کو صرف پانچ آیتیں ایسی مل سکیں جو منسوخ ہیں۔ مگر وہ بھی منسوخ نہیں ہیں جیسا کہ تفصیل کے ساتھ ہم نے ان پر اپنی کتاب تاریخ القرآن میں بحث کر دی ہے۔ غرض اس نسخ کے عقیدہ نے ان تفسیروں کے اندر ایک عجیب اہمال پیدا کر دیا ہے۔

(۶) ان مفسروں کو قرآن کریم کی صاف اور سیدھی تعلیم کمتر پسند آتی ہے۔ اس میں مختلف طریقہ سے ندرت اور غرابت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس مقصد کو زیادہ تر موضوع اور مجہول روایتوں سے حاصل کرتے

ہیں قصص میں اس قسم کی عجیب وغریب باتیں جو بیان کی گئی ہیں، ان کا تو کچھ ٹھکانا ہی نہیں۔ معمولی اور سیدھی باتوں میں بھی یہ اپنی جدت طرازی سے اضافے کرتے ہیں۔ "تنزل الملٰئکۃ والروح فیہا" میں 'روح' کی تفسیر کی گئی ہے کہ ایک فرشتہ ہے جو ساتوں آسمان کا ایک لقمہ بنا سکتا ہے۔ اس کا سر عرش کے تلے اور پاؤں زمین کے ساتویں طبق کے نیچے ہے۔ اس کے ایک ہزار سر ہیں اور ہر سر اس دنیا سے بڑا ہے اور ہر ہر سر میں ہزار ہزار منہ ہیں الیٰ آخرہ۔ قوم ثمود کی آزمائش کے لئے اللہ نے جو اونٹنی نکالی تھی اس کی نسبت تفسیروں میں ہے کہ پہاڑ میں سے کراہنے کی آواز آئی اور وہ اس میں سے پیدا ہوئی۔ حالانکہ قرآن کے کسی حرف سے اس کا اشارہ تک نہیں ملتا۔ "استوت علی الجودی" کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ حضرت نوح کی کشتی پہلے کعبہ کے پاس آئی (یہ کعبہ ابراہیمی تو ہو نہیں سکتا جس کا ذکر قرآن میں ہے۔ غالباً فرشتوں کا بنایا ہوا ہوگا اسی وجہ سے ڈوبا نہ تھا) اور سات بار اس کا طواف کیا، پھر من کی طرف گئی۔ وہاں سے لپٹ کر جودی پہاڑ پر جا کر دسویں رجب کو جو جمعہ کا دن تھا ٹھہر گئی۔ یہ ہے ہمارے مفسروں کی قرآن فہمی۔

ایک مورخ نے لکھا ہے کہ روما کے کنیسہ میں کسی بزرگ کی سنگ مرمر کی مورت بنا کر رکھی ہے جہاں عقیدت مند حاجت طلبی کے لئے آتے ہیں اور اس کے نیچے شمعیں یا بتیاں روشن کرتے ہیں۔ مرور زمانہ سے ان چکنے پیچ دار دھوؤں سے وہ سفید مورت اس قدر سیاہ ہوگئی ہے کہ اب کوئی طاقت اس کو صاف نہیں کرسکتی۔ یہی کیفیت ہمارے ان مفسروں کی ہے جنھوں نے قرآن کو واضح کرنے کے لئے اپنی اپنی تفسیروں کی جو شمعیں روشن کیں ان سے اس کا نورانی چہرہ اس قدر تہ در تہ سیاہیوں کے نیچے چھپ گیا کہ اب اللہ ہی اس کو دور کرے تو کرے۔

(۷) یہ مفسرین بہت سی آیتوں کی تفسیر میں متعدد معانی اور مختلف اقوال نقل کرتے چلے جاتے ہیں مثلاً "غیر المغضوب علیہم ولا الضالین" کی تفسیر میں بیسیوں قول ہیں۔ "والفجر ولیالٍ عشر" کی متعدد تفسیریں ہیں۔ "وشاہد ومشہود" کی شرح میں کئی باتیں لکھی گئی ہیں۔ "اصحاب الاخدود" کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ وہ اہل فارس تھے یا یمن کے باشندے تھے یا حبشی یا نجرانی یا شامی تھے۔ الغرض سینکڑوں آیات ہیں جن کی تفسیر "یا" "یا" کرکے لکھتے چلے جاتے ہیں اور کسی ایک بات کو جزم ویقین کے ساتھ نہیں بیان کرتے۔ ان مختلف اقوال میں نہ اتفاق کی صورت ہوتی ہے نہ تطابق کی۔ اگر ایک بات کو دوسری پر ترجیح دیتے ہیں تو درایت سے کام نہیں لیتے بلکہ

قائل کی عظمت و شہرت کے اوپر اس کا معیار رکھتے ہیں۔ غرض ان مختلف اقوال میں صحیح فیصلہ کرنے کی قوت ان کے اندر مفقود ہوتی ہے اور یہ تو ظاہر ہے کہ قرآن کا مفہوم ایک اور صرف ایک ہی ہو سکتا ہے۔ اس لئے ایسی تفسیروں سے بجائے اس کے کہ آیات کا مفہوم واضح ہو اکثر گورکھ دھندا ہو کے رہ جاتا ہے کیونکہ مفسر خود کوئی مفہوم نہیں سمجھ سکا ہے۔

(۸) ان تفاسیر میں قرآنی حقایق کی جستجو کم ہوتی ہے اور غیر متعلق اور غیر ضروری باتوں میں صفحوں کے صفحے سیاہ کئے جاتے ہیں۔ جنت کا ذکر آئے گا تو اس کے پیالوں اور آبخوروں کی تعداد شمار کرنے لگیں گے اور حوض کوثر اور طوبیٰ کی پیائش کریں گے۔ دوزخ کے بیان میں اس کے طبقوں کی گہرائی اور سانپوں اور بچھوؤں کی درازی ناپنے لگیں گے۔ اصحاب کہف کے قصے میں ان کی تاریخی حقیقت لکھنے کے بجائے ان کے ناموں کی فہرست اور ان کے کتے کی نسل بیان کریں گے۔ اور جنگ بدر میں فرشتوں کے نزول کی حقیقت سمجھانے کی جگہ ان کی شکلوں، گھوڑوں، عماموں کا رنگ اور سواری اور قتل وحملہ کی کیفیت لکھیں گے۔ اگر ان چیزوں کا موقع نہ ہوگا تو فصاحت و بلاغت کی لطافتیں دکھلائیں گے یا خیالی فلسفیانہ بحثیں کریں گے۔

یہ عیوب و اسقام جو میں نے بیان کئے موجودہ تفاسیر میں کوئی تفسیر بھی ان سے خالی نہیں ہے۔ اگر اسی کو قرآن کی خدمت سمجھا جاتا ہے تو حقیقت یہ ہے کہ اب تک اس کی کوئی خدمت ہی نہیں ہوئی۔ ہمارے زمانہ کا ایک متلاشی حق ان تفاسیر کے متعلق لکھتا ہے:-

> "آج اگر کوئی طالب حقیقت اپنی بجھی ہوئی آگ سلگانے کی نیت سے کسی بڑی سے بڑی تفسیر کی طرف رجوع کرتا ہے تو پہلا ورق کھولتے ہی اس میں انسانی باطل آرائی اور غلط گوئی، داستاں سرائی اور حقیقت پوشی، آساں سوالی اور درسیاں جوابی کی وہ حیا سوز بدعنوانیاں دکھتا ہے کہ اس قصاب خانہ عقل و فہم کو دیکھ کر روح کانپ اٹھتی ہے۔ کہیں اس کے اندر صرف و نحو کے مستقل مقالے ہیں، کہیں اعراب پر لمبی چوڑی بحثیں ہیں، کہیں اسالیب فصاحت پر جرح و قدح ہے، کہیں ظن و قیاس کے ظلمت انگیز مناظرے ہیں، کہیں حدثنا اور قال قال کا بے سرا راگ ہے، کہیں فرضی اور بے سند قصوں کا طومار

ہے، کہیں بے ربطیاں میلوں تک ڈیرہ ڈالے ہوئے ہیں، ہر آیت سیاق سے الگ سباق سے علیحدہ، اندر سے ٹکڑے ٹکڑے باہر سے بے مطلب اور بے نتیجہ بن گئی ہے۔ جہاں ربط روز روشن کی طرح عیاں ہے وہاں طفلانہ نمائش ہے۔ جہاں بے ربطی کی خلیج عظیم اور تدبر و علم کی ضرورت ہے وہاں آئیں بائیں شائیں ہے۔ نہ اصول مطلب سے بحث ہے نہ نتائج پر نظر ہے، نہ علم کی تلاش ہے، نہ حکمت کی جستجو ہے، ....

کسی مفسر قرآن کی نظر آجتک اس بات پر نہیں رہی ہے کہ ناظر کا بڑا مدعا پیغام الٰہی کی ماہیت کو سمجھنا ہے کہ چند الفاظ میں اس کے اندر کیا لکھا ہے، چند جملوں میں وہ کیا اصول ہیں جن پر عمل چاہیئے، ان کی حکمت الٰہی کیا ہے، ان کی دستوری سند کیا ہے، وہ کیوں ذکر للعالمین ہے، کیوں ھدیٰ اور رحمۃ ہیں۔ بعینہٖ یہی باتیں ہیں جو ہر تفسیر اور ترجمہ میں کالعدم ہیں۔ اسی مدعا کو ٹھان کر لوگ تفسیریں پڑھتے ہیں اور مایوس ہو کر رہ جاتے ہیں، کوئی مستقل اصول، کوئی گر، کوئی کارگر بات موجودہ تفاسیر سے ان کے پلے نہیں پڑتی۔ الغرض تفسیر یا ترجمۂ قرآن کا مطالعہ متلاشی علم کے لئے مدت مدید سے وہ بے نتیجہ اور ناموافق شے رہا ہے کہ ایمان کے شعلہ کو آسمان سائے کرنے کے بجائے معتقد کی اس سلگتی ہوئی چنگاری کو بھی بجھا دیتا ہے جو ہر مسلمان کے دل میں رسماً یا خلقاً موجود ہے۔" تذکرہ علامہ عنایت اللہ خاں مشرقی "

سب سے بڑی مصیبت یہ ہوئی کہ متاخرین نے یہ طے کر لیا کہ قرآن فہمی میں عقل کو دخل نہیں دینا چاہیئے بلکہ جو کچھ متقدمین کہہ گئے ہیں اسی کو صحیح تفسیر یقین کرنا چاہیئے۔ اس عقیدت نے قرآن فہمی کا دروازہ ہی بند کر دیا اور مسلمان بالعموم اسی ذخیرہ پر جو سلف سے چلا آتا تھا قانع ہو گئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود علماء اسلام کا طبقہ بھی قرآن سے محروم ہو گیا چہ جائیکہ عوام اور قرآن چھوڑنے کی جو سزا تھی وہ سب کو ملی لیکن وہ چشمۂ نور یعنی قرآن کریم اسی طرح زندہ اور زندگی بخش ہے۔ وہ ہر زمانہ کے لئے ہے اور ہمیشہ ایک نیا عالم پیدا کر سکتا ہے۔ وہ ایسی مکمل کتاب ہے جو واضح ہے، مفصل ہے، اپنے اصول اپنے اندر رکھتی ہے اور اپنی تفسیر خود ہے۔

علم سیاست اور اجتماعی تباہی

[ذیل میں ہم ایک مشہور اطالوی عالم سنیور موسکا (روما) کے ایک مضمون کا ترجمہ درج کرتے ہیں۔ یہ ان کی معرکۃ الآرا تصنیف "سیاست بحیثیت علم" سے ماخوذ ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ جرمن زبان میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ مدیر]

یہاں جس سوال پر بحث مقصود ہے وہ علمی حیثیت سے شاید ان تمام مسائل سے زیادہ اہم ہے جن سے علم سیاست بحث کرتا ہے یا جن پر اسے بحث کرنا چاہیئے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس علم کی ترقیوں سے ایک دن وہ تباہ کن انتشارات یک قلم رک سکیں گے یا کم از کم ان کی تعداد اور شدت میں کمی ہو سکے گی یا نہیں جو بدفعات وقتاً فوقتاً پیدا ہو ہو کر تہذیب و تمدن کی ترقی کو روک دیتے ہیں اور ان قوموں تک کو، کچھ ہی عرصہ کے لئے سہی، مقابلۃً بربریت کی طرف لے جاتے ہیں جو انسانیت کی تاریخ میں ممتاز حیثیت حاصل کر چکی تھیں۔ میں یہاں بعض باتیں پیش کرنا چاہتا ہوں جو شاید اس پیچیدہ مسئلہ کے حل میں کچھ مدد دے سکیں، مگر ان کے اظہار سے پہلے خود مسئلہ کو ذرا زیادہ صحت و وضاحت کے ساتھ بیان کرنا ضروری ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ یہ انتشارات عموماً اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب قوم بوڑھی ہو جاتی ہے اور اسی کا فطری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کچھ عرصہ بعد مر جاتی ہے۔ مجھے تو یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ جب لوگ قوموں کے بڑھاپے اور ان کی موت کا ذکر کرتے ہیں یہ بس ایک شاعرانہ استعارہ کا استعمال ہوتا ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اور استعارہ بھی ایسا جس سے اس منظر کا پورا پورا تصور قائم نہیں ہو پاتا جس کی تحقیق منظور ہے۔ اور ان لوگوں کے ذہن میں تو یہ تصور اور بھی قائم نہیں ہو پاتا جنھوں نے تاریخ کا مطالعہ چنداں غور سے نہیں کیا ہے۔

فرد تو ضرور بڈھا ہوتا ہے اور مرتا ہے۔ یہ اس کی تقدیر کا تقاضا ہے، جب اس کی قوت حیات ختم ہو چکتی ہے، کوئی مرض یا کوئی شدید خارجی سبب اس کے کسی ایسے عضو کے فعل کو پوری طرح انجام نہیں ہونے

دیتا یا بالکل بند کردیتا ہے جو حیات کے لئے لازمی ہے۔ جماعت کے باب میں ایسا مادی بوڑھاپا سمجھ میں نہیں آتا۔ اس لئے کہ ہر نئی نسل کے جوانوں میں پوری پوری قوت حیات موجود ہونی چاہیئے۔ مادی موت بھی ناممکن سی معلوم ہوتی ہے، اس لئے کہ اس کے واسطے تو یہ ضروری ہوگا کہ ایک پوری نسل کی نسل اولاد پیدا کرنے سے محترز رہے۔

ہاں، لوگ ایسی قوموں کی مثالیں دے سکتے ہیں جو بالکل غائب ہوگئیں اور جن کے اخلاف کا آج پتہ بھی نہیں لگتا۔ مثلاً تسمانیہ کی دیسی آبادی غائب ہوگئی، آسٹریلیا کی اصلی آبادی بھی ختم ہوا چاہتی ہے، جزائر کناری کے گوانوں میں شاید کچھ گنتی کے آدمی بچے ہوں تو بچے ہوں۔ امریکہ کے بہیرے اصلی قبائل بالکل مٹ چکے اور بہت عنقریب مٹنے کو ہیں۔ لیکن ان سب صورتوں میں ایک چھدری چھدری منتشر آبادی کا معاملہ تھا جو شکار یا ماہی گیری سے اپنا پیٹ پالتی تھی، جن کی روزی سفید آدمیوں کی نو آبادی نے ان سے چھین لی۔ جب سفیدوں سے ان کا تعلق ہوا تو ان کا تمدن اس قدر پست تھا کہ نہ یہ زراعت شروع کر سکے نہ ان سفیدوں سے دولت آفرینی کے اور طور طریقے سیکھ سکے۔

لیکن صورت حال بالکل اور ہوتی ہے جب ایسے لوگوں کا معاملہ ہو جو زراعت تک پہنچ چکے ہیں، کثیر التعداد منظم اور قوی قومیتوں کی شکل رکھتے ہیں اور اپنا مخصوص تمدن پیدا کر چکے ہیں۔ اس حال میں شاید کبھی بھی اخلاف کی کمی کے باعث کوئی نسل مادی طور پر نہیں مری ہے۔ اس منزل کو پہنچ چکنے کے بعد لوگ اپنی اصلی شکل کھو سکتے ہیں، دوسرے تمدنوں میں جذب ہو سکتے ہیں، اپنا مذہب اور کبھی کبھی اپنی زبان بھی بدل سکتے ہیں، ان میں کامل ذہنی اور اخلاقی تبدیلی ہو سکتی ہے، مگر مادی طور پر پھر بھی جئے جاتے ہیں!

اس قسم کے قلب ماہیت کے باوجود جئے جانے کی مثالوں سے تاریخ بھری پڑی ہے۔ قدیم گیلک اور قدیم آئبیرین قوموں کے اخلاف برابر لاطینی تمدن کے زیر سایہ زندگی گزارتے رہے جس نے ان کی تشکیل کی تھی۔ قدیم عراقی یا شامی اقوام آٹھویں صدی کی عربی فتوحات کے بعد عربوں کی زبان اور ان کا مذہب اختیار کرنے کے باوجود بھی آخر جیا ہی کیں۔ یہی مصر میں ہوا، جہاں نام نہاد عربی آبادی میں اب تک بھی اپنے ان اصلی اجداد کا ناک نقشہ محفوظ ہے جنھوں نے عہد فرعونی کا تمدن پیدا کر کے اسے چار ہزار سال کی عمر بخشی تھی۔

اٹلی کے موجودہ باشندے آج بھی زیادہ تر قدیم اطالوی نسل سے ہی ہیں اور موجودہ اہل یونان کی رگوں میں آج بھی پیریکلیس یا ارسطو کے کسی ہم عصر کا یا نویں دسویں صدی کے کسی بازنطینی کا خون دوڑتا ہے۔

اگر ہم ان قوموں کو نظر انداز کر دیں جنھیں کسی بلند تر تمدن والی پردیسی حکومت نے اپنے اندر جذب کر لیا ہے، جیسے کہ گیلک، آئبیرین اور بہت سی اور کم و بیش بربریت میں رہنے والی قوموں کو روما کی اولوالعزمی نے ایک قومی شیرازہ میں منسلک کر لیا تھا، ہاں، اگر ہم ایسی قوموں کو نظر انداز کر دیں تو یہ بات صاف ہے کہ جو قوم خود اپنا تمدن بنا سکتی اور اسے صدیوں تک قائم رکھ سکتی ہے اس کی موت بس دو وجوہ سے آسکتی ہے اور آتی بھی ہے۔ یہ وجوہ اسے اندر سے گھن کی طرح کھا کھا کر کھوکھلا کر دیتی ہیں اور پھر باہر سے ذرا سا دھکا انھیں ختم کر دینے کے لئے کافی ہوتا ہے۔ اور تقدیر کا کرشمہ دیکھئے یہ دونوں وجہیں ایک دوسرے سے اکثر وابستہ ہوتی ہیں۔ قومیں واقعی مرتی اس وقت ہیں جب ان کے برسر اقتدار طبقہ میں یہ صلاحیت باقی نہیں رہتی کہ زمانہ کی بدلتی ہوئی ضرورتوں کے ساتھ اپنی نئی تنظیم کر سکیں اور جماعت کی پست ترین گہرائیوں سے نئے عناصر کو ابھار کر اپنے خون کی تجدید کر سکیں۔ اور جیسا کہ اوپر کہہ چکا ہوں موت ان قوموں کے لئے بھی مقدر ہے جن میں وہ اخلاقی قوتیں فنا ہو جائیں جو انھیں مجتمع کئے رہتی ہیں اور جن کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انفرادی مساعی کی ایک بڑی تعداد متفق و متحد و منظم ہو کر ایک ہی مشترک مقصد کی خادم بن جاتی ہے، بالفاظ دیگر، بڑھاپا جو موت کا پیش خیمہ ہے، ان سیاسی تنظیمات پر طاری ہوتا ہے جن میں وہ خیالات و جذبات اپنا تسلط کھو چکتے ہیں جو ان کی انفرادیت کے برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہیں اور ایسے نئے خیالات و جذبات پیدا نہیں ہوتے جو انھیں مشترک اور متحد سعی کے قابل بنا سکیں۔

اسی حقیقت سے روایات، رسم و رواج، اور بزرگوں کی ریت سے اس وابستگی کی توجیہہ ہوتی ہے جو عراق و مصر کی پرانی ریاستوں سے لے کر سلطنت روما کے عہد تک قدیم اقوام کے مذہب اور سیاسی ذہنیت کی بنیاد تھی۔ یہی وابستگی چند نسل پہلے تک چین و جاپان میں کارفرما رہی اور جس سے باوجود اس کے کہ ظاہر صورت اس کے خلاف ہے خود یورپ کی جدید اقوام بھی ناآشنا نہیں، خصوصاً اینگلو سکسن نسل کی قومیں۔ قوم بظاہر جبلی طور پر محسوس کرتی ہے کہ اگر اسے مرنا نہیں ہے تو بعض اصولوں اور بعض بنیادی خصائص کا پابند رہنا ازبس ضروری ہے اور یہ اصول اور خیالات ان تمام اجزاء میں جاری و ساری ہوتے ہیں جن سے قوم عبارت ہے۔ وہ محسوس کر لیتی ہے

کہ اس کی شخصیت اسی طرح قائم اور اس کی مخصوص اجتماعی ہیئت اسی طرح برقرار رہ سکتی ہے کہ اس سے ہی ہر الگ الگ تیھر کو وہ چونا میسر ہوتا ہے جو ان سب کو باہم جوڑے رکھتا ہے۔

اگر ماضی کی پرستش میں مبالغہ ہو اور دوسری قوتیں اس کی وجہ سے یک قلم اثر انداز نہ ہو سکیں تو پھر خوش قسمتی کہیئے یا بدقسمتی اس کا لازمی نتیجہ جمود ہوتا ہے۔ لیکن جمود ولاپا داش بس اسی وقت ممکن ہے کہ دوسری تمام قومیں بھی حرکت نہ کریں۔ چین و جاپان نے سترھویں، اٹھارویں اور کچھ کچھ انیسویں صدی میں یہ کوشش کی تھی کہ کامل سکون کی حالت میں زندگی گزاریں۔ لیکن اس میں کامیابی نہ ہوئی اور انھیں اس سکون سے نہایت سختی کے ساتھ جھنجھوڑ کر باہر گھسیٹا گیا۔ اور یہ بات ہے بھی قدرتی۔ اس لئے کہ کامل جمود انسانی جماعت کے لئے ایک مصنوعی سی کیفیت ہے۔ خیالات، جذبات اور رسوم کا دائمی تغیر فطری ہے اور اس تغیر کا اظہار سیاسی تنظیمات سے ہونا ضروری ہے۔ اگر اس بات کو روکنا منظور ہو تو ان تمام اثرات کو مٹانا ہوگا جو مشاہدہ و تحقیق، اشاعت علوم اور وسعت تجربہ سے رونما ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کی موجودگی میں تو نئی ذہنیت کا پیدا ہونا اور ان نئے جذبات کا نشو و نما پانا ناگزیر ہے جن سے اجداد کی تعلیمات پر یقین اور روایتی خیالات پر بھروسہ، جو سیاسی عمارت کی بنا ہے، اکثر اوقات اندر ہی اندر سے کمزور ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایک یونانی جو فلاطون اور ارسطو کے ساتھ رہتا سہتا ہو ان دیوتاؤں پر مشکل ہی سے عقیدہ رکھ سکتا تھا جو ہومر نے انسانی شکلوں میں پیش کئے ہیں؛ اور اس بات کے تسلیم کرنے پر تو وہ اور بھی آمادہ نہ ہوتا کہ یہ دیوتا یونانی شہروں کے فرمانرواؤں کو جنھیں یونان کے سب سے بڑے شاعر نے مخلوق کا چرواہا قرار دیا ہے، برابر مشورہ دیتے رہتے ہیں اور ان کے پشت پناہ ہیں۔ والٹیر کا کوئی ہمعصر فرانسیسی مشکل ہی سے باور کرسکتا کہ لوئی پانزدہم کو خدا کی طرف سے فرانس پر حکومت کرنے کا فرض تفویض ہوا ہے۔ اور ایک چینی یا جاپانی جو کسی یورپی یا امریکی یونیورسٹی میں پڑھ آیا ہے بمشکل اس یقین کو محفوظ رکھ سکتا ہے کہ حکمت انسانی کا مکمل ترین و جامع ترین اظہار بس کنفوسیوس کی تصانیف میں ہے۔

ان حالات سے ظاہر ہے کہ ان سخت انتشارات اجتماعی کو جن سے تہذیب کا کوئی خاص نمونہ ختم ہوتا اور جس کے باعث متعلقہ نسلوں کو بے حساب مصائب سے دوچار ہونا پڑتا ہے، یعنی اس چیز کو جسے ریاست یا قوم کی موت کہتے ہیں ٹالنے کی بس ایک تدبیر ہے۔ اور وہ تدبیر یہ ہے کہ آہستہ آہستہ مگر مسلسل اخلاقی اتحاد عمل

کے نئے عناصر پیدا کیے جائیں جو پرانوں کی قایم مقامی کرسکیں۔ غالباً اس معاملہ میں بھی بہترین نتائج اسی طرح حاصل ہوسکتے ہیں کہ دو فطری طور پر متضاد رجحانات میں یعنی تحفظ و تجدید، بقا و تغیر کے رجحانات مخالفہ میں صحیح توازن قائم رکھا جائے۔ بالفاظ دیگر ایک سیاسی تنظیم، ایک قوم یا ایک تمدن صحیح معنوں میں غیر فانی ہوسکتے ہیں اگر وہ یہ کرسکیں کہ اپنے کو برابر بدلتے رہیں مگر کبھی منتشر نہ ہونے دیں۔

اور اگر واقعی قوموں کی موت، سیاسی تنظیمات کا مکمل انتشار، اور پیہم و شدید مصائب اجتماعی، جن سے تمدن کی ترقی بالکل رک جاتی اور انسانیت پھر سے بربریت کے قعر میں جا پڑتی ہے، کبھی مٹائے جاسکیں گے تو اس میں یقیناً علم سیاست کی ترقی اور اثر کو بہت کچھ دخل ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ گذشتہ زمانہ میں بارہا محض سیاسی تجربہ نے ایسے انتشارات کو روکا تھا ما ہے بشرطیکہ اس تجربہ کو کسی غیر معمولی دماغ نے روشن کر دیا ہو اور کسی غلط تعلیم نے اسے گمراہ نہ کر دیا ہو۔ اس لئے مجھے یہ بات بالکل صاف معلوم ہوتی ہے کہ اگر ان قوانین کا صحیح علم ہو جائے جو انسان کی اجتماعی فطرت میں کارفرما ہیں تو یقیناً یہ علم شخصی تجربہ سے زیادہ موثر ثابت ہوگا۔ اس علم سے ہمیں کم سے کم اس میں تمیز کرنا آجائے گا کہ کن چیزوں کا وقوع ممکن اور کن کا سرے سے ممکن ہی نہیں ہے۔ اور اس طرح کم از کم یہ تو نہ ہوا کرے گا کہ بہتیرے نیک ارادے اور بہت ساری خوش نیتی اس میں ضائع جائے بلکہ الٹی نقصان دہ ثابت ہو کہ آدمی خواہ مخواہ جماعتی زندگی میں اس تکمیل کی امید لگا بیٹھے جو کبھی حاصل ہی نہیں ہوسکتی، علاوہ بریں اس سے یہ بھی ممکن ہو جائے گا کہ سیاسی زندگی میں بھی وہی طریقے برتے جائیں جن کا استعمال انسانی ذہن قدرت کی قوتوں کو قابو میں لانے کے وقت کیا کرتا ہے۔ اور وہ طریقہ بس یہی تو ہے کہ آدمی ان قوتوں کے فعل کو توجہ سے مشاہدہ کرتا ہے، انھیں سمجھتا ہے، اور انھیں مسترد کئے بغیر ان کے عمل کو کم و بیش بدلتا رہتا ہے۔

میں کہیں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ میری رائے میں انیسویں صدی میں اور بیسویں صدی کے اس ابتدائی زمانہ میں علم تاریخ کی ترقیات اور علوم اجتماعی کی تصریحات نے یقینی واقعات اور حکمی معلومات کا ایسا ذخیرہ فراہم کر دیا ہے کہ موجودہ اور آنے والی نسل کے لئے ایک واقعی علمی سیاست کی تدوین ممکن ہوگئی ہے۔ اور یہ وہ بات ہے جو پہلی نسلوں کے لئے ناممکن نہ تھی۔ البتہ یہ بتلانا بہت دشوار ہے کہ یہ علم اپنے کو عمل کے لئے موثر کب بنا سکے گا۔ یہ ایک عنصر فعال کی حیثیت کب اختیار کرے گا جس سے دوسرے عناصر عمل کی تکمیل اور ان میں تغیر ممکن ہو تصورات

کا کوئی نظام، علمی سیاسی قوت اس وقت بن سکتا ہے جب وہ کم سے کم حکمراں طبقہ کی اکثریت کا جزو ذہن بن جائے اور ان کے خیالات و احساسات پر اسے غلبہ حاصل ہو جائے۔ مگر اس غرض کے لئے وہ خیالات سب سے کم موزوں ہو جاتے ہیں جو واقعی علمی ہوں، اس لئے کہ ان میں لوچ یا تطابق کی صلاحیت نہیں ہوتی اور اسی لئے ان میں بہت کم یہ قوت ہوتی ہے یا بالکل نہیں ہوتی کہ ان جذبات کا رخ موڑ سکیں جو کسی خاص وقت غلبہ پاتے ہیں یا کسی وقتی غرض کے پورا کرنے میں مدد دے سکیں۔

[ذیل میں ہم فاشستی مذہب کے بانی "مسولینی" کا ایک مقالہ ترجمہ کرکے پیش کرتے ہیں۔ یہ مقالہ مسولینی نے ۱۹۳۲ء میں *Encyclopodia Italiana* کی چودھویں جلد کے لئے لکھا تھا۔ اس سے اس نئے سیاسی مذہب کی فلسفیانہ اساس اور بانی مذہب کی ذہنیت پر خوب روشنی پڑتی ہے۔ مدیر]

---

(۱)

اب تو اس بات کو بہت زمانہ ہونے آیا۔ جب میں نے ۱۹۱۹ء میں میلان کے اندر پوپولو ڈاٹالیہ میں دعوت دے کر جنگ عظیم میں مداخلت کی حامی جماعت کے ان سب اراکین کو یکجا کیا تھا جو خود جنگ میں شریک ہو چکے تھے اور جنوری ۱۹۱۵ء میں فاشستی انقلابی جماعت کے قیام کے بعد سے برابر میرے ساتھ تھے۔ تو اس جلسہ کے وقت میرے ذہن میں کوئی خاص مسلک یا مذہب نہ تھا۔ مجھے ذاتی تجربہ صرف ایک مذہب کا تھا یعنی اشتراکیت کا۔ کوئی دس برس کا تجربہ یعنی ۱۹۰۳ء سے ۱۹۱۴ء کے موسم سرما تک۔ لیکن اگرچہ میں اس تحریک میں پہلے ایک معمولی رکن کی حیثیت سے اور پھر بہ حیثیت قائد حصہ لیتا رہا مگر اشتراکی مذہب کا تجربہ عمل میں مجھے کبھی نہ ہوا تھا۔ اور میرا مسلک ذاتی اس زمانہ میں بھی عمل کا مسلک تھا۔

۱۹۰۵ء کے بعد سے اشتراکیت کا کوئی ایسا نظریہ نہ تھا جسے سب بلا اختلاف مانتے ہوں۔ اس لئے کہ مذہب اشتراک میں ترمیم کی تحریک برنشٹائن کی قیادت میں اٹھ چکی تھی۔ ادھر حالات وقت کے اثر سے ایک انتہا پسند انقلابی تحریک بھی رونما ہو چکی تھی جو اگرچہ اٹلی میں کبھی بھی باتوں سے آگے نہیں بڑھی، مگر روس میں اسی پر بولشویک مذہب کی بنیاد قائم ہوئی۔ غرض اصلاح، "انقلاب" اور مرکزیت یہ وہ الفاظ تھے جن کی صدائے بازگشت بھی آج ختم سی ہو چکی ہے۔ مگر فاشستی تحریک کے بہتے دھارے میں ان خیالات کا پتہ چلتا ہے جو سوریل اور پیگی سے شروع ہوئے تھے اور لاگردیل کی "تحریک اشتراکی" *Mouvement Socialiste* سے، یا اطالوی حزب العمال کی

تحریک سے جس نے ۱۹۰۴ء سے ۱۹۱۴ء تک اطالوی اشتراکی حلقوں میں ایک نیا عنصر شامل کر دیا تھا، جسے گیولیٹی کی دغا نے بہت کچھ کمزور کر دیا۔

۱۹۱۹ء میں جنگ عظیم کے بعد اشتراکیت بہ حیثیت ایک مسلک کے ختم ہو چکی تھی۔ بس ایک نفرت باقی تھی۔ عمل کا صرف ایک امکان اس کے لئے تھا، خصوصاً اٹلی میں یعنی ان لوگوں سے انتقام جنھوں نے جنگ کی حمایت کی تھی اور جنھیں اب اس کے نتائج کا کفارہ دینا چاہئے تھا۔ میرے اخبار 'پوپولو ڈاٹالیہ' کا دوسرا نام ان دنوں تھا "سابق سپاہیوں اور دولت آفریں جماعت کا اخبار"۔ اور یہ الفاظ "دولت آفریں جماعت" اسی وقت سے ایک ذہنی رجحان کا پتہ دے رہے تھے۔ فاشستی تحریک کسی ایسے مسلک کی پیداوار نہیں ہے جس کی پہلے سے مفصل طور پر تدوین ہو چکی ہو۔ اسے تو عمل کی ضرورت نے پیدا کیا ہے۔ اسی لئے پہلے دن سے یہ اس قدر نظری نہیں ہے جس قدر عملی ہے۔ فاشزم محض ایک اور سیاسی جماعت کا نام نہیں ہے۔ یہ تو اپنی زندگی کے پہلے دو سال میں بھی سب سیاسی جماعتوں کا مخالف رہا۔ یہ تو بجائے خود ایک زندہ تحریک ہے۔

میں نے اس زمانہ میں اسے جو نام دیا اس سے گویا اس کی ماہیت متعین ہو گئی۔ پھر بھی اگر کوئی اس زمانہ کے اخباروں کی گرد آلود مسلیں الٹے پلٹے اور اس جلسہ کی کارروائی پڑھے جس میں *Fasci Italiani di combattimento* نامی جماعت کی تشکیل ہوئی تھی تو وہاں کسی مرتب مسلک کی تعلیمات نہ ملیں گی بلکہ کچھ جوامع الکلم ہوں گے، کچھ امیدیں اور کچھ حوصلے، جو اپنی اصل حالت سے تپ تپا کر ایک دن اس مسلک کے تصورات ترکیبی بننے والے تھے جسے فاشستی سیاسی مسلک کہتے ہیں اور جو حال و ماضی کے تمام اور مسلکوں سے جدا ہے۔

میں نے اس وقت کہا تھا کہ "اگر سرمایہ دار طبقہ یہ سمجھتا ہے کہ ہمارا کام صرف اتنا ہے کہ جو بجلی ان پر گرنے والی ہے اسے اپنے اندر سے گذار دیں تو وہ بہت دھوکے میں ہے۔ ہمیں تو اپنا کام فوراً شروع کر دینا چاہئے ...... ہم تو محنت کرنے والے گروہ کو حقیقی اور موثر قیادت کا عادی بنانا چاہتے ہیں۔ اور انھیں یقین دلانا کہ کسی صنعتی یا تجارتی کاروبار کو کامیابی سے چلانا سہل کام نہیں ہے ...... ہم ہر رجعت پسندی کا مقابلہ کریں گے، چاہے وہ صنعتی ہو چاہے روحانی ...... جب مسند حکومت پر جانشین کی جگہ خالی ہو تو ہمیں اس کے لئے لڑنے

کو بھی تیار رہنا چاہیئے .... ہمیں عجلت کی ضرورت ہے، جب موجودہ حکومت ٹوٹے تو ہمیں اس کی جگہ لینے کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ جانشینی کا حق ہمیں تو پہنچتا ہے، اس لئے کہ ملک کو جنگ میں شریک ہونے پر مجبور ہمیں نے کیا تھا اور ہمیں نے اسے فتحیاب کرایا......... سیاسی نمائندگی کا موجودہ طریقہ بالکل ناکافی ہے، نمائندگی براہ راست افراد متعلقہ کی ہونی چاہیئے......... اس لائحۂ عمل کے خلاف یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ یہ تو اسی 'کارپوریشن' کے خیال کی طرف لوٹتا ہوا۔ اگر ایسا ہے تو بھی کیا مضائقہ ہے....
..... لہٰذا میری خواہش ہے کہ یہ جمعیتہ معاشی نقطۂ نظر سے قومی حزب العمال کی حمایت کو از سر نو قبول کرے۔"

کیا یہ عجیب بات نہیں کہ اس پہلے دن بھی پیازاسان سیولکرو میں لفظ "کارپوریشن" منہ پر آیا جو پھر بعد کو دوران انقلاب میں وہ ادارہ ثابت ہوا جسے جماعتی قانون سازی نے ترتیب دے کر ہمارے عہد کی بنیاد بنا دیا ہے۔

---

(۲)

روم پر چڑھائی سے پہلے کا زمانہ بڑی دشواریوں کا زمانہ تھا۔ عمل کی ضرورتوں میں تحقیق علمی اور تکمیل مسلک کی فرصت کہاں تھی؟ قصبوں اور گانووں میں جنگ کرنی تھی۔ بہت کچھ بحث مباحثہ بھی ہوتا تھا، مگر جو بات اہم تھی اور مقدس، وہ یہ کہ لوگ جانیں دے رہے تھے اور جانتے تھے کہ جان کیسے دیتے ہیں۔ ممکن ہے کہ مسلک کی، خوبصورتی سے بیان کئے ہوئے اور اہتمام سے مکمل کئے ہوئے مسلک کی، موٹے موٹے عنوانات کی اور کٹے چھٹے دفعات کی کمی ہو، مگر اس کی جگہ ایک اور چیز لے رہی تھی جو اس سے زیادہ فیصلہ کن تھی یعنی یقین۔

پھر بھی اگر کوئی شخص جو تحقیق کرتا اور مواد سے کام لیتا جانتا ہو، کتابوں اور مضمونوں، کم و بیش اہم کانگریسوں کی قراردادوں اور تقریروں سے اس زمانہ کے واقعات کو سمجھنے کی کوشش کرے تو وہ پائے گا کہ فاشستی مسلک کے اساسی اصول اسی کشاکش کے زمانہ میں ڈھل گئے تھے۔ اسی زمانہ میں فاشستی تخیل نے اپنے کو خوب مسلح کر لیا تھا، اچھی طرح نکھار لیا تھا اور اپنی ذہنی تنظیم کا کام شروع کر دیا تھا۔ انفرادی شہری اور

ریاست کے تعلق کا مسئلہ تھا، اس سے متعلق اقتدار اور آزادی کے مسائل تھے، سیاسی اور جماعتی مسائل بھی تھے اور مخصوص قومی مسائل بھی اور ان سب کے لئے حل کی تلاش تھی۔ اُدھر لبرلزم، جمہوریت، اشتراکیت اور فری میسن جماعتوں سے مقابلہ بھی جاری تھا۔

لیکن چونکہ نظم و ترتیب کا نہ ہونا ان حالات میں ناگزیر تھا اس لئے فاشزم کے مخالفوں نے اس کی اس صلاحیت ہی سے انکار کیا ہے کہ وہ کوئی منظم مسلک پیش کر سکتا ہے۔ اگرچہ ان کی آنکھوں کے سامنے ہی یہ مسلک نشوونما پاتا رہا اور مرتب ہوتا رہا ہے، پہلے جیسا کہ سب نئے خیالات کا حال ہوتا ہے کچھ شور و شغب کے ساتھ اور ایک شدید بے دلیل انکار کی صورت میں اور بعد کو مثبت تعمیری حیثیت سے اس نے ان قوانین اور اداروں کی شکل اختیار کی جو ۱۹۲۶ء، ۱۹۲۷ء اور ۱۹۲۸ء میں فاشسٹی حکومت نے نافذ کئے ہیں۔

اس وقت فاشزم ایک بالکل نرالی چیز ہے، بہ حیثیت عہد حکومت کے بھی اور بہ حیثیت مسلک سیاسی کے بھی۔ اور اس کے معنی یہ ہیں کہ آج فاشزم خود اپنے اوپر اور دوسروں پر اپنی تنقیدی استعداد سے کام لینے کے بعد ایک واضح اور مخصوص نقطۂ نظر قائم کر چکا ہے، جس کی طرف وہ رجوع کر سکتا ہے اور تمام معاملات میں جن سے دنیا اس وقت دوچار ہے، چاہے عملی ہوں یا ذہنی، یہ اس کی روشنی میں عمل پیرا ہو سکتا ہے۔

اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ وقت کی سیاسی مصلحتوں سے قطع نظر فاشزم جس قدر انسانیت کے مستقبل اور اس کی نشوونما پر نگاہ ڈالتا ہے تو نہ امن عام کا فائدہ سمجھ میں آتا ہے، نہ اس کے امکان پر یقین۔ لہذا یہ امن پرستی کے مسلک کو رد کرتا ہے، کہ یہ ترک سعی کا مسلک ہے اور قربانی و ایثار کے مقابلہ میں بزدلی کا مظاہرہ۔ جنگ ہی انسانی قوت کو بلند ترین درجہ تک پہنچا سکتی ہے اور جن قوموں میں اس کی صلاحیت ہے ان پر شرافت کی مہر ثبت کر دیتی ہے۔ باقی سب آزمائشیں بس بدل اور قائم مقام ہیں جن سے آدمی کبھی اس جگہ نہیں پہنچتا جہاں ایک عظیم الشان فیصلہ کرنا ضروری ہوتا ہے یعنی زندگی اور موت میں فیصلہ۔ لہذا جو مسلک امن کے اس مضر نظریہ پر مبنی ہو وہ فاشزم کا مخالف ہے۔ اسی طرح فاشزم کی روح کے منافی ہیں تمام بین الاقوامی جمعیتیں اور انجمنیں۔ ہر چند کہ مخصوص حالات سیاسی کی وجہ سے کبھی انھیں تسلیم ہی کیوں نہ کرنا پڑے اور تاریخ بتا دیگی کہ اگر ایک مرتبہ بھی کسی محرک سے قوی قومی جذبہ بیدار ہو گیا تو وہ جذباتی محرک ہو یا خیالی یا عملی، یہ سب جمعیتیں اور انجمنیں منتشر

ہو کر ہوا میں اڑتی پھریں گی۔

یہ امن پرستی کی مخالف ذہنیت فاشزم نے افراد کی زندگی میں بھی شامل کر دی ہے۔ سکواڈرسٹا کا یہ پرغرور مقولہ Me ne frego جو زخم کی پٹیوں پر لکھا ہوتا ہے محض stoic فلسفہ نہیں ایک سیاسی مسلک کا خلاصہ نہیں، بلکہ مقابلہ و مبارزت کی تعلیم ہے، مقابلہ کے خطروں کو اٹھانے کا درس ہے، اور اٹلی کے لئے زندگی کی ایک نئی راہ کی علامت ہے۔ غرض یہ کہ فاشسٹ زندگی کو قبول کرتا ہے اور اس سے محبت کرتا ہے، یہ خودکشی کا نام نہیں جانتا اور اسے بڑی حقارت سے دیکھتا ہے۔ اس کے نزدیک زندگی ایک فریضہ ہے، ایک کشمکش اور ایک فتح۔ اس کے نزدیک زندگی بلند ہونی چاہئے اور پر، اپنی خاطر بھی زندہ رہنا چاہئے لیکن اس سے زیادہ دوسروں کے لئے، ان کے لئے جو قریب ہیں اور ان کے لئے جو دور ہیں، ان کے لئے جو اس وقت موجود ہیں اور ان کے لئے جو بعد کو آئیں گے ....

فاشسٹ واقعی اپنے ہمسایہ سے محبت کرتا ہے۔ لیکن یہ ہمسایہ اس کے لئے کوئی غیر واضح اور دھندلا تصور نہیں ہوتا۔ اس ہمسایہ کی محبت کی وجہ سے ضروری تعلیمی و تادیبی سختی میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی، نہ یہ فرق مراتب میں حائل ہوتی ہے۔ فاشزم کسی "عالمگیر معانقہ" کا قائل نہیں۔ مہذب اقوام کی جمعیۃ میں اچھی طرح زندہ رہنے کے لئے وہ اپنے معاصرین پر نہایت تیز نگاہ رکھتا ہے، ان کی کیفیت دماغی کو اچھی طرح دیکھتا رہتا ہے، اور ان کے اغراض کے متغیر رجحانات میں کسی عارضی اور فریب دہ ظاہرداری سے دھوکا نہیں کھاتا۔

زندگی کے اس تصور نے فاشزم کو اس نظریہ کی ضد بنا دیا ہے جو نام نہاد علمی مارکسی اشتراکیت کی بنیاد ہے، یعنی تاریخ کی مادی تعبیر کا نظریہ، جس کی رو سے تہذیب انسانی کی تاریخ کی تشریح بس مختلف جماعتی طبقوں کے اغراض کے تصادم سے اور وسائل و ذرائع دولت آفرینی میں تغیر و ترقی سے ہو سکتی ہے۔ اس بات سے بے شک کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ معاشی زندگی کے تغیرات مثلاً نئے اجناس خام اور انھیں کارآمد بنانے کے نئے طریقوں کی دریافت اور سائنس کے نت نئے اختراعات سے بہت کچھ اثر پڑتا ہے لیکن یہ کہنا کہ تاریخ انسانیت کی تشریح ان سے ہو سکتی ہے اور دوسرے تمام عناصر کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے ایک دھوکا ہے۔ فاشزم آج بھی

اعتقاد رکھتا ہے اور ہمیشہ رکھیگا تقدس پر اور شجاعت پر یعنی ان اعمال پر جن میں براہ راست یا بالواسطہ کوئی اثر کارفرما نہیں ہوتا۔

اور اگر تاریخ کا یہ مادی تصور تسلیم نہ کیا جائے جس کی رو سے انسان بس کٹھ پتلیاں ہیں جنھیں بخت و اتفاق کی موجیں کبھی اِدھر لاڈالتی ہیں کبھی اُدھر کہ اصلی موثر قوتیں تو ان کے قابو سے باہر ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم جنگ طبقات کے تصور کے بھی منکر ہیں جو اس نظریۂ تاریخ کا ناگزیر نتیجہ ہے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ فاشزم اس بات کا منکر ہے کہ جماعتی زندگی کو بدلنے میں جنگ طبقات کی قوت ہی سب سے غالب قوت ہے۔

اشتراکیت کے ان دو بنیادی اصولوں کو رد کرنے کے بعد اس میں سوائے ان جذباتی آرزوؤں کے اور کیا رہ جاتا ہے کہ کوئی ایسا جماعتی نظم ہو جائے کہ انسانی رنج و تکلیف میں کمی ہو سکے اور یہ آرزو اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ خود انسانیت۔ لیکن اس میں بھی فاشزم 'معاشی' مسرت کا منکر ہے جسے اشتراک پورا کرنا چاہتا ہے اور معاشی ارتقا کے ایک خاص لمحہ میں ہر ایک کو مادی خوشحالی کی زیادہ سے زیادہ مقدار فراہم کر دینے کی امید دلاتا ہے۔ فاشزم مسرت کے مادی تصور اور اس کے امکان سے بھی انکار کرتا ہے اور اسے اپنے مخترعین یعنی انیسویں صدی کے نصف اول کے معاشیین کے لئے چھوڑ دینا چاہتا ہے۔ یعنی فاشزم اس حسابی مساوات کا منکر ہے جس کی رو سے مادی خوشحالی برابر ہوتی ہے مسرت کے کہ اگر یہ صحیح ہو تو انسان حیوانوں کی سطح پر اتر آئے جنھیں بس ایک ہی چیز کا دھیان ہوتا ہے کہ خوب کھائیں اور موٹے ہوں، اور اس کی وجہ سے انسانیت خالص جسمانی وجود کی پستیوں میں پہنچ جاتی ہے۔

(باقی)

دنیا کی رفتار

جمعیتہ اقوام اور جنگ حبش

اٹلی اور حبش میں بالآخر جنگ شروع ہوگئی۔ بین الاقوامی مشوروں سے بس یہ کام نکلا کہ اٹلی نے پوری طرح تیاریاں کرلیں اور پھر وقت مقررہ پر فوجی اقدام شروع کر دیا۔ جمعیتہ اقوام نے غالباً برطانوی اثر سے اٹلی پر نقض امن کا الزام لگا دیا ہے اور اب اپنے دستور کی مختلف دفعات کے ماتحت اٹلی کے خلاف مناسب کارروائیوں کا مسئلہ درپیش ہے۔

جمعیتہ کے دستور کی جن دفعات کا ذکر اس سلسلہ میں آیا ہے وہ دفعہ ۱۰، ۱۱، ۱۳ (شق ۴)، ۱۵ (شق ۶ و ۷) اور دفعہ ۱۶ ہیں۔ دفعہ ۱۰ کی رو سے ارکین جمعیتہ پر یہ فرض عاید ہوتا ہے کہ باقی تمام ارکین جمعیتہ کی مملکت اور ان کی سیاسی خودمختاری کا احترام کریں اور انھیں خارجی حملوں سے محفوظ رکھیں۔ اور اسی دفعہ میں یہ عام اور غیر متعین سی شق ہے کہ اگر حملہ ہو جائے تو جمعیتہ کی کونسل ان تدابیر کے متعلق ہدایت کرے گی جن سے یہ فرض پورا کیا جاسکے۔

دفعہ ۱۱ کے الفاظ بھی بہت عام اور غیر واضح ہیں۔ اس کی رو سے "قوموں میں امن کے تحفظ کے لئے جمعیتہ ہر مناسب اور موثر تدبیر کیا کرے گی۔"

دفعہ ۱۳ (شق ۴) کا مفاد یہ ہے کہ اگر کوئی ریاست کسی ثالثی یا عدالتی فیصلہ کو تسلیم نہ کرے تو جمعیتہ کی کونسل اس فیصلہ کو نافذ کرانے کی تدابیر تجویز کرے گی۔

دفعہ ۱۵ (شق ۶ و ۷) میں ارکین جمعیتہ اس امر کا اقرار کرتے ہیں کہ کسی تنازع میں وہ اس فریق کے خلاف جنگ نہ کریں گے جس نے جمعیتہ کی کونسل کی سفارشات کو تسلیم کرلیا ہو بشرطیکہ یہ سفارشیں فریقین کو چھوڑ کر باقی سب ریاستوں نے باتفاق رائے منظور کی ہوں۔ اور اگر یہ اتفاق رائے نصیب نہ ہو تو پھر ہر ایک ریاست کا یہ حق محفوظ ہے کہ وہ حق و انصاف کے قیام کے لئے جو کارروائی مناسب سمجھے کرے۔

لیکن ان دفعات کی عدم وضاحت کے مقابلہ میں دفعہ ۱۶ بالکل واضح ہے اور اس میں حملہ آور کے خلاف کارروائیوں کی تفصیل ہے مگر ان کارروائیوں کے اختیار کرنے کی شرط یہ ہے کہ جمعیتہ کا کوئی رکن دستور کی دفعات ۱۲،

۱۳ اور ۱۵ کی خلاف ورزی کرکے جنگ شروع کردے۔ ایسی صورت میں سمجھا جائے گا کہ اس نے تمام اراکین جمعیتہ کے خلاف ایک جنگی کارروائی کی ہے اس لئے وہ ذمہ داری لیتے ہیں کہ فوراً اس پر ایسا دباؤ ڈالیں گے کہ وہ قانون جمعیتہ کی پابندی پر مجبور ہو جائے۔ اور پھر اس کے بعد اسی دفعہ میں دباؤ ڈالنے کی تدابیر کی تفصیل ہے۔ اس دفعہ میں اہم بات یہ ہے کہ جس ریاست کے خلاف یہ تدابیر اختیار کی جائیں اس نے واقعی جنگ شروع کردی ہو۔ غالباً اسی خیال سے اٹلی نے جنگ تو شروع کردی ہے مگر اعلان جنگ نہیں کیا!

اس سلسلہ میں دباؤ ڈالنے کی جو تدابیر اختیار کی جاسکتی ہیں ان کی چار قسمیں کرسکتے ہیں (۱) اخلاقی اور سیاسی تدابیر (۲) مالی اور معاشی تدابیر (۳) بین الاقوامی مقاطعہ (۴) فوجی تدابیر۔

اخلاقی اور خالص سیاسی تدابیر اسی وقت تک کارگر ہوتی ہیں کہ سابقہ کسی کمزور سے ہو۔ اسی وقت بین الاقوامی رائے عامہ کا پاس بھی ضروری ہوتا ہے اور سیاسی تعلقات کے انقطاع کا ڈر بھی کچھ کارگر ہوتا ہے ورنہ جب کوئی طاقتور ریاست شر پر آمادہ ہوتی ہے تو وہ رائے عامہ اور سیاسی تعلقات کی زیادہ پروا نہیں کرتی۔ نہ اس کا خیال رکھتی ہے کہ اس کے اعمال کے نتائج کو باقی حکومتیں تسلیم کریں گی یا نہیں۔ جاپان نے چین میں جو کیا اس میں دنیا کی رائے عامہ کیا کرسکی۔ جمعیتہ اقوام نے جب منچوکو کی ریاست کو اپنی قرارداد مورخہ ۱۱ مارچ ۳۵ء کی رو سے تسلیم نہیں کیا تو کیا جاپان نے زبان حال سے یہ جواب نہ دیا کہ "کردم و شد" لیکن بہرحال وضع داری کے سلسلہ میں یہ چیزیں بھی ابھی تک غاصب کو غصب سے روکنے کی تدابیر میں شمار ہوتی ہیں۔

مالی تدابیر میں طویل مدت کے لئے قرض اور تھوڑی مدت کے لئے ساہوکارہ اور تجارت میں ادھار کا انتظام کرنے سے انکار کرنا خاصی مؤثر تدبیر ثابت ہو سکتی ہے۔ یہ دباؤ ضرورت پڑتے ہی ڈالا جاسکتا ہے اور اگر بروقت ڈالا جائے تو خاصا مؤثر ثابت ہو سکتا ہے۔ لیکن اس میں بھی دشواریاں ہیں۔ ایک تو یہ کہ ادھار اور اعتبار کا جال کچھ ایسا پیچیدہ ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ اس میں آسانی سے یہ پتہ چل سکے کہ ادھار کسے دیا گیا۔ بظاہر کسی کو دیا جاسکتا ہے اور استفادہ کوئی اور کرسکتا ہے۔ دوسرے جس کے خلاف یہ تدبیر اختیار کی جائے وہ بھی یہ کرسکتا ہے کہ اپنے تمام سابقہ قرضوں کی ادائگی سے انکار کر بیٹھے۔ البتہ مالی تدابیر کو بہت زیادہ مؤثر بنایا جاسکتا ہے اگر مظلوم قوم کے لئے زمانہ جنگ میں مالی آسانیوں کا انتظام کیا جاسکے۔ چنانچہ ۱۹۳۰ء میں مظلوم اقوام کی مالی امداد

کے متعلق ایک معاہدہ کا مسودہ بنا تھا اور اس پر بہت سی ریاستوں کے دستخط بھی ثبت ہو چکے تھے (جس میں اٹلی بھی شامل ہے!) لیکن اس معاہدہ کا نفاذ ابھی تک نہیں ہوا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اٹلی اور حبش کے قضیہ میں حبش کو مالی امداد پہنچانے کے متعلق اراکین جمعیۃ کا رویہ کیا رہتا ہے۔

معاشی تدابیر میں سب سے پہلے تو یہ ہو سکتا ہے کہ جمعیۃ ان اسلحہ اور ان تمام اشیاء خام کی برآمد ممنوع قرار دے جو جنگ کے لئے لابد ہیں۔ لیکن اگر تمام اراکین جمعیۃ عملاً ایسا کر بھی دیں تو بھی یہ تدبیر کارگر اسی وقت ہو سکتی ہے کہ جو ملک جمعیۃ کے رکن نہیں ہیں (مثلاً امریکہ، جرمنی اور جاپان) وہ بھی اس پر عمل کریں۔ اگر یہ ایسا کرنے پر آمادہ نہ ہوں تو جمعیۃ کو یہ طے کرنا ہوگا کہ بحری ناکہ بندی کی جائے یا نہیں۔ ناکہ بندی میں ان قوموں سے بھی جنگ کے امکانات پیدا ہو جائیں گے۔

لیکن معاشی اعتبار سے اس سے زیادہ موثر چیز یہ ہے کہ اراکین جمعیۃ غاصب ملک کے مال کی درآمد اپنے یہاں روک دیں۔ اس میں عملی آسانیاں بھی ہیں اور ناکہ بندی کی ضرورت بھی نہیں۔ غاصب اس کی وجہ سے مبادلۂ خارجہ سے محروم ہو جاتا ہے، جس کے سبب وہ دوسرے ملکوں سے بھی بآسانی مال نہیں خرید سکتا۔

رہا مقاطعہ معاشی جو دفعہ ۱۶ کا منشا معلوم ہوتا ہے سو اس کی تاثیر میں کیا کلام۔ مگر اس کی عملی دشواریاں بھی بے حساب ہیں۔ اس دفعہ کی رو سے تمام اراکین جمعیۃ کا فرض ہے کہ فوراً غاصب ریاست سے تمام تعلقات تجارتی و مالی منقطع کر دیں، اپنی رعایا اور غاصب حکومت کی رعایا میں ہر قسم کا ربط ضبط روک دیں، اور غاصب حکومت کی رعایا اور تمام دوسری حکومتوں کی رعایا کے درمیان مالی، تجارتی اور شخصی روابط کو روکیں (چاہے یہ دوسری حکومتیں جمعیۃ کی رکن ہوں یا نہ ہوں)۔ لیکن ایسی کارروائی کے امکانات بہت کم ہیں۔ مقاطعہ کرنے سے بعض حکومتوں کو کم اور بعض کو زیادہ نقصان پہنچنے کا احتمال ہے جن کا انحصار غاصب سے سابقہ تعلقات پر ہے۔ پھر اس کے لئے ناکہ بندی ضروری ہو جاتی ہے جس میں صاف صاف جنگ کی صورت نکل آتی ہے، غاصب سے بھی اور دوسری ریاستوں سے بھی جو جمعیۃ کی رکن نہیں۔

اور جمعیۃ کے دستور میں غالباً انھیں دشواریوں کا خیال کر کے فوجی تدابیر کا ذکر بھی ہے چنانچہ اسی دفعہ ۱۶ میں ہے کہ "ایسے حالات میں کونسل کا فرض ہوگا کہ متعلقہ حکومتوں کو مشورہ دے کہ کس قدر بری،

بحری یا ہوائی فوج ہر رکن جمعیۃ کو اس غرض سے فراہم کرنی ہوگی کہ دستور جمعیۃ کو برقرار رکھا جائے"۔ لیکن مختلف اراکین میں فوجی فراہمی کا تناسب مقرر کرنے کی دشواری، کسی نئی بین الاقوامی فوج کے اجتماع کی دقتیں، پھر اس فوجی قوت کی قیادت کا مسئلہ اور ایسی ہی اور بہت سی باتیں اس سفارش پر عمل کرنے میں حائل ہوں گی۔

بلکہ اس وقت کہ اٹلی کے خلاف برطانیہ کے سخت اصرار پر محض معاشی اور مالی تدابیر اختیار کرنے کا فیصلہ ہوا ہے اس پر سخت اختلاف رائے ہے کہ یہ تدابیر بھی کس انداز سے اختیار کی جائیں۔ ایک طرف تو وہ ہیں جو دفعہ ۱۶ سے اٹلی کا کامل مقاطعہ کرانے کی تدبیریں سوچ رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ وہ قومیں بھی جو جمعیۃ کی رکن نہیں کسی طرح اس بات پر مجبور کی جائیں کہ اٹلی کو مالی و معاشی مدد نہ دیں اور اگر دینا چاہیں تو انھیں روکا جائے۔ دوسری طرف وہ ہیں جو جتاتے ہیں کہ ایسا کیا گیا تو ان دوسری قوموں سے تصادم ہو جائے گا اور ہم معاہدۂ پیرس میں یہ عہد کر چکے ہیں کہ سوائے اپنی ملکی حفاظت کے کسی حال میں جنگ نہ کریں گے۔ لہذا دفعہ ۱۶ کے ماتحت بھی جو کارروائی کوئی ریاست کرے وہ بس اپنے ہی علاقہ میں محدود ہو، اپنے ملک سے باہر نکل کر کچھ کرنا ضروری نہ قرار دیا جائے۔

اس تذبذب اور اختلاف کی صورت میں ظاہر ہے کہ اٹلی کے خلاف معاشی اور مالی دباؤ کی تدابیر بھی کچھ بہت موثر طور پر کام میں نہ لائی جاسکیں گی۔ لیکن اخلاقی لحاظ سے اس میں شک نہیں کہ اٹلی کو جمعیۃ نے غاصب قرار دے کر بڑی جرأت کا ثبوت دیا ہے۔ یوں ہی بڑوں کے جھگڑوں میں ایسی کارروائیاں چند بار ہو جائیں تو شاید بین الاقوامی معاہدوں کی وقعت میں تھوڑا بہت اضافہ ہو۔ فی الحال تو اٹلی نے اس معاشی دباؤ کے مقابلہ کا کچھ نہ کچھ انتظام کر ہی لیا ہے۔ چنانچہ اواخر اگست ہی میں مسولینی نے یہ بیان دیا تھا کہ "فاشستی حکومت اپنا فرض سمجھتی ہے کہ اطالوی قوم کو یہ بتا دے کہ ملک کے اعلیٰ ترین فوجی حکام نے دوسری قوموں کے دباؤ ڈالنے کے مسئلہ پر ہر پہلو سے غور کر لیا ہے اور جہاں تک جنگی دباؤ کا تعلق ہے ان کے مقابلہ کے لئے تمام ضروری فیصلے اور تدابیر کچھ عرصہ ہو چکا کی جاچکی ہیں۔ غذا کے مسئلہ پر بھی غور کیا جاچکا ہے اور اس سال ہماری فصل بہت اچھی ہوئی ہے۔ صنعتی مال کے متعلق حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ حال اور مستقبل کی فوجی ضروریات کے لئے شہری آبادی کو اپنے صرف میں کمی کرنی ہوگی۔ چنانچہ حکومت نے مندرجہ ذیل تدابیر اختیار کرنے کا فیصلہ

کیا ہے :-

(۱) جس شخص کی پردیس میں کوئی رقم یا قیمتی ہو اُسے لازمی طور پر حکومت کے سپرد کر دے اور تمام پردیسی قرضوں کے تمسکات نیز اطالوی قرضوں کے تمسکات کو ۹ سال کے اطالوی تمسکات میں تحویل کرا دیا جائے جن پر ۵ فی صدی سود ملے گا۔

(۲) تمام تجارتی شراکتوں کا منافع عارضی طور پر ۶ فی صدی سے زیادہ نہ دیا جائے۔

(۳) منافع، سود اور تمسکات کی آمدنی پر ۱۰ فی صدی ٹکس لیا جائے۔

(۴) ۱۹۳۷ء کے ختم تک تمام موٹر سے چلنے والی گاڑیوں میں تیل کی جگہ اس کے بدل کا استعمال عام کر دیا جائے۔

ان تدابیر سے اٹلی کو امید ہے کہ وہ معاشی اور مالی دباؤ کو کچھ عرصہ بآسانی جھیل لے گا اور اس عرصہ میں فرانس کسی نہ کسی نہج سے معاملے طے کرا ہی دے گا اور اس کے قرائن اسی وقت سے معلوم ہو رہے ہیں۔ رسالہ جامعہ میں شروع سے یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ اس جنگ میں اٹلی زیادہ دن مبتلا نہیں رہنا چاہتا۔ اس کی مالی حالت کا تقاضا یہی ہو کہ جنگ طویل نہ ہو۔ مگر ملک کی اندرونی سیاسی حالت مجبور کرتی ہے کہ جنگ ہو اور اس میں فتح بھی حاصل ہو۔ حبش کے ملک کو فتح کرنا بہت صبر آزما اور دشوار کام ہے مگر حبش کی غیر منظم افواج پر ابتدائی معرکوں میں فتح حاصل کرنا بہت سہل ہے۔ چنانچہ اٹلی یہ ابتدائی فتوحات حاصل کرنے کے بعد بخوشی مصالحت پر تیار ہو جائے گا۔ مصالحت کے وقت چونکہ جمعیۃ کے فیصلوں اور دنیا کی رائے عامہ کے خلاف ہونے کی وجہ سے اس کی اخلاقی حالت بہت قوی نہ ہوگی اس لئے حبش کی تقسیم میں دوسرے حصہ داروں کو بھی اپنا حق لینے میں آسانی ہوگی۔ غرض مختصر سی جنگ کے بعد معاملات کے طے ہو جانے میں سب کا فائدہ ہے۔ اس لئے شاید یہی صورت پیش آئے۔

جاپان اور حبش | اٹلی اور حبش کی جنگ کے سلسلہ میں حبش کے ساتھ جاپانی ہمدردی کی خبریں بار بار اخبارات میں شائع ہو چکی ہیں۔ پہلے سامان جنگ بھیجنے کی اطلاعیں آئیں، پھر جاپانی فوجی افسروں کے وہاں پہنچنے کی

خبر آئی۔ ان خبروں کی تردید بھی کبھی شائع ہوئی لیکن یہ خبریں ایک ایک کرکے صحیح ہوں یا نہ ہوں اجمالی طور پر یہ کہنا بالکل درست ہوگا کہ جاپان ایشیائی اور افریقی اقوام کی سیادت کا خواب ضرور دیکھ رہا ہے کہ اس سیادت کے صلہ میں ہی اس کی روزافزوں صنعتی قوت کے لئے نئی نئی منڈیاں کھلیں گی۔ حبش کے متعلق جن خبروں کا ذکر ہم نے کیا ان سے اس معاشی رابطہ کا جزوی اظہار ہوتا ہے جو پچھلے چند سال میں جاپان اور حبش کے درمیان قائم ہوگیا ہے۔

ابھی ۱۹۳۱ء تک حبش کی کل درآمد کا تقریباً، ۵ فیصد ہندوستان سے جاتا تھا اور صرف ۱۲ فیصد جاپان سے۔ آج حبش کی کپڑے کی منڈی میں جاپانی مال ۵۰ فیصدی سے کچھ زیادہ ہی ہے۔ جاپانی فوجی انجینئروں کی جماعت بھی عرصہ سے وہاں گئی ہوئی ہے۔ بظاہر اس غرض سے ہوائی جہازوں کے مرکز قائم کرنے میں حکومت کو مشورہ دے۔ ۱۹۳۳ء کے موسم سرما میں حبشی وزیر خارجہ نے قاہرہ میں یہ بیان دیا کہ جاپانی اثر حبش کی معاشی زندگی میں بہت اہم جزو بن گیا ہے۔ پھر حبشی حکومت نے یہ اعلان کیا کہ روئی کی کاشت کے لئے حکومت نے ۴ لاکھ ہکٹار (ایک ہکٹار = ایکڑ) زمین جاپان کو بلا کسی معاوضہ کے دی ہے اور اس کے بعد اور بھی دینے کا قصد ہے۔ بعد کے واقعات سے معلوم ہوا کہ یہ قصد پورا بھی کیا گیا۔ اس کے علاوہ جاپانی تاجروں کو اور اہل صنعت کو ملک کے بعض علاقوں میں مستقل بودوباش اختیار کرنے کا حق بھی دیا گیا ہے۔ ایک جاپانی حبشی شراکت کو ۶½ لاکھ ہکٹار زمین کا ٹھیکہ دیا گیا ہے اس شرط پر کہ حکومت کو پیداوار کا ۱۰ فی صدی بطور مالگذاری دیا جائے گا۔ چونکہ یہ علاقہ غیر آباد ہے اور نشیبی جس میں حبشی خوشی سے بستے نہیں اس لئے مارچ ۱۹۳۴ء میں حبش اور جاپان میں ایک اور معاہدہ ہوا کہ جاپانی کسان اس علاقہ میں آکر بس سکتے ہیں۔ چنانچہ جاپانیوں کی روزافزوں تعدادیں یہاں بسنے کے لئے برابر بھیجی جارہی ہے۔ اس معاہدہ میں یہ قابل لحاظ دفعہ بھی ہے کہ دونوں حکومتیں اپنے باشندوں میں مناکحت کے تعلقات بڑھانے میں ساعی ہوں گی!

حبش نے جاپانی مال پر محصول درآمد میں بھی بہت کچھ کمی کردی ہے جس سے برطانوی اور اطالوی تجارت کو بہت نقصان پہنچا ہے۔ مگر اب جاپانی 'غیر مہذب ایشیائی' تو رہے نہیں کہ جب چاہا دبالیا۔ ایک مضبوط حکومت کی قوت ان کے ساتھ ہے۔ ان کا یہ منصوبہ کہ افریقہ میں کپاس کی کاشت بڑے پیمانہ پر کرکے یورپ کی صنعت پارچہ بافی پر ایک اور ضرب کاری لگائیں سب پر عیاں ہے۔ مگر کوئی کرے تو کیا کرے۔

سچ ہے زبردست مارے اور رونے نہ دے ۔

نہر سویز اور جنگ حبش | اٹلی کے خلاف تدابیر اختیار کرنے کا چرچا اب عرصہ سے ہے۔ ان میں ایک تدبیر شاید پہلی مرتبہ، ۲ جون کو برطانوی ایوان عام میں مسٹر اٹلی اور مسٹر منیڈر نے اپنی تقریروں میں یہ پیش کی اگر اٹلی اور حبش میں جنگ شروع ہو جائے تو نہر سویز کو اٹلی کے جہازوں کے لئے بند کر دیا جائے ۔ اس وقت سے اس مسئلہ پر بڑی دلچسپ بحث ہو رہی ہے جمعیۃ اقوام یا برطانیہ یا مصر کو اس کا حق بھی ہے کہ نہر سویز کو بند کرے ۔

نہر سویز ایک کمپنی کی ملک ہے جسے ۱۸۵۴ء اور ۱۸۵۶ء میں خدیو مصر نے تعمیر نہر کے لئے کچھ مراعات عطا کیے تھے ۔ اس شراکت پر فرانسیسی قانون کی دفعات نافذ ہیں اور اس کی آخری عدالت مرافعہ پیرس ہے ۔ لیکن چونکہ کمپنی کا مقام اسکندریہ میں ہے اس لئے مقامی نوعیت کے معاملات میں مصری عدالتوں کو حق سماعت حاصل ہے کمپنی کا انتظام ۳۲ ڈائرکٹروں کے سپرد ہے جن میں سے ۲۱ فرانسیسی ہیں، ۱۰ برطانوی ہیں اور ایک ولندیزی ۔ منجملہ ۸ لاکھ حصوں کے ۱۷۶۶۰۲ یعنی کوئی ۴۴ فی صدی برطانیہ کے ہاتھ میں ہیں ۔

نہر ۱۸۶۹ء میں کھل گئی تھی ۔ ۱۸۸۲ء میں عربی پاشا نے خدیو کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تو اس وقت برطانوی فوجوں نے اس عذر پر کہ نہر خطرہ میں ہے اس پر قبضہ کر لیا اور نہر ۳ دن تک جہازوں کے لئے بند رہی ۔ اسی وقت سے نہر کی بین الاقوامی حیثیت کا مسئلہ سامنے آیا اور ۱۸۸۸ء میں برطانیہ، جرمنی، آسٹریا ہنگری، اسپین، فرانس، اٹلی، ندرلینڈ، روس اور ترکی میں باہم ایک معاہدہ ہوا جس کا منشا یہ تھا کہ نہر سویز جنگ اور صلح کے زمانہ میں یکساں بلا روک ٹوک سب جہازوں کے لئے کھلی رہے گی چاہے تجارتی ہوں چاہے جنگی ۔ اس معاہدہ کی تصدیق برطانیہ نے مصری سیاست کی غیر یقینی حالت کی بنا پر ملتوی رکھی اور کہیں ۱۹۰۴ء میں جاکر اس معاہدہ کو قبول کیا ۔ اس معاہدہ کی دفعہ ۹ کی رو سے مصری حکومت اس معاہدہ کو نافذ کرنے کے لئے مناسب کارروائی کرے گی اور اس کے وسائل کافی نہ ہوں گے تو سلطان ترکی سے مدد لے گی ۔ مصر کی حفاظت کے لئے حکومت کو مناسب کارروائی کا اختیار ہے مگر پھر بھی نہر میں جہازوں کی آمد و رفت میں ہرج نہ واقع ہونا چاہیئے ۔ نہر اپنی تاریخ میں صرف دو دفعہ بند ہوئی ہے ۔ ایک تو ۱۸۸۲ء میں خدیو کے حکم سے سر ولسلے نے

تین روز کے لئے اسے بند کیا' اور دوسرے جنگ عظیم کے زمانہ میں جبکہ ترکی افواج کی نقل و حرکت کے باعث مصر اور نہر کی حفاظت خطرہ میں تھی۔ مگر چند ہی روز بعد نہر پھر کھول دی گئی۔ اسپین اور امریکہ کی جنگ کے زمانہ میں اسپینی بیڑہ نہر میں سے گذرا (۱۸۹۸ء)۔ مصری حکومت نے اسپینی بیڑہ کو جو منیلا جا رہا تھا اس شرط پر کوئلہ لینے دیا کہ وہ اسپین کو واپس ہو جائے گا۔ روس اور جاپان کی جنگ میں (۱۹۰۴ء) برطانیہ نے باوجود جاپان کا حلیف ہونے کے روسی بیڑہ کو نہر میں سے گذرنے دیا۔

غرض سوائے اس کے خود نہر کا وجود خطرہ میں ہو یا مصری مملکت کا، نہر سویز کو بند کرنا اس معاہدہ کے خلاف ہوگا لیکن اٹلی کے خلاف اس حربہ کو استعمال کرنے کے مؤید کہتے ہیں کہ جمعیتہ اقوام اس بین الاقوامی معاہدہ کو اپنے دستور کی دفعہ ۲۰ کے ماتحت رد کر سکتی ہے جس میں سب ارکین جمعیتہ نے اس دستور کو قبول کرکے ان تمام معاہدوں کو رد کر دینے کا اقرار کیا ہے جو اس کی دفعات سے متصادم ہوں۔ لیکن قانونی تدبیر زیادہ صحیح معلوم نہیں ہوتی اس لئے کہ خود صلحنامہ ورسائی میں اس معاہدہ کو تسلیم کیا گیا ہے۔ اور جس معاہدہ کو صلحنامہ صحیح تسلیم کرے اسے پھر اپنے سے متصادم قرار دے کر رد کیسے کرا سکتا ہے۔ اس پہلو پر اٹلی کے رسالہ Affari Esteri نے اپنی جون کی اشاعت میں بڑی وضاحت سے بحث کی ہے۔ لہذا اگر جمعیتہ نہر سویز کو بند ہی کرانا چاہے تو اسے اپنی دفعہ ۱۹ کے تحت پہلے اس ۱۸۸۸ء والے معاہدہ کو غیر ضروری ہونے کی بنا پر منسوخ کرانا ہوگا اور اس معاہدہ پر خود اٹلی کے دستخط بھی ہیں!

لیکن سچ پوچھئے تو یہ قانونی بحثیں بے سود ہیں۔ اگر جمعیتہ صرف اعلان کرے گی کہ نہر بند ہے تو اٹلی نے اس کے دوسرے اعلانات کے ساتھ جو کیا ہے اس کے ساتھ بھی کر سکتا ہے۔ اگر جمعیتہ یا جمعیتہ کا کوئی رکن اتنی قوت رکھتا ہے کہ اٹلی کو روک سکے اور اس قوت کے استعمال کے لئے بھی تیار رہے تو وہ بحر روم اور بحر احمر میں بحری ناکہ بندی کرکے اطالوی جہازوں کو سویز تک پہنچنے ہی کیوں دے گا کہ اس کے بلا روک ٹوک آزاد گذرگاہ ہونے کا مسئلہ زیر بحث آئے۔

جلد ۲۴ | دسمبر ۱۹۳۵ء | نمبر ۱۲

فہرست مضامین

پروفیسر محمد مجیب بی۔اے (آکسن) پرنٹر و پبلشر نے جامعہ برقی پریس میں چھپوا کر شائع کیا

روسی مسلمانوں کا ادب

(ماخوذ از رسالہ REVUE DES ETUDES ISLAMIQUES)

(۲)

ترک آذر بائجان

(کومریڈ الک برلی کی رپورٹ)

عہد قدیم اور قرون وسطےٰ کی ممتاز ادبی شخصیتیں: آذر بائجاں کے ادب کی ابتدا آٹھویں صدی سے ایک شاعرہ زبیدہ خاتون کی تصانیف سے ہوئی۔ ہمارے تاریخی ماخذ اتنے کم ہیں کہ ہم نوی صدی ء کے ادب کی نسبت کوئی رائے قائم نہیں کر سکتے۔ زبیدہ خاتون کے بعد دادا گورگت نے شہرت حاصل کی، جو دسویں صدی میں گذرا ہے۔ پھر آذر بائجاں میں اسلام پھیلا، ترکی عورت کی حیثیت گھٹ کر لونڈی کے برابر ہوگئی[۵] اور اس بے عزتی سے بچنے کے لئے عورتوں نے بغاوت کی۔ ان کی رہبر ایک شاعرہ محستی خانم تھیں۔ بارھویں صدی میں ابوالعلا گنجوی نے بہت نام پیدا کیا۔ وہ "معمار سخن" کہلاتا ہے۔ اس کے کلام کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو:۔

"میں اپنے معاصرین کا علم بردار ہوں۔ گنج والے میری قسمیں کیوں نہ کھائیں جب شاعر سب مجھے اتنا مانتے ہیں کہ میری نقل کرتے ہیں۔ مجھے اس اعتبار کا حق بھی ہے، کیوں کہ میں شاعروں کا سردار اور رہبر ہوں۔"

لیکن گنجوی کے حسن بیان اور کلام کی فنی قدر و قیمت کے باوجود آج کل کے انشا پرداز،

---

۵ یہ صریح جھوٹ ہے۔ عورتوں کی حیثیت گھٹنے اور اُن کے حقوق سلب ہونے کا سبب ایرانی اور بازنطینی تہذیب کے اثرات تھے۔ ملاحظہ ہو:۔ خالدہ ادیب کی کتاب "ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش" ساتواں لکچر۔

جو ”گنج سرخ“ کہلاتے ہیں، اس کی تصانیف سے کوئی فیض حاصل نہیں کرسکتے، انھیں اپنا موروثی حق نہیں ٹھہرا سکتے، اس لئے کہ گنجوی نے دل و جان سے اپنے آپ کو دربار کے حوالے کر دیا تھا اور اپنے کلام کو امرا اور اشراف کے لئے وقف کر دیا تھا۔ اس کے مقابلے میں مشہور شاعر شیخ نظامی، جنھوں نے ابوالعلا گنجوی کے بعد میدان ادب میں قدم رکھا، پہلے کی طرح اب تک عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں، اور ان کے کلام میں وہی تازگی ہے جو آٹھ صدی پہلے تھی۔ یہ زبردست مفکر اور آرٹسٹ جن کی تصانیف کا یورپی اور ایشیائی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے، اپنے بارے میں یوں لکھتے ہیں:۔

”اگر تو اس صدی میں کسی سے پوچھے کہ وہ کہاں ہے، تو شاعر کا ہر شعر ایک صدائے بازگشت کی طرح بتلائے گا کہ یہاں!“

شیخ نظامی نے اپنے کلام کا ایک مجموعہ چھوڑا ہے جو ”پنج گنج“ کے نام سے مشہور ہے۔ اس پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے بعض تصورات پر دائمی حقیقت کا رنگ کیسا چڑھا ہوا ہے۔ وہ زیادہ تر الحاد کے مسئلے پر بحث کرتے ہیں اور دیوتاؤں اور مذہبی رہنماؤں کو بری طرح لتاڑتے ہیں۔ شاہی حکومت اور جاگیری نظام معاشرت کی بھی انھوں نے خوب خبر لی ہے۔ عوام میں انھیں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی، ان کے شعر اب تک لوگوں کی زبانوں پر ہیں، اور محبت اور احترام نے ان کی شخصیت کو ایسا چمکایا کہ اب تک اس کی روشنی دھیمی نہیں پڑی ہے۔ شیخ نظامی مشرقی دنیا کی نمایاں شخصیتوں میں سے ہیں اور اس لئے ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ ان کی تصانیف کے ترجمے اور اشاعت کی کتنی ضرورت ہے۔

چودھویں صدی کے آخر میں عمادالدین نسیمی، جن کا شمار آذربائیجان کے بہترین شاعروں میں ہوتا ہے، محفل ادب میں رونق افروز ہوئے۔ تبلیغی شاعری کے علاوہ ان کی بعض تصانیف ایسی ہیں جن میں زندہ دلی اور تشبیہ اور استعارے کی رنگا رنگی پائی جاتی ہے۔ ان کا بیان نہایت نفیس اور دلگداز ہے، اور وہ آذربائیجان کے ترکی ادب کے بانی مانے جاتے ہیں۔

کوئی چار سو برس سے فضولی ترکوں کے دلوں کو گرویدہ کئے ہوئے ہے۔ وہ ایک بے مثل شاعر تھا، اور اس کی تصانیف ایک بہت غیر معمولی قابلیت کا پتہ دیتی ہیں۔ دور جدید میں فضولی نے روسی اور یورپی

مستشرقین سے بھی داد وصول کی ہے، اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کا کلام ترکی شاعری کا مثالی نمونہ ہے
فضولی اشراف کے مذاق سے ناآشنا تھا اور عوام کے مذاق اور حوصلوں کو خوب سمجھتا تھا، اس نے کبھی
دربار کی غلامی نہیں کی، اور اس نقطۂ نظر سے اس کی تصانیف بے عیب ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک
بڑا شاعر اور مصور مانا جاتا ہے۔ آذربائیجانی ادیبوں کے اس سرتاج نے ترکی زبان کی نشو ونما میں بھی
بہت مدد دی، کیونکہ ترکی اس وقت تک محض عربی اور فارسی الفاظ کی ایک آمیزش تھی۔

فضولی کا خاص میدان غزل ہے۔ اپنے شاہکار "لیلےٰ مجنوں" میں اس نے آزاد عشق، اور
مردوں عورتوں کی مساوات کی تعلیم دی، اور اپنے زمانے کے رسم رواج کی پردہ دری کی۔ ترکی تھیٹروں
میں یہ قصہ اب تک بڑے شوق سے دیکھا جاتا ہے۔

صبح انقلاب | اٹھارہویں صدی کے شاعر واقف کی تصانیف ترکوں کی قومی شاعری کی نشوونما
کے ایک قدم آگے بڑھنے کا ثبوت ہیں۔ اس کی خاص تاریخی اہمیت یہ ہے کہ اس میں عوام کی شاعری
کی طرف رجحان پایا جاتا ہے، اور اس نے گیتوں کو رواج اور ترقی دینے کی بڑی کوشش کی۔

اس کے بعد انیسویں صدی میں باقی خائف، قاسم بے ذاکر، اور اخوندف نے ادبی تخلیق کا سلسلہ
جاری رکھا۔ اگر ہم واقف اور ذاکر کا مقابلہ کریں تو معلوم ہوگا کہ ذاکر کا حقیقت اور معاشرتی حالات سے
بہت زیادہ گہرا تعلق تھا، اور جمہور اور اس کی زندگی سے وہ بہت زیادہ قریب تھا۔ ذاکر اس زمانہ میں
پیدا ہوا جب زار کی حکومت آذربائیجان کو لوٹ رہی تھی، اور وہ ان زمینداروں کا نمائندہ ہے جن کے
مال و دولت کو روسی غارت کر رہے تھے۔ ذاکر کے طنزیہ کلام میں اس زمانے کے سیاسی، معاشی اور
معاشرتی تغیرات کے بہت سے اشارے ملتے ہیں، اور اسی وجہ سے اس کی خاص حیثیت ہے۔ پھر بھی
ہمیں یہ کہنا پڑتا ہے کہ ذاکر قدامت پسند تھا، اور ترقی کے جو آثار اس وقت تھے وہ اسے نظر نہیں آئے
انیسویں صدی کے دوسرے حصے کے معاشرتی تصورات فتح علی اخوندف کی تصانیف میں ظاہر ہوتے ہیں۔
اخوندف ایک بہت بڑا عالم تھا جس نے یورپی تہذیب کے بہترین عناصر کو جذب کر لیا تھا۔ اس کی تصانیف
ایک تصویر خانہ ہیں جس میں ہر قسم کے لوگوں کی شبیہیں ملتی ہیں، جیسے تاجر، چھوٹے زمیندار، ایرانی نسل کے

ادنے سرکاری ملازم، حاکم، مولوی، من چلے وغیرہ، اوران کی صورتوں اور سیرتوں میں وہی رنگارنگی ہے جو روس کے بڑے حقیقت نگاروں کے کارناموں میں دکھائی دیتی ہے۔ اس کی سب سے مشہور تصنیف "حاجی قرا" میں نئے سرمایہ داروں کی حوصلہ مندی اور لالچ، اور چھوٹے زمینداروں کے عنقریب ناپید ہونے والے طبقے کی ذہنیت کا خاکہ خوب اتارا گیا ہے۔

اخوندف نے عورتوں کی مظلومیت اور مردوں عورتوں کے درمیان عدم مساوات کے خلاف زور شور سے احتجاج کیا۔ اس کی ہر ہیروئن عام طور سے بڑی ہنرمند، ذہین اور تیز ہوتی ہے۔ وہ ترکوں کی زندگی کو یورپی رنگ میں رنگنا چاہتا تھا۔ اپنے مزاحیہ ڈراموں میں اس نے مدرسوں اور دینی درسگاہوں پر، جہاں نوجوان اپنا وقت ضایع کرتے تھے بڑی معاندانہ تنقید کی ہے، اور اسی کے ساتھ زاری حکومت کو بھی آڑے ہاتھوں لیا ہے۔ لیکن اس کا خاص حملہ ایران کی زندگی اور طرز حکومت پر تھا، اور یہیں اس کی تلوار کی دھار سب سے زیادہ تیز معلوم ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اخوندف نے نظام جاگیری، تنگ نظری، سرکاری ملازموں اور ملاؤں کی تنگ نظری اور حرص کا بھی بھانڈا پھوڑ دیا۔

یہ ڈرامے سب سیدھی سادی عام فہم زبان میں لکھے گئے ہیں، اوران کی بدولت عام مذاق کو بہت ترقی ہوئی۔ اس اعتبار سے اخوندف نے زبان اور طرز بیان میں بڑی جدت کی، کیونکہ اس نے پرانا اسلوب، جو ادب سے لطف اندوز ہونا ایک بہت چھوٹی جماعت کے لئے مخصوص کردیتا تھا، بالکل ترک کردیا۔ لاطینی حروف اختیار کرنے کا مسئلہ سب سے پہلے اسی نے چھیڑا، اور یہ بھی اس کے کارناموں میں شمار ہونا چاہیئے؟

اخوندف پہلا ترکی ڈراما نویس تھا اور وہ قومی تھیٹر کا بانی مانا جاتا ہے۔

ترکی سرمایہ داروں کی جماعت ایسے زمانے میں پیدا ہوئی جب پیٹرول کی تجارت بڑھ رہی تھی، اور اس میں اپنی ذات کا احساس بھی بہت تھا۔ اسی کے بل پر اس نے عقائد اور تہذیب کو ایک نئی شکل دی جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ اس کے تسلط کو قائم رکھے۔ رسالہ "فیوضات" جو مشہور لکھپتی تاگیف کی سرپرستی میں جاری ہوا، سرمایہ داروں کی زبان بن گیا۔ اپنی اشاعت کے پہلے ہی دن سے اس نے قدامت پسندی،

ترک اتحاد، اتحاد اسلام اور قومیت کی حمایت شروع کر دی۔ "فیوضات" کے حلقے کے مصنف۔ علی بک، محمد ہادی۔ عوام سے علیحدہ رہے، اور قوم ان سے بیگانہ رہی، کیوں کہ ان کی تصانیف عوام کی سمجھ میں نہیں آسکتی تھیں۔ لیکن اپنا کام وہ کر گئیں، اور سرمایہ داروں کی خود پسندی کو بڑی وفاداری کے ساتھ سراہا۔

دوسری طرف، ادنیٰ سرمایہ داروں کی جمہور، جس میں روس کی انقلابی تحریک نے جان ڈالی تھی، اپنے عقائد کا ایک رسالہ میں اظہار کرتی رہی جو ۱۹۰۶ میں قائم ہوا اور جس کا نام "ملا ناصر الدین" تھا یہ رسالہ زاری حکومت اور ملاؤں کے تسلط کا دشمن تھا، اور اس میں استبداد، تشدد، مذہب، تاریک خیالی اور مزدوروں اور کسانوں کو لوٹنے کے خلاف مضامین نکلتے رہے۔ صابر، ایک شاعر جو "ملا ناصر الدین" کے حلقۂ ادارت کا نمائندہ ٹھہرایا جا سکتا ہے، طنزیہ رنگ میں بہت تند و تیز ہو گیا اور اس کا کلام ٹکسالی مانا جاتا ہے۔ اس کے مضامین اور رسالے، اس کا مشہور "حپ حپ نامہ" ایسے کارنامے ہیں جنھوں نے وطن کے باہر بھی لوگوں کو اس کے نام سے آشنا کر دیا ہے۔

۱۹۱۹ کا سال ایسا گذرا ہے جو آذربائجان کی تاریخ پر ایک دھبہ ہے۔ "مساواتیوں" کا تسلط ترکی ادب کی تاریخ میں ایسے صفحات چھوڑ گیا ہے جن سے آذربائجان کی بے آبروئی ہوتی ہے، جن میں زہر اگلا گیا ہے اور خود پسندی کا ڈنکا بجایا گیا ہے۔ محفل ادب بہت سے نااہلوں سے بھر گئی جو سرمایہ داروں اور زمینداروں کی چاپلوسی کرتے تھے، اور ملک میں فساد پیدا کر کے اس کے بڑے شاندار نام رکھتے تھے۔ "مساواتی" مصنف قومیت کو رواج دینا چاہتے تھے اور ترکی اور آرمینی بھائیوں کو اشتعال دے کر ایک دوسرے سے لڑاتے تھے۔ اس دور کی تصانیف، جو بس کہنے کے لئے "ادبی" ہیں کوئی قدر نہیں رکھتی ہیں۔

سوویٹ عہد کا ادب | اپریل سنہ ۱۹۲۰ء سے آذربائجان کی ادبی اور تہذیبی تاریخ کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے۔ اس وقت تک قومیت اور سرمایہ داروں کی ذہنیت ترکوں کے ادب پر حاوی رہی تھی۔ سنہ ۱۹۲۶ء میں "قزل قلم" پرولتاری مصنفوں کا اتحاد، قائم ہوا، اس نے پرانے عقائد اور ذہنیت کے خلاف جم کر لڑنا اور تہذیبی انقلاب اور لینن کی تعلیمات کی حمایت کرنا شروع کیا۔ وہ مزدور جنھوں نے خط و کتابت

کے ذریعہ انشا پردازی کی مشق کی تھی اس کے گرد جمع ہوگئے، اور نئے شاعر اور نثار نمودار ہونے لگے۔

اس ادبی حلقے کا نمائندہ، سلیمان رستم، آذربائیجان کے پرولتاری ادب کا ہراول ہے، اور اس کی نظموں کا پہلا مجموعہ، "رنج سے راحت تک" ادبی اور سیاسی نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ پرولتاری نثر کے لئے نذر علی، ایک اشتراکی نے مفید محرک کا کام دیا۔ خانہ جنگی کے متعلق اس نے جو ناول لکھے ہیں وہ ہر طرح سے قابل قدر ہیں۔ اس حلقے کے اور ممتاز اراکین فاروق، فیضی، اسماعیل حافظ، ابوالحسن وغیرہ ہیں۔ اس تحریک کے ایک ہمدرد، مشہور ڈراما نویس جعفر جبرلی نے سیاسی اور علمی موضوعوں پر پرولتاری پہلو سے بحث کی ہے۔

۲۳ اپریل ۱۹۳۲ کو اشتراکی پارٹی کی مرکزی کمیٹی نے جو فیصلہ کیا اس کا آذربائیجان میں دس بارہ نئی کتابوں کے ذریعہ خیر مقدم کیا گیا جن میں نظموں کے مجموعے ہیں اور ناول بھی۔ اشتراکیت کی تعمیری کوششوں نے کئی پرانے مصنفوں کو اپنی طرف کھینچ لیا ہے، اور بہت سے قابل نوجوان مصنفوں کی جماعت میں شامل ہوگئے ہیں۔ اس طرح پرولتاری مصنفوں کے اتحاد کے اراکین تعداد میں اب ساٹھ کے قریب ہیں۔ ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۴ء تک ہمارے یہاں اتنی کتابیں شایع ہوئی ہیں جتنی کہ انقلاب سے پہلے پندرہ برس میں (یعنی ۱۹۰۵ تا ۱۹۲۰) اور یہ وہ زمانہ تھا جب "مساواتی" جو اپنے سوا کسی کو قومی تہذیب کی نمائندگی کرنے کا حق نہیں دیتے تھے، حکومت کر رہے تھے۔

آذربائیجان کی پرولتاری شاعری ابھی تک بچپن کی کمزوریوں اور بیماریوں میں مبتلا ہے، اور اسی وجہ سے ہمیں اس میں بہت سی خامیاں ملتی ہیں۔ انھیں دور کرنے کے لئے حقیقت نگاری کے اشتراکی طرز کو اختیار کرنا چاہیئے لیکن یہ بات بھی ظاہر ہے کہ ایسے زمانے میں جب بنیادی تغیرات عمل میں آ رہے ہیں آذربائیجان کا ادب عروج پر نہیں ہو سکتا۔ اس وقت کے مصنفوں میں صمد ورغون کی مثال لیجیئے۔ اس کا دماغ بہت الجھا ہوا ہے۔ اسے چاہیئے کہ اپنے ذہن کو، جو سرمایہ داری اور نراج، پرانی دیہاتی زندگی اور پرانے رسم رواج کے رنگ میں ڈوبا ہے، آہستہ آہستہ قابو میں لائے اور پاک صاف کرے۔ اب ورغون اشتراکی ہراولوں کے خیالات اختیار کر رہا ہے اور اپنے کلام کا معیار بڑھا رہا ہے،

جیساکہ اس کی دو نظموں، " لالٹین " اور " شاعر کی نصیحت " سے ظاہر ہوتا ہے۔ ممد بُرغون دیہاتی زندگی سے بہتر واقفیت رکھتا ہے، اور اس کے جو مرقعے اس نے پیش کئے ہیں ان کا اور کہیں جواب نہیں ملتا۔ اس میدان کے باہر اس کا ذہن اتنی خوبی سے کام نہیں کرتا، پٹرول کی جنگ پر اس نے " لوک تبن " کے عنوان سے جو نظم لکھی، جس میں نفطہ کے کنویں کی تصویر کھینچنے کی کوشش کی گئی ہے، فنی نقطۂ نظر سے خاص قدر نہیں رکھتی۔ اس وقت وہ ایک نظم تیار کر رہا ہے جس میں ان اشتراکیوں کی زندگی بیان کی جائے گی جو دیہات میں مصروف ہیں۔

ایک اور شاعر، رفیلی میکائیل، نئے اور پرانے عقائد کی کشمکش سے گذر کر پرولتاریہ کی جنگجو صفوں میں آکر کھڑا ہو گیا ہے۔ اس کی آخری نظمیں " لینن گراد " اور " سیاستوپول " ثابت کرتی ہیں کہ وہ پرولتاری مقاصد میں محو ہو گیا ہے۔ " سیاستوپول " کے بعض حصے ایسے ہیں جو کبھی بھلائے نہیں جاسکتے۔ رفیلی نے جو رستہ طے کیا ہے اس سے ہم دیکھ سکتے ہیں کہ ایک مصور، جو کسی اور طبقے کا رکن تھا، انقلاب کے بعد کس طرح ایک پرولتاری مصنف ہو گیا، اور عقائد کے ساتھ اس کی فنی قابلیت کی بھی کس طرح اصلاح ہوئی۔

نئی تخلیقی قوتیں اب ہمارے یہاں شاعروں کی ایک نئی نسل پیدا ہو رہی ہے جس نے اپنا مخصوص اسلوب بیان بھی نکالا ہے۔ اگر ہم مثال کے طور پر رسول رضا کے کلام کو لیں تو ہم دیکھیں گے کہ اس کے یہاں سیاسی خیالات کی فراوانی ہے اور وہ حقیقی مسائل سے بحث کرتا ہے، مگر وہ حقیقت نگاری سے رومانیت کے عنصر کو بالکل خارج نہیں کرسکا ہے۔ اسی طرح ایک اور شاعر، مشفق، اپنے پرانے تعصبات اور اوہام پر غالب آنے کی کوشش کر رہا ہے، لیکن وہ بھی پرولتاری ذہنیت کو غیر طبقوں کے اثرات سے آزاد نہیں کرسکا ہے۔

یہاں پر ہمیں فرخ اور رحیم کا بھی ذکر کر دینا چاہیئے جنھوں نے پچھلے سالوں میں چند نئی تصانیف شائع کی ہیں۔

۱۹۰۵ء سے اس وقت تک ترکی ادب کی نثر کو نظم کے مقابلے میں کم ترقی ہوئی ہے، پھر بھی ہم اس میدان میں بھی زندگی اور جدوجہد کے آثار دیکھتے ہیں، اور پچھلے دو برس میں چھ ناول اور کئی لمبے افسانے چھپے ہیں۔

۱۹۳۳ء میں نوجوان مصنف ابوالحسن نے اپنا زبردست ناول "ایک دنیا کی موت" لکھا۔ یہ ناول ایک تصویر خانہ ہے جس میں اشتراکیت کے جنگجو سورما، قدامت پسندوں اور کچھ دلے سرمایہ داروں کے مقابلے پر رکھ کر دکھلائے گئے ہیں۔ یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ ابوالحسن فنا ہونے والی دنیا کے رہنے والوں کو بہتر جانتا ہے اور ان کی سیرتوں کو بہتر بیان کر سکتا ہے۔ نئے دور کے آدمیوں کی سیرتیں مصنوعی اور نامکمل معلوم ہوتی ہیں۔

حال کی تصانیف میں "ایک دنیا کی موت" کے بعد محمد سعید اور دو بادی، ایک پرانے اشتراکی مصنف کے ناول "قبرستان کہر آلود" کا درجہ آتا ہے، جس کا موضوع ۱۹۰۸ء کا ایرانی انقلاب ہے۔ اس کتاب میں واقعات، سیاسی اور معاشرتی حالات، اور ان مختلف طبقوں کی کارگذاری جو اس انقلاب میں شریک تھے بیان کی گئی ہے۔ اس میں مجتہدوں اور تاجروں کی غداری کا پول کھول دیا گیا ہے؛ اور زاری حکومت نے انقلابی تحریک کا سر کچلنے کے لئے جو کارروائی کی اس کی مذمت کی گئی ہے۔ لیکن اوردوبادی ابھی تک اشتراکی حقیقت نگاری کے خاص طرز سے مانوس نہیں معلوم ہوتا۔ اس نے واقعات کو مسخ کر دیا ہے، کسانوں نے انقلاب میں جو حصہ لیا اس کا وہ حق ادا نہیں کر سکا ہے، اور ماورائے قفقاز کی انقلابی جماعت نے جو نمایاں خدمات انجام دیں ان پر روشنی نہیں ڈالی ہے۔

ترکی نثر میں نوجوان اشتراکی مصنف سیمرغ کا ناول "دشمن"، جس میں زرعی اصلاح کی تحریک کا ابتدائی زمانہ دکھایا گیا ہے، خاص اہمیت رکھتا ہے۔

مہدی حسین کا ناول "سیلاب"، جو حال ہی میں شائع ہوا ہے بہت مقبول ہوا۔ اس میں ہمارے ملک کی خانہ جنگی کے ایک دور کا قصہ سنایا گیا ہے۔ مصنف نے یہ واضح کر دیا ہے کہ پرولتاری انقلاب میں مزدوروں اور کسانوں کی خاص کارگذاری کیا تھی، اور عوام کی ذہنیت میں کون سی تبدیلیاں ہوئیں جن کی بدولت وہ نئی زندگی کی تعمیر کے لئے جان دینے پر تیار ہو گئے۔ لیکن اس میں مزدوروں کی کارگذاری فرضی معلوم ہوتی ہے اور کسانوں نے جو کچھ کیا وہ بہت بڑھا کر دکھایا گیا ہے۔

یوسف وزیر اور کانتے مردہ مصنف ہیں جنھوں نے انقلاب سے پہلے نام پیدا کیا۔ وہ کسی پارٹی کے

رکن نہیں ہیں اور اسی وجہ سے ایک عرصے تک انھوں نے لکھنا بند کر دیا ۔ کلنتے مرمزا حیہ طرز میں ماہر ہے اور اس کے کئی افسانے چھپ چکے ہیں ۔ اس کا نیا ناول "کول خوستان" جس میں دیہات کی نئی زندگی دکھائی گئی ہے، یہ ثابت کرتا ہے کہ مصنف نے کس قدر ترقی کی ہے ۔ یوسف وزیر انقلاب سے پہلے کے حریت پسند بورژوا مفکروں کا ایک نمائندہ ہے ۔ اس نے اپنا ناول "۱۹۱۷" ابھی ختم کیا ہے جس میں اس سال کے روسی انقلاب کے واقعات بیان کئے گئے ہیں، اور انقلاب کے دشمنوں کے ہر فرقے کی خودغرضی اور زیادتی واضح کی گئی ہے ۔

حال کی تصانیف پر ہم مجموعی طور پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ کی طرف ایک خاص رجحان ہے ۔ اس کا سبب یہ ہے کہ تقریباً تمام مصنف حقیقی زندگی اور اشتراکی نظام کی تدریجی تعمیر کا الگ کھڑے ہوئے تماشا دیکھ رہے ہیں، اور اس میں جیسا کہ چاہئے حصہ نہیں لیتے ۔ ہمارے تاریخی ناولوں کا خاص نقص یہ ہے کہ وہ مصنوعی اور واقعات سے خالی ہیں، اور ان میں تاریخی واقعات کی اشتراکی نقطۂ نظر سے تشریح نہیں کی جاتی ہے ۔ ان تصانیف کے علاوہ اور جو ہیں ان کی خامی موضوع کا غلط انتخاب ہے، ان میں اس وقت کی مصنوعات کا بہت کم ذکر آتا ہے اور تہذیب اور رسم و رواج کا بس ایک دھندلا سا خاکہ نظر آتا ہے ۔ پٹرول کے لئے جو جنگ ہوئی اس پر دو سال کے عرصے میں صرف دو کتابیں لکھی گئی ہیں جن کی کوئی خاص قیمت نہیں ۔ روئی کا مسئلہ چھیڑا ابھی نہیں گیا ہے ۔

آذربائجان کے سوویٹ ادب کا سب سے کمزور پہلو ڈراما ہے ۔ جعفر جبرلی نے، جو ہماری ڈراما نویسی کا ہراول ہے، مرکزی اشتراکی کمیٹی کے اپریل ۱۹۳۲ء کے فیصلے کے بعد ایک ڈراما لکھا جس کا عنوان "یاچار" ہے ۔ اس میں حقیقت نگاری کے صحیح اصول کے مطابق دیہات کے مختلف طبقوں کی کشمکش بیان کی گئی ہے، زمیندار کسان کے منہ پر سے نقاب ہٹا کر اس کی اصل صورت دکھائی گئی ہے، اور اسی کے ساتھ نئی نسل کے کارپرداز ماہران فن کے چند مثالی نمونے پیش کئے گئے ہیں ۔ جعفر جبرلی کی تصنیف ان مساواتیوں کی لغویات کا دنداں شکن جواب ہے جو ملک کو چھوڑ کر چلے گئے ہیں اور یہ دعوے ثابت کرنے میں اپنا وقت ضایع کر رہے ہیں کہ کوئی واقعی ہنرمند مصنف سوویٹ عقائد اور عمل کا حامی نہیں ہو سکتا ۔

حسین جاوید جعفر جبرلی سے بھی زیادہ قابل شاعر اور ڈراما نویس ہے جس کے خیالات اور طرز بیان میں آہستہ آہستہ تغیر ہو رہا ہے۔ اب تک اس نے جو کچھ لکھا ہے وہ ترک اتحاد اسلامی کے متعلق ایک قصیدہ ہے۔ ۱۹۲۳ء میں اس کا ڈراما "سیاؤش" شائع ہوا، جس میں پرانے ایرانی اور ترکی محلات کی بداخلاقی دکھائی گئی ہے، کسانوں کی بغاوتوں پر روشنی ڈالی گئی ہے اور حریت پسند اشراف کی ذہنیت واضح کی گئی ہے۔ حسین جاوید ایک نئے اور نرالے طریقے پر نئی زندگی سے مفاہمت کی کوشش کر رہا ہے۔

آذربائیجان کے "اتحاد انشاپردازان سوویٹ" اور اس کے شعبہ ڈراما کو اب یہ ضرورت پیش آئی ہے کہ نئے ڈراما نویسوں کے حلقے تیار کریں، انھیں تھیٹروں سے ملحق کر دیں اور انھیں کارگذاری دکھانے کا موقعہ دیں۔

ان نوجوان مصنفوں میں جنھوں نے انشاپردازی کے میدان میں ابھی قدم رکھا ہے ثابت رحمٰن، ابراہیم مرزا، یوسف شیرواں، حسین ناطق، سری ولی، جعفر ہنداں، انور اور اخوندف حامد قابل ذکر ہیں۔ ہیں دو نوجوان ترک عورتوں کے نام بھی یاد رکھنا چاہیئے جنھوں نے پرولتاریہ کی اس فتح کی شان میں قصیدے لکھے ہیں جس کی بدولت مشرقی عورتیں آزاد ہو گئیں۔ یہ ہیں دلبازی اور نگار۔ افسوس ہے آذربائیجان میں ابھی تک لوگ ان نوجوان مصنفوں کی کچھ بہت قدر نہیں کرتے۔

آذربائیجان کے مصنفوں کی کانگریس نے یہ ظاہر کر دیا ہے کہ ہم نے ادب میں کتنی ترقی کی ہے، اور یہ بتاتے ہوئے کہ ہمیں اصلاح کے کون سے ذریعے اور طریقے اختیار کرنا چاہئیں، ہمارے کام کی خامیاں اور غلطیاں بھی جتا دی ہیں۔ اشتراکی طرز کی حقیقت نگاری اختیار کرنے کے علاوہ آذربائیجان کے مصنفوں کو چاہیئے کہ ایسے موضوع منتخب کریں جن کا سوویٹ سے سچا تعلق ہے، انسان کے ذہن اور ضمیر پر سرمایہ داری کے فلسفۂ حیات کا جو کچھ اثر باقی ہے اسے بالکل مٹا دینے کی جم کر کوشش کریں، اور ملکی زندگی کی تعمیر میں عملی شرکت کریں۔

گرد ابجد اور ادب بھی تیار کر لیا گیا ہے | آرمینیا میں ایک لاکھ ترک اور پچیس ہزار آرمینی ہیں۔ انشاپردازوں کا ایک عام اتحاد قائم ہونے سے پہلے ترکوں اور کردوں کے الگ الگ حلقے تھے؛ ان میں صرف چند نوجوان

مصنف کام کرتے تھے جن کے مضامین وغیرہ اخباروں اور جنتریوں یا خاص مجموعوں میں شایع ہوتے تھے۔ اسی سلسلہ میں کرد ادب کا ایک مجموعہ چھپا۔ آرمینیا میں سوویٹ حکومت قائم ہونے کے دو ایک سال کے اندر کرد آبادی کے لئے ایک لاطینی ابجد تیار کی گئی اور تعلیم کے لئے ایک ادارے کی بنیاد بھی رکھی گئی۔ ابجد کا معین ہونا عام تعلیم کے لئے خاص اہمیت رکھتا ہے، اس لئے کہ کردوں کے پہلے کوئی اپنی ابجد نہیں تھی، جو کچھ لکھا جاتا تھا وہ عربی حروف میں۔ آرمینیا میں ابجد کے رائج ہوتے ہی کئی درسی کتابیں اور سیاسیات اور معاشیات پر رسالے شایع کئے گئے اور ایک کرد۔ آرمینی فرہنگ لغات مرتب ہوئی۔ اب "اشتراکی محضر" کا کرد زبان میں ترجمہ کیا جا رہا ہے۔ کردستان کے ادب العوام کا ذخیرہ بہت بڑا ہے، اور اس سے انشا پردازی کو بڑی تقویت پہنچ رہی ہے۔ پہلے زمانے کے پہاڑی قبائل اور اس وقت کے مزدور اور ان کے بچے جنھوں نے تعلیمی ادارہ اور آرمینیا کی سرکاری یونیورسٹی میں تعلیم پائی ہے قومی ادب کو فروغ دینے کی بہت کوشش کر رہے ہیں، اور اس کا اثر ان کردوں پر بھی پڑ رہا ہے جو سوویٹ اتحاد میں شامل نہیں ہیں۔

نئے دور کے کرد مصنفوں میں سب سے ممتاز مجیئے جندی، امینہ اودال، نوری، جرجو، عرب شمی لوف، احمدے مرازی، اتارے شیرو، جسیمہ جلیل ہیں۔

کفن

(۱)

جھونپڑے کے دروازے پر باپ اور بیٹا دونوں ایک بجھے ہوئے الاؤ کے سامنے خاموش بیٹھے ہوئے تھے اور اندر بیٹے کی نوجوان بیوی بدھیا دردِزہ سے پچھاڑیں کھا رہی تھی' اور رہ رہ کر اس کے منہ سے ایسی دلخراش صدا نکلتی تھی کہ دونوں کلیجہ تھام لیتے تھے۔ جاڑوں کی رات تھی' فضا سناٹے میں غرق۔ سارا گاؤں تاریکی میں جذب ہوگیا تھا۔

گھیسو نے کہا۔ معلوم ہوتا ہے بچے گی نہیں۔ سارا دن تڑپتے ہوگیا۔ جا دیکھ تو آ۔

مادھو دردناک لہجہ میں بولا۔ مرنا ہی ہے تو جلدی مر کیوں نہیں جاتی۔ دیکھ کر کیا کروں۔

" تو بڑا بے درد ہے بے۔ سال بھر جس کے ساتھ جندگانی کا سکھ بھوگا اسی کے ساتھ اتنی بیوپھائی "

" تو مجھ سے تو اس کا تڑپنا اور ہاتھ پاؤں پٹکنا نہیں دیکھا جاتا۔"

چماروں کا کنبہ تھا اور سارے گاؤں میں بدنام۔ گھیسو ایک دن کام کرتا تو تین دن آرام۔ مادھو اتنا کام چور تھا کہ گھنٹہ بھر کام کرتا تو گھنٹے بھر چلم پیتا۔ اس لئے انھیں کوئی رکھتا ہی نہ تھا۔ گھر میں مٹھی بھر اناج بھی موجود ہو تو ان کے لئے کام کرنے کی قسم تھی۔ جب دو ایک فاقے ہو جاتے تو گھیسو درختوں پر چڑھ کر لکڑیاں توڑ لاتا اور مادھو بازار سے بیچ لاتا۔ اور جب تک وہ پیسے رہتے دونوں ادھر ادھر مارے مارے پھرتے جب فاقے کی نوبت آجاتی تو پھر لکڑیاں توڑتے' یا کوئی مزدوری تلاش کرتے۔ گاؤں میں کام کی کمی نہ تھی۔ کاشتکاروں کا گاؤں تھا۔ محنتی آدمی کے لئے پچاس کام تھے۔ مگر ان دونوں کو لوگ اسی وقت بلاتے جب دو آدمیوں سے ایک کا کام پاکر بھی قناعت کر لینے کے سوا اور کوئی چارہ نہ ہوتا۔ کاش دونوں سادھو ہوتے تو انھیں قناعت اور توکل کے لئے ضبطِ نفس کی مطلق ضرورت نہ ہوتی۔ یہ انکی خلقی صفت تھی۔ عجیب زندگی تھی انکی۔ گھر میں مٹی کے دو چار برتنوں کے سوا کوئی اثاثہ نہیں۔ پھٹے چیتھڑوں سے اپنی عریانی کو ڈھانکے

ہوئے دنیا کی فکروں سے آزاد - قرض سے لدے ہوئے - گالیاں بھی کھاتے، مار بھی کھاتے - مگر کوئی
غم نہیں مسکین اتنے کہ وصولی کی مطلق امید نہ ہونے پر لوگ انھیں کچھ نہ کچھ قرض دے دیتے تھے -
مٹر یا آلو کی فصل میں کھیتوں سے مٹر یا آلو اکھاڑ لاتے اور بھون بھون کر کھا لیتے - یا دس پانچ اوکھ توڑ لاتے
اور رات کو چوستے - گھیسو نے اسی زاہدانہ انداز سے ساٹھ سال کی عمر کاٹ دی - اور مادھو بھی سعادت مند
بیٹے کی طرح باپ کے نقش قدم پر چل رہا تھا - بلکہ اس کا نام اور بھی روشن کر رہا تھا - اس وقت بھی دونوں
الاؤ کے سامنے بیٹھے آلو بھون رہے تھے جو کسی کے کھیت سے کھود لائے تھے - گھیسو کی بیوی کا تو مدت
ہوئی انتقال ہو گیا تھا - مادھو کی شادی پچھلے سال ہوئی تھی - جب سے یہ عورت آئی تھی اس نے اس خاندان
میں تمدن کی بنیاد ڈالی تھی - پسائی کر کے، گھاس چھیل کر، وہ سیر بھر آٹے کا انتظام کر لیتی تھی - اور ان دونوں
بے غیرتوں کا دوزخ بھرتی رہتی تھی - جب سے وہ آئی یہ دونوں اور بھی آرام طلب اور آلسی ہو گئے تھے -
بلکہ کچھ اکڑنے بھی لگے تھے - کوئی کام کرنے کو بلاتا تو بے نیازی کی شان سے دوگنی مزدوری مانگتے - وہی
عورت آج صبح سے دردِ زہ سے مر رہی تھی - اور یہ دونوں شاید اسی انتظار میں تھے کہ وہ مر جائے تو آرام
سے سوئیں -

گھیسو نے آلو نکال کر چھیلتے ہوئے کہا - جا کر دیکھ تو - کیا حالت ہے اس کی - چڑیل کا پھساد ہوگا اور کیا
یہاں تو اوجھا بھی ایک روپیہ مانگتا ہے - کس کے گھر سے آئے -

مادھو کو اندیشہ تھا کہ وہ کوٹھری میں گیا تو گھیسو آلوؤں کا بڑا حصہ صاف کر دے گا - بولا - مجھے وہاں
ڈر لگتا ہے -

"ڈر کس بات کا ہے - میں تو یہاں ہوں ہی"

"تو تمھیں جا کر دیکھو نہ"

"میری عورت جب مری تھی تو میں تین دن اس کے پاس سے ہلا بھی نہیں - اور پھر مجھ سے لجائے گی کہ
نہیں - کبھی اس کا منہ نہیں دیکھا - آج اس کا اُگھرا ہوا بدن دیکھوں! اسے تن کی سدھ بھی تو نہ ہوگی - مجھے
دیکھ لے گی تو کھل کر ہاتھ پاؤں بھی نہ پٹک سکے گی"

"میں سوچتا ہوں کوئی بال بچہ ہوگیا تو کیا ہوگا۔ سونٹھ، گڑ، تیل، کچھ بھی تو نہیں ہے گھر میں"
"تب کچھ آ جائے گا۔ بھگوان بچہ دیں تو۔ جو لوگ ابھی ایک پیسہ نہیں دے رہے ہیں وہی تب بُلا کر
دیں گے۔ میرے نو لڑکے ہوئے۔ گھر میں کبھی کچھ نہ تھا۔ مگر اسی طرح ہر بار کام چل گیا"
جس سماج میں رات دن محنت کرنے والوں کی حالت اُن کی حالت سے کچھ بہت اچھی نہ تھی، اور
کسانوں کے مقابلہ میں وہ لوگ جو کسانوں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانا جانتے تھے کہیں زیادہ فارغ البال تھے،
وہاں اس قسم کی ذہنیت کا پیدا ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ ہم تو کہیں گے گھیسو کسانوں کے مقابلہ
میں زیادہ باریک بیں تھا۔ اور کسانوں کی تہی دماغ جمعیت میں شامل ہونے کے بدلے شاطروں کی فتنہ پرداز
جماعت میں شامل ہوگیا تھا۔ ہاں اس میں یہ صلاحیت نہ تھی کہ شاطروں کے آئین و آداب کی پابندی بھی کرتا۔
اس لئے جہاں اس کی جماعت کے اور لوگ گاؤں کے سرغنہ اور مکھیا بنے ہوئے تھے اس پر سارا گاؤں
انگشت نمائی کرتا تھا۔ پھر بھی اُسے یہ تسکین تو تھی ہی کہ اگر وہ خستہ حال ہے تو کم سے کم اُسے کسانوں کی
سی جگر توڑ محنت تو نہیں کرنی پڑتی، اور اس کی سادگی اور بے زبانی سے دوسرے بیجا فائدہ تو نہیں اُٹھاتے۔
دونوں آلو نکال نکال کر جلتے جلتے کھانے لگے۔ کل سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ اتنا صبر نہ تھا کہ انھیں ٹھنڈا
ہو جانے دیں۔ کئی بار دونوں کی زبانیں جل گئیں۔ چھل جانے پر آلو کا بیرونی حصہ تو بہت زیادہ گرم نہ معلوم ہوتا
لیکن دانتوں کے تلے پڑتے ہی اندر کا حصہ زبان اور حلق اور تالو کو جلا دیتا تھا اور اس انگارے کو منہ میں رکھنے
سے زیادہ خیریت اسی میں تھی کہ وہ اندر پہونچ جائے۔ وہاں اسے ٹھنڈا کرنے کے لئے کافی سامان تھے۔
اس لئے دونوں جلد جلد نگل جاتے۔ حالانکہ اس کوشش میں انکی آنکھوں سے آنسو نکل آتے۔
گھیسو کو اُس وقت ٹھاکر کی برات یاد آئی جس میں بیس سال پہلے وہ گیا تھا۔ اس دعوت میں اُسے
جو سیری نصیب ہوئی تھی وہ اس کی زندگی میں ایک یادگار واقعہ تھی۔ اور آج بھی اُس کی یاد تازہ تھی۔ بولا۔
وہ بھوج نہیں بھولتا۔ تب سے پھر اس طرح کا کھانا اور بھر پیٹ نہیں ملا۔ لڑکی والوں نے سب کو پوڑیاں
کھلائی تھیں۔ سب کو۔ چھوٹے بڑے، سب نے پوڑیاں کھائیں۔ اور اصلی گھی کی۔ چٹنی، رائتہ، تین طرح کے
سوکھے ساگ، ایک رسے دار ترکاری، دہی، چٹنی، مٹھائی۔ اب کیا بتاؤں کہ اس بھوج میں کتنا سواد ملا۔

کوئی روک نہیں تھی ۔ جو چیز چاہو مانگو ۔ اور جتنا چاہو کھاؤ ۔ لوگوں نے ایسا کھایا، ایسا کھایا، کہ کسی سے پانی نہ پیا گیا ۔ مگر پروسنے والے ہیں کہ سامنے گرم گرم، گول گول، مہکتی ہوئی کچوڑیاں ڈالے دیتے ہیں منع کرتے ہیں کہ نہیں چاہیئے ۔ پتل کو ہاتھ سے روکے ہوئے ہیں ۔ مگر وہ ہیں کہ دئے جاتے ہیں ۔ اور جب سب نے منہ دھو لیا تو ایک ایک بیڑا پان بھی ملا ۔ مگر مجھے پان لینے کی کہاں سدھ تھی ۔ کھڑا نہ ہوا جاتا تھا ۔ چٹ پٹ جا کر اپنے کمبل پر لیٹ گیا ۔ ایسا دریا دل تھا وہ ٹھاکر ۔

مادھو نے ان تکلفات کا مزہ لیتے ہوئے کہا ۔ اب ہمیں کوئی ایسا بھوج کھلاتا ۔

"اب کوئی کیا کھلائے گا ۔ وہ جمانا دوسرا تھا ۔ اب تو سب کو کپھایت سوجھتی ہے ۔ شادی بیاہ میں مت کھرچ کرو ۔ کریا کرم میں مت کھرچ کرو ۔ پوچھو غریبوں کا مال بٹور بٹور کر کہاں رکھو گے! مگر بٹورنے میں تو کمی نہیں ہے ۔ ہاں کھرچ میں کپھایت سوجھتی ہے ۔"

"تم نے ایک بیس پوڑیاں کھائی ہوں گی !"

"بیس سے جیادہ کھائی تھیں ۔"

"میں پچاس کھا جاتا ۔"

"پچاس سے کم میں نے بھی نہ کھائی ہوں گی ۔ اچھا پٹھا تھا ۔ تو اس کا آدھا بھی نہیں ہے ۔"

آلو کھا کر دونوں نے پانی پیا اور وہیں الاؤ کے سامنے اپنی دھوتیاں اوڑھ کر، پاؤں پیٹ میں ڈالے سو رہے، جیسے دو بڑے بڑے اژدر گینڈلیاں مارے پڑے ہوں ۔

اور بدھیا ابھی تک کراہ رہی تھی ۔

(۲)

صبح کو مادھو نے کوٹھری میں جا کر دیکھا تو اس کی بیوی ٹھنڈی ہو گئی تھی ۔ اس کے منہ پر مکھیاں بھنک رہی تھیں ۔ پتھرائی ہوئی آنکھیں اوپر ٹنگی ہوئی تھیں ۔ سارا جسم خاک میں لت پت ہو رہا تھا ۔ اس کے پیٹ میں بچہ مر گیا تھا ۔

مادھو بھاگا ہوا گھیسو کے پاس آیا ۔ پھر دونوں زور زور سے ہائے ہائے کرنے اور چھاتی پیٹنے لگے ۔

پڑوس والوں نے یہ آہ و زاری سنی تو دوڑے ہوئے آئے اور رسم قدیم کے مطابق غم زدوں کی تشفی کرنے لگے۔

مگر زیادہ رونے دھونے کا موقع نہ تھا۔ کفن کی اور لکڑی کی فکر کرنی تھی۔ گھر میں تو پیسہ اس طرح غائب تھا جیسے چیل کے گھونسلے میں ماس۔

باپ بیٹے روتے ہوئے گاؤں کے زمیندار کے پاس گئے۔ وہ ان دونوں کی صورت سے نفرت کرتے تھے۔ کئی بار انھیں اپنے ہاتھوں پیٹ چکے تھے، چوری کی علت میں، وعدہ پر کام پر نہ آنے کی علت میں۔ پوچھا۔ کیا ہے بے گھسوا۔ روتا کیوں ہے۔ اب تو تیری صورت ہی نہیں نظر آتی۔ اب معلوم ہوتا ہے تم اس گاؤں میں رہنا نہیں چاہتے۔

گھسوا نے زمین پر سر رکھ کر، آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے کہا۔ سرکار، بڑی بپت میں ہوں۔ مادھو کی گھر والی رات گزر گئی۔ دن بھر تڑپتی رہی سرکار۔ آدھی رات تک ہم دونوں اس کے سرہانے بیٹھے رہے۔ دوا دارو جو کچھ ہو سکا سب کیا۔ مدا وہ ہمیں دغا دے گئی۔ اب کوئی ایک روٹی دینے والا نہیں رہا مالک، تباہ ہو گئے۔ گھر اجڑ گیا۔ آپ کا غلام ہوں۔ اب آپ کے سوا اس کی مٹی کون پار لگائے گا۔ ہمارے ہاتھ میں تو جو کچھ تھا وہ سب دوا دارو میں اٹھ گیا۔ سرکار ہی کی دیا ہو گی تو اس کی مٹی اٹھیگی۔ آپ کے سوا اور کس کے دوار پر جاؤں۔

زمیندار صاحب رحمدل آدمی تھے۔ مگر گھیسو پر رحم کرنا کالے کمبل پر رنگ چڑھانا تھا۔ جی میں تو آیا کہہ دیں "چل دور ہو یہاں سے۔ لاش گھر میں رکھ کر سڑا۔ یوں تو بلانے سے بھی نہیں آتا۔ آج جب غرض پڑی تو آ کر خوشامد کر رہا ہے۔ حرام خور کہیں کا۔ بدمعاش" مگر یہ غصہ یا انتقام کا موقعہ نہ تھا۔ طوعاً و کرہاً دو روپئے نکال کر پھینک دئے۔ مگر تشفی کا ایک کلمہ بھی منہ سے نہ نکالا۔ اس کی طرف تاکا تک نہیں۔ گویا سر کا بوجھ اتارا ہو۔

جب زمیندار صاحب نے دو روپئے دئے تو گاؤں کے بنئے مہاجنوں کو انکار کی جرأت کیونکر ہوتی۔ گھیسو زمیندار کے نام کا ڈھنڈھورا پیٹتا جاتا تھا۔ کسی نے دو آنے دئے، کسی نے چار آنے۔

ایک گھنٹہ میں گھیسو کے پاس پانچ روپیہ کی معقول رقم جمع ہو گئی۔ کسی نے غلّہ دیدیا، کسی نے لکڑی۔ اور دوپہر کو گھیسو اور مادھو بازار سے کفن لانے چلے۔ ادھر لوگ بانس وانس کاٹنے لگے۔

گاؤں کی رقیق القلب عورتیں آآ کر لاش کو دیکھتی تھیں، اور اس کی بےبسی پر دو بوند آنسو گرا کر چلی جاتی تھیں۔

(۳)

بازار میں پہونچکر گھیسو بولا۔ لکڑی تو اسے جلانے بھر کو مل گئی ہے۔ کیوں مادھو!

مادھو بولا۔ ہاں لکڑی تو بہت ہے۔ اب کپھن چاہئے۔

"تو کوئی ہلکا سا کپھن لے لیں"

"ہاں اور کیا۔ لاس اٹھتے اٹھتے رات ہو جائے گی۔ رات کو کپھن کون دیکھتا ہے"

"کیسا برا رواج ہے کہ جسے جیتے جی تن ڈھانکنے کو چیتھڑا بھی نہ ملے اسے مرنے پر نیا کپھن چاہیئے"

"کپھن لاس کے ساتھ جل ہی تو جاتا ہے"

"اور کیا رکھا رہتا ہے۔ یہی پانچ روپیہ پہلے ملتے تو کچھ دوا دارو کرتے"

دونوں ایک دوسرے کے دل کا ماجرا معنوی طور پر سمجھ رہے تھے۔ بازار میں ادھر ادھر گھومتے رہے۔ یہاں تک کہ شام ہو گئی۔ دونوں اتفاق سے یا عمداً ایک شراب خانے کے سامنے آپہونچے۔ اور گویا کسی طے شدہ فیصلے کے مطابق اندر گئے۔ وہاں ذرا دیر تک دونوں تذبذب کی حالت میں کھڑے رہے پھر گھیسو نے ایک بوتل شراب لی۔ کچھ گزک۔ اور دونوں برامدہ میں بیٹھ کر پینے لگے۔

کئی کجیاں پیہم پینے کے بعد دونوں سرور میں آگئے۔

گھیسو بولا۔ کپھن لگانے سے کیا ملتا۔ آکھر جل ہی تو جاتا۔ کچھ بہو کے ساتھ تو نہ جاتا۔

مادھو آسمان کی طرف دیکھ کر بولا گویا فرشتوں کو اپنی معصومیت کا یقین دلا رہا ہو۔ دنیا کا دستور ہے نہیں لوگ بامھنوں کو ہزاروں روپئے کیوں دیدیتے ہیں۔ کون دیکھتا ہے پرلوک میں ملتا

ہے یا نہیں۔

"بڑے آدمیوں کے پاس دھن ہے پھونکیں۔ ہمارے پاس پھونکنے کو کیا ہے"؟

"لیکن لوگوں کو جواب کیا دوگے! لوگ پوچھیں گے نہیں کفن کہاں ہے!"

گھیسو ہنسا۔ کہہ دیں گے روپئے کمر سے کھسک گئے۔ بہت ڈھونڈھا ملے نہیں۔

مادھو بھی ہنسا اس غیر متوقعہ خوش نصیبی پر، قدرت کو اس طرح شکست دینے پر۔ بولا۔ بڑی اچھی تھی۔ بچاری۔ مری بھی تو خوب کھلا پلا کر۔

آدھی بوتل سے زیادہ ختم ہوگئی۔ گھیسو نے دو سیر پوریاں منگوائیں، گوشت اور سالن۔ اور چٹ پٹی کلیجیاں اور تلی ہوئی مچھلیاں۔ شراب خانے کے سامنے ہی دوکان تھی۔ مادھو لپک کر دو پتلوں میں ساری چیزیں لے آیا۔ پورے ڈیڑھ روپئے خرچ ہوگئے۔ صرف تھوڑے سے پیسے بچ رہے۔

دونوں اس وقت اس شان سے بیٹھے ہوئے پوریاں کھا رہے تھے جیسے جنگل میں کوئی شیر اپنا شکار اُڑا رہا ہو۔ نہ جوابدہی کا خوف تھا، نہ بدنامی کی فکر۔ ضعف کے ان مراحل کو انھوں نے بہت پہلے طے کر لیا تھا۔ گھیسو فلسفیانہ انداز سے بولا۔ ہماری آتما پرسن ہو رہی ہے تو کیا اُسے پن نہ ہوگا؟

مادھو نے فرق عقیدت جھکا کر تصدیق کی۔ جرور سے جرور ہوگا۔ بھگوان، تم انتر جامی (علیم) ہو۔ اُسے بیکنٹھ لے جانا۔ ہم دونوں ہردے سے اُسے دعا دے رہے ہیں۔ آج جو بھوجن ملا وہ کبھی عمر بھر نہ ملا تھا۔

ایک لمحہ کے بعد مادھو کے دل میں ایک تشویش پیدا ہوئی۔ بولا۔ کیوں دادا، ہم لوگ بھی تو وہاں ایک نہ ایک دن جائیں گے ہی۔

گھیسو نے اس طفلانہ سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔ مادھو کی طرف پر ملامت انداز سے دیکھا۔

"جو وہاں ہم لوگوں سے وہ پوچھے کہ تم نے ہمیں کفن کیوں نہیں دیا تو کیا کہو گے؟"

"کہیں گے تمھارا سر"

"پوچھیگی تو جرور"

"تو کیسے جانتا ہے اُسے کپھن نہ ملے گا ؟ تو مجھے ایسا گدھا سمجھتا ہے ! میں ساٹھ سال دنیا میں کیا گھاس کھودتا رہا ہوں۔ اُس کو کپھن ملے گا اور اس سے بہت اچھا ملے گا جو ہم دیتے۔"

مادھو کو یقین نہ آیا۔ بولا۔ کون دے گا ؟ روپئے تو تم نے چٹ کر دئے ؟

گھیسو تیز ہو گیا۔ میں کہتا ہوں اُسے کپھن ملے گا۔ تو مانتا کیوں نہیں ؟

"کون دے گا۔ بتاتے کیوں نہیں ؟"

"وہی لوگ دیں گے جنھوں نے ابکی دیا۔ ہاں وہ روپئے ہمارے ہاتھ نہ آئیں گے۔ اور اگر کسی طرح آجائیں تو پھر ہم اسی طرح یہاں بیٹھے پئیں گے۔ اور کپھن تیسری بار ملے گا۔"

جوں جوں اندھیرا بڑھتا تھا اور ستاروں کی چمک تیز ہوتی تھی، مے خانہ کی رونق بھی بڑھتی جاتی تھی۔ کوئی گاتا تھا، کوئی بہکتا تھا، کوئی اپنے رفیق کے گلے لپٹا جاتا تھا، کوئی اپنے دوست کے منہ میں ساغر لگائے دیتا تھا۔ وہاں کی فضا میں سرور تھا۔ ہوا میں نشہ۔ کتنے تو چلّو میں اُلّو ہو جاتے ہیں۔ یہاں آتے تھے صرف خود فراموشی کا مزہ لینے کے لئے، شراب سے زیادہ یہاں کی ہوا سے مسرور ہوتے تھے۔ زیست کی بلا یہاں کھینچ لاتی تھی۔ اور کچھ دیر کے لئے وہ بھول جاتے تھے کہ وہ زندہ ہیں، یا مُردہ ہیں، یا زندہ در گور ہیں۔

اور یہ دونوں باپ بیٹے اب بھی مزے لے لے کر چسکیاں لے رہے تھے۔ سب کی نگاہیں ان کی طرف جمی ہوئی تھیں۔ کتنے خوش نصیب ہیں دونوں۔ پوری بوتل بیچ میں ہے۔

کھانے سے فارغ ہو کر مادھو نے بچی ہوئی پوریوں کا پتل اُٹھا کر ایک بھکاری کو دیدیا جو کھڑا انکی طرف گرسنہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا اور "دینے" کے غرور اور مسرت اور ولولہ کا اپنی زندگی میں پہلی بار احساس کیا۔

گھیسو نے کہا۔ لے جا۔ کھوب کھا اور اسیرباد دے۔ جس کی کمائی ہے وہ تو مر گئی، مگر تیرا اسیرباد اُسے جرور پہونچ جائے گا۔ روئیں روئیں سے اسیرباد دے۔ بڑی گاڑھی کمائی کے پیسے ہیں۔

مادھو نے پھر آسمان کی طرف دیکھ کر کہا۔ وہ بیکنٹھ میں جائے گی دادا بیکنٹھ کی رانی بنے گی۔

گھیسو کھڑا ہو گیا اور جیسے مسرت کی لہروں میں تیرتا ہوا بولا۔ ہاں بیٹا، بیکنٹھ میں جائیگی۔ کسی کو ستایا نہیں۔ کسی کو دبایا نہیں۔ مرتے مرتے ہماری جندگی کی سب سے بڑی لالسا پوری کر گئی۔ وہ نہ بیکنٹھ میں جائے گی تو کیا یہ موٹے موٹے لوگ جائیں گے جو گریبوں کو دونوں ہاتھ سے لوٹتے ہیں۔ اور اپنے پاپ کو دھونے کے لئے گنگا میں جاتے ہیں اور مندروں میں جل چڑھاتے ہیں۔

یہ خوش اعتقادی کا رنگ بھی بدلا۔ تلون نشہ کی خاصیت ہے۔ یاس اور غم کا دورہ ہوا۔ مادھو بولا۔ مگر دادا بچاری نے جندگی میں بڑا دُکھ بھوگا۔ مری بھی کتنا دُکھ جھیل کر۔ وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر رونے لگا۔

گھیسو نے سمجھایا۔ کیوں روتا ہے بیٹا۔ کُھس ہو کہ وہ مایا جال سے مُکت ہو گئی۔ جنجال سے چھوٹ گئی۔ بڑی بھاگوان تھی جو اتنی جلد مایا موہ کے بندھن توڑ دیئے۔

اور دونوں وہیں کھڑے ہو کر گانے لگے۔

ٹھگنی کیوں نیناں جھمکا وے، ٹھگنی۔

سارا میخانہ محو تماشا تھا اور یہ دونوں میکش مخمور محویت کے عالم میں گائے جاتے تھے۔ پھر دونوں ناچنے لگے۔ اُچھلے بھی، کودے بھی، گرے بھی، مٹکے بھی۔ بھاؤ بھی بتائے اور آخر نشہ سے بدمست ہو کر وہیں گر پڑے۔
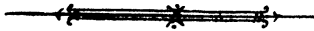
ہندو اور مسلم قومی تحریکیں
اور
ہندوستانی قومیت کی تحریک

(چودھری رحمت علی ایک صاحب ہیں جو کیمرج یونیورسٹی میں تعلیم پا رہے ہیں۔ عرصہ ہوا ان کا ایک مطبوعہ خط کیمرج سے موصول ہوا تھا جس پر انھوں نے "پاکستان کی قومی تحریک" کے صدر کی حیثیت سے اپنے دستخط کئے تھے۔ اس خط کی ابتدا میں بائیں حاشیہ پر ہندوستان کا ایک نقشہ بنا ہوا تھا جس کے شمال مغربی کونہ کو سبز رنگ دے کر نمایاں کیا گیا تھا اور اس پر پاکستان کا لفظ لکھا گیا تھا۔ اس کے رنگے ہوئے حصہ میں ہندوستان کے پانچ موجودہ صوبے اور ریاستیں یعنی کشمیر، شمال مغربی سرحدی صوبہ، بلوچستان، پنجاب اور سندھ شامل تھے۔ اس خط پر ۸ جولائی ۱۹۳۵ء کی تاریخ درج تھی اور یہ اس وقت لکھا گیا تھا جب کہ پارلیمنٹ قانون حکومت ہند کے مسودہ کو آخری شکل وصورت دے رہی تھی۔

اس تحریر میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ ہندوستان اور پاکستان دو ایسے خطے ہیں جن کے باشندے ایک دوسرے سے نمایاں طور پر ممتاز ہیں۔ ان کی تہذیبیں علیحدہ علیحدہ ہیں۔ ان کا فلسفہ، تمدن، زبان، ادب اور فنون لطیفہ ایک دوسرے سے بنیادی طور پر مختلف ہیں۔ ان کے مذہب، ان کی معاشری اور تاریخی روایات میں ابتدا سے کوئی باہمی یگانگت اور ہم آہنگی نہیں پائی جاتی۔ ان دونوں علاقوں میں ایک ہی قوم کے دو فرقے آباد نہیں ہیں بلکہ دو مختلف قومیں آباد ہیں۔ ان کے مسائل کا حل فرقہ وارانہ سمجھوتوں سے نہیں بلکہ بین الاقوامی معاہدوں سے ممکن ہے۔ اس لئے مجوزہ ہندوستانی فیڈریشن میں پاکستان کو ہندوستان کے ساتھ

شریک کرکے جو ظلم پاکستان کے ساتھ کیا گیا ہے اس کے خلاف جدوجہد کرنا ضروری ہے تاکہ اس ناانصافی کا ازالہ ہو سکے اور پاکستان ہندوستان سے الگ ہو کر اپنی مخصوص قومی زندگی کو ترقی دے سکے۔

ہمیں چودھری رحمت علی صاحب کی کوئی ذاتی واقفیت نہیں ہے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ عملاً کس حد تک ایک مخلص اور بے ریا کارکن ہیں۔ کیمبرج میں ان کا اپنی تحریک شروع کرنا بادی النظر میں مشتبہ سا معلوم ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ چودھری رحمت علی صاحب سے زیادہ شاطر ہاتھ پس پردہ اس تحریک کو چلانا چاہتے ہوں اور ہندوستان میں بھی ایک اُلسٹر بنا کر یا ترکوں کے خلاف جیسے عربوں کی قومی تحریک شروع کی گئی تھی ایسی ہی کسی چیز کا آغاز کرکے یہاں کی قومی تحریک کی بنیادیں بھی کھوکھلی کی جا رہی ہوں۔ اس مضمون میں ہمارے پیش نظر چودھری رحمت علی صاحب یا برطانیہ کے وہ ہونہار فرزند نہیں ہیں جو مشرقی ممالک کی ذہنیت کو یہاں کے لوگوں سے بہتر سمجھ کر کرنل لارنس بننے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ ان کے خط کا حوالہ دینا یہاں صرف اس لئے ضروری سمجھا گیا کہ ان کے خط میں جو مطالبہ پیش کیا گیا ہے اسے ہندوستانی مسلمانوں کی قومی تحریک کے ارتقا کی آخری منزل سمجھنا چاہیئے۔ جب کسی ملک کی آبادی کا ایک حصہ دوسرے حصہ سے اپنے آپ کو بہت زیادہ مختلف پانے لگے اور جب مفاہمت اور مصالحت کے تمام دروازے اپنے لئے بند پائے تو اس کا انجام یہی ہو سکتا ہے کہ اس کے دل میں یہ تمنا پیدا ہو کہ وہ اپنی ایک جداگانہ دولت و حکومت قائم کرے۔ ذیل کے مضمون میں اسی بات کے دریافت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ آیا واقعی صورت حال اس درجہ خراب ہو گئی ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے لئے متحد ہو کر ایک مشترکہ قومی زندگی بسر کرنا ناممکن ہو گیا ہے اور ایک کو دوسرے کے ظلم سے بچانے کے لئے ملک کو دو حصوں میں تقسیم کرنا ناگزیر ہو گیا ہے تاکہ دونوں علیحدہ علیحدہ رہ کر اپنی مخصوص قومی زندگی کو امن وچین سے گذار سکیں۔

اس مضمون کو اس عنوان کی پہلی قسط سمجھنا چاہیئے ہمیں توقع ہے کہ ملک کے اہل الرائے

حضرات بلاقید مذہب اس موضوع پر رسالہ جامعہ کے ذریعہ اپنے بیش بہا خیالات کا اظہار فرما کر اس سلسلہ کو جاری رکھیں گے ۔)

احساس قومیت کی بیداری آدمی تنہا زندگی بسر نہیں کرتا بلکہ دوسرے لوگوں کے ساتھ مل جل کر، ہنس بول کر اپنا وقت گذارتا ہے ۔ لیکن سب لوگوں کے ساتھ اس کی راہ و رسم، مروت و محبت یکساں نہیں ہوتی ۔ کچھ لوگوں کی صحبت میں اسے لطف حاصل ہوتا ہے اور کچھ لوگوں کی صحبت اسے گراں گذرتی ہے جس کا اظہار بعض صورتوں میں وہ کراہیت اور نمایاں نفرت کے ساتھ کرتا ہے اور بعض صورتوں میں مجہول رواداری کے ساتھ ۔ یہ ہو سکتا ہے کہ تھوڑے عرصہ کے لئے کاروباری معاملات میں یا غیر معمولی حالات کے زیر اثر وہ ان لوگوں سے بھی جن کی صحبت اسے گراں گذرتی ہے میل جول رکھنا گوارا کرے ۔ لیکن اپنے دن رات کا بیش تر حصہ برضا و رغبت وہ ایسے ہی لوگوں کے ساتھ بسر کرنا پسند کرے گا جن کے خیالات اور احساسات میں وہ اپنے ساتھ ہر قدم پر یگانگت، ہم آہنگی اور اتحاد و اتفاق دیکھے گا ۔ ساتھ اٹھنا بیٹھنا، ساتھ کھانا پینا، ایک ہی زبان میں گفتگو کرنا، ایک ہی وضع کا کپڑا پہننا، ایک ہی طرز کے مکان میں رہنا، کائنات و زندگی کے متعلق ایک طرح کے اعتقاد رکھنا، ایک ہی انداز سے عبادت کرنا، ایک ہی قسم کی چیزوں کو پسندیدگی اور ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھنا، آپس میں شادی بیاہ کو جائز رکھنا، ایک ہی ادب، صنعت، طرز عمارت، مصوری، موسیقی سے لطف حاصل کرنا، معاشی کاروبار میں مشترکہ اغراض و مفاد رکھنا ۔ غرضکہ اتنے بے شمار نقطہ ہائے اتصال ہوتے ہیں کہ جب ایسے لوگ ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی جسم کے متعدد اعضاء ہیں جو باہم مل کر ایک دوسرے کی تکمیل کر رہے ہیں ۔ ایسی حالت میں جب ایک شخص اپنی ترقی کے لئے کوئی کوشش کرتا ہے تو اس سے کل کنبہ، برادری، قبیلہ یا قوم کی ترقی از خود ہو جاتی ہے اور جب جماعت کی ترقی کا کوئی کام کیا جاتا ہے تو اس کا اثر بواسطہ در بواسطہ ہر فرد کی ذات تک پہنچتا ہے ۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بعض لوگوں سے رفاقت اور بعض سے بیگانگی کا کیا سبب ہے ؟ اس کا ایک سبب نہیں متعدد اسباب ہو سکتے ہیں ۔ مثلاً اتحاد نسل، اتحاد زبان، اتحاد مذہب، تمدن و معاشرت کا

اتحاد، تجارتی اتحاد، فتح و شکست، حملہ و مدافعت، رنج و راحت میں باہمی شرکت، شراکت وطن، شراکت محکومیت وغیرہ وغیرہ۔

زمانہ حال میں مغربی ممالک نے ان رشتوں میں جس رشتہ کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے وہ شراکت وطن کا رشتہ ہے۔ لیکن ملک پرستی بجائے خود کوئی قومی جذبہ بن سکتی ہے یا نہیں اس کا فیصلہ آسان نہیں ہے۔ اس کی مخالفت میں کہا جاسکتا ہے کہ آدمی کسی بے جان قطعہ زمین سے محبت نہیں کرتا بلکہ اس پر بسنے والے آدمیوں سے اسے تعلق اور لگاؤ ہوتا ہے۔ اور اگر یہ آدمی ایک جگہ قیام نہ کریں تو زمین سے کوئی محبت نہ پیدا ہو۔ اس کو ثابت کرنے کے لئے شکار اور گلہ بانی کی خانہ بدوش زندگی کو پیش کیا جاسکتا ہے جس میں ایک جماعت مستقل طور پر کسی جگہ قیام نہ کرنے کے باوجود اپنی جماعتی زندگی کے شیرازہ کو قائم رکھتی ہے۔ لیکن ملک پرستی کے حامی یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب آدمی ایک خاص قطعہ زمین پر بس جاتا ہے وہاں اپنے لئے مکان بنا لیتا ہے، باغ لگا لیتا ہے، مسلسل کھیتی باڑی کرتا ہے تو اس وقت کیا صورت ہوتی ہے؟ کیا اس وقت بھی زمین کی محبت سے انکار کیا جاسکے گا؟ لیکن تاریخ کی گردش سے ایک ایسی صورت بھی پیدا ہو سکتی ہے جس میں ایک آدمی کے لئے صرف وہ مادی منافع باقی رہ جائیں جو زمین اور املاک سے حاصل ہوتے ہیں اور اس کی وہ تمام دماغی اور روحانی لذتیں اس سے چھین لی جائیں جن سے اس کی یا اس کے آباؤ اجداد کی زندگی مالامال رہا کرتی تھی۔ آدمی عموماً کسی ایک زبان کے الفاظ میں غیر معمولی شیرینی، کسی ایک طرز کی مصوری اور صناعی میں خاص نزاکت و حسن اور کسی ایک نوع کی موسیقی میں بے مثال نغمہ پاتا ہو اور اسے اپنا سمجھ کر اس کی خاص طور پر قدر کرتا ہو۔ لیکن انسانی آبادی کے مختلف گروہوں میں جو اتحاد و ارتباط اور افتراق و انشقاق کا سلسلہ جاری ہے اور بعض وقت قربت اور بعض وقت بعد پیدا ہوتا رہتا ہے، ایک گروہ کا اثر و اقتدار ایک وقت زائد اور دوسرے کا کم ہوتا رہتا ہے اور جسے قوموں، تمدنوں اور تہذیبوں کے عروج و انحطاط، ترقی و زوال کے ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے ——— کیا یہ ممکن نہیں کہ وہ کسی وقت ایسی شکل اختیار کرلے کہ جس کے زیر اثر ایک آدمی کو اپنی زمین اور املاک کے مادی منافع تو حاصل رہیں لیکن اپنی تمام تمدنی وابستگیوں سے وہ محروم کردیا جائے تو کیا اس وقت وہ آدمی اس محرومی کو خاموشی سے گوارا کرے گا؟ کیا وہ ان کے ضائع

ہونے کے بعد بھی اپنی زندگی کو مکمل باور کرتا رہے گا؟ کیا اس کی زندگی میں ایک خلا، ایک اشتہا، ایک خلش اور بے چینی پیدا نہیں ہوگی جیسے تھوڑی سی آزادی اور اختیار کی حالت میں وہ ضرور رفع کرنے کی کوشش کرے گا؟ محکومی، مجبوری اور ظلم کی حالت میں تو یہ ممکن ہے کہ لوگ ان محرومیوں کو گوارا کرتے رہیں لیکن ان چیزوں کی یاد اندر ہی اندر ان کے دلوں میں سلگتی رہے گی۔ وہ موقع کے منتظر رہیں گے اور جب کبھی موقع ملے گا وہ اس دبے ہوئے شعلہ کو بھڑکا کر اس کی تاریکی اور ویرانی کو دور کرنے کی کوشش کریں گے۔ وہ تدبیریں سوچتے رہیں گے کہ اپنی حالت محکومیت کو آزادی میں بدلیں اور ان کی آزادی کا مفہوم ان چیزوں کے احیاء و ترقی کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔ اور جب کبھی یہ بجھی ہوئی چنگاری ذرا چمکے گی کیا لوگ اسے "احساس قومیت کی بیداری" کے نام سے موسوم نہ کریں گے؟

اس سے ظاہر ہوا کہ کسی ایک ملک کی محض سکونت احساس قومیت پیدا کرنے کے لئے کافی نہیں ہے۔ اس کے لئے ضرورت اور رشتوں کی بھی ہے جن کی بنیاد پر قومیت کا احساس بیدار ہوتا ہے۔ اگرچہ اس کی مخالفت میں یہ کہنا بھی غلط نہیں ہے کہ مادی منافع کے لالچ میں جب ایک ہی مقام پر مستقل سکونت اختیار کرنے کے لئے آدمی مجبور ہوتا ہے تو اس جگہ کے تمدن و معاشرت کے طریقوں سے بھی اسے مانوس ہونا پڑتا ہے اور رفتہ رفتہ اپنے پرانے طریقوں کو بھول کر نئے طریقوں کو جو جدید ماحول میں کامیاب زندگی گذارنے کے لئے زیادہ موزوں ہے اختیار کرلیتا ہے۔

زمین کی محبت اور تمدن و تہذیب کی محبت میں جب کشمکش ہو جاتی ہے اس وقت اس کا انحصار کہ دونوں میں سے کون کس پر غالب آئے گا اس بات پر ہوگا کہ آبادی کا اپنے قدیم تمدن و تہذیب سے لگاؤ کس شدت کے ساتھ ہے۔ اس تعلق کو قائم رکھنے کے لئے کس قسم کے مواقع موجود ہیں مثلاً کوئی ایسا مستحکم معاشری نظام ہے جو سخت حملوں کو جھیلنے کی اہلیت رکھتا ہے اور تہذیب و تمدن کے شیرازہ کو منتشر نہیں ہونے دیتا یا کہیں باہر کوئی ایسی جگہیں ہیں جہاں وہ تمدن و تہذیب زندہ اور مائل بہ ترقی ہو اور جہاں سے ترک سکونت کرکے لوگ برابر اس قطعہ زمین کی طرف آرہے ہوں یا جہاں کی ترقی کی مثال یہاں سکونت اختیار کرنے والوں کے لئے حوصلہ افزا ہو پھر اس خاص قطعہ زمین پر بسنے والی دوسری آبادیوں کا رویہ بھی اس پر اثر ڈالے گا۔ یہ رویہ اگر ہمدردانہ اور مفاہمت پر

مائل ہوگا تو نقطۂ اتصال جلد پیدا ہوسکیں گے اور پرانی وفاداریاں جلد فنا ہوسکیں گی ورنہ تصادم عرصہ تک جاری رہے گا۔

یہی حال تقریباً اور دوسرے رشتوں کا بھی ہے مثلاً نسل کی پاکیزگی اسی وقت تک قائم رہے گی جب باہمی ازدواج میں رکاوٹیں ہوں گی۔ زبان اور مذہب کے اختلافات بھی اسی وقت تک نمایاں رہیں گے جب تک عصبیت کے ساتھ ان کی پابندی کی جائے گی۔ تجارت وصنعت کے رشتے، مفاد کے اشتراک اور اختلاف کے ساتھ بندھتے اور ٹوٹتے ہیں۔ فتح و شکست حملہ و مدافعت، رنج و راحت اور محکومیت کے رشتوں کا انحصار، شراکت کی شدت اور مدت پر ہوگا۔

ان تمام باتوں کو پیش نظر رکھ کر اس بات کا فیصلہ کرنا کہ کس وقت اور کن اسباب کے ماتحت کسی انسانی گروہ میں احساس دوری یا قربت اس قدر قوی ہو جائے گا کہ وہ اپنے آپ کو ایک علیحدہ قوم کہنے لگے گا بہت دشوار ہے۔ اس سلسلہ میں رینان کے اس علمی انکشاف کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے جس میں اس نے یہ ثابت کیا ہے کہ قومیت کے وجود کے لئے جو شرط ضروری ہے وہ نہ نسل کا اشتراک ہے، نہ مذہب، زبان، تمدن و معاشرت وغیرہ کا بلکہ قومیت جس چیز سے پیدا ہوتی ہے وہ صرف قومیت کا احساس ہے۔ اگر یہ احساس موجود ہے (اس سے بحث نہیں کہ اس کا محرک کیا ہے) تو اور تمام دوسرے اختلافات کے ہوتے ہوئے بھی ایک انسانی گروہ قوم کہلا سکتا ہے۔

پھر قوم کے لفظ کا جو مفہوم موجودہ زمانہ میں ہے اسے پیدا ہوئے بھی بہت زیادہ عرصہ نہیں گذرا۔ لارڈ ایکٹن نے اس کی ابتدا افتراق پولینڈ سے کی ہے۔ انگلستان کو اس کے مخصوص حالات اور معاشی ضروریات نے سولھویں صدی میں سب سے پہلے ایک قوم بنا دیا۔ فرانس میں یہ چیز اٹھارویں صدی کے آخری حصہ میں پیدا ہوسکی۔ جرمنی کی قومیت ایک اعتبار سے نپولین سے شکست کھانے کے بعد پیدا ہوئی ہے۔ اٹلی میں بھی تقریباً جرمنی کے ساتھ ساتھ قومیت کا احساس پیدا ہوا۔ اس لئے مغرب میں انیسوی صدی کو قومیت کی صدی کہا جاسکتا ہے۔ مشرقی ممالک نے بھی اس نئے تخیل کے اثر کو مغرب سے قبول کیا اور یہاں بھی انسویں صدی کے آخری سالوں سے قومیں پیدا ہونے لگیں۔

ہندوستان میں قومیت کا احساس کب پیدا ہوا اس کے متعلق لوگوں میں اختلاف رائے ہے بعض لوگ اس کے وجود ہی سے انکار کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ہندوستان میں وہ عناصر ہی نہیں پائے جاتے جو قومیت کے لئے ضروری ہیں ان کے نزدیک ہندوستان کی حیثیت ایک جغرافی اصطلاح سے زیادہ نہیں ہے اس ملک کی وسعت اس قدر زیادہ ہے اور یہاں کے صوبوں، نسلوں، زبانوں، مذہبوں، ذاتوں، معاشرت اور پیدائش دولت کے طریقوں میں اس قدر شدید اختلاف پائے جاتے ہیں کہ یہاں کی آبادی کو آدمیوں کا ایک گروہ تو کہا جا سکتا ہے لیکن جماعت نہیں کہا جا سکتا کیونکہ ان میں باہم ایسے تعلقات اور روابط نہیں ہیں جو انھیں کسی قریبی اور پائدار رشتہ سے منسلک کرتے ہوں۔ جو رشتے ہیں وہ اس قدر سطحی اور کمزور ہیں کہ وہ قومیت کے پیدا کرنے کے لئے کافی نہیں ہیں۔

لیکن اگر یہ بات صحیح ہے تو ہندوستان میں قوم و قومیت کے جو الفاظ پچھلے پچاس سالوں سے ہر خاص و عام کی زبان پر ہیں ان کا کیا مفہوم ہے؟ سرسری مشاہدہ سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ ہندوستان کی آبادی کو مذہب، معاشرت اور تاریخی روایات کی بنا پر دو نمایاں بڑے گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے جن میں اکثر صورتوں میں باہمی اختلاف کا احساس بھی خاصا شدید پایا جاتا ہے۔ یہ دو گروہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے ہیں آیندہ صفحات میں ہم دیکھیں گے کہ ان دونوں گروہوں میں مشترک طور پر کسی بیرونی قوم کے مقابلہ میں یا باہم ایک دوسرے کے مقابلہ میں کسی قسم کا کوئی قومی جذبہ پایا جاتا ہے یا نہیں۔

ہندوؤں میں قومیت کا احساس ہندوؤں میں ایک طرح کی بنیادی وحدت تو نہایت قدیم زمانہ سے پائی جاتی ہے۔ ڈاکٹر رادھا کمد مکرجی نے دو کتابیں "ہندوستان کی بنیادی وحدت" اور "ہندو تمدن میں قومیت" لکھی ہیں۔ ان میں انھوں نے ان نمایاں قوتوں کو جو ہندوؤں کی زندگی میں وحدت پیدا کرتی ہیں نہایت تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ انھوں نے ثابت کیا ہے کہ کس طرح ہندوستان کے رہنے والے نہایت قدیم زمانہ سے برہم ورت کو یعنی اس ملک کو جو ہمالیہ اور جنوبی سمندروں کے درمیان واقع ہے اپنا مشترک وطن سمجھنے لگے تھے۔ رامائن میں ایک دوہا ہے جس میں ماں اور مادر وطن کو بہشت سے بھی زیادہ عزیز اور لائق احترام بیان کیا گیا ہے۔ یہ حب وطن کی وہ صورت ہے جو ترقی کرکے قومی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ پھر جتنے مندر، تاریخی عمارتیں، مقدس دریا

ہندوستان کے مختلف حصوں میں پھیلے ہوئے ہیں اور جن کی یاترا اور درشن مذہب کے پابند ہندو اکثر کرتے رہتے ہیں وہ بھی ملکی اور تمدنی اتحاد پیدا کرنے کے نہایت موثر ذرائع ہیں۔ ک۔م۔ پانیکار نے بھی اپنی کتاب "ہندوستانی قومیت :۔ اس کی ابتدا، تاریخ اور نصب العین" میں یہ بات ظاہر کی ہے کہ ہندوستانی تاریخ میں چندر گپتا موریا کے زمانہ سے مرہٹوں تک برابر ایک تسلسل پایا جاتا ہے۔ ان کے نزدیک مرہٹوں اور سکھوں کا عروج ایک طرح کی قومی تحریک تھی جسے بجا طور پر ہندو جذبۂ قومی و مذہبی کے احیاء سے تعبیر کیا جا سکتا ہے مسٹر پ۔ن۔ بوس نے اپنی کتاب "سوراج ؛ تمدنی و سیاسی" میں اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ برطانیہ کی آمد سے قبل ہندوستان میں سیاسی تو نہیں لیکن تمدنی قومیت پائی جاتی تھی جسے مغرب نے فنا کر دیا۔ بابو بپن چندر پال نے اپنی کتاب "روح ہند" میں لکھا ہے کہ ہندوستان میں ایک وفاقی قومیت پائی جاتی تھی جس میں بھارت ورش کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں اور راجدھانیاں باہمی دوستی سے ایک وفاقی حکومت بنالیتی تھیں جس کا صدر ایک بڑا راجہ ہوا کرتا تھا اور ہندوستان کی قومیت کا یہ تخیل یورپ کی ملکی قومیت سے مختلف تھا۔ ان کا خیال ہے کہ مسلم حکومت نے ہندوستانی تمدن کی اس وحدت کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا لیکن مغرب نے پرانے نظام تمدن کو برباد کر ڈالا۔

لیکن جب ہندوستانی تاریخ کے تخیلات کا نہیں بلکہ واقعات کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو اس سے قومیت کا وجود اپنے مفہوم کے تمام لوازم کے ساتھ ثابت نہیں ہوتا گو اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ایک نہایت طویل زمانہ تک ہندوستانیوں میں ایک مشترک تمدن رائج رہا ہے اور اس تمدن کا اثر اس قدر ہمہ گیر تھا کہ جنوب کے دراوڑوں کو بھی یہ اپنی گرفت میں لئے ہوئے تھا اور اس سے آزاد ہونے کا کوئی رجحان ان میں نہ پایا جاتا تھا۔ لیکن مسلمانوں کی فتح کے بعد ہندوستان کی تمدنی وحدت میں ایک بڑی خلیج پیدا ہو گئی جس کو ہموار کر کے قومی وحدت کو حاصل کرنا سہل نہیں رہا ہے۔ لیکن جو لوگ ہندو قومیت کے عناصر اتحاد کو اپنے سامنے رکھتے ہیں وہ مسلم عنصر کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ وہ ہندو تمدن کی قوت انجذاب کے بہت زیادہ قائل ہیں اور ہندوستان کی گذشتہ تاریخ کی صدہا مثالیں سامنے رکھ کر یہ ثابت کرتے ہیں کہ مسلمانوں کا ہندو تمدن میں جذب ہو جانا نہایت آسانی سے ممکن ہے۔

ہندو قومی تحریک کو شعوری طور پر، قصد و ارادہ کے ساتھ چلانے والی تحریکیں برہمو سماج، آریہ سماج اور رام کرشن اور ویوا کانند کے مشن تھے۔ تھیا سوفیکل سوسائٹی نے بھی بڑی حد تک ہندو قومیت کے احیاء کو ہی اپنا مقصد قرار دے لیا ہے۔ یہ سب ہندو مذہب کی اصلاحی تحریکیں ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ جارحانہ اور کسی قسم کی مفاہمت پر نہ آمادہ ہونے والی جماعت آریہ سماجوں کی ہے۔ اس نے ابتداء سے صرف ہندو راج کا ہی خواب دیکھا ہے اور ہندوستان کو صرف ہندوؤں کا ہی موروثی حق سمجھا ہے۔ ان کی ترقی کے مفہوم میں صرف ہندو مذہب، زبان، معاشرت اور علوم و فنون کی ترقی اور احیاء شامل ہیں۔ ہندوستان کے دوسرے عناصر کو وہ اپنے اندر جذب کر کے فنا کرنا چاہتے ہیں۔ ہندوستانی تعلیم یافتوں میں ابتدائی لوگ مغرب کے تمدن سے بہت زیادہ متاثر ہوئے تھے اور ان کے پیش نظر جو نصب العین ہندوستانی قومیت کا تھا وہ مغربی نمونہ کا تھا جس میں سیاسی، معاشی اور معاشرتی ترقی مغرب کی تقلید کے ذریعہ سے ہی ممکن تھی لیکن بعد کے تعلیم یافتہ لوگوں پر مذہبی رنگ غالب ہونا شروع ہوا اور اس کے غلبہ کے ساتھ ساتھ قومیت کی بنیاد مذہب پر رکھی جانے لگی جس میں غیر ہندوؤں کے لئے شرکت ناممکن ہو گئی۔ ہندی اور سنسکرت کی ترویج اور ترقی کی کوششیں بھگوت گیتا اور مذہبی شاستروں کا مطالعہ، ویدانت کے فلسفہ کا جدید مغربی فلسفہ سے مقابلہ اور اس کی برتری کی تبلیغ، ہندو عہد تاریخ کی خوبیاں اور کارگذاریاں، شیواجی کو قومی ہیرو سمجھنا، گروکل پاٹ شالوں کا قیام، ہندو یونیورسٹی، ہندو سماج کی اصلاحی تحریکیں مثلاً اچھوت سدھار، بیواؤں کی شادی، نو عمری کی شادی کا انسداد، تیوہاروں تقریبوں پر فضول خرچی سے پرہیز، تعلیم نسواں وغیرہ شروع کی گئیں اور ان میں صرف ہندوؤں کو پیش نظر رکھا گیا۔ پھر چونکہ مسلمان ملک کی سیاسی تحریک سے علیحدہ رہے اور بنگال کے افتراق سے ہندو مسلمانوں میں بھی کچھ بد مزگی پیدا ہوئی اس لئے دوری اور بڑھتی رہی اور فرقہ وارانہ ذہنیت کے نہایت شدید مظاہرے ہونے لگے اور جتنا زیادہ دھرم کے پابند لیڈروں اور پنڈتوں کا اثر پبلک زندگی میں بڑھا اتنی ہی زیادہ ہندوستانی قومیت ہندو قومیت بنتی چلی گئی۔ کانگریس لیگ سمجھوتہ کے ذریعہ ہندو قومیت اور مسلم قومیت کے علمبردار ایک دوسرے سے کچھ قریب ہوئے اور تحریک عدم تعاون کے ہنگامے میں تو اس قدر متضاد اور غیر ہم آہنگ عناصر کچھ عرصے کے لئے شیر و شکر ہوئے کہ جس کی مثال شاید کم مل سکے گی۔ لیکن یہ اتحاد عرصہ تک

قائم نہ رہ سکا۔ اس نے بنیادی اختلافات کو ایک مشترکہ شکایت کی وجہ سے کچھ عرصہ کے لئے دبا دیا۔ مذہبی احیاء کے وہی لیڈر جو ایک دوسرے کی مخالفت میں سرگرم رہتے تھے اپنی مخالفتوں کو بھلا کر ایک دوسرے کے شریک ہو گئے۔ لیکن ان کی راہیں اس قدر بنیادی طور پر مختلف تھیں کہ تھوڑے عرصہ کے بعد جدائی لازمی تھی۔ چنانچہ نہایت سخت تصادم ہوا اور ہندو مہاسبھا، سنگھٹن، شدھی اور ایسی ہی خالص ہندو قومی تحریکیں شروع ہو گئیں جو ابھی تک ہندوستانی زندگی کے شیرازہ کو منتشر کئے ہوئے ہیں۔

مسلمانوں میں قومیت کا احساس مسلمانوں میں مذہبی عقیدے کی سادہ اور واضح یکسانیت، عبادت کے جماعتی طریقے اور معاشری زندگی میں مساوات ایسے عوامل ہیں جن سے اتحاد بہت جلد پیدا ہوتا اور دیر تک قائم رہتا ہے۔ پھر حکمراں طبقہ کی حیثیت سے ہندوستان میں زندگی گذارنے کی وجہ سے بھی ان میں باہمی تعلق اور یگانگت بڑھ گئی۔ تمدن و معاشرت کے مخصوص طریقے پیدا ہو گئے جن کی بنا پر مسلمان اپنے آپ کو حاکم سمجھ کر غیر مسلم رعایا سے الگ الگ رہنے لگے۔ سلطنت جب ہاتھ سے نکل گئی اس وقت بھی مسلمانوں کی عزت و عظمت یہاں کی مقامی آبادی میں باقی رہی اور ان کی معاشرت کا اختلاف نمایاں رہا جس کی تقلید کرنا یہاں کی محکوم رعایا اپنے لئے باعث فخر سمجھتی تھی۔ انگریزوں کے برسر اقتدار ہونے سے ان کے عہدے، ریاستیں، جاگیریں، منصب اور معافیاں ان کے ہاتھ سے نکلنے لگیں لیکن پھر بھی عرصہ تک بہت سی باقی رہیں جن کی وجہ سے ان کی شان و شوکت اور نمود و نمائش اور اقتدار و برتری قائم رہی۔ غدر کے بعد غدر کا بیشتر الزام مسلمانوں پر رکھا گیا اور ان سے بدلہ لیا جانے لگا۔ ان کی تباہ حالی کو دیکھ کر سرسید نے مسلمانوں اور انگریزوں میں مفاہمت اور مصالحت کرانا چاہی۔ ابتدا میں سرسید ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی بہبودی کے خواہش مند تھے لیکن مسلم حکومت اور اقتدار کی یادگاریں ان سے اس قدر قریب تھیں کہ وہ اسلامی اثرات کو جو ایک عرصہ تک جاری رہنے کی وجہ سے ہندوستان کی زندگی کا ایک جزو بن گئے تھے اور جنھیں ہندو اور مسلمان برضا و رغبت اختیار کر چکے تھے مٹتا ہوا دیکھنا گوارا نہ کر سکتے تھے۔ چنانچہ جب کچھ ہندوؤں نے اردو کے مقابلہ میں ہندی کے رواج دینے کی کوششیں شروع کیں تو سرسید کو بہت ناگوار ہوا اور اس دن سے انھوں نے سمجھ لیا کہ ہندو مسلم اتحاد ممکن نہیں ہے اور وہ اب

پوری طور پر سلمانوں کے لئے ہی کوشش کرنے لگے۔ اس کے علاوہ سلمانوں کے لئے خاص طور پر کوشش کرنے کا ایک اور سبب بھی تھا۔ سلمان اپنے تعصب اور غرور کی وجہ سے انگریزی تعلیم سے اور انگریزوں نے ہندوستانیوں کو ترقی کے جو مواقع دئے تھے ان سے پوری طرح فایدہ نہیں اٹھا سکے تھے اور وہ ہندوؤں کے مقابلہ میں تعلیم اور سرکاری ملازمتوں میں بہت پیچھے رہ گئے تھے اس پس ماندگی کو مٹانے کے لئے بھی سرسید مسلمانوں کی تحریکوں کو ہندوؤں سے الگ رکھنا چاہتے تھے۔ سرسید کی ہستی بڑی ہمہ گیر واقع ہوئی تھی۔ اُنھوں نے مسلم مذہب، زبان، تمدن و معاشرت، تعلیم ـــ سب کو بچانے کے لئے بیک وقت کوششیں شروع کیں اور مسلمانوں کی ایک قومی درسگاہ قائم کرکے ہندوستان میں مسلم قومیت کی تحریک کو مستقل بنیاد پر قائم کردیا۔ سرسید کے علاوہ اور لوگ بھی مذہبی تحفظ اور احیار کی کوششوں میں لگے ہوئے تھے۔ دارالعلوم دیوبند، دارالعلوم ندوہ، دارالمصنفین یہ مفید ادارے ان دوسرے لوگوں کی کوششوں سے قائم ہوئے۔ پھر مسلم قومی شاعروں میں حالی اور مصنفین میں نذیر احمد، شبلی اور سرسید کے رفقار خاص طور پر لایق ذکر ہیں۔ ان سب کی مشترکہ کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں ایک قومی بیداری شروع ہوئی جو ہندو قومی بیداری سے بالکل علیحدہ ایک چیز تھی۔ سرندرناتھ بنرجی نے جب سرسید سے انڈین سول سروس ایجیٹیشن کے سلسلہ میں اشتراک عمل کرنا چاہا تو سرسید نے انکار کردیا۔ کانگریس سے بھی سرسید علیحدہ رہے۔ ان کے مقابلہ میں ایک طرف تو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی گئی جس میں مسلمانوں کے تعلیمی اور اصلاح معاشرت کے مسائل پر بحثیں ہونے لگیں اور دوسری طرف آل انڈیا مسلم لیگ قائم کی گئی جو مسلمانوں کے سیاسی مسائل پر غور و فکر کرنے لگی۔ سرسید ابتدا ہی سے حکام رس تھے اور اس حکام رسی کی بنا پر انھیں یہ اعتماد تھا کہ وہ مسلمانوں کے لئے انگریزوں سے ہندوؤں کے مقابلہ میں بہتر سیاسی مراعات حاصل کرسکیں گے۔ اسی مقصد کے ماتحت انھوں نے اپنے مدرسہ کے اسٹاف میں بہت سے انگریزوں کو بھرتی کیا۔ سرسید کے پیش نظر غالباً کل ہندوستان کی آزادی کا نصب العین کبھی بھی نہیں رہا۔ ان کا مطمح نظر شاید صرف یہ تھا کہ انگریزوں کے ساتھ اشتراک عمل کرکے ہندوستان پر انگریزوں اور مسلمانوں کی ایک مشترکہ حکومت قائم کریں مگر سرسید اپنے مذہبی عقاید میں قدامت پسند نہیں تھے۔ وہ مغرب سے بہت زیادہ مرعوب تھے۔

اسی لئے وہ مغربی فلسفہ کے ساتھ اپنے مذہبی عقاید کی جا و بیجا مطابقت کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس کی ایک وجہ ممکن ہے یہ بھی ہو کہ سرسید مذہبی علمار کے ان فتووں کی مخالفت کرنا چاہتے تھے جن سے غدر کے زمانہ میں مسلمانوں کو انگریزوں کے خلاف جہاد پر آمادہ کیا گیا تھا اور جن کی موجودگی میں انگریزوں سے اشتراک عمل اور مصالحت کی کوئی صورت پیدا نہ ہو سکتی تھی۔ بہر حال سرسید کی تحریک انگریزوں اور مغربی تہذیب سے مفاہمت کی خواہش مند تھی۔ لیکن علی گڈھ تحریک سے علیحدہ ملک میں راسخ العقیدہ مسلمانوں کی مذہبی احیار کی تحریکیں شروع ہوئیں اور اسلامی ملکوں کی سیر و سیاحت سے ہندوستانی مسلمانوں کی یہ تحریکیں بیرونی اسلامی ممالک کا اثر بھی قبول کرنے لگیں۔ ان تحریکوں میں جمال الدین افغانی کی بین الاقوامی اسلامی تحریک نے خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں کی زندگی پر بہت گہرا اثر ڈالا۔ یہ تحریکیں انگریزوں سے مصالحت نہیں چاہتی تھیں بلکہ انھیں مسلمانان عالم کا سب سے بڑا دشمن سمجھتی تھیں جنگ طرابلس، بلقان اور جنگ عظیم نے مسلمانوں کی مذہبی قومیت اور غیر ملکی اسلامی ہمدردیوں کو بہت نمایاں کیا اس دور کے مصنفین میں "الہلال" کے "ابو الکلام"، "کامریڈ" کے "محمد علی"، "زمیندار" کے "ظفر علی خاں" اور ڈاکٹر اقبال بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ تحریک عدم تعاون اور خلافت میں مسلمان اس لئے شریک نہیں ہوئے تھے کہ وہ ہندوستان کی آزادی کے بہت زیادہ خواہش مند تھے بلکہ وہ اس لئے شریک ہوئے تھے کہ وہ خلافت اور اسلامی ممالک کی آزادی کے بہت زیادہ متمنی تھے۔ چنانچہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں جو وقتی اتحاد خلافت کے مسئلہ کی حمایت کی وجہ سے پیدا ہوا تھا وہ خلافت کے ختم ہو جانے پر باقی نہ رہ سکا۔ ہندوستان کے مسلمان مذہب اور سیاست کو دو علیحدہ علیحدہ چیزیں نہیں سمجھتے تھے اور ان کی تمنا یہ تھی کہ خلیفہ کی قیادت میں آزاد مسلمان ریاستوں کا ایک وفاق قائم کریں۔ خود اپنے لئے ہندوستان کے مسلمانوں نے کوئی سیاسی نصب العین نہیں بنایا تھا۔ ان کی ساری امیدیں اور تمنائیں غیر ملکی اسلامی ریاستوں کی آزادی سے وابستہ تھیں اور انہی کی کامیابی یا ناکامی سے وہ خوش اور رنجیدہ ہوتے تھے لیکن جب ترکوں اور دیگر اسلامی ملکوں نے مذہب اور سیاست میں تفریق پیدا کر کے خالص قومی ریاستیں قائم کرنا شروع کیں تو ہندوستانی مسلمانوں کی قومی زندگی کھوکھلی ہو گئی۔ اس کے سامنے کوئی نصب العین نہیں رہا۔ دوسری طرف ہندوؤں کے شدھی اور سنگھٹن شروع کر دینے کی وجہ سے

ہندو مسلم اتحاد کے مواقع بھی بہت کم ہو گئے۔ اس کے بعد تنظیم اور تبلیغ کی تحریکیں شروع ہوئیں اور اب اس بات کی کوششیں ہونے لگیں کہ مسلم قومیت کو ہندوستان میں فروغ دینے کی تمام ممکن تدبیریں اختیار کی جائیں اور ان کو ایک مضبوط حیثیت دی جائے۔ مسلمانوں میں جتنا جتنا اپنی علیحدہ قومیت کا احساس بڑھتا رہا ہے اور جتنا انھوں نے ہندو قومیت کو ترقی کرتے اور منظم ہوتے دیکھا ہے اتنے ہی وہ اپنے سیاسی تحفظ کے لئے بھی زیادہ کوشاں ہوتے گئے ہیں۔ چنانچہ اس وقت مسلم قومیت کی انتہائی شکل پاکستان کے تخیل کو سمجھنا چاہئے۔ لیکن پاکستان کا تخیل ابھی تک مسلمانوں کی ایک نہایت ہی محدود جماعت کے ذہنوں میں پایا جاتا ہے۔ اس نے کسی منظم تحریک کی شکل ابھی تک اختیار نہیں کی ہے۔ اس کا رہنما کیمبرج میں ابھی تک تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ پاکستان کی قومی تحریک کے حامیوں کی طرف سے جن جن صوبوں کو پاکستان میں شامل کیا گیا ہے اس میں پنجاب کا پورا صوبہ بھی شامل ہے۔ لیکن اس صوبہ میں مسلم اکثریت صرف ۵۴ فی صدی ہے اور سکھوں اور ہندوؤں کی اقلیت میں ہندو قومیت اس درجہ سرایت کئے ہوئے ہے کہ وہ کسی طرح مسلم اکثریت کے پاکستان کا جزو بننے کے لئے تیار نہیں ہے۔ اس لئے پاکستان کی قومی تحریک کے نصب العین کو پورا کرنے کے لئے مسلمان اس نارضامند، کثیر التعداد، خوش حال اور برسر اقتدار اقلیت کی خواہشات کو کس طرح پامال کر سکیں گے یہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ کسی طرح توقع نہیں کی جا سکتی کہ یہ اقلیت ان کی خاطر پنجاب کے زرخیز صوبہ کی نفع بخش سکونت ترک کر کے یو۔ پی، بمبئی، مدراس، سی۔ پی۔ بہار اڑیسہ وغیرہ کے ہندو صوبوں میں وہاں کی مسلم آبادی کی جگہ جا بسے گی۔ اسی طرح ان ہندو صوبوں کی مسلمان آبادی بھی شاید اپنی پرانی املاک و جائداد کو چھوڑ کر پنجاب میں بسنے کے لئے بہت زیادہ بے چین نہ ہوگی۔ ایسی حالت میں پاکستان کس طرح بن سکے گا اور جو مسلمان پاکستان سے باہر ہوں گے ان کے ساتھ ہندو اکثریت کے کس سلوک کو مناسب سمجھا جائے گا ایسے مسائل ہیں جو بہت پیچیدہ ہیں اور جن کے متعلق ضرورت ہے کہ پاکستان کے حامی پوری روشنی ڈالیں۔ ان باتوں پر مسلمانوں کو بہت جلد غور کرنا چاہئے کیونکہ سیاسی زندگی میں کوئی واضح نصب العین نہ رکھنے کی وجہ سے انھیں ناقابل تلافی نقصان پہنچ رہا ہے۔

ہندوستانی قومیت | مسلم قومیت اور ہندو قومیت کے مقابلہ میں اب ہندوستانی قومیت کا مطالعہ کرنا بھی

ضروری ہے۔ یہ بالکل جدید چیز ہے اور مغرب کے اثر اور تعلیم سے ہندوستان میں پیدا ہوئی ہے۔ مغرب کی آزادی کی تحریکوں پر اس کی بنیاد قائم ہے۔ ایسے لوگوں نے اسے شروع کیا جنھوں نے انگلستان اور مغربی ممالک کے عہد جدید کے ادب کا مطالعہ کیا تھا انگریزی مگنا کارٹا اور بل آف رائٹس کی دفعات، ہیمپڈن اور برک کی تقریریں، مل کی تصانیف، روسو، مانٹسکو وغیرہ کی تحریریں ـــــ یہ چیزیں اس جذبہ قومی کی محرک ہوئیں۔ انگریزی تعلیم سے ان لوگوں کو ایک مشترک زبان ملی جسے صوبوں کے درمیان تبادلۂ خیال کے لئے استعمال کیا جا سکتا تھا، مغربی تاریخ کی معرفت انھوں نے مغربی تمدن اور روح قومیت کو اختیار کیا اور انگریزوں کی صحبت اور رہنمائی میں انھوں نے قومی تنظیم کے طریقوں کو سیکھا۔ انگریزی پڑھے ہوئے لوگوں کا ابتدائی طبقہ تو انگریزوں کی برتری سے اس درجہ مرعوب تھا کہ اس میں کسی قسم کا صحیح قومی احساس پیدا ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن بعد کے تعلیم یافتہ لوگوں نے اصلاحات کا مطالبہ کرنا شروع کیا۔ گورنروں کی کونسلوں میں کچھ نشستوں کی خواہش کی اور سول سروس کے اعلیٰ عہدوں پر تقرر چاہا۔ مگر ان کی قومیت بھی بے جان تھی یہ ملک کے فرزند ہونے کی حیثیت سے اس بات کا مطالبہ نہیں کرتے تھے کہ انھیں اور صرف انھیں ملک کی قسمت کے فیصلہ کا حق ملنا چاہیئے بلکہ وہ اپنی اہلیت اور قابلیت ثابت کرکے عہدوں کے خواہش مند ہوئے تھے۔ وہ کسی کی نمایندگی نہیں کرتے تھے بلکہ ذاتی منفعت کے لئے تمام کوششیں کرتے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ انھیں معلوم ہوا کہ جس طبقہ کی وہ نمائندگی کرتے ہیں اس کے مفاد کو اس لئے نقصان پہنچ رہا ہے کہ عنان حکومت ایک غیر قوم کے لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔ اس کے بعد سے وہ شعوری طور پر صحیح معنی میں قوم پرست ہو گئے جن خیالات کو انھوں نے انگریز مفکرین اور مصنفین کے یہاں پڑھا تھا انھیں اپنے حالات کے عین مطابق پایا۔ خصوصیت کے ساتھ جب ہندوستانی قومیت کے معاشی پہلو کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو اس وقت اس بات کا پورا پتہ چلتا ہے کہ ہماری تحریک قومیت کس درجہ انگریزی تعلیم کی ممنون کرم ہے۔

اسی سلسلہ میں ۵۷ء کے غدر نے قومیت کی ترقی میں جو حصہ لیا ہے اس کا بیان کرنا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ غدر بلاشبہ برطانوی سلطنت کے خلاف ہندوستانی قومیت کی پہلی جنگ آزادی تھی مولویوں نے جہاد کے فتوے دے کر اور پنڈتوں نے ملکشوں کو نکالنے پر آمادہ کرکے لوگوں کی ملکی، مذہبی،

تمدنی اور معاشرتی روایات کو قومی احساس کی شکل میں زندہ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن یہ بات صرف ایک بہت محدود حد تک صحیح ہے۔ کیونکہ قومیت صحیح معنی میں کسی جاگیردارانہ نظام میں پائی ہی نہیں جا سکتی۔ غدر کے اکثر رہنما مرہٹوں اور مغلوں کے نیم جاگیردارانہ نظام سلطنت کو زندہ کرنا چاہتے تھے۔ جاگیرداری نظام کے ایسے حامیوں نے جنھیں انگریزوں سے کچھ توقعات تھیں غیر ملکیوں کی حمایت کی۔ لیکن ایسے لوگوں نے جنھیں مغربی سیلاب کے تیزی سے پھیلنے کی وجہ سے نقصان پہنچا تھا اس طوفان کو روکنے کی کوشش کی۔ باغیوں کی اس کوشش کا انجام نہایت دردناک ہوا۔ لیکن اپنی شکست کے باوجود انھوں نے عوام کی ان بے چینیوں کی طرف مفکریں کی توجہ منعطف کرادی جو پرانے نظام کے برباد ہونے اور اس کی جگہ کسی نئے نظام کے نمودار نہ ہونے سے پیدا ہوئی تھیں۔ زراعت کا زوال، صنعتوں کی تباہی، عوام کی تباہ حالی اور ناموزوں اور غیر مانوس اداروں کا قیام یہی چیزیں ہیں جن کی بنیاد پر بعد کو ہندوستانی قومی تحریک کو شروع کیا اور چلایا گیا۔

ہندوستانی قومیت کا معاشی پہلو | ہندوستانی قومیت کی ترقی میں جن معاشی اسباب نے خاص طور پر اعانت کی ان میں سب سے اول لائق ذکر سفر اور ذرائع نقل و حمل کی سہولتیں اور تجارت کی ترقی ہیں۔ ان سے صوبہ جات میں باہمی میل ملاقات کے زیادہ امکانات پیدا ہوئے اور وہ موانع اور تعصبات ختم ہوگئے جو ملک کے ایک حصہ کو دوسرے سے جدا کیا کرتے تھے۔ جب ہندوستان کے لوگ دور دراز صوبوں میں بھی گھر جیسا سکھ اور آرام پانے لگے اور جب ملک کی وسعت کے باوجود قربت بڑھنا شروع ہوئی تو پھر ہندوستان ایک جغرافی اصطلاح باقی نہیں رہا بلکہ اس کے قومیت کے تخیل نے ایک زندہ وجود کی شکل اختیار کرلی۔ وسائل خبر رسانی کی ترقی سے لوگوں کے خیال میں وسعت پیدا ہوئی اور اصلاح معاشرت کی ایک قومی تحریک کا آغاز ہوا۔

پھر مغربی مادی تمدن و تہذیب نے اور زیادہ بنیادی طور پر یہاں کی زندگی پر اثر ڈالنا شروع کیا۔ انگلستان نے جیسا کہ کارل مارکس نے نیویارک ڈیلی ٹریبون میں لکھا تھا غیر شعوری طور پر ہندوستان میں ایک معاشری انقلاب کی ابتدا کردی۔ لالہ لاجپت رائے نے ہندوستانی قومی تحریک کی بنیادوں کے متعلق اپنی کتاب "نوجوان ہندوستان" میں بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "ہندوستان میں انگریزی

حکومت کے طریقے ان کا نظام تعلیم، ان کے مطابع، ان کے قوانین، ان کی عدالتیں، ان کی ریلیں، تار گھر، ڈاکخانے، دخانی جہاز ـــــ سب کے سب ہندوستانیوں میں جذبہ حب الوطنی پیدا کرنے کے موجب ہوئے برطانیہ نے اس بات کو اس وقت نہ جانا لیکن اتحاد کے یہ تمام ذرائع غیر شعوری طور پر ہندوستانی قومیت کی بنیاد رکھتے رہے۔

اس کے علاوہ ہماری قومیت کو ملک کی صنعتی ترقی سے بھی بہت گہرا تعلق ہے۔ کانگریس کی ابتدا نہایت اعتدال پسند جماعت کی حیثیت سے ہوئی تھی لیکن جب یہ حقیقت روز بروز زیادہ واضح شکل میں نظر آنے لگی کہ ہندوستان سے ناجائز طریقہ پر انتفاع حاصل کیا جا رہا ہے اور جب ہندوستانیوں میں یہ احساس پیدا ہونے لگا کہ صنعتی ترقی کے ذریعہ جو فوائد برطانیہ کو ہندوستان سے حاصل ہو رہے ہیں ان کا حق انھیں برطانیہ سے زیادہ ہے تو کانگریس میں قومیت کا رنگ نمایاں ہونے لگا۔ "جب مشینیں کسی ایسے ملک میں جہاں کوئلہ اور لوہا پایا جاتا ہے ایک دفعہ رائج کر دی جاتی ہیں تو ایسے ملک کو ان مشینوں کے خود پیدا کرنے سے کوئی شخص باز نہیں رکھ سکتا۔ ہندوستان جیسے وسیع ملک میں ریلوں کا شروع کرنا اور پھر یہ توقع کرنا کہ ہندوستان میں وہ تمام صنعتیں جو ریلوں کی فوری ضروریات کو پورا کرتی ہیں ترقی نہ پائیں گی ایک ناممکن چیز کی تمنا کرنا ہے۔ نہ صرف ایسی صنعتیں قائم ہوں گی بلکہ ان کے بعد ایسی دوسری صنعتیں بھی قائم ہوں گی جو ریلوں سے قریبی طور پر متعلق نہیں ہیں۔ غرضکہ ہندوستان میں ریلوں کے رواج کو جدید صنعت کا ہراول سمجھنا چاہئے" مارکس نے یہ پیشین گوئی ۱۸۵۳ء میں کی تھی اور یہ بڑی حد تک صحیح ثابت ہوئی ہے گو سامراجی حکمت عملی کی وجہ سے ہندوستانی صنعت کی ترقی میں بہت سے موانع پیدا ہوئے اور رفتار خاصی سست رہی۔ ہندوستانی قومیت کا درحقیقت آغاز اس وقت ہوا جب ہندوستان کے سرمایہ داروں نے دیکھا کہ قومی آزادی کے بغیر وہ صنعت کے بیشتر منافع سے محروم رہیں گے۔

مندرجہ بالا واقعات کی روشنی میں یہ بات واضح طور پر سمجھ میں آ جاتی ہے کہ ہندوستانی قومیت کے تخیل کو ر۔ س۔ دت، دادابھائی نارو جی، رینا ڈے اور گوکھلے کی تحریروں سے کیوں اس قدر تقویت پہنچی۔ یہی لوگ تھے جنھوں نے غیر ملکی فاتح کے ناجائز انتفاع کی قلعی کھول کر رکھ دی تھی اور ہندوستانیوں کو بتلایا تھا

کہ غیر ملکی حکومت کی وجہ سے انھیں کس کس قسم کے معاشی نقصانات پہنچ رہے ہیں۔

پہلی بات جس کی طرف ان لوگوں نے توجہ دلائی یہ تھی کہ ہندوستان سے دولت مستقل طور پر انگلستان کی طرف کھنچی ہوئی چلی جارہی ہے "مطالبات وطن" کے نام سے جو رقوم انگلستان روانہ کی جاتی ہیں وہ ایک طرح کا خراج ہیں جو ہندوستان اپنی محکومیت کی وجہ سے انگلستان کو ادا کرتا ہے۔ ہندوستان میں جو انگریز ہیں ان کا اپنی تنخواہوں کو ہندوستان میں خرچ کرنے کی جگہ انگلستان بھیجنا، پنشن جلد مل جانے کی سہولتیں، رخصت انگلستان میں بسر کرنا اور اسی قسم کے ہزاروں قومی نقصانات کے خلاف نہایت تکمیل کے ساتھ رائے عامہ کو متوجہ کیا گیا پھر ہندوستان کے قرضہ عامہ کے بارے میں تحقیق کرکے یہ بتلایا گیا کہ اس کے ایک بڑے حصہ کا بار خواہ مخواہ ہندوستان کے سر منڈھا گیا ہے۔ علاوہ ازیں تجارت و صنعت کے منافع کی شکل میں ہندوستان کو جو نقصان پہنچ رہا ہے وہ بھی بتلایا گیا۔ کلکتہ کے نزدیک جو یورپ والوں کے جوٹ کے کارخانے ہیں جب وہ ۱۱۲ روپیہ کماتے ہیں تو اس میں سے ہندوستانی مزدوروں کو تو صرف بارہ روپیہ اجرت کے دیتے ہیں اور باقی سو روپیہ اسکاٹ لینڈ کے سرمایہ داروں کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔ انیسویں صدی کے آخری سالوں میں قحط کے بار بار واقع ہونے سے جو تباہ حالی ہندوستان کے کسانوں میں پھیلی تھی اور ہندوستان میں عسرت و افلاس ترقی پر تھا اس کی ذمہ داری بھی غیر ملکی حکومت پر رکھی گئی۔ کہا گیا کہ کسانوں سے جس قدر مالگذاری وصول کی جاتی ہے وہ تقریباً سب کی سب غیر ملکوں کو چلی جاتی ہے۔ ہندوستانی صنعتوں کی تباہی اور زراعتی پیشہ پر آبادی کے ایک روز افزوں حصہ کا انحصار یہ چیز بھی برطانوی اعمال نامے کو سیاہ کرنے کے لئے استعمال کی گئی۔ پھر غدر کے بعد سفید فوجوں کے اضافہ سے ہندوستانی مدافعت کا خرچ بہت بڑھ گیا تھا اس نے بھی قومی شکایات میں ایک نمایاں جگہ اختیار کرلی۔

اس تمام بحث کے بعد یہ بات غالباً محتاج وضاحت نہیں رہتی کہ ہندوستانی احساس قومیت کی بیداری میں غیر ملکی تسلط سے ہماری قومی عزت نفس کو جو نقصان عظیم پہنچا ہے اسے بہت زیادہ اہمیت حاصل نہیں ہے بلکہ اس میں زیادہ دخل مادی احساس زیاں کو ہے۔ ابتدا میں کانگریس کی طرف سے ہندوستانیوں کے لئے صرف چند زایہ عہدوں کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ لیکن بعد میں یہ صورت نہیں رہی۔ کیونکہ پھر کانگریس نے ایک طرف تو

مالیات کی آزادی یعنی قومی خرچ کی نگرانی کا مطالبہ کرنا شروع کیا اور دوسری طرف قومی صنعتوں کے تحفظ کی تحریکیں چلانا شروع کر دیں۔ پھر یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ ۱۹۲۴ء تک برطانوی حکومت ایسی حکمت عملی پر کاربند رہی جس سے برطانوی درآمد، خصوصیت کے ساتھ لنکا شائر کے کپڑے کو تقویت پہنچتی تھی۔ جب کبھی سرکاری آمدنی بڑھانے کے لئے باہر کے کپڑے پر چنگی لگائی جاتی تھی تو اس کے تامینی اثرات کو زائل کرنے کے لئے ہندوستان میں بنے ہوئے کپڑے پر اکسائز کا محصول بھی ساتھ ہی ساتھ لگا دیا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں سرکار کی طرف سے جو نہریں بنائی جاتی تھیں ان سے بیشتر روئی پیدا کرنے والی زمینوں کی آبپاشی مدنظر ہوتی تھی تاکہ اس سے ایک طرف تو لنکا شائر کی روئی کی ضرورت پوری ہو سکے اور دوسری طرف سرکاری مالگذاری کے ادا کرنے میں سہولت ہو۔ لیکن ہندوستانی قومیت کو آہستہ آہستہ کامیابی حاصل ہونا شروع ہوئی۔ چنانچہ ہندوستانی فولاد کی صنعت کو سرکار کی طرف سے تامین اور عطیات دلائے گئے جس سے اس کی ترقی میں بہت مدد ملی۔ پھر ہندوستانی کپڑے کے کارخانوں کے تحفظ کے لئے لنکا شائر تک کے خلاف محاصل درآمد عاید کرائے گئے۔

غرضکہ ہندوستانی قومیت کی جنگ میں معاشی قوتوں کا اثر ہر قدم پر نمایاں نظر آتا ہے۔ بنگال میں افتراق کے خلاف جو شورش کی گئی اس میں "سودیشی" کی تحریک کو بھی ساتھ ہی ساتھ چلایا گیا۔ جنگ عظیم کے زمانہ کی معاشی ابتری نے قومی تحریک میں پرولتاریہ یعنی مزدوروں اور کسانوں کے طبقہ کو بھی قومی تحریک میں شامل کر دیا جس سے مہاتما گاندھی کی ستیاگرہ (۱۹۱۹ء تا ۱۹۲۲ء) نے ایک نئی صورت اختیار کر لی۔ ۱۹۲۹-۳۰ء میں عالمگیر کساد بازاری کے اثرات ہندوستان کے لئے نہایت تباہ کن ثابت ہوئے۔ ۱۹۳۰ء کی پیداوار کی قیمت ۱۹۲۹ء کے مقابلہ میں نصف رہ گئی۔ پھر چاندی کی قیمت گھٹنے اور شرح مبادلہ کے بڑھنے سے بھی ہندوستان کو نقصان پہنچا۔ انہی معاشی اسباب کی بنا پر مہاتما گاندھی دوبارہ قومی قوتوں کو مجتمع کر کے برطانوی حکومت کو کئی سال تک پریشان رکھ سکے۔

ان معاشی قوتوں کے مقابلہ میں جب ایسی غیر معاشی قوتوں کو رکھا جاتا ہے جیسے انگریزوں اور ہندوستانیوں میں اعزاز و مرتبت کے لئے کشمکش، قانون اسلحہ سے بیزاری، ریلوں اور دوسری سرکاری ملازمتوں میں گورے

کالے کی تفریق، سی۔ آئی۔ ڈی اور سنسر شپ کی زیادتی، اخباروں اور جلسوں کے خلاف قوانین وغیرہ تو معلوم ہوتا ہے کہ ان سے بجائے خود ہندوستانی قومیت کی تحریک پیدا نہ ہو سکتی تھی۔ اس اتحاد قومی کے پیدا کرنے میں مادی مفاد کے اشتراک کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

سوشلزم کی تحریک | زندگی کے معاشی پہلو کی اہمیت نے ہندوستان میں ایک نئی تحریک یعنی سوشلزم کا بھی آغاز کر دیا ہے۔ یہ تحریک بھی مغرب سے آئی ہے اور مغربی مفکرین کے خیالات ہی کی رہین منت ہے۔ یورپ میں کارل مارکس جس کا ذکر ضمناً اوپر کیا جا چکا ہے اس تحریک کا بانی تھا اور لینین اور اسٹالین نے اسے روس میں عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی ہے۔ اس تحریک کے حامیوں کا یہ خیال ہے کہ مشین اور اعلیٰ پیمانہ پہ صنعتی کاروبار کے طریقے رفتہ رفتہ انسانیت کے ارتقا کے ساتھ پیدا ہوئے ہیں اور اب ان کو اختیار کئے بغیر تمام دنیا کے لئے مفر کی کوئی صورت ہی نظر نہیں آتی ہے۔ لیکن پیداوار کے ان جدید طریقوں میں بہت زیادہ سرمایہ کی ضرورت ہوتی ہے جسے ہر دولت پیدا کرنے والا شخص فراہم نہیں کر سکتا۔ اس لئے ایک قلیل جماعت سرمایہ داروں اور ایک کثیر جماعت مزدوروں کی پیدا ہو جاتی ہے۔ سرمایہ داروں کی جماعت قلیل سے قلیل تر اور مزدوروں کی جماعت کثیر سے کثیر تر ہوتی جاتی ہے۔ نفع طلبی کی ذہنیت کے ماتحت سرمایہ داروں کی دولت اور اقتدار برابر بڑھتا جاتا ہے اور مزدوروں کے احساس افلاس اور بے بسی میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے پھر سرمایہ داروں کا اقتدار ایک ملک تک محدود نہیں رہتا بلکہ کل عالم پر چھا جاتا ہے۔ اس لئے ان کی پالیسیاں تمام دنیا کے ذخائر، منڈیوں اور مزدوروں کو نظر کے سامنے رکھ کر متعین کی جاتی ہیں۔ مزدوروں کو کارخانوں میں ایک جگہ کام کرنے سے میل ملاقات کے مواقع زیادہ ملتے ہیں اور باہمی مفاد کے اشتراک کا انھیں احساس ہو جاتا ہے جس سے ایک مزدور ذاتی نفع کے لئے دوسرے کا مقابلہ نہیں کرتا بلکہ سب مزدور جماعتی نفع کے لئے مل کر سرمایہ دار سے سودا کرتے ہیں۔ اپنی قوت کا احساس رفتہ رفتہ یا کبھی یکبارگی ان کے حوصلوں کو بہت بڑھا دیتا ہے اور اب وہ اجرت میں خفیف بیشی یا اوقات کار میں کمی سے مطمئن نہیں ہو جاتے بلکہ سرمایہ داروں کے قلیل گروہ کی جگہ مزدوروں کی جماعت کا مکمل تسلط زمین، سرمایہ اور پیداوار و دولت کے وسائل پر چاہنے لگتے ہیں اور چونکہ سرمایہ داروں کا تسلط عالمگیر ہوتا ہے اس لئے ان کا ہر جگہ مقابلہ کرنے کے لئے انھیں بھی

اپنی تحریک کو عالمگیر بنانا پڑتا ہے۔ تمدن و معاشرت کے اختلاف کی ان کی نگاہ میں کوئی اہمیت نہیں ہے وہ ان سب کو بورژوا یعنی سرمایہ داروں کی تخلیق کی ہوئی چیز سمجھتے ہیں۔ یہ تحریک مذہب سے بالکل منحرف ہے۔ اسے نشہ سمجھتی ہے جسے پلا کر سرمایہ دار مزدور کو عاقبت کی امید میں دنیا کی تکالیف کو سہنے کے لئے آمادہ کرتا ہے۔ یہ انسانی ذہنیت اور نظام معاشرت میں ایک بنیادی انقلاب چاہتی ہے۔ ہندوستان میں یہ تحریک ابھی نئی نئی شروع ہوئی ہے اور صرف ایک قلیل التعداد تعلیمیافتہ جماعت کے ذہنوں میں اس کا پورا خاکہ پایا جاتا ہے۔ صنعتی شہروں کے مزدوروں میں بھی اس کا کچھ کچھ اثر ہے۔ لیکن ابھی عام طور پر اسے کسانوں اور مزدوروں نے اختیار نہیں کیا ہے۔

خاتمہ | ہندو قومیت، مسلم قومیت، ہندوستانی قومیت اور سوشلزم کی تحریکوں کا ہم نے علیحدہ علیحدہ مطالعہ کیا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان کا انجام کیا ہونے والا ہے۔ کون سی تحریک ان میں دوسری تحریکوں پر غالب آئے گی یا ان میں باہم کوئی یگانگت اور ہم آہنگی پیدا کی جاسکے گی۔ پانچ ممکن صورتیں ہیں جو رونما ہو سکتی ہیں:۔

(۱) مسلم قومیت کا ہندوستان پر مکمل تسلط۔

(۲) ہندو قومیت کا ہندوستان پر مکمل تسلط۔

(۳) ہندوستان کی تقسیم دو حصوں میں۔ ایک حصہ میں خالص اسلامی قومیت اور دوسرے میں خالص ہندو قومیت۔ گویا پاکستان اور ہندوستان واقعی پیدا ہو جائیں۔ آبادیاں قومیت کی بنا پر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو جائیں۔ رہی یہ بات کہ اس پاکستان اور ہندوستان میں کون کون سے علاقے شامل ہوں یہ بات عام رائے شماری اور باہمی سمجھوتہ سے طے کر لی جائے۔

(۴) ہندو قومیت اور مسلم قومیت کی باہمی آمیزش سے ایک ایسی قومیت پیدا ہو جس میں دونوں کے عناصر شامل ہوں۔

(۵) ہندو قومیت اور مسلم قومیت دونوں کی تباہی اور ان کی جگہ مغربی وضع کی سرمایہ دارانہ قومیت یا بالشوزم کی قسم کا نیا معاشی اور معاشری نظام پیدا ہو جائے۔

اب ان میں سے واقعی کون سی صورت رونما ہوگی اس کا فیصلہ تو مشکل ہے لیکن اگر ہندو قومیت اور مسلم قومیت میں کوئی ایسا باعزت سمجھوتہ ہو سکے جس سے مذہب اور معاشرت کی بنیادی باتوں کو ترک کئے بغیر دونوں فریق اپنے سیاسی اور معاشی معاملات میں جن کی اہمیت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے شریک رہ سکیں تو میں سمجھتا ہوں یہ بہت مناسب بات ہوگی کیونکہ اور تمام کوششوں میں (چاہے ان کے دوسرے فوائد اور کتنے ہی کیوں نہ ہوں) غیر ضروری فتنہ و فساد اور تکلیف و مصیبت کا احتمال ہے۔

نازو

میرے شوہر کو مناظرِ قدرت اور ان کی دلپسند پرشادابیوں سے بہت محبت ہے۔ چنانچہ ہم شہر سے بہت کافی فاصلے پر رہتے ہیں۔ ہمارے چھوٹے سے مکان کے گرد ایک چھوٹا سا احاطہ ہے جس میں پھول ہیں، کیاریاں ہیں اور روشیں ہیں، لیکن اس احاطے کے باہر عروسِ فطرت دستِ انسانی کی گستاخیوں سے ناآشنا ہے۔ چاند، سورج، مینھ اور شبنم مشاطہ کے فرائض دن رات انجام دیتے ہیں اور اس کے سادہ حسن اور معصوم شباب کو برقرار رکھتے ہیں۔ ہمارا مکان فطرت کی ان شادابیوں میں اس طرح محصور ہے جس طرح ایک آشیانہ درخت کے سرسبز پتوں اور گھنی شاخوں میں گھرا ہوتا ہے۔ مکان سے کوئی دو سو قدم کے فاصلے پر ریل کی پٹری ہے، جس پر سے دن رات ریلیں گذرتی ہیں۔

یہ گذرنے والی ریلیں اکثر مجھے نازو کی یاد دلاتی ہیں۔ اُس نازو کی جو اپنی بہن کی گود میں پرورش پاکر اپنی بہن کو داغ دے گئی، جو جوان ہوئی اور جوان ہو کر مر گئی، جو گلاب کے پھول کی طرح شاداب تھی اور چودھویں رات کے چاند کی طرح روشن، لیکن جس کی جوانی ان دونوں کی جوانی سے بھی زیادہ مختصر تھی۔

اماں جان کی ناگہانی موت کے وقت نازو صرف تین برس کی تھی۔ میں نے اس کو بڑی محبت، بڑی جانفشانی سے پالا۔ میں دن دن بھر اس کو گود میں لئے رہتی اور ساری ساری رات پنگوڑے میں لٹا کر لوریاں سناتی۔ میں اس کو اس قدر پیار کرتی تھی کہ اماں جان بھی اگر زندہ رہتیں تو شاید نہ کر سکتیں۔ وہ میری محبت بھری گود میں سانس لے کر بڑی ہوئی، جوان ہوئی۔ اس کی جوانی چڑھتی ہوئی آندھی کی طرح آئی۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے کچھ سے کچھ ہو گئی۔ اُس کا چہرہ دمک اُٹھا، جہان بھر کی تابانیاں اور رونقیں اس میں سمٹ کر آگئیں۔ اس کے سیاہ بال بے حد گھنے اور لانبے ہو گئے۔ اس کا قد اتنا دراز ہو گیا کہ اگر وہ منہ موڑ کر کھڑی ہوتی تو سچ مچ ایک عورت معلوم ہوتی۔ میں اس اٹھان، اس بالیدگی کو دیکھ کر بہت خوش ہوتی تھی لیکن آہ مجھے یہ علم نہ تھا کہ یہ ساری پھبن، یہ تمام رعنائی ایک فریب ہے، ایک دھوکا ہے۔ یہ جوانی جو آندھی کی طرح

آئی ہے ایک جھونکے کے مانند گزر جائے گی۔

ہائے وہ کیسی منحوس اور نامراد صبح تھی جب نازو نے مجھ سے کہا تھا کہ "آپا میرے سر میں درد ہے اور کچھ حرارت محسوس ہو رہی ہے۔" میں نے اس کے چڑھتے ہوئے بخار کو معمولی سوء ہضم کا نتیجہ سمجھا تھا اور اُس کی طرف زیادہ توجہ نہ کی تھی۔ اس وقت میں کیا جانتی تھی کہ یہ بخار وہ بخار نہیں ہے جو ایک دو دن کی دوا کے بعد اتر جاتا ہے بلکہ وہ بخار ہے جو اکثر و بیشتر موت کا نقیب بن کر آتا ہے۔ ابا جان نے علاج میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ دہلی کے افضل سے افضل طبیب بلائے اور جب ان کی کوششیں نامشکور رہیں تو باہر والوں سے رجوع کیا لیکن بخار کسی طرح نہ اترا۔ اور بالآخر ایک دن مجھ نامراد کو یقین دلا دیا گیا کہ کوئی ارضی طاقت میری بہن کو موت کے منہ سے نہیں بچا سکتی۔ مجھ سے جتنا رویا گیا میں روئی، جتنا غم کیا گیا کیا اور جتنی دعائیں مانگی گئیں مانگیں، مگر طبیبوں کی اس رائے میں تبدیلی نہ ہوئی اور میری نازکی پالی ہوئی نازو اسی طرح موت سے قریب تر ہوتی چلی گئی۔

نازو بچپن سے ایک بہت خاموش اور کم سخن لڑکی تھی۔ وہ بات کرنا جانتی ہی نہ تھی۔ صرف رونا جانتی تھی۔ جب تک اس نے ہوش نہیں سنبھالا بات کرنے کی بجائے ہمیشہ آنسو ہی بہائے۔ یعنی اگر اس کو کبھی کسی چیز کی ضرورت ہوتی یا کوئی تکلیف ہوتی تو بجائے اس کے کہ مجھ سے آ کر کہے وہ کسی جگہ تنہائی میں بیٹھ کر رونے لگتی۔ جب بڑی ہو گئی تو یہ رونا تو کم ہو گیا لیکن زبان کی ویسی ہی گونگی رہی۔ چنانچہ اس نے اپنی طویل بیماری کے زمانے میں کبھی زبان سے کچھ نہ کہا۔ دن دن بھر خاموش آنکھیں کھولے پڑی رہتی۔ طبیبوں نے جو اس کی صحت کی طرف سے مایوسی ظاہر کی تھی اس کی بابت اس سے کچھ نہیں کہا گیا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ نادان نہ تھی۔ سب کچھ سمجھتی تھی۔ اور اپنی بیماری کی نوعیت سے اچھی طرح واقف تھی۔ ایک دفعہ —— یہ اس وقت کی بات ہے جب وہ چلتی پھرتی تھی اور ابھی اتنی کمزور نہیں ہوئی تھی کہ بستر سے بھی نہ اُٹھ سکے —— اس نے اپنے بکس میں سے ایک قیمتی دوپٹہ نکال کر اوڑھ لیا۔ ایسے دوپٹے عام طور پر کسی تقریب کے سلسلے میں نکالے جاتے ہیں اور روزانہ استعمال میں نہیں آتے۔ جس خیال کے ماتحت اُس نے یہ دوپٹہ اوڑھا تھا مجھ پر اچھی طرح واضح تھا۔ تاہم میں نے تجاہل سے کام لیا اور جب وہ سامنے آئی

تو مصنوعی تعجب کا اظہار کیا لیکن وہ جواب میں بالکل خاموش رہی۔ اس طرح اکثر اس کی باتوں سے یہ ظاہر ہوا کہ وہ اپنے لاعلاج مرض کو پہچانتی ہے اور نتیجے سے واقف ہے۔

جب نازو تندرست تھی ـــــ ابھی بیمار نہ پڑی تھی ـــــ تو اس کے جوان دل میں بہت سی جوان آرزوئیں تھیں۔ بخار میں آرزوؤں کا یہ لہلہاتا ہوا چمن جھلس کے رہ گیا اور اس کے سارے ذوق و شوق ختم ہو گئے، لیکن اس حالت میں بھی دو ارمان اس کے دل میں باقی تھے۔ وہ ریل میں بیٹھنا چاہتی تھی اور "آپا زبیدہ" کے بیاہ میں شریک ہونے کی آرزومند تھی۔

نازو دہلی میں پیدا ہوئی اور ہوش سنبھالنے کے بعد کبھی دہلی سے باہر نہیں گئی۔ اس لئے اس کو ریل کے سفر کا ارمان تھا۔ جن لوگوں کی رشتہ داری شہر سے باہر ہوتی ہے ان کو ریل کا سفر آئے دن درپیش رہتا ہے لیکن ہمارے تمام اعزا و اقارب دہلی ہی میں تھے۔ صرف نانا ابا کی وجہ سے تھوڑا سا تعلق میرٹھ سے تھا کہ وہ وہاں برسوں سے مقیم تھے۔ چنانچہ جب نازو گود میں تھی تو اماں جان کے ساتھ چند مرتبہ میرٹھ گئی بھی تھی لیکن اس کو اس زمانے کا کچھ ہوش نہ تھا۔ پھر ادھر تو اماں جان کا انتقال ہوا اور اُدھر نانا ابا کی آنکھیں بند ہوئیں یہ تعلق بالکل ختم ہو گیا اور نازو ہوش سنبھالنے کے بعد کبھی دہلی سے باہر نہ جا سکی۔

نازو کی دوسری خواہش یہ تھی کہ وہ کسی لڑکی کے بیاہ میں شریک ہو۔ وہ بیاہ کی تمام رسموں کو دیکھنا چاہتی تھی اور اپنے اس شوق کے متعلق اکثر باتیں کیا کرتی تھی۔

بیماری سے کچھ دنوں پہلے اس کو امید ہو گئی تھی کہ اب یہ دونوں خواہشیں بہت جلد پوری ہو جائیں گی۔ میرٹھ میں ہماری خالہ کی بیٹی زبیدہ کا بیاہ ہونے والا تھا۔ خالہ اماں نے ابا جان کو لکھا تھا کہ زبیدہ کی شادی اکتوبر میں ہوگی اور میں سب کو میرٹھ بلاؤں گی۔ نازو نے اسی وقت سفر اور شادی میں شرکت کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ وہ دن اور ہفتے گن گن کر وقت کاٹ رہی تھی اور ابھی مارچ ہی کا مہینہ شروع ہوا تھا کہ اس موذی بخار نے اس کو آ لیا۔

پھر بھی میں نے اس سے کہہ رکھا تھا کہ جب زبیدہ کا بیاہ ہوگا تو میں تجھ کو اپنے ساتھ لے کر میرٹھ جاؤں گی اور فی الحقیقت میں اس کو میرٹھ لے جانا چاہتی تھی تاکہ اس کے دل میں یہ ارمان نہ رہ جائے چنانچہ

جب بیاہ میں ایک ہفتہ رہ گیا اور خالہ اماں نے بلاوے کا خط لکھا تو میں نے ابا جان سے ذکر کیا اور نازو کو میرٹھ لے جانے کی اجازت مانگی۔ انھوں نے قطعیت کے ساتھ انکار کر دیا۔ مجھے اس کی بالکل امید نہ تھی۔ میں حیران و ششدر رہ گئی، تھوڑی دیر کے لئے بدحواس ہو گئی۔ پھر جب میں ذرا سنبھلی اور مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ یہ صدمہ نازو کے لئے ناقابل برداشت ہوگا تو میں نے اپنی تمام کوششیں ابا جان کو راضی کرنے میں صرف کر دیں۔ میں روئی بھی، منتیں بھی کیں، اوروں سے سفارشیں بھی کرائیں، لیکن ابا جان نے جو ایک دفعہ کہہ دیا تھا وہی کہتے رہے۔

نازو خالہ اماں کے خط کی بابت سن کر بہت خوش ہوئی تھی اور اس دن سے دل ہی دل میں امید کر رہی تھی کہ اب بہت جلد میرٹھ کے سفر کی تیاریاں ہوں گی۔ لیکن تین دن گذر گئے اور نہ ابا جان نے اجازت دی اور نہ مجھ میں کسی وقت باوجود کوشش کے اتنی ہمت پیدا ہو سکی کہ میں نازو سے کہہ دیتی کہ "پیاری نازو! تمھارے ابا جان تم کو میرٹھ جانے کی اجازت نہیں دیتے۔ تم وہاں نہ جاؤ گی۔" آخر چوتھے روز دوپہر کے وقت جب وہ کھانا کھا کر لیٹی تو میں نے جی کڑا کر کے کہا "نازو صبح کی ڈاک سے خالہ اماں کا دوسرا خط آیا ہے۔ زبیدہ کی شادی ملتوی ہو گئی، غالباً ایک دو مہینے کے بعد ہوگی۔" نازو نے یہ سن کر اپنی نظریں جھکا لیں اور منہ سے کچھ نہ کہا۔ تھوڑی دیر بعد میں اس کی دو ایلنے الماری تک گئی۔ جب دوا شیشے میں انڈیل کر لائی تو میں نے دیکھا کہ نازو کی آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک سیلاب جاری ہے۔ یہ آنسو اس کے زرد زرد رخساروں سے ڈھلک کر نیچے گر رہے ہیں اور تکیے کو بھگو رہے ہیں۔

اس واقعے کو پانچ برس گذر چکے ہیں۔ اب نہ نازو ہے نہ ابا جان ہیں۔ نہ وطن ہے نہ وہ گھر جس میں میں نے اپنی زندگی کا عظیم ترین صدمہ برداشت کیا۔ میں ہوں میرا ویران دل ہے، پردیس ہے اور جنگل میں یہ مکان ہے۔ رات کو جب ہر طرف سناٹے کا عالم ہوتا ہے، آسمان سے ظلمتیں برستی ہیں، اور جنگل کی وسیع پہنائیوں سے جھینگروں اور مینڈکوں کے شور کے سوا کوئی آواز نہیں آتی تو ٹھیک ساڑھے نو بجے، ریل اپنی شاندار ہیبت انگیز گڑگڑاہٹ کے ساتھ میرے مکان کے سامنے سے گذرتی ہے۔ اس وقت میں ایسا محسوس کرتی ہوں کہ نازو افق کے کسی بعید ترین گوشے سے، حسرت و اشتیاق کے ساتھ ریل کو

دیکھ رہی ہے اور اپنے دونوں ہاتھ اس کی طرف بڑھائے ہوئے ہے لیکن جب ریل اس کے اشتیاق کو پامال کرتی ہوئی، اس کے ارمانوں کو کچلتی ہوئی، سفاکانہ بے التفاتی کے ساتھ نکل جاتی ہے تو اُس کے ہاتھ گر پڑتے ہیں، اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگتے ہیں اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے۔

ہوں، مگر وہ اس کی پروانہ کریں۔

کوئیں سے ہٹتے ہی زمیندار صاحب کا مکان تھا۔ راستہ کے برابر کندھوں تک اونچا چبوترہ تھا۔ جس پر ایک بڑا سا مردانہ کمرہ تھا۔ دروازوں پر چقیں پڑی رہتی تھیں۔ اندر تخت بچھا تھا۔ اس پر صاف چادر تنی رہتی تھی بڑی بڑی پھیلی پھیلی کرسیاں تھیں۔ کنیز سوچا کرتی تھی کہ ان پر بیٹھنے سے بڑا آرام ملتا ہوگا۔

کنیز کی آنکھیں چقوں پر جمی ہوئی تھیں۔ اور سوچ رہی تھی کہ دیکھا چاہیے آج شبیر میاں کیا سوانگ نکالتے ہیں، کوئی فقرہ کستے ہیں، یا پانی پھینکتے ہیں، یا ڈھیلا مارتے ہیں۔ کہ اتنے میں پیچھے سے شبیر میاں تیزی سے آئے زن سے اس کے گلے میں کوئی چیز لال رنگ کی ڈالی۔ اور پھر اس کا منہ چوم کر کود کر کمرے کے اندر گھس گئے۔

صبح کی خنکی ابھی باقی تھی، اور کنیز کے ہاتھ پاؤں کوئیں کے پانی سے بھیگے ہوئے تھے، اس لئے اس کو ہلکی ہلکی سردی محسوس ہورہی تھی۔ مگر اس حادثہ سے اس کا سارا بدن بھک سے جل اٹھا، پیشانی پر پسینہ کے قطرے آگئے، دل دھک دھک کرنے لگا، اور آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے۔ اس نے گھبرا کر چبوترے کا سہارا لیا۔ گھڑا اس پر رکھ دیا۔ اور پھر نیچی آواز سے کہنے لگی۔

"شبیر میاں! لونڈیوں سے دل لگی اچھی نہیں۔ میں سٹ جاؤں گی، آپ کا کچھ نہیں ہوگا"

نہ معلوم شبیر میاں کمرے کے اندر تھے بھی یا نہیں۔ اور کنیز کی آواز انھوں نے سنی بھی یا نہیں۔ کنیز نے حواس درست کئے، اور گھڑا اُٹھا کر گھر چلی۔ ادھر اودھر دیکھتی جاتی تھی کہ کسی نے دیکھا تو نہیں۔ مگر ابھی سناٹا تھا، کوئی راہگیر نہیں تھا چبوترے کے دوسری طرف چھپر کے نیچے ایک آدمی بیلوں کو کھول رہا تھا۔ مگر وہ آڑ میں تھا۔ یہ دیکھ کر اس کے دل کو ڈھارس ہوئی۔ مگر شبیر میاں کی اس حرکت پر اس کو غصہ بہت تھا۔ اگر کوئی دیکھ لیتا؟ بفاطن نے کبھی دیکھا ضرور۔ ورنہ کیسے معلوم ہوا؟ اتنے میں اس کی نگاہ اپنے گلے پر پڑی تو دیکھا شیشے کا ترشا ہوا ایک ہار پڑا تھا۔ چھوٹے چھوٹے بیر بہوٹی کے ایسے لال لال دانے تھے۔ بیچ میں ہر سنگھار کا ایسا ایک پھول تھا۔ چلنے سے اس میں جنبش پیدا ہوتی تھی جس سے

جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔ اس کو دیکھ کر اس کے دل میں ایک لہر سی پیدا ہوئی۔ غصہ تو بدستور باقی رہا۔ مگر ساتھ ہی شبیر میاں کی محبت بھی زور کر آئی، اس نے چپکے سے گھڑا ایک ہاتھ سے سنبھال کر، دوسرے ہاتھ سے ہار اتار لیا، اور اس کو کمر میں کھونس لیا۔ اور پھر گھر چلی گئی۔

ماں چولھا لیپ رہی تھی۔ باپ پلنگ پر پاؤں لٹکائے بیٹھا حقہ گڑ گڑا رہا تھا۔ چھوٹا بھائی نمو مرغیاں کھول رہا تھا۔ کنیز نے گھڑا مٹی کے بنے ہوئے چھوٹے سے چبوترے پر رکھ دیا، اور بولی

"اب میں اتنے سویرے پانی لینے نہیں جایا کروں گی۔"

ماں نے یہ سن کر منہ بگاڑ لیا۔ مگر کچھ بولی نہیں۔ باپ نے سنا تک نہیں۔ مگر نمو بولا۔

"اب میں سویرے سویرے مرغیاں نہیں کھولا کروں گا۔"

یہ کہہ کر اس نے مرغیوں کو کنیز کی طرف دونوں ہاتھوں سے ہشکا دیا۔

کنیز۔ "دیکھو نمو! مجھے یہ باتیں نہیں اچھی لگتیں۔ میری ہر بات کی نقل کرتا ہے۔ میری ہر بات کی نقل کرتا ہے۔"

نمو۔ "بڑی وہ بنی ہیں۔ میں کیا نقل کرتا ہوں۔ میں نے کوئی بات تم سے کہی۔"

نمو نے پھر مرغیوں کو ہشکا دیا۔ اب کے ایک مرغی پھڑپھڑا کر کنیز پر آگری۔

کنیز۔ "حرامزادہ۔ ٹھہر تو۔۔۔۔"

نمو فوراً گھر کے باہر بھاگ گیا۔

ماں۔ "یہ کیا ہے کنیزیا! تو ہر وقت نمو کے پیچھے پڑی رہتی ہے۔ اس نے اتنا ہی تو کہا تھا کہ میں سویرے سویرے مرغیاں نہیں کھولا کروں گا۔ اس میں کیا برائی۔"

کنیز نمو کی حرکت بیان کرتی۔ مگر اس کا دل بھرا ہوا تھا، رونا آگیا۔ چپکے سے چھپر کے نیچے پلنگ پر لیٹ گئی اور زار و قطار رونے لگی۔ ماں نے اٹھ کر مرغیوں کو گھر سے باہر نکال کر دروازے بند کرلئے باپ ویسے ہی حقہ پیتا رہا۔ بیچ بیچ میں کھانستا جاتا تھا۔ نمو باہر ہی تھا، اور جب تک کنیز گھر میں تھی اس کے لوٹنے کی کوئی امید نہ تھی تھوڑا سا رو لینے کے بعد کنیز کے دل کی بھڑاس نکل گئی۔ اس نے چپکے سے کمر سے

ہار نکالا۔ اور اس کو بچھونے پر پھیلایا۔ اب تک شبیر میاں پر غصہ بہت کم ہو چکا تھا۔ مگر یہ سوچ کر کانپ جاتی تھی کہ اگر کوئی دیکھ لیتا تو کیا ہوتا؟ ماں باپ مارتے مارتے میرا کیا حال کر دیتے؟ اور گاؤں میں کتنی بدنام ہو جاتی۔ مگر، خیر، اب کیا پروا۔ کسی نے دیکھا تھوڑے۔ شبیر میاں کتنے اچھے لگتے ہیں۔ گورا گورا رنگ ہے صاف صاف کپڑے پہنتے ہیں۔ بال بہت درست رہتے ہیں۔ ان کے سفید پاؤں چپلوں میں کیسے اچھے لگتے ہیں۔ جب نیکر پہنے ہوئے، بندوق ہاتھ میں لئے شکار سے واپس آتے ہیں، تو معلوم ہوتا ہے کہ انکی قربت ہر طرح کے خطروں سے محفوظ کر دیگی۔ وہ سچ مچ محبت کرتے ہیں۔ ورنہ سویرے سویرے اٹھ کر، گھنٹوں انتظار میں کیوں بیٹھے رہتے۔ میرے ستانے کی کیا کیا تدبیریں سوچا کرتے ہیں۔ ایک دن انھوں نے پیالہ بھر سرخ رنگ ڈال دیا تھا۔ میں کتنی گھبرا گئی تھی کہ اماں دیکھیں گی تو کیا کہیں گی۔ اور پھر کوئیں پر دھونے گئی۔ مگر وہاں پہنچتے پہنچتے رنگ اڑ گیا۔

کنیز نے ہار گلے میں پہن لیا۔ اور کوٹھری کے اندر جا کر آئینہ دیکھنے لگی۔ یہاں ابھی اندھیرا تھا۔ اس لئے کچھ صاف نظر نہیں آیا۔ اتنے میں ماں کی آواز آئی۔

"زمیندار صاحب کے یہاں نہیں جائے گی؟ ابھی کوئی بلانے آتا ہوگا۔ پھر گھر میں مار بھی پڑے گی۔"

کنیز نے جلدی سے ہار اتار کر کمر میں کھونس لیا۔ باہر آئی، کوئلہ چبا کر دانت مانجے پھر ایک ٹوٹی سی کنگھی جس کے آدھے دندانے سیل سے بند تھے طاق پر سے اٹھا کر مانگ درست کی، اور زمیندار صاحب کے یہاں چلی۔

اب اس کو دوسری فکر دامنگیر ہوئی۔ اکثر ایسا ہوتا کہ شبیر میاں اس کو ڈیوڑھی میں چھپے ملتے اور اس کا راستہ روک کر کھڑے ہو جاتے۔ گدگداتے۔ گالوں پر ہاتھ مارتے، اور پھر اپنے کمرے میں جس کا ایک دروازہ ڈیوڑھی میں کھلتا تھا گھس جاتے۔ اب اس کا غصہ تو فرو ہو چکا تھا۔ اور دل ہی دل میں اس خیال سے کہ شبیر میاں اس کے انتظار میں کھڑے ہوں گے خوش ہو رہی تھی۔ بوسہ کے خیال میں بھی اس کو لذت محسوس ہوتی۔ مگر اس لذت میں ایک عجیب قسم کا ڈر ملا ہوا تھا۔ ایسا نامعلوم ڈر، جو بچے تاریکی میں محسوس کرتے ہیں۔ لیکن یہ کر ہی کیا سکتی تھی۔ زمیندار صاحب کی ڈیوڑھی سے گذرنا ضروری تھا۔ پھاٹک تک تو

یہ آہستہ آہستہ گئی ۔ اور وہاں پہونچنے پر ذرا رُکی ۔ پھر زن سے دوڑ کر ڈیوڑھی پار کر گئی ۔

زمیندار صاحب کی بہو، اور شبیر میاں کی بڑی بھاوج زچہ خانے میں تھیں ۔ آج کل کنیز انھیں کا کام کرتی تھی ۔ ان کی طبیعت میں حکومت بہت تھی ۔ بات بات پر کنیز کو ڈانٹا کرتیں ۔ اکثر ذرا سی غلطی پہ مار بھی پڑ جاتی آج کونڈا صاف کرانے کے لئے دیر سے منتظر تھیں، کنیز کو دیکھتے ہی برس پڑیں ۔ دور ہی سے ایک ڈانٹ بتائی ۔ قریب آتے آتے پنکھا کھینچ مارا، مگر نشانہ خالی گیا ۔ اب کسی دوسرے حربہ کی تلاش ہوئی ۔ تکیئے ۔ چادریں ۔ پاندان ۔ پانی سے بھرا لوٹا ۔ اور شاید لوٹے ہی کی باری آتی ۔ مگر جوتیوں پر نگاہ پڑ گئی ۔ ایک اٹھا کر کھینچ ماری ۔ جو اتفاق سے کنیز پر جا پڑی، اگر سیدھی نکل چلی جاتی تو کنیز کی اور شامت آتی ۔ مگر طوفان اب بھی فرو نہیں ہوا تھا ۔ اور کوسنوں کی بوچھار جاری تھی، اتفاق سے شبیر میاں آ گئے ۔ انھوں نے بھاوج کی اس فرعونیت پر دو چار فقرے کسے ۔ جس سے وہ خاموش ہو گئیں، اور کنیز کی جان بچی ۔

کنیز نے چپکے سے کونڈا اٹھالیا، اور صاف کرنے چلی گئی ۔ مگر نہ جانے کیوں ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ شبیر میاں اس کو گھور رہے ہیں ۔ ایک دفعہ کام کرتے کرتے اس نے دبی نظروں سے پیچھے دیکھا، تو شبیر میاں سے نگاہیں چار ہو گئیں، دونوں اضطراراً مسکرا دئے ۔ شبیر میاں فوراً دوسری طرف دیکھنے لگے ۔ کنیز نے بھی جھینپ کر گردن جھکالی ۔

کنیز کے دل میں اب اپنی قدر پیدا ہو گئی ۔ شبیر میاں کے یہاں اتنی لونڈیاں اور مامائیں ہیں ۔ باہر نوکر ہیں چوکیدار ہیں ۔ مگر وہ صرف میری ہی طرفداری کرتے ہیں ۔ کتنے فخر کی بات ہے ؟

رات کو کھانا کھلا کر کنیز جب گھر جانے لگی تو ڈیوڑھی کے قریب پہونچ کر اس کا دل دھڑکا وہ دروازے پر ٹھٹکی، اور صبح والی ترکیب پر عمل کرنا چاہا ۔ مگر نہ جانے کیوں وہ دوڑنے سے باز رہی ۔ اور معمولی تیز رفتاری سے ڈیوڑھی کو عبور کرنا چاہا ۔ شبیر میاں جو دروازے کی اوٹ میں کھڑے انتظار کر رہے تھے فوراً اس پر جھپٹ پڑے ۔ اس کو دونوں ہاتھوں سے دبوچ لیا ۔ اور اپنے لب اس کے لبوں پر چپکا دئے اس فوری حملہ سے کنیز بدحواس ہو گئی ۔ کھانا جو گھر لئے جا رہی تھی ہاتھ سے چھوٹ پڑا ۔ شبیر میاں اس کو لے کر اپنے کمرے میں بھاگ گئے ۔ کنیز نے ہاتھ پیر مارے ۔ گڑگڑائی ۔ برا بھلا کہا ۔ چیخنے کی دھمکی دی ۔ مگر شبیر میاں

تجربہ کار تھے ۔ ان کی گرفت مضبوط تھی ۔ علاوہ ازیں بے پناہ اظہار محبت، اور گرما گرم بوسوں سے انھوں نے اس کی قوت ارادی کو کمزور کردیا ۔ کنیز کے جسم میں برقی لہر دوڑ گئی ۔ انجام کی تصویر دماغ کے سامنے دھندلی ہوگئی ۔ اس نے اضطراراً آخری جدوجہد کرنا چاہی ۔ مگر بے سود ۔ وقت گذر چکا تھا شراب کا ایک نشہ رگ وپے میں سرایت کر رہا تھا رفتہ رفتہ سرور ونشاط کا جسم ودماغ پر راج ہوگیا، اور پھر اس نے خوشی خوشی اپنے کو طوفانی لہروں میں چھوڑ دیا ۔

(۲)

اس واقعہ کو ڈیڑھ مہینہ گذر گیا ۔ شبیر میاں کی چھٹیاں ختم ہوگئیں، اور کالج کھل گیا ۔ انھوں نے مختلف بہانوں سے ایک ایک دن اور دو دو دن دیر کرنا شروع کردی ۔ ان کے والد دوسرے زمینداروں کی طرح معاملات سے بے خبر نہیں رہتے تھے ۔ اس لئے شبیر میاں کے لئے یہ ناممکن تھا کہ ان کو کسی قسم کا دھوکا دیتے ۔ دو ایک دن تو وہ شبیر میاں کو طرح دیتے رہے ۔ اور پھر انھوں نے شبیر میاں کو کوچ کا حکم سنا دیا ۔

اسی رات کو کنیز شبیر میاں سے احاطے کے پچھواڑے ایک جگہ پر جو پہلے سے مقرر کرلی تھی ملنے گئی ۔ شبیر میاں بہت پہلے سے انتظار میں بیٹھے تھے ۔ اس کو دیکھ کر آہستہ سے بولے

"کنیز یا"

"جی"

پھر کنیز نے پوٹلی ایک کنارے رکھدی، اور شبیر میاں سے بھڑ کر بیٹھ گئی ۔ اور بولی

"ہماری ایک نشانی اپنے پاس رکھئے گا ؟"

"کیوں نہیں"

کنیز نے ایک رومال شبیر میاں کے ہاتھ میں دیا ۔

کنیز ۔ "آپ کے قابل تو نہیں ہے"

شبیر میاں نے غور سے رومال دیکھا ۔ معمولی نین سک کا بنا ہوا رومال تھا جس پر انگریزی میں بھدا سا "شبیر" سرخ ریشم سے کڑھا ہوا تھا ۔ شبیر تھوڑی دیر تک اس کو چاند کی روشنی میں جو درخت سے چھن کر

ہلکی ہلکی آرہی تھی دیکھتے رہے ۔ اور پھر بولے

" تو یہ تم نے بنایا ۔"

" میں کیا بناتی ؟ جی تو یہی چاہتا تھا کہ کسی طرح سے خود بنانا سیکھ کر بناتی ۔ مگر لونڈیوں کو کام دھندوں سے کہاں اتنی چھٹی ـــــ بنوایا ہے ۔"

" بنوایا ہے ! ہائیں !! "

" جی "

" کس سے ؟"

" آپ کو اس سے کیا مطلب ؟ جس سے بنوایا ہے وہ کسی سے کہے گا نہیں ۔"

" تو بڑی گدھی ہے ۔ پگلی کہیں کی ۔ لونڈی پھر لونڈی ۔ تجھے میری عزت کی ذرا پروا نہیں ۔"

کنیز ذرا آبدیدہ ہو کر بولی

" دوسرے گاؤں میں بنوایا ہے ۔ بنانے والے کو معلوم بھی نہیں کس کے لئے بنوایا ـــــ نہیں لیجئے گا ؟ ۔"

کنیز شبیر میاں کی محبت میں سرشار تھی ۔ اس کے چھپائے نہیں چھپتی ۔ اکثر دوسروں کے سامنے ایسی حرکتیں کر بیٹھتی کہ اگر ان کو کوئی ذرا خیال سے دیکھے تو ان دونوں کے تعلقات پر شک کرنے لگے ۔ شبیر میاں کنیز کی ایسی حرکات پر بہت چراغ پا ہوتے اور انہی کے خیال سے کنیز اپنے کو امکان بھر سنبھالے رکھتی ۔ کنیز رفتہ رفتہ اپنے تعلقات کے غیر رسمی ہونے کو بھول گئی تھی ، ہاں ' اگر کبھی شبیر میاں کی شادی کا تذکرہ آتا ۔ یا کوئی بڑا ' بوڑھا شبیر میاں کو دعا دیتا " اللہ کرے شادی بیاہ ہو " تو کنیز کا دل کڑھ جاتا ۔ اور اس وقت اس کو اپنے تعلقات کی ناپائداری کا احساس ہوتا ۔ مگر پھر شبیر میاں سے ملاقات ہوتے ہی اس کو بھول جاتی ۔ اس محبت کے کھیل نے اس کی زندگی میں لذت پیدا کردی تھی ۔ جس کی وجہ سے رنج اس کے دل میں ٹھہر ہی نہیں پاتا ۔

شبیر میاں نے آخر کنیز کے جذبات کا خیال کر کے رومال جیب میں رکھ لیا ، اور پھر بولے ۔

" کل صبح کو میں روانہ ہو جاؤں گا ۔"

"پھر اب کیا ہوگا"

"تو بھی کیسی بچوں کی ایسی باتیں کرتی ہے۔ ہوگا کیا؟ میں دسمبر کی چھٹیوں میں پھر آؤں گا۔"

کنیز تھوڑی دیر تک سر جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔ شبیر میاں نے جب کچھ ڈھارس دینے کی کوشش کی تو وہ ان کے سینہ پر سر رکھ کر رونے لگی اور ان کے سمجھانے سے کسی طرح نہیں چپ ہوتی۔ بڑی مشکلوں سے اُنھوں نے سمجھا بجھا کر، ڈانٹ ڈپٹ کر اور صبح پھر ملنے کا وعدہ کرکے اس کو گھر بھیج دیا۔

شبیر میاں وہاں سے اٹھ کر ٹہلتے ہوئے پاس کے تالاب کے پاس چلے گئے۔ یہاں مینڈک جھینگروں کے ساتھ آواز ملا کر غائیں غائیں کر رہے تھے۔ کیچڑ اور بھیگی ہوئی گھانس کی بو ہوا میں پھیلی ہوئی تھی۔ ساتویں تاریخ کا چاند غروب کے قریب تھا۔ درختوں کے سایہ لمبے ہوگئے تھے، اور روشنی بھی مدھم تھی۔ اس منظر نے شبیر میاں کے دل کو ذرا سکون دیا۔ ان کی طبیعت بہت بےچین ہو رہی تھی۔ سرور کا دور گذر چکا تھا، اب خمار کا وقت تھا۔ کچھ کنیز کی بےبسی۔ کچھ اپنی عزت آبرو کا ڈر، سب سے زیادہ بدمزاج باپ کی ناراضگی کا خطرہ ان کے دل میں ہیجان مچائے تھا ان کو اپنے اوپر غصہ آرہا تھا۔ اور یہ چاہتے تھے کہ اپنے قصور کا بانی کسی اور کو قرار دیں۔ اس وقت ان کو اپنے چھوٹے بھائی کی آنا یاد آرہی تھی جو دو سال پہلے انکی زندگی کا بہت اہم جز بن گئی تھی۔ اور اس کے چلتروں پر ان کی معصومیت بھینٹ ہوئی تھی۔ یہ اپنا سارا قصور اسی کے سر منڈھتے رہے۔

تھوڑی دیر کے بعد ہلکی ہلکی ہوا چلنے لگی، دور سے کوئل کی آواز آرہی تھی۔ شبیر میاں کے دل میں گداز پیدا ہونے لگا۔ اُنھوں نے جیب سے رومال نکال کر دیکھا۔ کنیز کی محبت عود کر آئی۔ اور یہ سوچنے لگے۔ کہ درحقیقت تمام قصور کی ذمے دار میری کنیز سے محبت تھی۔ اس محبت کا انجام یہ نہوتا تو کیا ہوتا؟ کیا میں کنیز سے شادی کرلیتا؟ رہی محبت سو وہ اب بھی میرے دل میں باقی ہے۔ شبیر میاں نے رومال چوما۔ سینہ سے لگایا۔ اور پھر کنیز کے ساتھ وفادار رہنے کا عہد کیا۔

(۳)

صبح کنیز بہت سویرے اٹھ کر شبیر میاں کے کمرے میں گئی۔ مگر وہ کمرے میں موجود نہیں تھے۔ اس کو

بہت حیرت ہوئی۔ ڈیڑھ مہینہ کے اندر یہ پہلا واقعہ تھا کہ اُنھوں نے وعدہ خلافی کی تھی۔ کیوں نہیں آئے؟ کیا بات ہے؟ کیا رومال کے معاملہ میں برا مان گئے۔

شبیر میاں اس ڈر سے نہیں آئے تھے کہ شاید پھر کنیز رونے دھونے لگے یا کوئی ایسی حماقت کر بیٹھے جس سے ان کی اخفا کی ساری کوششیں خاک میں مل جائیں۔ کنیز تھوڑی دیر تک انتظار کرتی رہی اور پھر افسردہ دل گھر کے اندر چلی گئی۔

دس بجے شبیر میاں سامان واماں درست کرکے روانہ ہونے لگے۔ ماں، بھاوج کو سلام کیا۔ آتے جاتے ہوئی نگاہ کنیز پر ڈالی جو کھمبے سے لگی کھڑی ہوئی تھی۔ اور پھر باہر چلے گئے۔ کنیز آنکھ بچا کر ایک کوٹھری میں گھس گئی اور رو رو کر خوب دل کی بھڑاس نکالی۔

اب اس نے دسمبر کی چھٹیوں کا انتظار شروع کیا۔ ایک دن سے دوسرا دن ہوا۔ پھر ایک ہفتہ سے دوسرا ہفتہ۔ ایک مہینہ ہوا، پھر دوسرا مہینہ شروع ہوا، اور یوں ہی زندگی کٹنے لگی۔ وہی روزمرہ کا کام۔ بیبیوں کی ڈانٹ لونڈیوں ماماؤں کے طعن تشنیع۔ صبح کام کرنے آنا، اور رات کو گھر واپس چلا جانا۔ پہلے اسی زندگی کی عادی تھی اس لئے احساس بھی نہیں تھا۔ مگر اب ایکبار زندگی کی لذت اٹھا چکی تھی اس کو ایسا معلوم ہوتا کہ جنت میں داخل کی گئی، اور پھر نکال کر پھینک دی گئی۔ اب کام بھی خراب کرنے لگی تھی، اس لئے بیبیوں کی توجہ بھی اس کی طرف سے ہٹ گئی۔

دو مہینہ کے بعد اس کی صحت میں نمایاں تغیر ہونے لگا۔ دبلی ہو گئی۔ چہرے پر زردی آگئی۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے۔ جو اس کو دیکھتا تو کہتا کہ تجھے کیا ہو گیا ہے؟ یہ چپ ہو رہتی۔ ایک مہینہ اور گذرا، اب ماں باپ کو اس کی بیماری کی طرف توجہ ہوئی۔ کنیز کا نکاح تو دو سال پہلے ہو چکا تھا، ان لوگوں نے بیماری کا رنگ بھانپ کر رخصتی کے لئے سلسلہ جنبانی کی۔ کنیز کی سسرال والے راضی ہو گئے۔ مگر انھوں نے پانچ مہینہ کی مہلت چاہی۔ اور گیہوں کی فصل کٹنے پر رخصتی کی تاریخ مقرر کی۔ ادھر سے اور جلد رخصتی کرانے پر اصرار ہوا۔ جس کو ان لوگوں نے بالکل نامنظور کر دیا ایک مہینہ اور گذرا، اور ماں باپ کی تشویش بہت بڑھ گئی ہر ایک سے کہنے لگے کنیزیا کو جلندھر کی بیماری ہو گئی ہے۔ جب لوگوں نے رائے دی کہ گاؤں کے ویدجی کو

دکھادو ۔ یا کوس بھر پر اسپتال ہے وہاں لے جاؤ تو ان دونوں نے ٹال دیا ہاں گنڈا تعویذ کرنے لگے ۔ دو ایک دوائیاں بھی کھلائیں ۔ آنے والی مصیبت بانجھیں چڑھائے اپنے دانت دکھا رہی تھی ۔ مگر یہ دونوں اپنے کو دھوکے ہی میں رکھنا پسند کرتے تھے ۔

کنیز کے لئے سب طرح مصیبت تھی ۔ ماں طعن تشنیع کرتی ۔ باپ منہ سے سیدھی طرح بات نہ کرتا اگر دونوں میں سے کبھی کوئی ہمدردی دکھاتا تو اس طرح کہ کنیز شرمندہ ہو جاتی ۔ زمیندار صاحب کے یہاں ڈانٹ اور مار ان دنوں زیادہ ہوگئی تھی ۔ ہاں اگر کوئی غمگسار تھا تو لفاطن' اس نے دو ایک دوائیاں بھی لاکر چپکے چپکے کھلائیں ۔

کنیز اب خوش تھی' کیونکہ دسمبر کی چھٹیاں قریب آرہی تھیں ۔ شبیر میاں آنے والے تھے' اسے یقین تھا کہ ان کے آتے ہی کنیز اکثر لوگوں سے پوچھا کرتی کہ چھٹیاں کب شروع ہوں گی ۔ اور کب تک رہیں گی ۔ رفتہ رفتہ چھٹیاں آگئیں ۔ مگر کنیز کو حیرت تھی کہ شبیر میاں کی ماں اور بھاوج ابکی خلاف معمول ان کے آنے کا انتظار نہیں کر رہی ہیں ۔ اس وجہ کو پہلے سے اس نے سمجھنا ہی نہیں چاہا جب دن گذرتے گئے' اور شبیر میاں نہ آئے' تب یہ سمجھتی گئی' اور اس کا دل اندر ہی اندر ٹوٹتا گیا آخر ایک دن شبیر میاں کی ماں سے تصدیق ہوگئی ۔ وہ کسی کو بتا رہی تھیں کہ " ابکی ہم لوگوں نے شبیر میاں کو لکھا ہے کہ یہاں نہ آؤ ۔ بلکہ اپنی بہن کے یہاں ہو آؤ "

کنیز اب بہت بیمار رہنے لگی ۔ زمیندار صاحب کی بیوی نے اس کی ماں کو بلا کر پانچ روپیہ دئے اور کہا کہ کنیز کا علاج کرو اور جب تک اچھی نہ ہو جائے کام کاج کے لئے نہ بھیجو ۔ کنیز اب گھر میں بے کار پڑی رہتی ۔ کبھی کبھی دو ایک چھوٹے چھوٹے کام کر دیتی ۔ اور اس کی جلندھر کی بیماری روز بروز بڑھتی جاتی تھی ۔ ماں سب دیکھتی تھی سمجھتی تھی ۔ اور ترس کھا کر چپ ہو جاتی تھی ۔ باپ اکثر چلا اٹھتا تھا ۔

" کبھی بڑے گھروں میں لڑکی نوکر نہ رکھائے "

ایک دن رات کو کنیز کے ماں باپ' اپنے خیال میں اس کو سوتا پا کر آپس میں باتیں کرنے لگے ۔

ماں ۔ " بھیا کے یہاں چلے چلو ۔ بہت دن سے ہم لوگ وہاں نہیں گئے ہیں "

باپ ۔ "کیا خراب قسمت ہے؟ کھیتی کو دیکھوں؟ کیا کروں؟"

ماں ۔ "تم پہنچا کر چلے آنا"

باپ ۔ "کنیز جانے کے بھی قابل ہے"

ماں "جائے گی نہیں تو کیا کرے گی ۔ بدنصیب کہیں کی"

باپ "منہ دکھانے کے قابل نہیں رکھا"

کنیز سب سن رہی تھی ۔ اس نے اسی وقت طے کر لیا کہ کچھ ہوا اپنے ناپاک وجود کو ماں باپ کے مکان سے ہٹا لیجاؤں، کہاں جاؤں گی؟ نہ اس نے یہ سوال سوچا، اور نہ سوچ سکتی تھی ۔ رات بھر جگتی رہی جب اس کے خیال میں دو تین گھنٹہ رات رہ گئی، چپکے سے اٹھی اور کوٹھری میں چلی گئی ۔ وہاں جلانے کی لکڑیاں اور کنڈے کے ڈھیر تھے ۔ اس نے ان کو ایک کونے میں ہٹا دیا ۔ اور ٹٹول کر ایک چھوٹی سی ہانڈی نکالی ۔ اس میں سے شبیر میاں کا دیا ہوا ہار نکالا ۔ اور گلے میں پہن لیا ۔ اور پھر چپکے سے دروازہ کھول کر باہر نکل گئی ۔

کنیز کو وقت کا اندازہ نہیں ہوا تھا ۔ درحقیقت صبح ہو گئی تھی ۔ اور لوگ بیلوں کو لیئے کھیتوں کی طرف جا رہے تھے ان میں سے ایک نے کنیز کو دیکھا، اور پہچان کر کہا ۔

"کہاں جا رہی ہے کنیزیا؟"

کنیز گھبراتی، ہچکچاتی ۔ پھر بولی ۔

"ویدجی کے یہاں ۔ ابا کی طبیعت بہت خراب ہے"

"ویدجی ادھر کہاں؟ تالاب پار جا"

کنیز اسی طرف مڑ گئی ۔ اس کے لئے تو سب سمتیں یکساں تھیں ۔ تھوڑی دور جا کر اس نے خیال کیا کہ صبح تو ہو گئی تالاب پار بہت سے جاننے والے مل جائیں گے ۔ اس لئے پہلے ہی والا راستہ بہتر ہے ۔ مگر جیسے ہی وہ پلٹی دیکھا کہ ان کا راہبر کھڑا دیکھ رہا ہے ۔ نہ معلوم راستہ بتانے کے لئے، یا کنیز کا ارادہ دریافت کرنے کے لئے ۔ مجبوراً وہ اسی سمت چلی ۔ کچھ دور جا کر اس کے "علی الدی چچا" آتے دکھائی دیئے ۔ اس نے فوراً راستہ بدل دیا، اور پگڈنڈی چھوڑ، سڑک پر نکل گئی ۔ ادھر سے بیل گاڑی آ رہی تھی ۔ گاڑی کا پردہ چھوٹا ہوا تھا

صرف ایک کونہ اٹھا ہوا تھا۔ گاڑی خیراتی ہانک رہا تھا جو کنیز کے ساتھ کا کھیلا ہوا تھا۔ کنیز نے سوچا کہ اس کو درست بنانا چاہئے۔ قریب جا کر خوشامد سے کہنے لگی۔

"خیراتی سڑک کو جا رہا ہے؟ مجھے بھی اپنے ساتھ لیتا چلتا"

"کہاں جائے گی؟"

"خالہ کے پاس - اپنا علاج کرانے"

"اکیلی؟"

"ہوں"

خیراتی معنی خیز تبسم سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اور بولا

"ہوں! ہوں ہوں"

کنیز کھسیا کر بولی

"اگر لیجانا ہو تو ویسا کہ۔ نہیں تو میں خود چلی جاؤں گی"

کنیز اس لئے اور گھبرا گئی تھی کہ اس کے علی الدی چچا قریب آ رہے تھے۔ بارے خیراتی اس کو گھبرایا ہوا دیکھ کر ترس کھا گیا، اور بولا

"بیٹھ جا"

کنیز علی الدی چچا سے آڑ میں ہو کر گاڑی میں بیٹھ گئی اور پردہ چھوڑ دیا۔ گاڑی کچی سڑک پر کھسر کھسر کرتی ہوئی چلنے لگی۔ علی الدی چچا برابر سے گذر گئے۔ کنیز کے دل کو اطمینان ہوا اور وہ گاڑی کے ہچکولوں سے مزا لینے لگی۔ زندگی میں صرف تین چار بار گاڑی پر بیٹھی تھی۔ مگر کسی مرتبہ اس طرح نہیں کہ پوری گاڑی اسی کے لئے وقف ہو۔ کنیز آرام اور اطمینان پا کر گاڑی میں لیٹ گئی، اور پردے کا ایک کونہ اٹھا کر جھانکنے لگی۔ خیراتی پوری آواز سے تانیں اڑا رہا تھا۔

"مٹ نہ جائے درد دل۔ مٹ نہ جائے درد دل"

گاڑی سڑک چھوڑ ایک باغ کے بیچ سے گذری۔ اور اس کے بعد ایسے راستہ سے چلنے لگی جس کے

دونوں طرف بہت اونچے پتاور کے جھنڈ کھڑے تھے۔ کنیز بچپن میں گاؤں کے ہر حصہ میں گھوم چکی تھی۔ اس لئے اس کو تعجب ہوا کہ خیراتی کدھر جا رہا ہے۔ اور بولی

"کدھر جا رہا ؟"

خیراتی بدستور تانیں مار رہا تھا

"درد دل ہو، بھئی درد دل"

گفتگو کی گنجائش نہ پا کر کنیز خاموش ہو گئی۔ رات بھر کی جاگی ہوئی تھی، اس لئے لیٹے لیٹے آنکھ لگ گئی۔ مگر تھوڑی ہی دیر گذری ہوگی کہ اس کو ایک طرح کی بےچینی محسوس ہوئی، اور آنکھ کھل گئی۔ دیکھا تو گاڑی اسی کے مکان کے دروازے پر کھڑی ہے۔ اور خیراتی اس کے ماں باپ سے باتیں کر رہا ہے۔

خیراتی۔ "اتریئے بیگم صاحبہ۔ سڑک آگئی"

باپ۔ ڈانٹ کر بولا۔ کنیریا۔ اُتر......

کنیز ڈر سے کانپتی ہوئی اتری۔ اترتے ہی باپ نے ایک گھونسا مارا۔ اور پھر ایک لکڑی اٹھا کر چار پانچ ضربیں لگائیں۔ کنیز دروازے سے گذر کر صحن میں گر پڑی۔ باپ نے اب ایک لات رسید کی پھر بھی غصہ کم نہیں ہوا۔ برابر گالیاں دئے جا رہا تھا۔ آخر ماں کو رحم آگیا اور بولی۔

"کیا مار ڈالو گے وہ غریب کیا کرتی تم ہی نے اس کی زندگی وبال کر دی تھی۔ زمیندار کے گھر میں ذکر رہ کر آج تک کوئی لڑکی بچی ہے۔ ابھی پارسال بھندو کی بیوہ کے بچہ ہوا تھا........"

"چپ۔ بڑبڑ کئے جاتی ہے۔ میں گاؤں میں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔"

پاس پڑوس کے مرد، اور عورتیں آکر جمع ہو گئیں۔ قصہ ان لوگوں کو خیراتی سے معلوم ہو گیا تھا اور جو کچھ باقی بچا، وہ ماں باپ کی لڑائی سے کھل گیا۔ ہر ایک اپنی سی کہنے لگا۔

"بُرا کیا"

"بُرا کیا۔"

"بُرا ہوا۔"

"کہاں گئی تھی ؟"

"گئی ہی کیوں تھی ؟ کوئی نکال رہا تھا ؟"

"بچاری غیرت دار ہے ؟"

"پہلے سے سوچ لیتی ؟"

ماں باپ کا بُرا حال، سب کے سامنے دُکھڑا رو رہے تھے - ایک عورت بولی۔

"ایسی باتیں غریبوں کے گھر ہوہی جاتی ہیں ؟"

دوسری عورت: "عزت آبرو بڑے لوگوں کی باتیں ہیں ؟"

غل شور سنکر زمیندار صاحب کے گھر سے بفاطن خبر لینے آئی - اور کنیز کے باپ سے پوچھنے لگی۔

"کیا بات ہے ؟"

"کیا بتاؤں ؟ شبیر میاں نے ہم لوگوں کی عزت لے لی - اور اس حرامزادی کو تو کسی کام کا نہ رکھا"

یہ سنتے ہی دو تین آدمی بول اُٹھے ۔

"ہائیں ہائیں - کسی کا نام کیوں لیتے ہو ؟"

"کیا کہ رہے ہو - کیا کہ رہے ہو ؟"

"کسی کا نام کیوں لو - اپنی قسمت کو کہو - قسمت کو"

ماں - "ہاں اپنا لکھا"

ایک بڑھیا نے بفاطن کے پاس جا کر کہا ۔

"یہ نہ کہدینا کہ کسی کا نام لیا - کیا فائدہ ؟ جو ہونا تھا ہو چکا"

دوسری عورت: "زمیندار صاحب کو خفا کرکے گاؤں میں رہنا ہوگا کیسے ؟"

تیسری - "دریا میں رہ کر مگر مچھ سے بیر"

بفاطن چپکے چلی گئی - جو جمع ہو گئے تھے وہ بھی ایک ایک دو دو کرکے رخصت ہونے لگے - دو عورتیں ٹھہر گئیں - اُنھوں نے کنیز کو صحن سے اٹھایا جو ابھی تک منہ ڈھکے، بے کل پڑی رو رہی تھی - اور اس کو لیجا کر پلنگ پر

لٹایا۔ چوٹیں بہت بے جگہ لگیں تھیں۔ خوب سینکا گیا۔ ہلدی چونا لگایا گیا۔ مگر کنیز کی بےچینی میں کچھ کمی نہیں ہوتی۔ اکثر وہ بڑی زور سے چیخ اٹھتی۔ ان عورتوں کے کچھ سمجھ میں آیا۔ کچھ نہیں سمجھ میں آیا۔ مگر جو بن پڑا کرتی رہیں۔ آخر تین بجے آٹھ مہینہ کا چھوٹا سا بچہ پیدا ہوا۔

چار روز کے بعد کنیز کے ماں باپ گھر نمو پر چھوڑ کر صبح تڑکے کنیز کو لیکر گاؤں سے چلے، اور یہ ارادہ کیا کہ کنیز کو مصلحتاً کچھ دنوں کے لئے اس کی خالہ کے پاس پہونچا دینا چاہئے۔ پھر جیسا رنگ ہو ویسا کیا جائے گا کیونکہ اس کی رخصتی کی طرف سے تو اب بالکل مایوسی ہی ہو چکی تھی اور زمیندار صاحب نے بھی اعلان کر دیا تھا کہ میں ایسی خراب عورت کو گھر میں نہیں آنے دوں گا۔ سورج نکلتے نکلتے یہ لوگ ایک کوس نکل گئے۔ وہاں کسی شاہ صاحب کا مزار تھا ان لوگوں نے جا کر دو پیسہ چڑھائے۔ ایک باباجی بیٹھے تھے، دعائیں دینے لگے۔ ان کی نگاہ کنیز پر پڑی دیکھا تو ایک نوجوان عورت گلے میں شیشے کا سرخ ہار پہنے۔ گود میں ایک لڑکا لئے کھڑی ہے۔ دوپٹہ منہ کی طرف گھونگھٹ کی طرح لٹکا ہوا ہے۔ باباجی اس کی طرف دیکھ کر۔ کنیز کے باپ سے کہنے لگے۔

"پوتا ہے کہ نواسہ؟"

کنیز غیرت کے مارے کٹ گئی۔ اور اس نے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ باباجی اس شرم سے نتیجہ اخذ کر کے بولے۔

"پوتا ہے۔ اللہ اچھا رکھے۔ کما کر دادی دادا کا پیٹ بھرے"

تینوں مسافروں میں سناٹا چھا گیا، اور وہاں سے خاموش چلی کھڑے ہوئے۔

پندرہ دن بعد جب کنیز کے ماں باپ کنیز کو پہونچا کر واپس ہوئے تو یہاں آتے ہی معلوم ہوا زمیندار صاحب کے یہاں شادی کے سامان ہو رہے ہیں۔ شبیر میاں کو قسمتوں سے بڑی مالدار بیوی مل رہی ہے۔ یہ دونوں ٹھنڈی سانسیں بھر کر گھر چلے گئے۔

کانگریس کی پچاس سالہ جوبلی

۲۸ دسمبر ۱۹۳۵ء کو کانگریس کی زندگی کے پچاس سال پورے ہوئے۔ اس موقع پر ملک کے تقریباً تمام شہروں اور بڑے قصبوں میں جلوس نکالے گئے اور ہندوستان کے جھنڈے کو سلامی دی گئی۔ اس تقریب میں ہندوستان کی آبادی کی خاصی کثیر تعداد شریک ہوئی اور ملک کے پڑھے لکھے اور دولتمند لوگوں کی ایک بڑی جماعت نے جسے ہندوستان کی معاشی اور سیاسی زندگی کا بجا طور پر رہنما کہا جاسکتا ہے اس جشن جوبلی کو کامیاب بنانے میں تقریر تحریر اور اجتماع کے ذریعہ پوری سرگرمی کے ساتھ کوشش کی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ کانگریس کیا چیز ہے جس کی پچاسویں سالگرہ منانے کے لئے اس قدر شور و ہنگامہ برپا کرنا مناسب سمجھا گیا۔

کانگریس ایک ایسے ادارے کا نام ہے جو ایک زندہ اور ترقی پذیر تحریک کو چلا رہا ہے۔ اس کی بنا چند مفروضات پر رکھی گئی ہے جو شعوری یا غیر شعوری طور پر اس کے چلانے والوں کے ذہن میں ہمیشہ موجود رہے ہیں۔ ان میں سب سے اہم مفروضہ یہ ہے کہ اس رقبہ میں جسے انگریزوں نے اپنی سہولت کے لئے ایک واحد حکومت قرار دے رکھا ہے اور جس کا سیاسی نام انھوں نے ہندوستان قرار دیا ہے دراصل ایک ہی قوم آباد ہے جس کے اغراض و مفاد مشترک ہیں اور جو متحد ہو کر اپنی فلاح و بہبود کے لئے کوشش کرنا چاہتی ہے۔ افغان، بلوچ، پنجابی، سندھی، بنگالی، گجراتی اور مدراسی جو دور دراز علاقوں میں رہتے ہیں ان کے آپس کے فرق، ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی اور دوسرے مذہبوں کے اختلافات، ہندی، مرہٹی، اردو، بنگالی، تامل، تلیگو وغیرہ بولنے والوں کی باہمی بیگانگی، زمیندار اور کسان، سرمایہ دار اور مزدور، شہری اور دیہاتی کی تفریق ــــ یہ سب چیزیں غیر اہم اور ناقابل التفات ہیں بنیادی طور پر ہندوستان کے بسنے والے ایک ہیں۔ ان میں قومی وحدت کا احساس پایا جاتا ہے۔ ان کی شکایتیں اور محرومیاں یکساں، ان کی تمنائیں اور حوصلے مشترک، ان کے اغراض و مفاد ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ یہ سب ملکی ہیں اور انگریز غیر ملکیوں سے ان کا ہر قدم پر تصادم ہے کیوں کہ انگریزوں کے ہندوستان پر قبضہ کرنے سے اعلیٰ فوجی اور سول عہدے ہندوستانیوں کے ہاتھ سے چھن گئے۔ ملک کی تجارت اور صنعت برباد ہوگئی، زراعت پر محصول کا بار اس قدر بڑھا کہ کسانوں کی حالت گفتنی ہوگئی اور ان کی قوت مدافعت اس قدر کم ہوئی کہ ذرا سی بدحالی کے مقابلہ

کی بھی سکت ان میں باقی نہ رہی غیر ملکی تہذیب، زبان، مذہب اور تعلیم کو فروغ ہوا۔ ملکی علوم اور تمدن کو زوال ہوا۔ ملک کے رہنے والے ذلیل اور خوار ہوگئے۔ حکومت کے اقتدار کا ایسا ناجائز فایدہ اٹھایا گیا کہ بڑے سے بڑا ہندوستانی بھی ایک چھوٹے سے چھوٹے انگریز کے سامنے سر جھکانے پر مجبور ہوگیا۔ قوانین کی سخت گیری نے تقریر، تحریر اور اجتماع کی آزادی سلب کرلی۔ ہتھیار اور اسلحہ رکھنا ممنوع قرار دیا گیا۔ غرضکہ زندگی کے بیشتر حقوق چھین لئے گئے جن کے دوبارہ حاصل کرنے کے لئے ہر ہندوستانی انفرادی طور پر تمنا کرنے لگا۔ اس انفرادی تمنا کو اجتماعی شکل و تنظیم دینے کے لئے ایک سیاسی جماعت کانگریس کے نام سے ۱۸۸۵ء میں قائم کی گئی۔ اس جماعت نے پچاس سال تک مسلسل اپنی جد و جہد کو جاری رکھا ہے۔ اس نے اپنا کام (اگر ابتدائی دو تین سالوں کو نظر انداز کردیا جائے) حکومت کی سرپرستی سے نہیں بلکہ اس سے آزاد رہ کر اور اس کی مخالفت کے باوجود اپنی ذاتی کوشش سے چلایا ہے۔ اپنے مقصد کے حصول میں یہ ابھی تک ناکام ہے لیکن اس جماعت کے رہنماؤں کا خیال ہے کہ وہ اپنی منزل مقصود کے بہت قریب پہنچ گئے ہیں۔ کچھ عرصہ سے اس کا مطمح نظر موجودہ غیر ملکی حکومت کو ختم کرنا اور اس کی جگہ ملکی اور نمایندہ طرز کی حکومت کو قائم کرنا ہوگیا ہے۔ یہ نصب العین اس کے سامنے اپنے قیام کی ابتدا سے ہی واضح شکل میں موجود نہ تھا۔ پہلے اس کے مطالبات بہت کم اور نرم تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ اس کے حوصلے بڑھتے گئے ہیں اور اب اس نے مکمل آزادی کو اپنا مقصد قرار دے لیا ہے۔ اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے جو طریقے اس نے مقرر کئے ان میں بھی رفتہ رفتہ تبدیلی ہوتی رہی ہے۔ پہلے عرضی اور ڈپوٹیشن کے ذریعہ حکومت ہند اور حکومت انگلستان کو اپنے مطالبات کی طرف متوجہ کیا جاتا تھا اور ان کی فیاضی اور انصاف پسندی سے اصلاحات کے ملنے کی امید کی جاتی تھی۔ لیکن اب حکومت کے فوایدکو ناممکن بنا کر انگلستان کو صلح کی شرایط کے لئے مجبور کرنے کا حوصلہ کیا جانے لگا ہے۔ پہلے یہ تحریک چند اعلیٰ انگریزی تعلیم حاصل کئے ہوئے لوگوں تک محدود تھی جنھوں نے یورپ کی آزاد اور آئینی حکومتوں کا مطالعہ کیا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ تحریک پھیل کر کم علم اور بے علم لوگوں میں بھی پہنچ گئی ہے۔ پہلے مزدوروں اور کسانوں کی شکایتوں کی ترجمانی چند خود ساختہ نمایندے کرتے تھے اب ان کے صحیح نمایندے بھی سامنے آنے لگے ہیں اور ایسے آئین و دستور کے خاکے بنائے جاتے ہیں جن میں ان کے حقوق کی پوری نگہداشت ہوسکے

گی۔ کانگریس کی یہ ترقی بہت سے لوگوں کے لئے نہایت قابل اطمینان نظر آتی ہے۔ لیکن جب اس کا مقابلہ دوسرے ملکوں کی ترقی سے کیا جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان کی رفتار کس درجہ سست ہے۔ امریکہ، جرمنی، اٹلی، جاپان، روس، کینیڈا، آسٹریلیا، جنوبی افریقہ، نیوزیلینڈ کی پچاس سال پہلے کی حالت کا جب ان کی موجودہ حالت سے مقابلہ کیا جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں ہندوستان کی رفتار کس قدر سست ہے اور اس وقت اطمینان کی جگہ رنج و افسوس کرنا پڑتا ہے کہ ہندوستان نے نصف صدی یونہی باتوں میں گنوا دی اور جو کام کرنے کا تھا وہ ابھی تک پورا نہ ہو سکا۔

مگر اس قسم کی سخت رائے کا اظہار شدت کے ساتھ اسی صورت میں کیا جا سکتا ہے جب یہاں کے مخصوص حالات کو غیر معمولی نہ سمجھا جائے۔ جو لوگ یہاں کے موانع اور دشواریوں کو اسی ملک کے لئے مخصوص سمجھتے ہیں ان کی نگاہ میں کانگریس کی کارگذاریاں کسی طرح حقیر نہیں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب انگریزوں نے اس وسیع علاقہ کو جو آج ہندوستان میں شامل ہے رفتہ رفتہ مختلف حکمرانوں سے حاصل کیا تو اس میں کسی قسم کا کوئی ایسا قریبی رشتہ اتحاد نہیں پایا جاتا تھا جو از خود اسے ایک سیاسی وحدت عطا کر سکتا۔ ذرائع آمد و رفت اور وسائل خبر رسانی کی خامیوں کی وجہ سے آبادی کا بیشتر حصہ صرف ایک محدود علاقہ سے معاشرتی، تجارتی اور سیاسی تعلقات پیدا کر سکتا تھا۔ اکثر علاقے بلکہ چھوٹے چھوٹے گاؤں اپنی معاشی اور اجتماعی ضروریات کے لئے کسی دوسرے کے محتاج نہ ہوتے تھے۔ ان کی آبادی کے اکثر افراد کی دنیا اپنے گاؤں یا آس پاس کے بیس پچیس گاؤں تک محدود ہوتی تھی۔ اس مختصر دنیا کے باہر دوسرے علاقوں کے معاملات سے انھیں بہت کم سروکار ہوتا تھا۔ تمام ہندو سوسائٹی ذات پات کے ایک تدریجی نظام میں بندھی ہوئی تھی۔ چار بڑی ذاتیں تھیں جن میں ہزاروں اور نئی شاخیں پیدا ہو گئی تھیں۔ برہمن، کشتری اور ویش کی دنیا شودر کے مقابلہ میں زیادہ وسیع ہوتی تھی۔ پھر برہمنوں، کشتریوں اور ویشوں کے بھی مختلف مدارج تھے۔ اونچے درجے کے شہر میں رہنے والے برہمن علم حاصل کرنے، یاترا درشن کے لئے اور راجہ مہاراجوں کے ساتھ دور دراز کا سفر کرتے تھے۔ فوج میں لڑنے والے کشتریوں کو بھی جنگ کی وجہ سے ایک وسیع رقبہ اور کثیر آبادی سے واقفیت ہو جاتی تھی۔ قیمتی مال کی تجارت کرنے والے ویش بھی

نفع کی تلاش میں بہت سے علاقوں میں گھومتے تھے ۔ لیکن اس اعتبار سے سب سے زیادہ سفر کرنے والے بیراگی اور مہاتما ہوتے تھے جو گھر بار کو چھوڑ کر سنیاس لے لیتے تھے اور خانہ بدوشی کی حالت میں مکان اور غذا کی فکر سے آزاد، جان و مال سے بے پروا، رہزنوں اور ڈاکوؤں سے نڈر ہوکر پا پیادہ جدھر چاہتے تھے گھومتے پھرتے تھے ۔ ان سفر کرنے والے لوگوں کی وجہ سے زندگی میں ایک طرح کی وحدت پیدا ہوتی تھی لیکن اس کا اثر، وسعت اور گہرائی دونوں لحاظ سے، بہت محدود تھا ۔ کیونکہ سنیاسی، درویش اور ایک حد تک برہمن بھی ایک طرح کی بین الاقوامی آبادی ہوتے تھے اور دو علاقوں میں ان کے باہمی تعلقات کی وجہ سے کسی سیاسی وحدت کا پیدا ہونا لازمی نہ تھا ۔ کشتری لڑائی کے میدان میں مخالفت کے لئے ہی ایک دوسرے سے ملتے تھے ۔ پھر جو تھوڑی بہت وحدت ان سب کی وجہ سے پیدا بھی ہوتی تھی وہ مسلمانوں کے اقتدار کے بڑھنے سے ختم ہو گئی ۔ کیونکہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان ان لوگوں کی معرفت کسی قسم کا رشتہ اتحاد پیدا نہ ہو سکتا تھا ۔ گو منتشر مسلمانوں میں باہمی وحدت پیدا کرنے کے لئے علماء، درویش اور تاجر، ذات پات کی تفریق نہ ہونے کی وجہ سے نسبتاً زیادہ کامیاب رہتے تھے ۔ اس سلسلہ میں گذشتہ صدی کی ایک مثال پیش کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا ۔ ۱۸۰۰ء کے آس پاس سکھوں کے مذہبی مظالم کے خلاف جہاد کرنے کے لئے مجاہدین کی جو جماعت حضرت سید احمد صاحب بریلوی کی سرکردگی میں یو۔پی ۔ دہلی، راجپوتانہ، سندھ، بلوچستان اور سرحدی صوبہ کا دورہ کرتی ہوئی پنجاب پر حملہ آور ہوئی، اس کا خیر مقدم مسلمانوں نے ہر جگہ اپنی قومی فوج سمجھ کر کیا ۔ یہ جماعت اللہ پر توکل کرکے سامان رسد کا انتظام کئے بغیر نکلی تھی لیکن اسے کسی جگہ فراہمی رسد میں کوئی غیر معمولی دشواری نہیں ہوئی بلکہ لوگوں نے ازخود رضا و رغبت اس کی ضروریات مہیا کرنے کا ذمہ لے لیا اور ہر جگہ رضاکاروں کے ذریعہ اس کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا ۔ اس جماعت کا منشاء یہ تھا کہ سکھوں نے مسلمانوں کے فرائض مذہبی یعنی اذان، نماز باجماعت وغیرہ کی بجا آوری میں جو پابندیاں بہ جبر عاید کی ہیں ان کا خاتمہ کیا جائے ۔ اس جماعت کو نظم و انتظام کی خرابی اور مقامی رفیقان کار کی غداری اور دغا بازی کی وجہ سے کامیابی نہیں ہوئی ۔ علماء اور درویشوں کے ذریعہ مسلمانوں میں آسانی سے جو وحدت پیدا کرائی جا سکتی ہے اس کی دوسری مثال ۱۸۵۷ء کے غدر کو بھی

سمجھنا چاہئے ۔ بہر حال برطانوی ہندوستان میں محکوم رعایا کی حیثیت سے سلمانوں کی ایک کثیر تعداد کے شامل ہو جانے سے ہندوستان کے قومی اتحاد کا مسئلہ پیچیدہ ہو گیا ہے ۔ لوکمانیہ تلک کے متعلق یہ بیان کیا جاتا ہے کہ انھوں نے ایک دفعہ کہا تھا کہ ہندوستانی قومیت کی جنگ دو رخہ نہیں بلکہ سہ رخہ ہے جس میں فریق ایک طرف سے صرف انگریز اور دوسری طرف سے ہندوستانی نہیں ہیں بلکہ ایک طرف ہندو، دوسری طرف انگریز اور تیسری طرف مسلمان ہیں ۔ مسٹر گوکھلے کے متعلق مسز سروجنی نائیڈو کے حوالہ سے بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ہندو مسلم اتحاد کی طرف سے کچھ زیادہ پرامید نہ تھے کیونکہ انھوں نے خاتون موصوف سے ایک مرتبہ کہا تھا کہ یہ اتحاد میری اور تمھاری زندگی میں تو ہوتا نظر نہیں آتا ۔ اس کے بعد جو واقعات رونما ہوئے اور برابر ہوتے جا رہے ہیں ان سے اس مسئلہ کی پیچیدگی برابر بڑھتی جا رہی ہے ۔ فرقہ پرست رہنما اپنے ادارے الگ الگ بنا کر اپنے مورچے مضبوط کر رہے ہیں اور اپنے فرقوں کو اکسا اکسا کر تشدد کی طرف زیادہ مائل کرتے جا رہے ہیں ۔ اب ادھوری جنگ کرنے کا خیال لوگ ترک کر رہے ہیں اور آخر تک لڑ کر ہمیشہ کے لئے فیصلہ کرنا چاہتے ہیں ۔ لیکن انگریزوں کی موجودگی میں یہ غالباً ممکن نہیں ہے کیونکہ ان کا مفاد بظاہر اسی میں ہے کہ آپس کے جھگڑوں کو جہاں تک ہو سکے بڑھایا جائے تاکہ خانہ جنگی کی حالت میں کبھی ایک فریق کا اور کبھی دوسرے کا ساتھ دے کر دونوں کے زور کو کم کیا جائے اور اپنی جڑیں مضبوط کی جائیں ۔ ابتدا سے وہ یہی کھیل کھیل رہے ہیں ورنہ ان کی قلیل تعداد ہندوستان کی کثیر آبادی پر کیسے حکومت کر سکتی تھی ۔

مندرجہ بالا حالات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک میں نااتفاقی اور عدم اتحاد کے عناصر کس درجہ قوی ہیں اور کسی متحدہ قومیت کا ارتقا کس قدر ناممکن الحصول نظر آتا ہے ۔ کانگریس کی یہ ایک بڑی کارگزاری ہے کہ ایک ایسے ملک میں جو احساس وطنیت سے بالکل معرا تھا اس نے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک یگانگت پیدا کر دی ۔ کانگریس کے بانیوں نے ہندوستانی ذہن کو عہد قدیم کی تنگ نظریوں، عہد متوسط کے تعصب اور جاگیردارانہ نظام کی ہمہ گیری سے آزاد کرنے کا تہیہ کیا تھا ۔ اور ان کے پیروؤں نے اپنی اپنی سمجھ کے مطابق اس کام کو جاری رکھا ۔ اس میں شک نہیں کہ برطانوی حکومت کے قیام، ذرائع آمد و رفت اور وسائل خبر رسانی کی ترقی، امن و تعلیم کے رواج اور تجارت و جدید صنعت کے فروغ سے بھی اس کام میں

بہت امدادملی بلکہ بعض انتہا پسند تو شاید یہ تک کہیں گے کہ کانگریس کا احیار ماضی کی تحریکیں ان جدید قوتوں کے آزادانہ عمل میں مزاحم ہوئیں جس کی وجہ سے ملکی اتحاد اور ارتقائے قومیت کو صدمہ پہنچا اور ترقی کی رفتار سست ہوگئی۔ لیکن جو لوگ مغربی آزاد تجارت کی تباہ کاریوں اور انتفاع ناجائز سے واقف ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ مغرب کے یہ عطیے کسی غیر منظم جماعت کے لئے کس درجہ نقصان رساں ثابت ہوسکتے ہیں اور وہ صحیح طور پر اس بات کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ کانگریس نے نفع ذاتی کی جگہ نفع قومی کے تخیل کو اُبھار کر ہندوستان کی مدافعت کی طاقت کو کس قدر استوار کیا ہے۔ اس کا کام ابھی تک نامکمل ہے۔ رجعت کی قوتوں کو کانگریس نہیں بلکہ برطانوی شہنشاہیت اُبھار رہی ہے اور قوتوں کا عمل اس قدر پیچ در پیچ ہے کہ بعض وقت جو کام قومیت کی ترقی کے لئے شروع کئے جاتے ہیں وہ فی الحقیقت مخالف کو نقصان پہنچانے کی جگہ فایدہ پہنچاتے ہیں۔ بہر حال سیاست کی ان پیچیدگیوں کے باوجود کانگریس کی خدمت بصورت مجموعی ہندوستان کے لئے مفید ثابت ہوئی ہے۔

دنیا کی رفتار
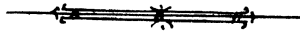
برطانیہ اور اٹلی حبش کے معاملہ میں برطانیہ اور اٹلی کا جو اختلاف ظاہر ہوا ہے اس کے اسباب پر ذیل کا اقتباس سے روشنی پڑے گی جو ہم ایک مشہور جرمن اخبار میونشنر نواسے ناخرشٹن (MUENCHNER NEUESTE NACHRICHTEN سے لیتے ہیں)

اٹلی میں متحدہ شاہی حکومت کے قیام سے برابر یہ سمجھا جاتا تھا کہ ملک کی پرامن اور خود مختار نشو و نما کے لئے بہترین ضمانت انگلستان کی دوستی ہے۔ اٹلی والے حقیقت حال سے اچھی طرح واقف تھے۔ انیسویں صدی میں انگلستان بلاشرکت غیرے بحر روم پر حاوی تھا اور وہاں کوئی بات اس کی مرضی کے بغیر نہ ہوسکتی تھی، جو صورت آج باقی نہیں ہے۔ انگلستان کی غرض بھی اس میں پوشیدہ تھی کہ اٹلی مضبوط ہو۔ انیسویں صدی میں بحر روم کی سیاست میں فرانس اور انگلستان کے تصادم کو نہ بھولنا چاہیئے۔ فرانس برابر چاہتا تھا کہ بحر روم اس کا ہو جائے اور انگلستان اسے اس منصوبہ میں برابر شکست دیتا تھا۔ اسی لئے وہ اٹلی کو رفتہ رفتہ بحر روم میں تقویت دیتا جاتا تھا تاکہ ایک ایسی طاقت پیدا ہو جائے جس کے اغراض فرانس کے خلاف ہوں اور چاہے بعد کو یہ اس کی جگہ لینا چاہے مگر اس وقت اپنی کمزوری کے باوجود فرانس کے خطرہ کو دفع کرسکے۔ اٹلی چونکہ فرانس کے مقابلہ میں کمزور تھا اس لئے انگلستان کو پورا بھروسہ تھا کہ یہ ہمارے ساتھ رہے گا۔ اٹلی اپنے جغرافی موقع اور اپنی معاشی ساخت کی وجہ سے مجبور تھا کہ انگلستان کا دم چھلا بنا رہے۔ بحر روم کا انگریزی بیڑا اس کے ساحلی شہروں کو تباہ کرکے اس کے جسم پر کاری زخم لگا سکتا تھا۔ اور اگر کہیں فرانس سے بھی اس کی اَن بَن ہو تو اس کے ملک کی کامل ناکہ بندی کرسکتا تھا جنگ عظیم کے بعد بھی پہلے تو دونوں ملکوں کے اس تعلق میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ فاشستی حکومت نے ہر طرح انگلستان سے تعلقات استوار رکھے بلکہ انھیں اور بہتر بنانے کی کوشش کی، حالانکہ اپنے ابتدائی زمانہ میں یہ حکومت صاف صاف

فرانس کے خلاف رہی۔ لیکن رفتہ رفتہ اٹلی نے مصر اور ایشیائے کوچک میں تمدنی اور معاشی نشر و تبلیغ کا ایک جال بچھایا۔ پھر مصر کے بعد فلسطین میں دلچسپی لینا شروع کی۔ یہاں کی فاشستی اٹلی نے اپنے سر دوہرے فرائض لئے، ایک تو ایشیائے کوچک کے محافظ کی حیثیت سے فرانس کی جگہ لینا چاہی دوسرے صیہونی تحریک سے روابط بڑھائے۔ اسی کے ساتھ ساتھ مسلمانوں سے دوستانہ تعلقات قایم کرنے کی تدبیریں شروع کیں تاکہ ان کی مدد سے حبش کو زیر کرے۔ ایشیائے کوچک کی ان تین قوتوں سے کھیلنے کے لئے ضرورت تھی کہ حکمت عملی میں لوچ ہو، چنانچہ یہی لوچ اور تغیر پذیری فاشستی سیاست خارجہ کی امتیازی خصوصیت رہی ہے۔

اٹلی کی یہ کوششیں ایسی تھیں جیسے کوئی خشک زمین میں آئندہ بارش کی امید پر نالیاں کھودے لیکن اس کے علاوہ بھی اٹلی نے بحر روم میں براہ راست قوت حاصل کرنے کی تدبیریں کیں۔ اس نے فاتح بننے کا حوصلہ کیا۔ اس کے لئے بس طرابلس اور ترکی میں میدان تھا۔ طرابلس جس پر پہلے برائے نام قبضہ تھا واقعی تفصیل کے ساتھ فتح کیا گیا، لیکن اناطولیہ میں قدم نہ جما پانے کی تلافی اس کم قیمت علاقہ میں تسلط سے نہ ہو سکی۔ شراکت سیاسی کے نئے شریک کی حیثیت سے روم نے انگلستان سے چاہا کہ اپنی سلطنت کے کچھ کام اس کے سپرد کئے جائیں جس سے بعض علاقوں میں اس کا درخور ہو جائے۔ فاشستی اٹلی نے نہایت زور اور اصرار سے انگلستان کو جتایا کہ یہ شرکت تاریخ نے مقرر کر دی ہے، اس کا وجود میں آنا لازم ہے، اور اٹلی صاف شرائط طے کرنے پر آمادہ ہے۔ لیکن انگلستان کئی سال تک سب سنتا رہا اور کوئی جواب نہ دیا۔ اٹلی کو لیبیا میں تسلط کے علاوہ اس سب قصہ سے جو حاصل ہوا وہ مصر کی دوستی۔ اٹلی نے مصری قومی تحریک سے اچھا تعلق پیدا کر لیا، اگرچہ صاف احتیاط کے ساتھ کہ انگلستان خفا نہ ہو جائے لیکن اٹلی اور انگلستان کے تعلقات میں کھلی ہوئی کشیدگی ۱۹۳۳ء میں رونما ہوئی جب اٹلی نے بحر احمر کے علاقہ میں اپنا سیاسی جال پھیلانا شروع کیا۔ انگریزوں کا خیال ہے کہ یہاں اٹلی نے یمن کو ابن سعود کے مقابلہ میں ابھارا۔ عرب کے معاملات میں کسی کی مداخلت انگلستان کو ذرا نہیں بھاتی۔ انگلستان ہرگز یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ ہندوستان سے آمد و رفت کے راستہ میں کوئی رکاوٹ

پیدا ہو۔ اٹلی نے سلطنت برطانیہ کے اس اصول اساسی کی خلاف ورزی کی تھی، لیکن یمن کی شکست فاش نے معاملہ کو طے کردیا۔ البتہ اطالوی اور برطانوی اخبارات میں جو تو تو میں میں ہوئی تھی اس کی تلخی باقی رہی۔

اب اس مرتبہ اٹلی اور انگلستان کے تعلقات میں جو کشیدگی ظاہر ہوئی ہے وہ اس اعتبار سے بالکل نئی بات ہے کہ اٹلی والوں نے بالارادہ اسے پیدا کیا ہے۔ اب تک انگلستان سے دوستی فاشستی سیاست خارجہ کا ایک مسلمہ عقیدہ تھا۔ لیکن پچھلے دنوں اطالوی اخبارات نے برابر اس عقیدہ کی تحقیر کی ہے اور ہنسی اڑائی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اٹلی کے ہوائی بیڑہ کی ترقی نے بالکل نئی صورت حال پیدا کردی ہے اور اب اٹلی کو بحر روم میں برطانوی قوت کا سہارا درکار نہیں ہے۔ آج اگر اٹلی کو انگلستان سے مدد درکار ہے تو اتنی ہی انگلستان کو اٹلی سے مطلوب ہے۔ اٹلی کے ہوائی جہاز چاہیں تو مالٹا کو دو گھنٹہ کے اندر بالکل برباد کردیں۔ آج سے پہلے اٹلی جو چیز ایک نئے کم مایہ شریک کاروبار کی حیثیت سے مانگتا تھا اسے آج وہ اپنا تاریخی حق جانتا ہے۔ بحر روم میں برطانوی تسلط ایک تاریخی یادگار ہے اور بس اس سے زیادہ نہیں۔ بحر روم۔ بحر لاطینی ہے جس میں فرانس اور اٹلی ایک دوسرے کے معاون ہیں۔

یہ اطالوی اخبارات کا خیال ہے۔ دیکھنا چاہئے کہ بحر روم میں قوتوں کا تناسب واقعی کیا ہے۔ کیا ہوائی بیڑہ کی ترقی نے واقعی اٹلی کا پلا بھاری کردیا ہے؟ ہمارا خیال ہے کہ نہیں۔ اور یہ کچھ بحری اور ہوائی جنگ کے نقطۂ نظر سے نہیں مثلاً اس بات کے خیال سے نہیں کہ سویز پر یا قبرص پر یا مالٹا پر اطالوی حملہ کامیاب ہوگا یا نہیں، بلکہ اس وجہ سے کہ اس تصادم سے دونوں قوتوں کا سخت نقصان ہے۔ یہ سچ ہے کہ مالٹا کو چند گھنٹوں میں زمین کے برابر کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اس سے پہلے پلرمو، اور نیپلز اور خود روم بھی راکھ کا ڈھیر ہوچکے ہونگے۔ یعنی خود اٹلی کا وجود معرض بحث میں آجائے گا اور انگلستان کے ہاتھ سے تو زیادہ سے زیادہ بحر روم میں اقتدار کے چند وسائل نکل سکیں گے۔ یہ سچ ہے کہ مالٹا کو اٹلی کے حملہ سے بچایا نہیں جاسکتا۔ گر مالٹا کو انگلستان اٹلی پر بم کے گولہ کی طرح پھینک سکتا ہے، بیشک گولا پاش پاش ہوجائے گا مگر اپنا تباہی کا کام تو کرجائیگا۔ پھر انگلستان کے بحری راستہ پر جو اسکندریہ، سویز

اور فلسطین کے ساتھ ساتھ جاتا ہے حملہ کرنا اور بھی مشکل اس وجہ سے ہوگیا ہے کہ پچھلے چند سال میں انگلستان نے صرف سنگاپور ہی میں نہایت تیزی سے بحری قلعہ بندی نہیں کی ہے بلکہ فلسطین کا بندرگاہ حیفہ بھی دیکھتے دیکھتے دنیا کا سب سے مضبوط جنگی مرکز بن گیا ہے۔

معاملات کا سیاسی پہلو اور بھی پیچیدہ ہے۔ جب اٹلی نے پہلے پہل بحر احمر کے علاقہ میں ہاتھ پاؤں مارنے شروع کئے تو برطانوی وزارت بحر کے ایک رکن نے اسے "سلطنت ہوا کی نالیوں میں سرطان" سے تعبیر کیا تھا۔ اور یہ بات ہے بھی بالکل ٹھیک۔ اس لئے اس علاقہ میں کسی ملک کو سرگرم عمل ہونا چاہیے اس کا رخ انگلستان کے خلاف نہ بھی ہو برطانیہ کے راستہ میں جس پر اس کی زندگی کا دارومدار ہے جمود اور انحطاط کا بیج بونا ہے۔ اور اس کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً اگر حبش پر اٹلی کا حملہ کامیاب ہو جائے تو اٹلی مشرقی افریقہ میں ایک سلطنت قایم کرے گا جو قدرتی طور پر بحر احمر کے دوسرے ساحل پر بھی پہنچنا چاہے گی۔ پھر حبش کے اندرونی حالات کا تقاضا یہ ہوگا کہ مصری قومی تحریک کی مدد کے علاوہ اور جگہ بھی اٹلی مسلمانوں کی حمایت کرے۔ اور اگر بالفرض یہ امکانات واقعہ نہ بھی بنیں تب بھی برطانوی سلطنت کی ہوا کی نالی میں یہ ہر دم کی تحریک کیا کم مصیبت ہوگی۔ جو تصادم برسوں سے برطانوی ہوشیاری سے ٹالے جا رہے ہیں مثلاً جاپان سے تصادم یا عالم اسلام سے ٹکر انھیں اٹلی کے اعمال ممکن ہے یکایک سامنے لاکھڑا کریں۔

انگلستان کو بحر روم میں ابھی تک حربی تفوق حاصل بھی ہو تب بھی اس علاقہ میں ایک ضدی اور ابھرتی ہوئی قوت کی کارفرمائی اسے ضرور بے چین رکھے گی۔ پچھلے دس برس میں انگلستان نے مشرق سے مغرب تک تحفظ بحری کی چار لائنیں قایم کی ہیں۔ سب سے دور ہانگ کانگ میں پھر سنگاپور میں جس پر ہالینڈ کی مدد سے قبضہ رکھا جائے گا، پھر عدن، پھر حیفہ، بندر سعید، اور اسکندریہ۔ یہ حفاظتی قلعہ بالکل برباد ہو جائے گا اگر سب سے قریب والی لائن اور اس کے بعد والی کے درمیان یا سب سے قریب والی لائن کے سامنے بھی کوئی قوت مسلط ہو جائے اور بلا تامل اپنی سیاست کے انجھر چلتی رہے۔

انگلستان والوں نے اپنی روایتی دوربینی سے ان تمام باتوں کو دیکھ لیا تھا۔ اس لئے وہ جیفہ میں قلعے بنانے اور مالٹا میں اطالوی تمدن کے مقابلہ میں خود مالٹا کی زبان اور تمدن کی حمایت کرنے پر نہیں رک گئے۔ بلکہ ان کی نظر میں بحر احمر میں امن کے قیام کو جو اہمیت حاصل ہے اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ حبش پر حملہ کو روکنے کے لئے انھوں نے اٹلی کو برطانوی نو آبادیوں میں سے کچھ علاقہ دینے تک پر آمادگی ظاہر کی۔ اٹلی نے اس کو یوں قبول نہ کیا کہ اس کے معنی یہی ہوئے کہ اٹلی کی توسیع کا مسئلہ پھر ٹل گیا۔ اٹلی سمجھتا ہے کہ اگر حبش کو سمندر تک پہنچنے کا راستہ مل گیا تو وہ اس سے اور قوت پکڑے گا اور اس وقت جس حملہ کو انگریز اپنی مداخلت سے رکوانا چاہتے ہیں وہ بعد کو اور بھی دشوار ہو جائے گا۔"

یونان میں شاہی جنگ عظیم نے کتنے تخت خالی کر دئے تھے۔ مگر اب معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ردعمل شروع ہو گیا ہے۔ کہیں کہیں تو بادشاہوں کی جگہ ان سے بھی زیادہ مطلق العنان قاید حکمرانی کر رہے ہیں اور کہیں تخت کی زیب و زینت کے لئے بادشاہوں کی واپسی کے ڈھنگ ڈالے جا رہے ہیں۔ چنانچہ یونان نے اپنی آبادی تقریباً ۹۵ فیصدی اکثریت کی رائے سے اپنے پرانے بادشاہ جارج دوم کو پھر تخت پر متمکن کر دیا ہے۔

بظاہر تو یہ بات ہے کہ قوم اپنے پرانے بادشاہ سے راضی ہو گئی ہے۔ بادشاہ نے بھی تو آخر قوم کی خاطر اپنی رومانوی بیوی الزبتھ کو طلاق دیدی جس سے یونانی اور جو یونانیوں سے سخت خفا تھی لیکن اس تغیر میں دول عظمیٰ کی سیاست کو بھی اچھا خاصا دخل ہے۔ یعنی انگلستان کی سیاست کا تقاضا یہ ہے کہ بلقان کے ممالک میں اس کا اثر شاہی خاندانوں کی وساطت سے مضبوط ہو۔ اس لئے کہ آئندہ کبھی روس سے ٹکر ہوئی تو اس کی بڑی ضرورت پڑے گی۔ جن ملکوں میں در پردہ اشتراکی تبلیغ نے روسی اثر کو بہت کچھ بڑھا دیا ہے وہاں برطانیہ کی یہ کوشش اور بھی شدت کے ساتھ جاری ہے۔ اور انھیں ممالک میں سے یونان بھی ہے۔ بلغراد کا دربار شاہی انگریزی اثر میں ہے ہی۔ رومانیا سے تعلقات بہت اچھے نہ تھے مگر انھیں بھی درست کرنے کی کوشش جاری ہے بلغاریہ کے بادشاہ کی شادی ایک اطالوی شہزادی سے ہوئی ہے اور اس سے خیال ہوتا ہے کہ بلغاریہ اٹلی کے موجودہ حریف برطانیہ کا ساتھ

نہ دے گا۔ مگر کہتے ہیں کہ اطالوی شہزادی کا سیاسی اثر زیادہ نہیں ہے۔ اور بلغاریہ اور یوگوسلاویا میں تعلقات روز بروز زیادہ خوشگوار ہوتے جاتے ہیں اور اس سے غالباً انگریز بھی بلغاریہ میں کام لے سکیں گے۔

یونانی تخت پر انگلستان کو شاہ جارج دوم کی واپسی میں بھی چنداں اعتراض نہ تھا مگر خبر تو یہاں تک تھی کہ ملک معظم کے نورعین شہزادہ کنٹ کو یونان کے تخت پر پہنچانے کے منصوبے بھی بنائے گئے تھے۔ اور اس سلسلہ میں یونان کے سابق وزیر اعظم سلداریس نے یوگوسلاویا کا سفر کرکے خود شہزادہ کنٹ اور دوسرے با اثر لوگوں سے گفتگو کر لی تھی۔ لیکن فرانس اور اٹلی جو رجعت شاہی کے حامی تھے شاید انگلستان کے اثر کو اتنا قوی ہونے دینا نہ چاہتے ہوں۔ یا اور وجوہ ہوں کہ آخر کو قرعہ شاہ جارج دوم کے نام ہی پڑا۔

بلقان میں انگلستان کی دلچسپی کا اصل سبب یہ ہے کہ اگر بلقانی حکومتوں سے دوستانہ تعلقات ہوں تو بحر روم میں انگریزی بیڑہ کو بڑی تقویت ہو جائے۔ یہ بات سب جانتے ہیں کہ جدید بحری اسلحہ نے جبل الطارق کے قلعوں کو بیڑہ کے لئے بہت کچھ بے کار بنا دیا ہے۔ اگر اطالوی ہوائی جہاز اس پر حملہ کردیں تو شاید اس کا بچانا بھی دشوار ہو۔ اسی وجہ سے انگریز مالٹا کو مضبوط بنانے میں شب و روز لگے ہوئے ہیں۔ جزیرہ قبرس بہت دور ہے اور اس پر جو کچھ سرمایہ لگا ہے اسے برطانوی بحری حلقوں میں تقریباً ضایع شدہ خیال کیا جاتا ہے۔ لیکن قبرس اور مالٹا کے درمیان متعدد چھوٹے چھوٹے جزیرے ہیں جن سے اب تک کوئی بحری کام نہیں لیا گیا ہے اور یہ سب یونان کے ہیں۔ اب کہ شاہی قایم ہو گئی ہے غالباً ان جزیروں کے لئے بات چیت جلد شروع ہوگی۔

غرض کچھ یونانیوں کی اپنی خواہش کہ سیاست ملکی میں تسلسل اور سکون کا سامان کریں، کچھ برطانیہ کے مذکورہ بالا منصوبے، پھر فرانس اور اٹلی کا کسی خالص برطانوی شہزادے کے مقابلہ میں شاہ جارج دوم کو غنیمت سمجھنا، نتیجہ یہ ہوا کہ شاہ جارج تخت یونان پر رونق افروز ہیں۔ ان کی تشریف آوری سے پہلے ہی یونان کے وزیر اعظم سلداریس کو ان کے ایک رفیق وزیر جنگ جنرل کونڈالیس نے (شاید اس شہزادہ کنٹ کی حمایت کے شبہ پر یا کیا!) نکال باہر کیا تھا۔ اب شاہ جارج نے تخت نشین ہونے کے چند روز بعد

ہی جنرل کو نڈائیس کو رخصت کر دیا ہے اور نئی وزارت کے مشورہ سے حکومت فرما رہے ہیں ۔

جزائر فلپائن کی آزادی ہندوستانیوں کو یہ معلوم کرکے یقیناً تعجب ہوگا کہ کل ۳۶ برس ریاستہائے متحدہ امریکہ کے قبضہ میں رہنے کے بعد حکمراں ملک ہی کے ایک قانون سے جزائر فلپائن کو آزادی حاصل ہونے والی ہے! اور انگریز حکمرانوں اور اس ملک کی آزادی خواہ جماعت کے لئے فلپائن میں یہ امریکن سیاسی تجربہ بہت سبق آموز ثابت ہو سکتا ہے ۔

آزادی کی کوشش تو اہل فلپائن کوئی بیس سال سے کر رہے تھے مگر ۱۵ نومبر گذشتہ کو مملکت فلپائن کے پہلے منتخب شدہ صدر مانول کیزون نے اپنے جلیل القدر عہدہ کے فرائض انجام دینے شروع کر دیئے اور امریکہ اور مشرق بعید کے باہمی تعلقات میں ایک نئے باب کا آغاز ہو گیا ۔ موجودہ قانون کی رو سے ریاستہائے متحدہ امریکہ فوراً اپنے اقتدار میں معتدبہ کمی کر دیگی اور دس سال میں ملک کا سیاہ و سفید ملک والوں کے ہاتھ میں دے کر بالکل علیحدہ ہو جائے گی ۔

لیکن ہندوستانی آزادی خواہوں کے لئے اس تجربہ کا یہ سبق بھی قابل توجہ ہے کہ آزادی کا حاصل کر لینا ہی کافی نہیں، اسے باقی رکھنے اور ترقی دینے کے لئے قوم میں اخلاقی معاشی اور فوجی قوت بھی ہونی چاہئے فلپائن میں ابھی نئے دستور سیاسی کو رائج ہوئے کوئی دو ہفتے ہی ہوئے ہوں گے اور یہ سوال خود وہاں کے مفکرین سیاسی کو ستانے لگا کہ دنیا کی موجودہ حالت میں اور خصوصاً جاپانی حلقۂ اثر میں اس آزادی کو برقرار بھی رکھا جا سکے گا یا نہیں ۔

کمزور کا تعلق جب کسی طاقتور سے قایم ہوتا ہے تو طرح طرح کی گتھیاں پیدا ہو جاتی ہیں جن کے سلجھانے میں بڑی دقت ہوتی ہے ۔ امریکہ سے تعلق نے فلپائن کی معاشی زندگی میں اسی قسم کی مشکلات پیدا کر دی ہیں ۔ جب سے یہ تعلق ہوا تجارت خارجہ کو ترقی ہوئی ۔ ۱۹۰۹ء سے تجارت آزاد کا سلسلہ شروع ہوا پہلے تو کچھ پابندیاں تھیں بھی ۱۹۱۳ء سے امریکہ اور فلپائن کی تجارت میں کسی قسم کی رکاوٹ محاصل درآمد و

برآمد کی نہ رہی۔ سنہ ۱۹۰۹ء سے سنہ ۱۹۲۱ء تک ۲۰ برس میں فلپائن کی تجارت خارجہ تقریباً چوگنی ہو گئی۔ یہ اچھی بات تھی، مگر فلپائن والے امریکی منڈی کے دست نگر بھی ہو گئے۔ یعنی پہلے سنہ ۱۹۰۹ء میں فلپائن سے جو مال باہر جاتا تھا اس کا کل ۱۲ فیصدی امریکہ میں کھپتا تھا، سنہ ۱۹۳۲ء میں ۸۷ فیصدی مال وہاں جانے لگا اور جو مال باہر سے فلپائن آتا تھا اس میں بقدر ۶۵ فیصدی ریاستہائے متحدہ امریکہ کا حصہ ہو گیا۔ لیکن اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ یہ تجارت خارجہ چند زرعی اجناس تک محدود ہے۔ ایک شکر ہی کا حصہ فلپائن سے باہر جانے والے مال میں ۶۰ فیصدی ہے۔ اور یہ سب کی سب امریکہ جاتی ہے۔ شکر، ناریل، تمباکو اور سن کو یکجا کر لیجئے تو فلپائن کی برآمد کا ۹۰ فیصدی ہو جاتا ہے۔ ادھر امریکہ کے سوتی کپڑے کے لئے فلپائن کی منڈی سب سے بڑی ہے اور ایشیائی منڈیوں میں امریکی گوشت، لوہے اور فولاد کی بھی بہترین منڈی ہے۔ غرض جب سیاست فلپائن کو امریکہ سے علیحدہ خود مختار ریاست بنانے کے درپے ہے تو معیشت ان جزائر کو امریکہ کا ایک جزو بنانے کی فکر میں ہے۔ اور سیاست کی اس جیت میں بھی بعض امریکی معاشی حلقوں کا اثر کارفرما ہے۔ اگر امریکہ میں فلپائن کی شکر اور ناریل کے تیل کی درآمد بند کرنے کی کوئی تدبیر ہو سکتی تو امریکہ کے زرعی حلقے اس خود مختاری کے اتنے حامی نہ ہوتے۔ امریکہ میں فلپائن کی آزادی کی حمایت سیاسی تدبیر کی رہین منت نہیں بلکہ معاشی اغراض کی پابند ہے۔ چنانچہ اس جدید قانون آزادی کے دفعات سے بھی اس کا پتہ چلتا ہے، اس قانون کی رو سے فلپائن کی منڈی تو کامل آزادی سے دس سال پہلے کے زمانہ میں امریکی مال کے لئے بالکل کھلی رہے گی مگر امریکی منڈی میں فلپائن کے روئی، شکر اور کھوپرے کے تیل کی مقررہ مقداریں ہی جا سکیں گی۔ اور اس مدت کے آخری ۵ سال میں خود فلپائن کی حکومت بھی خود اپنے مال کی برآمد پر محاصل لگائے گی۔ غرض جب فلپائن کا تعلق امریکہ سے بالکل قطع ہو جائے گا۔ تو کھوپرے کے تیل کی صنعت اور سگار سازی کی صنعت یکسر تباہ ہو جائے گی لیکن چونکہ کھوپرے اور تمباکو کی مانگ دنیا میں ہے اس لئے صنعت کی تباہی کے ساتھ ان صنعتوں کی زرعی اساس باقی رہ سکے گی۔ مگر شکر کا حال بہت ہی خراب ہو گا۔ شکر کی صنعت کے ہاتھ سے اگر امریکہ کی منڈی نکل گئی تو یہ اپنے کثیر مصارف پیدائش کی وجہ سے کوبا اور جاوا سے دنیا کی منڈیوں میں مقابلہ نہ کر سکے گی۔ اور اس کی تباہی کے معنی ہیں ۲۰ لاکھ اہل فلپائن کا روٹیوں کو محتاج ہو جانا اور حکومت کی آمدنی کے ۴۰ فیصدی کا

خطرہ میں پڑجاتا۔ اس کی تباہی کے معنی ہیں فلپائن کے تمام ساہوکارہ کا درہم و برہم ہو جانا کہ دس سب سے بڑے بنکوں کے قرضوں میں کوئی نصف کے قریب اس شکر کی ضمانت پر دئے جاتے ہیں، سرکاری بنک کے کوئی سوا دو کروڑ ڈالر کے قرضہ میں سے تین چوتھائی شکر پر ہی دیا جاتا ہے۔ سرکاری ریل کی آمدنی کا کوئی ۴۰ فیصد شکر کی صنعت ہی سے وصول ہوتا ہے۔ اس صنعت کی تباہی سے سارا نظام معیشت منہدم ہو جائے گا۔ اور ممکن ہے کہ اس کی وجہ سے خود آزادی کا تجربہ ناکام ہو جائے۔

یہ مسائل فلپائن کے اہل سیاست کو پریشان کر رہے ہیں اور ان کو امید ہے کہ ملک میں زرعی فصلوں کا تنوع بڑھا کر، اور صنعتوں کو فروغ دے کر، اور اپنی ضرورتیں آپ پوری کر کے پردیس پر اتنا سہارا لینے کی ضرورت جاتی رہے گی۔ لیکن زرعی تنوع پیدا کرنے میں بہت دیر لگتی ہے اور صنعت کے قیام کے لئے سرمایہ درکار ہوتا ہے اور اس کی ان جزائر میں کچھ ایسی بہتات نہیں۔ ڈر ہے کہ سیاسی تبدیلی کے باعث پردیسی سرمایہ کچھ عرصہ تک اُدھر کا رُخ نہ کرے گا۔ اور اس لئے صنعتی ترقی کی رفتار کچھ زیادہ تیز نہ ہوگی۔

ان معاشی دشواریوں کے ساتھ مشرق بعید کے اس علاقہ میں سیاسی پیچیدگیاں بھی کچھ کم نہیں ہیں اور حفاظت ملکی کا مسئلہ اس وجہ سے اور بھی اہم ہو گیا ہے، خیال ہے کہ جزائر فلپائن جمعیۃ اقوام کی رکنیت حاصل کر کے دوسروں کے غالبانہ حملوں سے اپنے کو محفوظ کر سکیں گے لیکن اس علاقہ کی جمعیۃ کے ایک رکن چین کے ساتھ جو کچھ ہو چکا ہے وہ بہت امید افزا نہیں ہے۔ نہ اس کے زیادہ امکانات ہیں کہ کوئی بڑی مغربی قوت ان جزائر سے جارحانہ اور مدافعانہ معاہدہ کرے۔ اس لئے کہ اس معاہدہ سے اس قوت کو چنداں فائدہ نہ پہنچے گا اور جاپان کی رقابت خواہ مخواہ کو پیدا ہو جائے گی۔ ایک صورت یہ بھی پیش کی جاتی ہے کہ تمام دول مل کر اس علاقہ کی غیر جانبداری کی ضامن بن جائیں۔ لیکن اس میں بھی جاپان حائل ہوگا جو اس علاقہ کے معاملات میں کسی دوسری قوت کی مداخلت کو روا رکھنے کے لئے آمادہ نہیں ہے۔ اور یقیناً جاپان کی نظر ان جزائر پر ہے۔ اس لئے کہ اگر وہ یہاں اپنا اقتدار قایم کر سکے تو ایشیا کے مشرقی ساحل کے تمام جزیروں پر اس کا قابو ہو جائے گا۔ اور شرق الہند میں اسے سیاسی اور تجارتی نفوذ کے لئے بڑا سہارا مل جائے گا۔ یعنی مشرق بعید میں جاپان کے اقتدار میں اور کوئی ساجھی نہ رہے گا۔

غلامی کی مصیبت سے نکلنے کے بعد آزادی کے خطرات بھی کچھ کم فکر میں ڈالنے والے نہیں ہوتے۔ مگر جو ان سے دو چار نہ ہو وہ انھیں حل کیسے کرے۔ امید رکھنی چاہیئے کہ فلپائن والے ان دشواریوں کا کوئی حل نکال سکیں گے چاہے اس میں اپنے نظام معیشت کو بدلنے کی ضرورت ہی کیوں نہ پڑے اور دس سال کے زمانہ امیدواری کے گذرنے پر ان دقتوں سے بچنے کے لئے پھر امریکہ کا اقتدار قایم کرانے میں مدد نہ ہونگے۔ آزادی کی سچی طلب کا یہی امتحان ہے، کہ قوم آزادی کے نقصان کو غلامی کے نفع پر ترجیح دینے کے لئے آمادہ ہو۔